بلوچستان

تاریخ کی روشنی میں

ملک محمد سعید دہوار

بلوچستان
تاریخ کی روشنی میں

مصنف

ملک محمد سعید دہوار

ناشر

نساء ٹریڈرز، پٹیل روڈ۔ کوئٹہ

فون ۷۴۶۸۱

عرضِ ناشر

ملک سعید کا شمار بلوچستان کے صفِ اوّل کے اہلِ قلم میں ہوتا ہے۔ وہ گیارہ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء میں جب ان کے علاقہ میں پرائمری سکول کھل گیا تو انہوں نے اسی سکول سے پرائمری پاس کر کے گورنمنٹ ہائی سکول مستونگ میں داخلہ لیا۔ اسلامیہ کالج پشاور سے گریجولیشن کی اور ایم اے سیاسیات کی ڈگری بلوچستان یونیورسٹی سے ۱۹۷۴ء میں حاصل کی۔ اس زمانے میں وہ جیل میں تھے۔ انہیں اردو فارسی اور انگریزی زبانوں پر مکمل عبور حاصل ہے۔

ان کی پہلی تصنیف ۱۹۷۱ء میں "بلوچستان ما قبل تاریخ" بلوچی اکیڈمی کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ حریت کراچی نے لکھا ہے کہ "فاضل مصنف نے بلوچستان کے آثارِ قدیمہ پر بحث کرتے ہوئے انگریزی کی بجائے اردو کی اصطلاحات استعمال کر کے اردو زبان کی بہت بڑی خدمت کی ہے اور اس کتاب کی اہمیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ آثارِ قدیمہ پر اردو کی یہ دوسری کتاب ہے۔" اس سے پیشتر محکمہ آثار

قدیم پاکستان کے ادریس صدیقی نے "تہذیب وادیٔ سندھ" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ متذکرہ بالا اخبار نے اس کتاب کی افادیت پر بحث کرتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنّف کو معاشرتی علوم پر بڑا عبور حاصل ہے۔

"بلوچستان تاریخ کی روشنی میں" ان کی دوسری تصنیف ہے جو سائنٹیفک بنیاد پر لکھی گئی ہے جس میں سات ہزار سال قبل مسیح سے لے کر ۱۸۹۳ء تک بلوچستان کی ماقبل تاریخ اور تاریخی دور پر بحث کی گئی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ابھی تک بلوچستان کی تاریخ پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے مستند مواد کی بنا پر یہ واحد منفرد کتاب ہے جس کو ایک مستند اور پُر از معلومات تاریخ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مصنّف کا خیال ہے کہ آگے جا کر وہ بلوچستان کی ہمعصر تاریخ پر ایک کتاب لکھیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کی اہمیت اس بنا پر بھی ہوگی کہ اس دور میں تاریخی واقعات کے دوران مصنّف خود زندہ و سلامت تھے۔

ملک سعید کا تعلق وادی مستونگ کے دہوار قبیلہ کے خواجہ خیل طائفہ سے ہے اور وہ علاقہ تیری کے سرکردہ ملک بھی ہیں جو وادیٔ مستونگ کا ایک سرسبز اور شاداب علاقہ ہے اور اس علاقہ میں وسیع آبی اور سیلابہ اراضیات اور باغات کے مالک

ہیں اور ایک ترقی پسند زمیندار بھی ہیں اور سماجی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے ملک صاحب سیاسی کارکن رہے اور اُن کا شمار نواب زادہ یوسف علی خان مگسی اور خان عبدالصمد خان اچکزئی کے ساتھیوں میں ہوتا ہے ؛

عابد بخاری
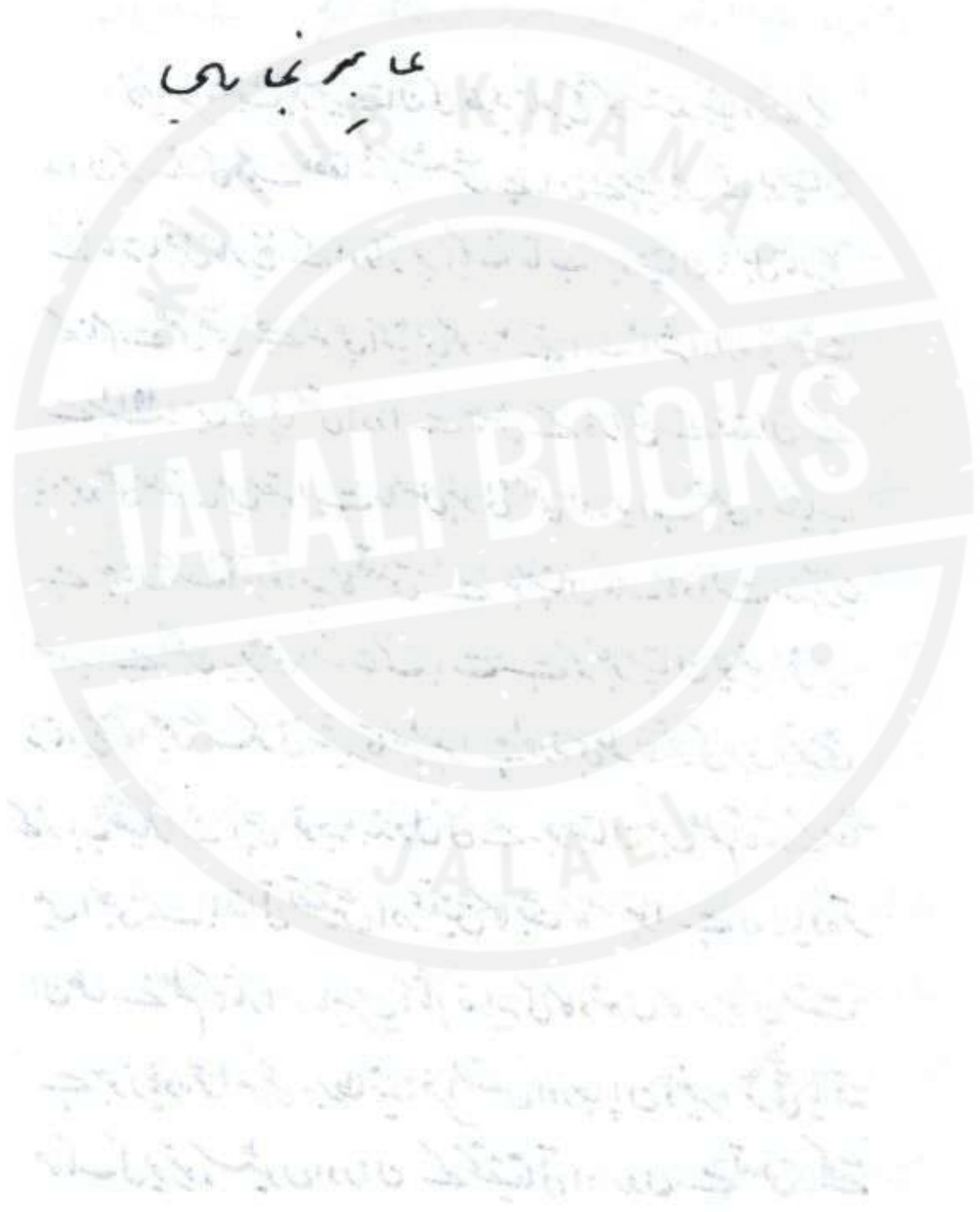
ابتدائے سخن

زیر نظر تالیف بلوچستان کی قدیم تاریخ کو مستند بنیادوں پر مدون کرنے کی ایک محققانہ کوشش ہے۔ اس سے پیشتر میں نے بلوچستان کے زمانہ ماقبل تاریخ کے ادوار پر ایک کتاب "بلوچستان ماقبل تاریخ" کے نام سے لکھی تھی جسے بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے ایک ناشر ادارہ کی حیثیت سے ۱۹۷۰ء میں چھاپی تھی اور اسے پبلسٹی کے ذرائع کے فقدان کے باوجود علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی تھی اور یہ اب بھی دستیاب ہے۔ جہاں تک آثارِ قدیمہ کا تعلق ہے۔ بلوچستان ملک کا دولت مند ترین صوبہ ہے۔ لیکن یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ بلوچستان یونیورسٹی میں نہ تاریخ کا ابھی تک کوئی شعبہ قائم ہوا ہے اور نہ ہی علم الآثار کی طرف یونیورسٹی کے اربابِ اختیار نے اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ بلوچستان میں علم الآثار کے معاملہ میں ابھی تک باقیاتی تفتیش اور تحقیق کا جتنا کام ہوا ہے وہ زیادہ تر ان علمائے علم الآثار اور ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی کاوشوں کا مرہونِ منت ہے جو زیادہ تر امریکہ، برطانیہ، فرانس اور جاپان وغیرہ ترقی یافتہ ممالک کی یونیورسٹیوں اور ان کے تحقیقاتی اداروں سے تعلق رکھتے

ہیں۔ بلوچستان کی قدیم بستیوں میں مہرگڑھ کی قدیم بستی سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے جو ضلع کچھی میں ڈھاڈر کے نزدیک ڈھاڈر سے سبی جانے والی سڑک کے کنارے اس سے دس کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کی اہمیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ جنوب مشرقی ایشیا کی قدیم ترین بستیوں میں سے ایک قدیم بستی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ بلوچستان کے زمانہ ماقبل تاریخ کی پوری داستان بکم و کاست پورے تسلسل کے ساتھ اسی بستی میں مدفون ہے جس کے اوپر علم الآثار کے ماہرین کی ایک فرانسیسی جماعت پہلے موسیو کسال آنجہانی اور اب ان کے معاون موسیو جارج کی سرکردگی میں تقریباً چھ سال سے سردیوں کے دوران خضریات کے ذریعہ باقیاتی تفتیش اور تحقیقات کا کام کر کے بلوچستان کے قدیم زمانہ کی سرگزشت کو اجاگر کرنے میں مصروف ہے اور یہ کام مسلسل جاری ہے اس باقیاتی تفتیش سے بلوچستان کی قدیم تہذیب، تہذیبی ترقی کے اسباب اس کی ابتداء عروج وسعت اور اس کے زوال کے متعلق پوری معلومات حاصل ہو رہی ہیں اور قدیم زمانہ کے بلوچستان کے باشندوں کی زندگی کا کوئی شعبہ جس میں ان کی دیہی منصوبہ بندی ان کی مجلسی زندگی اور طرز معاشرت، معیشت، صنعت و حرفت، تجارت، زراعت، مذہبی معتقدات طریقۂ تدفین ثقافت اور آرٹ وغیرہ شامل ہیں نظر سے اوجھل نہیں رہا ہے۔

اس سے پیشتر بلوچستان کی تاریخ سکندر اعظم کے زمانہ سے شروع ہوتی تھی۔ لیکن ۱۹۵۱ء میں علم الآثار کے ایک ممتاز برطانوی عالم والٹر اے فیر سروس نے امریکہ کے نیچرل ہسٹری میوزیم کی جانب سے وادیٔ کوئٹہ میں باقیاتی تفتیش کا کام کر کے اہم انکشاف یہ کیا کہ بلوچستان میں تہذیبی ترقی کی ابتداء ۳۵۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۳۲۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ ہوئی تھی جبکہ یہاں کے باشندوں کی معیشت کا دارومدار کلیتاً بھیڑ بکریوں کی پرورش پر تھا۔ وہ برتن بنا کر استعمال کرنے کے فن سے ناواقف تھے اور پتھر کے چقماقی اوزار اور ہتھیار استعمال کرتے تھے لیکن اب مہر گڑھ کی قدیم بستی پر مسلسل باقیاتی تفتیش سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ بلوچستان میں تہذیبی ترقی کی ابتداء سات ہزار قبل مسیح میں ہوئی تھی۔ جبکہ یہاں کے باشندوں کا گزارہ ان کی زندگی کے پہلے مرحلے میں کلیتاً پہاڑی بکروں بکریوں، پہاڑی دمبوں و دمبیوں اور غزالوں کے شکار پر تھا۔ وہ اپنی زندگی کے دوسرے مرحلے میں شکار پر بھی گذارہ کرتے تھے اور محدود پیمانے پر بھیڑ بکریوں کو پالتو بھی بنا لیا تھا۔ اور تیسرے مرحلے میں جا کر ان کی معیشت میں پالتو جانوروں یعنی بھیڑ بکریوں اور بعض دوسرے مویشیوں کو اہمیت حاصل ہو گئی تھی گویا کہ اب بلوچستان کی تاریخ کو ہزاروں سالوں کی قدامت کا فخر حاصل ہو گیا ہے اور زیر نظر تالیف کے ابتدائی حصہ میں اسی قدیم دور پر بحث کی گئی ہے۔ جس کا مواد کلیتاً ان علمائے

علم الآثار کی تحریروں سے ماخوذ ہے۔ جنہوں نے گزشتہ نصف صدی کے دوران بلوچستان کے مختلف علاقوں میں قدیم بستیوں پر باقیاتی تفتیش کا کام کر کے بڑے پیمانے پر نہایت اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ بات بڑی تعجب انگیز ہے کہ بلوچستان کے زمانہ ما قبل تاریخ کی سرگزشت اس کے تاریخی دور کی نسبت زیادہ مکمل، روشن، واضح اور پرشکوہ ہے۔

میں نے اپنی زیر نظر تالیف کے دوسرے حصے میں بلوچستان کے تاریخی دور پر شرح وبست کے ساتھ بحث کرنے کی کوشش کی ہے اور اس تمام مستند مواد کو بروئے کار لانے کی تگ و دو اور جدوجہد کی ہے جس تک مجھے رسائی حاصل ہوئی ہے۔ اب میری یہ کوششیں کہاں تک کامیاب ہیں اس کا فیصلہ قارئین کرام اہل دانش اور اہل علم حضرات ہی کر سکتے ہیں جن کو تاریخ سے گہری دلچسپی ہے۔

تاریخ کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ امراء و سلاطین شجاعوں اور سیاست دانوں کے کارناموں ان کی جنگی فتوحات جانشینوں اور دیگر بڑے بڑے سیاسی واقعات کی داستان ہے جو آبادی کے ایک بڑے حصے کے ذہنوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے۔ لیکن جدید زمانے کا مؤرخ اپنے آپ کو فقط بادشاہوں کے کارناموں، ان کی مہم جوئی، ان کے درباروں کی

شان و شوکت، درباری سازشوں سفیروں کی سرگرمیوں اور پارلیمان
کے اراکین کی کہانیوں تک محدود رکھنے کے حق میں نہیں ہے اگرچہ
ان تمام امور کو ابھی تک تاریخ میں اپنی جگہ ایک اہم مقام حاصل ہے
اور امراؤ سلاطین اور ہر عہد کی بڑی بڑی تاریخ ساز شخصیتیں تاریخ
کے دائرے میں ایک اہم مرکزی کردار کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن
تاریخ کا سب سے بڑا اور اہم موضوع کسی مخصوص عہد کی عام انسانی
آبادی ہے، جن کے درمیان، اس مخصوص عہد کے واقعات رونما
ہوئے اگر ایسا نہ ہو تو تاریخ کا موضوع بڑی حد تک بے جان
اور غیر مکمل ہو کر رہ جاتا ہے. حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کا تعلق صرف
گنے چنے انسانوں اور ان کے ذاتی کارناموں سے نہیں ہے چاہے
یہ انسان کتنی ہی بلند شخصیت کے مالک اور ان کے کارنامے کتنے ہی
بلند اور پر شکوہ کیوں نہ ہوں. اس کے برعکس تاریخ کا تعلق بنیادی
طور پر ایک ایسے کم و بیش سرگرم عمل سماجی گروہ سے ہے جو دوسرے
سماجی گروہوں پر قطعی طور پر اور مختلف انداز میں اثر انداز ہوتا ہے.
اور ان کے عمل کو دوسرے انسانوں کے عمل کی روشنی میں پرکھتا
ہے. درحقیقت یہی وہ کڑیاں ہیں جو انسانی کارناموں کو باہم مربوط
کرتی ہیں. اس بنا پر تاریخ نویسی میں مورخ کا بنیادی اصول یہ ہونا
چاہیئے کہ عالی مرتبت انسانوں کی ذاتی زندگی کے پہلوؤں کی بجائے
اپنی توجہ زیادہ تر ان طور طریقوں پر مبذول کرے جن طور طریقوں

سے ان کے عمل نے سماجی قوتوں کو متاثر کیا. یا ان سے متاثر ہوا ہو. تاریخ کا مطلب خالی خولی ان حقائق سے بحث کرنے کا نہیں ہے جو کسی مخصوص دور میں رونما تو ہوئے لیکن ان حالات و واقعات کا ذکر نہ ہو جو ان واقعات کے رونما ہونے کا باعث بنے تھے ایک خاص سماجی سائنس کی حیثیت سے مورّخ کا بنیادی مقصد ان واقعات کا بڑی سچائی اور مستند طریقہ سے بیان کرنا ہے جو ماضی میں پیش آئے تھے لیکن اس کا ایک ثانوی کام یہ بھی ہے کہ وہ ہمعصر ان دوسرے حقائق کے اثرات کا بھی کھوج لگائے جو عام انسانی تجربہ میں مرتب ہوئے تھے تاکہ وہ سماجی ارتقاء کی صحیح کیفیت بیان کرکے اور اسے پوری طرح اجاگر کرکے ایک با مقصد سماجی حقیقت کے بارے میں معلومات فراہم کرسکے. وہ باضمیر اور صابر مورّخ جس کا کام فقط ان واقعات کا انکشاف اور ان کا ریکارڈ مرتب کرنا ہو اور بس تو پھر یہ کوئی سود مند تاریخ نویسی نہیں ہے بلاشبہ وہ بڑا عمدہ بیلچہ کا کام سرانجام دیتا ہے اور نیچے سے کھود کر نہایت عمدہ مواد حاصل کرتا ہے جو عہد عتیق کے ملبہ تلے دبے ہوئے تھے لیکن اس مواد کو صحیح طریقے پر کام میں لاکر اس کی مدد سے تاریخ کے نقشے کو کچھ اس انداز سے مرتب کرنا کہ اس کے خدوخال پوری طرح اجاگر ہوں تاکہ موجودہ زمانے کے لوگ ماضی کی زندہ روح کو پوری طرح دیکھ

سکیں اور اسے سمجھ سکیں موّرخ کا بنیادی فرض ہونا چاہیئے۔

جہاں تک بلوچستان کے تاریخی دور کا تعلق ہے اس پر تاریکی کے دبیز پردے کچھ اس حد تک پڑے ہوئے ہیں کہ ان دبیز پردوں کو ہٹا کر اس کی ماضی کے ہر دور کے واقعات کو تسلسل کے ساتھ اجاگر کر کے ہر دور کے سماجی حالات کی روشنی میں پرکھ کر ان کے باہمی ربط اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کے عمل کو پوری طرح واضح کرنا ایک بڑا مشکل کام ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس میں اتنی کامیابی نہیں ہو سکی جتنی کہ توقع کی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود مجھے امید ہے کہ قارئین کرام اور اہل دانش و اہل علم حضرات بلوچستان کے تاریخی دور سے متعلق میری کاوشوں کو ایک بڑی حد تک مفید اور سودمند پائیں گے۔

ملک سعید دہواری

فہرست مضامین

پندرھواں باب

سولھواں باب

سترھواں باب

اٹھارہواں باب

انیسواں باب

بیسواں باب

اکیسواں باب

بائیسواں باب

تیئسواں باب

جغرافیائی کیفیت

بلوچستان کی سرزمین اپنی آب و ہوا کی شدت، رقبہ کی وسعت، مسافتوں کی طوالت، آبادی کی قلت، محدود وسائل آب پاشی قابلِ کاشت اراضیات کی کمی، معدنیات کی فراوانی، سرسبز اور شاداب وادیوں، بے آب و گیاہ لق و دق میدانوں، جنگلات اور سبزہ سے عاری گھٹے ہوئے پہاڑی سلسلوں، دشوار گذار درّوں، نسلی اختلافات اور زبانوں کے تنوع کی وجہ سے اس کرہ ارضی پر ایک عجوبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے شمال میں افغانستان اور مغرب میں ایران واقع ہے اس کے جنوبی ساحل سے بحیرہ عرب کی تند و تیز موجیں ٹکراتی ہیں۔ اس کے مشرق میں دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ وہ پٹی ہے۔ جس کی آبادی میں قومی عنصر بلوچ کا ہے اور جو ساحل سمندر سے لے کر سندھ اور پنجاب سے ہوتی ہوئی صوبہ سرحد کے ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کی آخری حد تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے اس کا رقبہ ۱۳۱۸۵۵ مربع میل ہے جو انگلستان یا پاکستان کے دوسرے صوبوں کے مجموعی رقبہ سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ بلوچستان

جو کلتیا ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ کوہستانی سلسلوں کی اس پٹی یا بیلٹ پر واقع ہے جو سفید کوہ کو جنوبی ایران کے پہاڑی نظام سے مربوط کرتی ہے اور اس طرح یہ ایک ایسا آبریز بنا لیتا ہے جس کا پانی ندی نالوں کی صورت میں مشرق میں دریائے سندھ اور جنوب میں بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے جبکہ شمال اور مغرب میں ان جھیلوں یا ہاموں میں جا کر گم ہو جاتا ہے جو وسط ایشیا کی خصوصیات میں سے ایک ہیں

جغرافیائی اعتبار سے اس علاقے کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ بالائی کوہستانی خطہ، نشیبی کوہستانی خطہ، میدان اور صحرا۔ بالائی کوہستانی خطہ خراسان کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں پہاڑی سلسلوں کی اونچائی ۱۲۰۰۰ فٹ تک پہنچ جاتی ہے جبکہ وادیوں کی اونچائی سطح سمندر سے ۵۰۰۰ فٹ کے لگ بھگ ہے۔ نشیبی کوہستانی خطہ میں مشرق کی جانب کوہ سلیمان جنوب کی جانب کوہ پب اور کوہ کیرتھر کے سلسلے اور مغرب میں مکران خاران اور چاغی کے پہاڑی سلسلے شامل ہیں۔ اس خطہ میں وادیوں کی سطح سمندر سے اونچائی ۲۵۰ فٹ سے بتدریج اوپر ہوتی جاتی ہے۔ بلوچستان کے میدانوں میں کچھی لسبیلہ اور دریائے دشت کی وادیاں شامل ہیں۔ صحرا صوبہ کے شمال مغربی حصہ میں واقع ہیں۔ جو ہموار کالی مٹی یا وسیع ریگستانوں پر مشتمل ہیں۔ جن کے ٹیلے کہیں کہیں بڑے اونچے ریگستانی پہاڑوں کی صورت اختیار کئے ہوئے ہیں۔

پہاڑ

بلوچستان کے مشرقی حصہ میں تقریباً تمام کوہستانی سلسلے کوہ سلیمان کی شاخیں ہیں جو بتدریج بڑھ کر اس کے مرکز تخت سلیمان تک پہنچ جاتی ہیں۔ اس کے بعد پہاڑوں کا یہ سلسلہ مغرب کی طرف ایک دائرہ کی صورت میں دریائے ژوب کے شمال میں توبہ کاکڑی کے ساتھ ساتھ گھوم جاتا ہے۔ حتیٰ کہ سلسلہ کوہ براہوئی پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد مکران اور خاران میں یہ مغرب کی جانب گھوم جاتا ہے۔ کوہِ براہوئی کے جنوب میں کوہِ کیرتھر اور کوہ پب، صوبہ کے جنوب مشرقی کونے میں پھیل گئے ہیں۔ جن میں سے جنوبی سلسلہ مکران کے ساحلی سلسلہ کوہ کے نام سے موسوم ہے اس کے بعد وسطی سلسلہ کوہ مکران ہے۔ جس کے عین شمال میں کوہِ سیاہان واقع ہے۔ اس کے اوپر راسکوہ واقع ہے جو خاران اور چاغی کے پہاڑی سلسلوں کو آگے بڑھ کر چھوتا ہے۔ عموماً یہ تمام پہاڑ ماسوائے بالائی کوہستانی سلسلوں کے جنگلات اور سبزہ سے عاری ہیں جنوبی مکران میں پہاڑوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں پتھر بہت کم پائے جاتے ہیں اور سفید چٹانیں جن پر یہ مشتمل ہیں بمرورِ زمانہ ٹوٹ پھوٹ کر عجیب و غریب شکل و صورت اختیار کر گئی ہیں۔ اگرچہ کوئی بھی پہاڑ کسی نام سے موسوم نہیں ہے لیکن ان کی چوٹیاں کسی نہ کسی نام سے ضرور موسوم ہیں۔

دریا

بلوچستان میں ایسا کوئی دریا نہیں ہے جس میں پانی بڑی مقدار میں اور مستقل طور پر پایا جاتا ہو۔ ان میں سال کے دوران پانی ایک پایاب ندی کی صورت میں ضرور بہتا ہے جو آگے جاکر بجری میں غائب ہوجاتا ہے۔ جہاں کہیں قابلِ عمل ہو ان دریاؤں کا پانی آبپاشی کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ بارشوں کے موسم میں ان دریاؤں میں طغیانی آجاتی ہے۔ جو تنگ گھاٹیوں میں انسانوں اور حیوانوں کے لئے ایک آفت بن جاتی ہے۔ بعض جگہوں میں یہ گھاٹیاں اس قدر تنگ ہوتی ہیں کہ ان کی چوڑائی چند میٹر کے لگ بھگ ہوتی ہے اور ان کی دیواریں دونوں طرف بڑی سیدھی اور اونچی ہوتی ہیں۔ صوبے کا سب سے بڑا دریا ہنگول یا گدر ڈور ہے۔ اس کے شمال مشرقی حصے کا پانی مشرق میں دریائے ژوب اور مغرب میں دریائے پشین لوڑہ میں جاکر شامل ہوجاتا ہے۔ جھالاوان کے اس قسم کے دریاؤں میں دریائے مولا دریائے ہب اور پورالی اہمیت رکھتے ہیں۔ مزید شمال میں دریائے ناڑی میں لورالائی اور سبی کا پانی بہہ کر کچھی کے علاقے کو سیراب کرتا ہے۔ مکران میں دریائے دشت جنوب کی طرف اور دریائے رخشان جو آگے جاکر دریائے ماشکیل میں شامل ہوجاتا ہے شمال کی طرف بہتا ہے۔ دریائے بولان اور دریائے کیچ کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ اول الذکر کے جاری پانی سے ڈھاڈر اور سبی کے علاقے

سیراب ہوتے ہیں۔

مناظر

بلوچستان سطح مرتفع ایران کا مشرقی حصہ ہے اور یہاں بعینہٖ وہی مناظر ملتے ہیں جو ایران کی خصوصیت ہیں۔ اگرچہ یہاں کے مناظر کچھ زیادہ جاذبِ نظر نہیں ہیں لیکن رعنائی سے بالکل عاری بھی نہیں ہیں۔ یہاں سنگلاخ اور سبزہ سے عاری چٹانوں کے ساتھ ساتھ جن میں بڑی بڑی گھاٹیاں پائی جاتی ہیں۔ نہایت خشک صحرا اور پتھریلے میدان بھی ملتے ہیں۔ جو عموماً ایک یکساں اور غیر جاذبِ نظر منظر پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان کے درمیان اس قسم کی بڑے وسیع اور ہموار وادیاں بھی پائی جاتی ہیں جن کی لہلہاتی ہوئی فصلیں اور باغات بڑے جاذبِ نظر ہوتے ہیں۔ ان سے بڑی پیداوار حاصل ہوتی ہے پہاڑوں کے اندر۔ جاری پانی کے ندی نالوں کے کنارے موسم بہار میں سبزہ زاروں کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ سردیوں میں شمالی بلوچستان کے پہاڑ برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ جبکہ جنوبی بلوچستان میں گاؤں کے اردگرد کھجور کے نخلستان ایک دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ پہاڑوں پر چڑھنے کے بعد اردگرد کے مناظر ایک دلکش نظارہ کا باعث بنتے ہیں۔

جھیل

بلوچستان میں کوئی اہم جھیل نہیں پائی جاتی ہے۔ ہامون ماشکیل

اور ہامون لوڑہ کا شمار غالباً جھیلوں میں نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ فقط بارش کے موسم میں ندی نالوں میں سیلاب آنے کے بعد پانی سے بھر جاتے ہیں۔ لسبیلہ میں سرندہ جھیل سے مشابہت رکھتا ہے لیکن یہ چاروں طرف سے خشکی سے گھرا ہوا ہے۔ استولا یا تادیپ یا ہپت تلار فقط ایک ہی جزیرہ ہے جو ساحل مکران کی دوسری جانب واقع ہے۔ بشرطیکہ جزنا کی خالی خولی چٹان کو بھی جو راس مواری کے پار واقع ہے ایک جزیرہ مان لیا جائے۔

ساحل

مکران کا ساحل سمندر ۴۷۲ میل ہے۔ لیکن براہِ راست کراچی سے خلیج گوتر فقط ۳۲۵ میل ہے۔ بارش کی کمی اور زمین کی شوریت اور ترکیب ارضی کی بنا پر بلوچستان کا ساحل بنجر اور غیر آباد ہے جہاں کے شوردار خشک میدان کاشتکاری کے لئے نہایت غیر موزوں ہیں ان غیر آباد میدانوں میں ایسے پہاڑ بھی ہیں جن کی سطح بالکل ہموار اور چپٹی ہے۔ ساحل سمندر کٹا پھٹا ہے۔ جس کی بڑی خصوصیت وہ جزیرہ نما اور راس مرتفع ہیں۔ جن کی کھڑی سطح بالکل ہموار اور چپٹی ہوتی ہے۔ ان کا درمیانی رقبہ نشیبوں پر مشتمل ہے۔ جو بعض جگہوں میں شوردار وسیع دلدلوں کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے۔ ساحل مکران کی اہم بندرگاہیں سونمیانی لسبی اور رماڑہ گوادر اور جیونی ہیں۔ لیکن بڑی بڑی کشتیاں بندرگاہ سے دو تین میل دور کھڑی رہتی ہیں۔ کلمت

ایک چھوٹی بندرگاہ ہے۔

ترکیب ارضی

ترکیب ارضی کے بل بوتے پر بلوچستان کو آسانی سے تین علاقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ پہاڑوں کا ایک بیرونی سلسلہ جو ایک دوسرے کے پیچھے سینکلین (SYNCLINE) اور انٹی کلائین ANTICLINE کی صورت میں واقع ہیں۔ جن کے ڈھانچوں کو جڑا پہاڑوں سے مشابہت دی جاسکتی ہے۔ اس علاقے میں دو سب ڈویژن ہیں (ا) سیوستان[1] کا نصف دائرہ کا رقبہ۔ (ب) قلات سندھ اور مکران کے پہاڑی سلسلے جو جنوبی ایران تک بڑھ کر مغرب میں خلیج ہرمز تک پہنچ گئے ہیں۔ مزید اسی قسم کے قوسی سلسلے کردستان تک بڑھتے چلے گئے ہیں۔

۲۔ شدید لوٹ پھوٹ کا علاقہ جو ہمالہ کے مخصوص ڈھانچہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ جس کی جنوبی یا جنوب مشرقی حد ایک شدید گھونپ (OVERTHRUST) کی صورت میں واقع ہے جس کا مغربی تسلسل ہمالہ کے عظیم باؤنڈری[2] فالٹ پر مشتمل ہے۔

---

[1] سیوستان کی اصطلاح مقامی طور پر مستعمل نہیں ہے۔ فقط تکنیکی کتابوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

[2] THE GREAT HIMALAYAN BOUNDERY FAULT.

سیوستان کے نصف دائرے کے رقبہ کا رشتہ ان پہاڑی سلسلوں سے وہی ہے جو یورپ کے جڑا پہاڑ کوہ ایلپس سے رکھتے ہیں۔

۳۔ پہاڑوں کے الگ تھلگ ٹکڑوں کا علاقہ جنہیں صحرائی نشیبی رقبے ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ جن میں نوشکی اور خاران کے صحرا شامل ہیں۔

ترکیب ارضی کی بنا پر وسطی اور مغربی بلوچستان کا بہت کم مطالعہ کیا جاسکا ہے۔ تینوں علاقوں میں ان کی ترکیب بڑے سادہ طریقے سے واقع ہوئی ہے۔ بالائی ایوسین (EOCENE) آتشیں دخول (INTRUSIONS) دوسرے اور تیسرے علاقائی اقسام تک محدود ہیں اور مکران کا گروہ اسی نام کے ساحل سے متعلق ہے۔ عظیم باؤنڈری فالٹ کے ساتھ ہمیں صحیح معنوں میں ہمالہ کے ڈھانچے کی صورت ملتی ہے جو پوری طرح آشکارا ہے گویا کہ سوالک چٹانوں کے سلسلے پتھریلے میدانوں سے اٹھ کھڑے ہو کر پار کے پہاڑوں کا رخ اختیار کرتے ہیں۔ وادی ژدب کے جنوب میں قوسی پہاڑوں کے یکے بعد دیگرے کئی سلسلے چار علاقوں میں واقع ہیں۔ پہلا یا بیرونی سوالک دوسرا ایوسین (EOCENE) تیسرا جرائی (JURRASIC) چوتھا اندرون ترین یا ٹریاسک (TRIASSIC) مختلف جیالوجیکل گروہوں میں سے بالائی اور وسطی سوالک (SAWALIK) ابھی تک پتھرلے

ہوئے نباتات سے عاری ثابت ہوئے ہیں۔ نشیبی سوالک کی سب سے گہری تہوں میں تازہ پانی کے سیپ SHELL اور پتھرائے ہوئے حیوانی ڈھانچوں کی باقیات ملتی ہیں۔ بالائی اور نشیبی ناڑی ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ موخرالذکر درّہ بولان میں زیادہ نمایاں ہے۔ سپن تنگی درہ بولان میں زردی مائل چینیلا چٹان ہے جس نے کیرتھر کی پہاڑی کھائی کو اوپر سے ڈھانپا ہوا ہے۔ یہ نمولٹک (NUMMLITIC) چینیلا چٹانوں میں بلوچستان میں سب سے اہم پہاڑ ہے۔ سپن تنگی کی چینیلا چٹان میں ادھر ادھر صلصالی جوڑ ملتے ہیں جو اس کی بنیاد کی طرف زیادہ کثرت سے واقع ہیں۔ اس طرح وہ آگے بڑھ کر نیچے کے گروہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جو غازج کہلاتا ہے۔ زمانہ قریب تک بلوچستان کی چٹانوں میں فقط غازج کی تہوں (BEDS) کو اقتصادی اہمیت حاصل تھی، لیکن اب شمالی وسطی بلوچستان، خاران اور چاغی میں قروم، بیروماٹیٹ، سنگ مرمر، کروماٹیٹ، تانبا، چاندی اور کچھ سونے کی دریافت سے بلوچستان کے پہاڑوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ خصوصاً سوئی گیس کی دریافت سے ملک کی اقتصادیات کو بڑا فائدہ پہنچا ہے۔

جب غازج کی تہوں کی موٹائی خاطر خواہ طور پر بڑھ جاتی ہے تو اس گروہ کی چٹانوں کی صورت کوژک کی صلصالی (SHALES)

چٹانوں سے ملتی جلتی ہے جس کا زمانہ نمولائیٹ (NUMMULITE)
کی موجودگی سے پوری طرح ثابت ہے۔ جو چینیا صلصالی اور رال والے
لائم سٹون (LIME STONE) کی بنیاد میں ملتی ہیں۔ کارڈیٹا بیومونٹی
(CARDITA BEAUMONTI) کی تہیں کئی جگہوں میں ملتی ہیں جو
الگ تھلگ قطعوں میں واقع ہیں۔ ڈنگان کے آشکارا سلسلے وسعت
میں بڑے محدود ہیں یہ صلصالی اور چینیا سے پتھروں (LIME STONE)
کے انتہائی مختلف سلسلوں پر مشتمل ہیں جو عموماً فلیچ فیسی
(FLYSCH FACIE) میں جا کر پیوست ہو جاتے ہیں ان کے نیچے
نیکومین (NECOMMIAN) عہد کی صلصالی چٹانوں SHALES
کا ایک گروہ آتا ہے جن میں بے شمار بلمنائیٹ (BLEMNITE)
کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ جو بلمنائیٹ کی تہیں کہلاتی ہیں۔ یہ ٹھوس
لائم سٹون کے اوپر واقع ہیں۔ جن سے بلوچستان کی تمام پہاڑی
چوٹیاں مرکب ہیں۔ ٹریاسک (TRIASSIC) صلصالی (SHALES)
اور لائم سٹون وادی ژوب کے جنوب میں وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے
ہیں وہ دراصل گبرو (GABBRO) کے ٹھوس موٹے ریشے میں دخول
پا گئے ہیں۔ جو عموماً سانپ (SERPUNTIME) کی صورت میں واقع
ہو کر بیشمار ڈولیرائیٹ (DOLERITE) یا بسالٹ (BASALT) کی
رگوں اور دکن ٹریپ (DECCAN TRAP) کے عہد کے ڈائیکس
(DYKES) میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ بہت سی آتشیں چٹانیں EOCENE

نہفتہ (INTRUSIVE) یا آتشکارا (ERUPTIVE) اسی عہد سے تعلق رکھتی ہیں جو تمام تینوں متذکرہ بالا علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ آتشیں (EOCENE) چٹانوں کا ایک دوسرا گروہ بھی ہے جو انتہائی گہری تہوں میں نہفتہ ہے لیکن آتش نشانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دوسری اور تیسری علاقائی (RIGIONAL) اقسام سے تعلق رکھتا ہے جہاں وہ خواجہ آمران کے گرینائیٹ (GRANITE) اور ڈیورائیٹ (DIORITE) اس کوہ کے اگائیٹ، سنائیٹ (AUGITE SYENITE) اور اگائیٹ، ڈیورائیٹ اور چاغی کے ہارن بلینڈ (HARNBLAND) ڈیورائیٹ (DIORITE) کی صورت میں واقع ہیں۔ بارش کی کمی کے باعث پہاڑوں کی ٹوٹ پھوٹ سے جو مواد جمع ہو جاتا ہے دریاؤں کا پانی اسے بہا کر نہیں لے جا سکتا بلکہ وہ ڈھیروں کی صورت میں پڑا رہتا ہے جس کی گہرائی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ میدان عموماً ایسے رقبوں میں پائے جاتے ہیں جو اس سے پیشتر جھیل تھے یا سمندر کا پانی ان میں جمع ہو جایا کرتا تھا۔

نباتات

نشیبی کوہستانی خطہ اور میدانی علاقوں میں نباتاتی کیفیت وہی ہے جو بلوچستان سے متصل پنجاب کے علاقہ کی ہے۔ عموماً درختوں اور جھاڑیوں کا فقدان ہے۔ یہاں کی کھلی نمایاں پتھریلی اور سنگلاخ

زمین پر ناکارہ قسم کی کم نشو ونما یافتہ بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ جن کے پودے جڑ سے لے کر پتوں کے سرے تک مختلف صورت کے کانٹوں سے لیس ہوتے ہیں لیکن جہاں تک ضرر رسانی کا تعلق ہے ان پودوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بعض کے پتے پوری طرح گر جاتے ہیں اور دوسرے اپنی گوشت نما شاخوں کو کھال کی طرح کے چھلکے سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ اس عام ناپسندیدہ نباتاتی مجموعہ کے اجزا میں مارمونک، کریہ، پرپک، کنڈی، پیزبند، جنگلی بیر، چھوٹا جنگلی بیر، پیلو، آک (کبڑھ) کیکر، ولایتی کیکر، درخت نما اونچا گز، جھاڑی نما چھوٹا گز، پالٹی (ریگ بوٹی) باشتو، پیزبند، ماجر شردو، کسپند یا دھندوال، تاغز وغیرہ شامل ہیں۔

بالائی کوہستانی خطہ کی نباتاتی کیفیت نشیبی کوہستانی خطہ اور میدانی علاقوں کی نباتاتی کیفیت سے بالکل مختلف ہے۔ طویل وادیوں کی ہموار سطح زخیز (جبر) اور گنڈی سے ڈھکی رہتی ہے جو کسی طرح بھی جاذبِ نظر نہیں ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ جہاں کہیں پہاڑی ٹیلے واقع ہیں وہاں گز نرونک اور شینلو کی جھاڑیاں زمین کے منظر میں کچھ تبدیلی لاتی ہیں۔ وادیوں میں کہیں کہیں مہندی کے پودے بھی اُگ آتے ہیں۔ اردگرد کے پہاڑوں پر جن کی اونچائی سات ہزار فٹ سے زائد ہے۔ گون (جنگلی پستہ) نرونک، دو بند شنجاف شیشار، بیلپ (زہریلی جھاڑی) طوغر، اُپرس، جنگلی بادام، خت

جنگلی زیتون، جنگلی انگور کی بیلیں، جنگلی انجیر اور جنگلی گلاب کے پودے پائے جاتے ہیں۔ ان بلندیوں پر زارچ کے دو قسم، خراتو، ماٹے ٹو، برشونگ، سپرابولی، سگ دندان (سمبالا) کوئی مھوتار، اتھرپت، اور نریاں بند اور جور بکثرت اُگ آتے ہیں۔

جب بہار کا موسم شروع ہوتا ہے تو قسم قسم کے پھولدار پودے اور جھاڑیاں جو سردیوں کے دوران چھپے رہتے ہیں، پھول پتے نکال لیتے ہیں اور ایک مختصر مدت کے لئے اپنے رنگا رنگی کی وجہ سے بڑا خوش کن منظر پیش کرتے ہیں ان میں گل لالہ اور سمن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ گل زرگری، گل نیلوفر اور لالہ زرد بہار کے موسم کے خاص پھول ہیں جو کھیتوں میں نکل آتے ہیں۔ گھاس کے دلدلی میدانوں میں کنول، بارتنگ، ملیخ، شرگی رغت اور درب گھاس بکثرت اگتی ہے۔ جاری پانی کی ندیوں کے کنارے پودینہ اور ان کے اندر جہاں پانی کم گہرا ہے ترمیرہ بکثرت اُگ آتا ہے۔

بلوچستان کے بہت سے پودے دوائی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ان میں شنگلی، جنگلی کالا زیرہ (زیرہ سیاہ) گاؤزبان، گواری درنہ ازغند، اسپغول، نریان بند، تمبار کلپورہ، خرتتہ، الیش ورگ، جف خندر، ازبوتک، تلخ کاڑ، ماٹے ٹو، ہرمل، بوٹے مادران، اجوائین خراسانی، کوئی ھینگ، زوفہ، گل بابونہ، پہاڑی میتھی

جنگلی اجوائن ، بہمن سفید ، زرمب ، سورنجان شیریں، لبسنڈک، خاک شیر، ہلتھی ، شاتیرا سموک ، پیل گوش ، بھنگیرہ ، پودینہ، نرگس وغیرہ شامل ہیں۔

حیوانات

بلوچستان کے بالائی کوہستانی علاقوں میں پہاڑی بکرا یعنی مارخور پایا جاتا ہے۔ جو پہاڑوں کے غاروں میں تن تنہا زندگی بسر کرتا ہے۔ نشیبی کوہستانی علاقوں میں مارخور کی بجائے سندھی بکرا (SIND IBEX) ملتا ہے۔ پہاڑی بکرے بکریاں پہاڑوں کے اوپر رہتے ہیں۔ جبکہ پہاڑی دمبے دمبیاں پہاڑوں کے دامن میں چرتے پھرتے ہیں۔ ہرن تقریباً ہر جگہ جہاں آب و ہوا معتدل یا گرم ہے، سنسان وادیوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ ان کے علاوہ پہاڑوں میں چیتا بھی پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھیڑیا، گیدڑ، لومڑی، چرخ اور جنگلی بلی ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

بلوچستان کے ان پرندوں میں جن کا شکار کیا جاتا ہے۔ چکور، سسی، تلور، تیتر، بھٹ تیتر، بٹیر اور جنگلی بطخ (اخ) زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ کوا، شُشُک، فاختہ، ہدہد، بلبل، تقریباً ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ سپرا دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلا وہ جو سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد علاقوں کی طرف جاتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو سردی گرمی دونوں موسم میں ایک ہی مقام پر رہتے ہیں۔

آب و ہوا

اس کا دار و مدار سطح سمندر سے بلندی پر ہے۔ بلوچستان ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے اور اس کے کئی قدرتی حصے ہیں اسی لئے یہاں سخت سرد، معتدل اور سخت گرم آب و ہوا کے خطے ملتے ہیں۔ بالائی پہاڑی علاقوں کی آب و ہوا سخت سرد ہوتی ہے یہاں برف پڑتی ہے اور سرد ہوائیں چلتی ہیں جس کی وجہ سے سردیوں میں عموماً درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے گر جاتا ہے۔ لیکن یہاں گرمی کا موسم بڑا خوشگوار ہوتا ہے۔ نشیبی پہاڑی علاقوں کی آب و ہوا سندھ سے ملتی جلتی ہے۔ یہاں گرمیوں میں سخت گرمی پڑتی ہے اور بادِ سموم چلتی ہے۔ لیکن بعض علاقوں میں جن میں خضدار، پنجگور اور موسیٰ خیل/لورالائی کے کچھ حصے شامل ہیں معتدل قسم کی آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ یہی کیفیت ساحلی علاقے کی ہے۔ سمندر کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا میں کسی قسم کی شدت نہیں پائی جاتی اور سال کے دوران عموماً موسم خوشگوار رہتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس کچھی کا علاقہ گرمیوں کے موسم میں بہت زیادہ گرم ہوتا ہے جو بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لیکن سردیوں میں یہاں کا موسم بڑا خوشگوار ہوتا ہے۔ شمالی بلوچستان کی آب و ہوا کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے موسم یورپ کی طرح پوری طرح واضح ہیں لیکن جنوبی بلوچستان میں صورت حال اس کے برعکس ہے۔

بارش

بلوچستان مون سون اور بحیرہ روم کی ہواؤں کے دائرے کے آخری سرے پر واقع ہے۔ بارش سے بھرپور ہوائیں یہاں تک پہنچتے پہنچتے اپنا زور کھو بیٹھتی ہیں۔ اسی لئے یہاں بارش کم مقدار میں اور بے قاعدگی سے ہوتی ہے۔ فقط شہرگ ہی میں سال کے دوران ۱۲-انچ کے لگ بھگ بارش ہوتی ہے۔ بالائی پہاڑی علاقوں میں بعض جگہوں پر ۱۰-انچ تک بارش ہوتی ہے جبکہ میدانی علاقوں میں بارش کی مقدار سال میں ۵ انچ تک ہے۔ جو کہیں کہیں گھٹ کر ۳-انچ ہو جاتی ہے۔ شمالی بلوچستان کے بالائی پہاڑی علاقوں میں بارش زیادہ تر سردیوں میں ہوتی ہے۔ جس کا دارومدار خلیج فارس سے اٹھنے والی ہواؤں پر ہے نشیبی پہاڑی علاقوں میں زیادہ تر بارش گرمیوں میں ہوتی ہے جس کا انحصار مون سون کی ہواؤں پر ہے جو شمالی بلوچستان کے پہاڑوں تک شاذونادر ہی پہنچتی ہیں بارش کے موسم میں ندی نالوں میں سیلاب آتے رہتے ہیں لیکن ان سے نقصان اس وقت ہوتا ہے جب خشک دریاؤں میں طغیانی آجاتی ہے۔ سائیکلون شاذونادر ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں ۱۹۰۲ء میں سائیکلون سے جانوروں اور انسانوں کو کافی نقصان پہنچا۔

بلوچستان زلزلوں کے دائرے میں واقع ہے یہاں زلزلے ہر جگہ آتے رہتے ہیں۔ جو کبھی کبھار بڑا نقصان دیتے ہیں۔ ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء

کے زلزلہ نے کوئٹہ شہر اور اس کے نواحی علاقوں میں قیامت برپا کر دی تھی۔ اس سے پیشتر ۱۹۲۲ء میں زلزلہ سے مچھ کے علاقے میں بڑا جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔ نومبر ۱۹۴۵ء میں سمندر کی تہہ میں زلزلہ آنے کی وجہ سے پسنی بندر سمندر کی لہروں کی زد میں آکر تباہ ہوا تھا۔ خواجہ آمران اور سرلٹ کے پہاڑی سلسلوں کے ساتھ ساتھ ایک بڑے شگاف کا انکشاف ہوا ہے جو ایک سو بیس میل لمبا ہے جو ایک شدید زلزلے کا نتیجہ ہے۔ یہ زلزلہ اس علاقے میں ۱۸۹۲ء میں آیا تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ نے ۱۹۵۱ء میں کوئٹہ کے نزدیک میاں غنڈی سے متصل دمب سادات کی کھدائی کے دوران زلزلہ کے آثار دریافت کئے تھے۔ اس قدیم بستی کا زمانہ تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح قرار دیا گیا ہے۔

ذرائع آمد و رفت

بلوچستان ایک کوہستانی علاقہ ہے۔ بادی النظر میں یہاں کے ذرائع آمد و رفت کا دشوار گذار ہونا ایک بدیہی عمل خیال کیا جاتا ہے لیکن حقیقت کچھ اس کے برعکس ہے۔ ذرائع آمد و رفت اور اہم شاہراہوں کا انحصار اگرچہ یہاں کے جغرافیائی حالات اور پہاڑوں کے رخ پر ہے۔ لیکن عام عقیدہ کے برعکس زمانہ قدیم سے بلوچستان کی مختلف وادیاں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت آسان راستوں سے باہم منسلک اور مربوط رہی ہیں اور بیرونی ممالک کے

ساتھ بھی اس کا نہایت اہم بین الاقوامی راستوں کے ذریعے تعلق
برابر قائم رہا ہے اور بدستور قائم چلا آرہا ہے۔ ایران اور افغانستان
سے کئی اہم راستے مختلف سمتوں سے بلوچستان سے ہو کر گزرتے
ہیں اور یہاں کے مختلف پہاڑی دروں کو عبور کر کے سندھ، پنجاب
اور شمال میں صوبہ سرحد کے میدانی علاقوں میں داخل ہوتے ہیں۔
ان شاہراہوں پر آمدورفت کا سلسلہ دوطرفہ طور پر جاری رہتا ہے
وادی کوئٹہ شمالی بلوچستان میں درہ بولان کے سرے پر
واقع ہے۔ جہاں درہ بولان کی عظیم شاہراہ سندھ اور پنجاب کو
بلوچستان سے منسلک کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ برطانوی اقتدار سے
پیشتر محل وقوع کی بنا پر بلوچستان کا شمار مشرق وسطیٰ کے ممالک
میں ہوتا تھا۔ لیکن انگریزوں نے فوجی حکمت عملی کے پیش نظر درہ
بولان کو سڑک اور ریلوے لائن کے ذریعے ترقی دے کر بلوچستان
کو برصغیر کا حصہ بنا دیا۔ جس کی وجہ سے بلوچستان کو سندھ اور
پنجاب اور صوبہ سرحد کی بڑی بڑی منڈیاں حاصل ہو گئیں۔ یہاں
ژوب، لورالائی، قندھار اور زاہدان سے بھی کئی ایک راستے
آکر ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتے ہیں اور یہ علاقے ریلوے
لائن اور سڑکوں کے ذریعے کوئٹہ سے منسلک ہیں۔ اسی طرح ژوب
اور لورالائی بھی دو اہم راستوں کے ذریعہ جو درہ گومل اور درہ
ٹوچی سے ہو کر گزرتے ہیں۔ پنجاب میں ڈیرہ غازی خان اور صوبہ

سرحد میں ڈیرہ اسماعیل خان سے ملے ہوئے ہیں۔ ان اہم شاہراہوں
کے لئے کوئٹہ ایک بڑے سنگھم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں ہی سے
ایک اور بڑی شاہراہ جواب تعاون برائے ترقیات کی شاہراہ
عظیم کا ایک حصہ ہے۔ مستونگ اور قلات کی سرسبز و شاداب
وادیوں کو عبور کر کے سوراب کی سرسبز اور شاداب وادی میں
داخل ہوتی ہے۔

سوراب سے جنوب، جنوب مغرب اور جنوب مشرق کی طرف
اکثر کوہستانی سلسلے ہاتھ کی انگلیوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں اور
اکثر راستے انہی کوہستانی سلسلوں کی درمیانی وادیوں کا رخ اختیار
کرتے ہیں۔ جنوب مغرب میں دریائے رخشان اور دریائے کیچ آمد و رفت
اور مواصلات کے زمرے میں ایک اہم ذریعہ ہیں۔ خضدار، نال
اور تربت کو ملانے والی شاہراہ دریائے مشکے کی وادی کو عبور
کر کے کولواہ اور کیچ کی وادیوں میں داخل ہوتی ہے۔ سوراب سے
پنجگور جانے والی اہم شاہراہ وسطی مکران اور کوہ سیاہان کے پہاڑی
سلسلوں کے درمیان سے ہو کر گزرتی ہے جو کوئٹہ کو پنجگور اور تربت
سے منسلک کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اسی طرح تربت سے
ایک شاہراہ جنوب مغرب میں جیونی اور گوادر کو اور دوسری شاہراہ
جنوب مشرق میں بسنی بندر کو تربت سے مربوط کرتی ہے۔ سوراب
سے خضدار کی طرف جانے والی شاہراہ جو درحقیقت کوئٹہ سے آنے

والی شاہراہ عظیم ہی ہے. خضدار اور بیلہ سے ہوکر جنوب مغرب
میں کوئٹہ کو کراچی سے منسلک کرتی ہے جو ملک کی سب سے
بڑی منڈی اور صنعتی شہر ہے. پنجگور اور تربت کی وادیاں بھی
آسان راستوں سے ایرانی بلوچستان کے اہم قصبات سے ملی ہوئی
ہیں. جنوب مشرق میں پہاڑوں کا ایک اور سلسلہ موجود ہے، جو
کیرتھر کے پہاڑی سلسلہ کے ساتھ متوازی صورت میں واقع
ہے. یہی پہاڑی سلسلہ سندھ اور جھالاوان کو ایک دوسرے
سے علیحدہ کرتا ہے. اور ان تمام راستوں میں جو کیرتھر کے کوہستانی
سلسلہ کو عبور کرکے سندھ کے میدانی علاقوں میں داخل ہوتے ہیں
درہ مولا بڑی اہمیت کا حامل ہے. جو وسطی بلوچستان کی اہم بستیوں
کو جن میں خضدار اور سوراب قابل ذکر ہیں گنداوہ سے ملاتا ہے
جو ضلع کچھی کے میدانی علاقے کا ایک اہم قدیم قصبہ ہے. خضدار
سے ایک دوسرا راستہ کرخ سے ہوکر سندھ میں شاہداد کوٹ
کو خضدار سے ملانے کا ایک اہم ذریعہ ہے. خضدار سے جنوب
کی طرف ایک اہم دوسرا راستہ بھی ہے جو باران لک کو عبور
کرنے کے بعد لسبیلہ میں داخل ہو جاتا ہے. ان کے علاوہ
بلوچستان سے وادئ سندھ میں داخل ہونے کے لئے ایک
اہم راستہ وہ ہے جو وسطی مکران اور لسبیلہ سے ہوکر لاکی کے
پہاڑی درّے کو عبور کرکے سندھ میں داخل ہو جاتا ہے، ایک

دوسرا راستہ ساحلی کچی سڑک بھی ہے جو گوادر بندر، پسنی بندر اور اورماڑہ بندر کو ایک دوسرے سے منسلک کرتی ہے۔ مواصلات کے زمرے میں ساحل سمندر کے سمندری راستہ نے بھی زمانہ قدیم سے ایک اہم کردار ادا کیا ہے اور سمندری راستوں کے توسط سے بلوچستان کا تعلق کئی ممالک کے ساتھ قائم رہا ہے اور یہاں کی بندرگاہوں سے مال بردار بڑی بڑی کشتیاں سیلون، بانگ کانگ، سنگاپور اور شنگھائی تک سفر کرتی رہی ہیں اور غالباً یہ سلسلہ کسی حد تک بدستور جاری ہے۔

معدنیات

آج سے کوئی پچاس ساٹھ سال پیشتر ازراہِ مذاق کہا جاتا تھا کہ جب اللہ میاں نے اس کرہ ارضی کو زینت بخشی تو اس نے اس عمل کے دوران تمام دنیا کا کوڑا کرکٹ اٹھا کر بلوچستان میں پھینک دیا۔ جو وسائل کے فقدان کی طرف ایک قسم کا اشارہ تھا۔ امیر عبدالرحمٰن خان امیر کابل نے بھی سمندر تک رسائی حاصل کرنے کے لئے انگریزوں سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ یہ بیکار خطہ اس کے حوالے کر دیں۔ اس پر طرہ یہ کہ انگریزوں نے اپنے دور اقتدار میں معدنیات کی تلاش کے زمرے میں جو انکشافات کئے انہوں نے ان کو بھی خفیہ رکھا۔ حتیٰ کہ جیالوجیکل سروے آف انڈیا کا وہ سیکشن جس کا تعلق بلوچستان سے

تھا نہایت خفیہ (TOP SECRETE) قرار پایا۔ جو نا مناسب
تاثرات کا باعث بنا لیکن اب گزشتہ چند سالوں کے دوران معدنی ذخائر
کی موجودگی کے زمرے میں جس قسم کے انکشافات ہوئے ہیں اس
سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ میاں نے دنیا کو زینت بخشنے کے دوران
بلوچستان کے پہاڑوں تلے وہ گنج ہائے گراں مایہ چھپا رکھے تھے
جن کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں تھا۔
یہاں مندرجہ ذیل معدنیات پائی جاتی ہیں:۔

۱۔ انٹی مونی (سرمہ سنگ) یہ مختلف قسم کے آمیزوں اور نمکیات کی تیاری میں کام آتا ہے۔ سخت سیسہ دراصل سیسہ اور انٹی مونی کا آمیزہ ہے۔ انٹی مونی اس قسم کی اشیاء کو سخت بنا دیتی ہے جو بیٹری کی پلیٹوں تیزاب کے چیمبروں کی چادروں سیسہ کے کیمیائی پائپوں، کھلونوں، کیبل کے پوشش، سائیفن کی ٹنکیوں اور جوہری اوزاروں، بیٹری کے چھپکے ہوئے پلیٹوں اور بندوق کی گولیوں کے نوکیلے حصہ کی تیاری میں استعمال ہوتے ہیں اس دھات کی محدود کانیں ضلع کوئٹہ میں قلعہ عبداللہ کے نزدیک دریافت ہوئی ہیں۔

۲۔ کرومائیٹ۔ یہ محرک قروم کی اینٹوں، بھٹیوں کے استر، اور کرونیم لوہے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جس سے کٹائی کے اوزار محرکات (غلہ) زرہ بکتر کی پلیٹیں تیار کی جاتی ہیں لیکن

اس کا استعمال لوہے کی صنعت میں اس بنا پر اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے لوہے کو زنگ زدگی سے محفوظ کر دیا جاتا ہے اس سے رنگ و روغن کی تیاری میں بھی کام لیا جاتا ہے اس کے اہم ذخیرے ضلع ژوب میں ایک بڑے رقبہ میں پائے گئے ہیں اور یہ واحد دھات ہے جو پاکستان سے باہر درآمد کی جاتی ہے اور زر مبادلہ کمانے کا باعث ہے ۱۹۰۳ء سے لے کر آج تک ان کانوں سے دس لاکھ ٹن کرومائیٹ نکالا گیا ہے اور بدستور نکالا جا رہا ہے۔ ضلع خضدار اور ضلع چاغی میں بھی کرومائیٹ کے ذخیرے موجود ہیں۔

۳۔ لیٹرائیٹ۔ یہ دھات خام لوہا، پیتل، نکل ٹیٹانیم کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ بشرطیکہ اس کے کیمیائی اور معدنی مرکبات بہتر درجے کے ہوں۔ گویا متذکرہ دھاتوں کے حصول کا دھات ایک اہم ذریعہ ہے۔ یہ دھات زیارت کے صحت افزا مقام کے اردگرد کے پہاڑوں میں پائی جاتی ہے اور اس کے وافر ذخیرے موجود ہیں۔

۴۔ سیسہ۔ اس کے استعمال سے سب لوگ واقف ہیں۔ یہ بیٹریوں اور کیبل کے پوش، سیسہ کے پائپوں رنگ و روغن اور بارودی گولیوں کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ دھات ضلع خضدار ضلع چاغی اور لسبیلہ میں پائی جاتی ہے۔

۵۔ میگانیز۔ یہ دھات ابتدا میں ادویات اور رنگوں وغیرہ کی تیاری
میں استعمال ہوتی تھی۔ اس کے بعد اسے رفتہ رفتہ لوہے کی
صنعت میں استعمال کیا جانے لگا۔ اگر اس کی تھوڑی مقدار
پگھلے ہوئے لوہے میں ڈالی جائے تو وہ اسے آکسیجن اور گندھک
کی باقیات سے پاک کردیتا ہے جو لوہے کی صنعت میں نقصان دہ
ہوتے ہیں۔ اسی طرح لوہے میں بڑی مقدار میں میگانیز کی آمیزش
سے میگانیز لوہا تیار ہوتا ہے۔ میگانیز اور نکل کی آمیزش سے تیار کی ہوئی دھات ہوائی
جہازوں میں کام آتی ہے۔ میگانیز اور پیتل کی آمیزش سے جو
دھات تیار ہوتی ہے اسے حوضوں کو کٹاؤ سے محفوظ رکھنے
کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ نیز دخانی جہازوں کی تیاری میں اسی
کے کابلے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ دھات چاغی لسبیلہ اور
ژوب کے اضلاع میں پائی جاتی ہے۔

۶۔ نکل۔ ابتدا میں اس کا استعمال فقط برتنوں پر پالش کرنے
تک محدود تھا۔ اور رفتہ رفتہ لوہے کے پائپوں اور لوہے کے
پیپوں کو زنگ سے محفوظ رکھنے کیلئے استعمال کیا جانے لگا اب
مشینوں میں بھی نکل استعمال کیا جاتا ہے۔ نکل اور لوہے کی
آمیزش سے مشینیں بھی بننے لگی ہیں اور اسے لوہے کے چھوٹے
اور بڑے اوزاروں اور انجینئرنگ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے
اسے زرہ بکتروں کی پلیٹوں کی تیاری میں بھی کام میں لایا جاتا

ہے۔ یہ دھات فقط ضلع ژوب میں پائی جاتی ہے۔

۷۔ زنک۔ یہ لوہے کی صنعت میں استعمال ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کئی آمیزوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کانسی اور برمن سلور وغیرہ۔ یہ ربڑ کی صنعت میں بھی کام دیتا ہے۔ یہ دھات فقط ضلع چاغی میں پائی جاتی ہے۔

۸۔ تانبہ۔ یہ زیادہ تر بجلی کے تاروں کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے اور ان گنت دوسری اشیاء اس سے تیار ہوتی ہیں۔ یہ دھات قلات، لورالائی، چاغی اور ژوب کے اضلاع میں پائی جاتی ہے۔

۹۔ خام لوہا۔ یہ نہایت اہم دھات ہے اور اس کا استعمال مختلف قسم کی ان گنت صنعتوں میں ہوتا ہے۔ اس دھات کے ذخیرے ضلع چاغی میں کئی مقامات پر دریافت ہوئے ہیں نیز ضلع خضدار میں بھی اس کے ذخائر موجود ہیں۔

۱۰۔ اسبسٹوس۔ یہ کئی اقسام پر مشتمل ایک ریشہ دار معدن ہے۔ جو قدرتی حالت میں ہوتا ہے۔ اس میں ریشم اور پشم کی خاصیت پائی جاتی ہے لیکن یہ جلتا نہیں ہے۔ اس کی دو اقسام مسلم باغ کے نزدیک پائی جاتی ہیں۔ ان کی فقط ایک قسم دنیا بھر میں استعمال کی جاتی ہے اور وہی قسم مسلم باغ کے نزدیک دریافت ہوئی ہے۔

۱۱۔ برائیٹ۔ بلوچستان میں جہاں جہاں اس کے ذخیرے پائے گئے ہیں وہ عمدہ قسم کے نہیں ہیں۔ یہ زیادہ تر بورنگ کے زمرے میں وزن پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ رنگ کی تیاری میں کام آتا ہے جو پینٹ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ شیشہ کی صنعت میں بھی کام دیتا ہے۔ یہ ضلع چاغی اور لسبیلہ میں پایا جاتا ہے۔ نیز ضلع خضدار میں بھی اس کے ذخیرے دریافت ہوئے ہیں۔

۱۲۔ فلورائیٹ۔ یہ معدن لوہے کی صنعت میں استعمال کیا جاتا ہے اس کے علاوہ شیشہ سازی کی صنعت میں کام آتا ہے اور برتنوں کی پالش میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے۔ اس سے تیزاب بھی بنتا ہے اور زیورات میں ایک زیبائشی پتھر کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اس کے ذخائر ضلع قلات میں دریافت ہوئے ہیں۔

۱۳۔ یاقوت۔ یہ گھڑیوں کی صنعت میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۴۔ گریفائیٹ۔ کٹھالیوں، سٹوپالش، بھٹیوں، سیسہ کی پنسلوں، پینٹ کی چکنائی وغیرہ کی تیاری میں کام آتا ہے۔ یہ ضلع قلات کے بعض مقامات میں پایا جاتا ہے۔

۱۵۔ کھڑیامٹی۔ یہ کیمیائی کھاد، شیشہ سازی اور چینی کے برتنوں کی تیاری اور سیمنٹ میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ لورالائی۔ سبی اور

چاغی کے اضلاع میں پائی جاتی ہے۔

۱۶۔ چونے کا پتھر۔ یہ بلوچستان میں ہر جگہ دستیاب ہے۔

۱۷۔ میگنسائیٹ۔ یہ لوہے کی صنعت میں استعمال ہوتا ہے یہ خضدار ژوب اور لسبیلہ کے اضلاع میں پایا جاتا ہے۔

۱۸۔ سنگ مرمر۔ اس کا استعمال ساری دنیا کو معلوم ہے۔ اس کے ذخائر ضلع چاغی میں پائے جاتے ہیں۔

۱۹۔ تیزابی نمک (فاسفیٹ) یہ فاسفورس ایسڈ (تیزاب) کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے جو کیمیائی کھاد کی صنعت کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ ضلع ژوب میں پایا جاتا ہے۔

۲۰۔ سوپ سٹون۔ یہ پینٹوں، چھتوں کے ٹائل، ربڑ اور مٹی کے برتنوں کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ نیز بھٹوں، ٹیکسٹائل، کازمٹیک، جوتوں کی پالش اور ناخن کی پالش میں استعمال ہوتا ہے۔

۲۱۔ گندھک۔ یہ گندھکی تیزاب کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے جو کیمیائی کھاد کی تیاری کے کام آتا ہے۔ یہ لوہے کی صنعت پٹرولیم کی صنعت، ٹیکسٹائل کی صنعت، تارکول، پینٹ اور رنگ و روغن کی تیاری میں کام دیتا ہے۔ یہ لسبیلہ، مکران، کچھی اور قلات کے اضلاع میں پایا جاتا ہے۔

۲۲۔ ورمیکیولائیٹ۔ یہ گھروں کے انسولیشن، فرج، سائیلنسر پلاسٹر

گاڑیوں کے انسولیشن، کولڈ سٹوریج، آگ بجھانے والے مواد، گریس، ربڑ کی اشیاء، پلاسٹک، فلموں کے فائر پروف کارٹنوں سونا اور کانسی پر لکھائی کا پیسٹ وغیرہ ان گنت صنعتوں میں کام آتا ہے۔ اس کے ذخائر ضلع چاغی میں دریائے ڈوکی میں پائے جاتے ہیں۔

۲۲۔ کوئلہ۔ اس کے استعمال کا علم ساری دنیا کو ہے۔ یہ مچھ آب گم جوہان، سورینج، ڈگاری، کھوسٹ، شارگ، سنجدی، دکی، کچھ وغیرہ ان گنت مقامات پر پایا جاتا ہے۔

۲۳۔ قدرتی گیس۔ یہ بگٹی علاقہ میں سوئی کے مقام پر حاصل کی جا رہی ہے اور تقریباً پاکستان کے تمام شہروں تک پائیپ کے ذریعے پہنچائی گئی ہے۔ گھریلو استعمال کے علاوہ کارخانوں میں بھی بڑے پیمانے پر استعمال کی جاتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

باشندے

باشندگانِ بلوچستان کی قومیت کی بنیاد من حیثیت القوم زبان اور نسل کی بجائے ان کی معاشرت اور کلچر پر استوار ہے۔ معاشرے کے بنیادی اصولوں کو رسم و رواج کا نام دیا گیا ہے جو بڑی حد تک یہاں کے اقتصادی حالات، مالی وسائل، معیشت اور طرز بود و باش کے آئینہ دار ہیں۔ ان اقتصادی اور مالی وسائل میں کاریزات، پانی کے چشموں، جاری پانی کے ندی نالوں، کنوؤں، مختلف وادیوں کو باہم مربوط کرنے والے آسان راستوں، تجارت، صنعت و حرفت اور چراگاہوں کے وسیع خطوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے ان کے علاوہ جغرافیائی حالات اور تاریخی عوامل نے بھی اس مخصوص اور منفرد معاشرے کی ترکیب اور ساخت میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ بلوچستان میں قدیم زمانہ سے مالی وسائل اور خصوصاً آب و اراضی کی تقسیم میں کچھ ایسا منصفانہ انداز اختیار کیا گیا ہے کہ عام طور پر باشندگان بلوچستان کے باشندوں کی آمدنی میں بہت زیادہ فرق موجود نہیں رہا ہے۔ عملی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زمانہ حال تک یہاں کا معاشرہ

ایک نیم جاگیردارانہ اور نیم قبائلی خود کفیل اور مستحکم معاشرہ ہے اس معاشرے کا سب سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ اس کے بنیادی اصول شمال میں توبہ کی پہاڑیوں سے لے کر جنوب میں عین ساحل سمندر تک اور مشرق میں دریائے سندھ سے لے کر مغرب میں اندرون ایران کے بلوچی علاقوں کی آخری سرحد تک تمام لوگوں کی زندگی پر بلا امتیاز یکساں طور پر حاوی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بلوچستان کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک اقتصادی وسائل اور معیشت کی نوعیت ہر جگہ تقریباً یکساں اور ایک ہی قسم کی ہے۔ اقتصادی وسائل کی یکسانیت نے ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا ہے جس نے آبادی کے مختلف الاصل عناصر اور لسانی گروہوں کو باہم مربوط کر کے ایک قومیت کی شکل دے دی ہے۔ ان گروہوں میں سے اگر کوئی گروہ اپنے آپ کو اس معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ خیال نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی حیثیت ابھی نووارد کی سی ہے اور ابھی تک اس کو اس تاریخی عمل سے گزرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا ہے جو اسے معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے۔ بلوچستان کے معاشرے میں اس قسم کا غیر ہم آہنگ عنصر غالباً اُن آباد کاروں کا ہے جو پاکستان کے دوسرے صوبوں سے تلاش معاش میں یہاں آکر آباد ہوئے ہیں، لیکن ان کو باشندگان بلوچستان کی قومیت کا جزو بننے کے لئے ابھی مزید وقت کی ضرورت ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ حصولِ آزادی اور قیام پاکستان

کے بعد مواصلات اور ذرائع آمد و رفت کی ترقی کی وجہ سے جن کی بدولت
بلوچستان کے اکثر علاقوں کا رابطہ مستقل طور پر سندھ اور پنجاب وغیرہ کی بڑی
بڑی منڈیوں سے قائم ہو گیا ہے، اور اس بنا پر بھی کہ آزادی اور قیام پاکستان
کی وجہ سے کاروبار اور خصوصاً زراعت و تجارت اور صنعت و حرفت کے
میدان میں ترقی کرنے کے زیادہ مواقع فراہم ہوئے ہیں بڑے پیمانے پر
سرمایہ کاری کے معاملہ میں حوصلہ افزا پیش رفت ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے
میں یہاں کے معاشرے میں سرمایہ دارانہ رجحانات بڑی تیزی کے ساتھ
سرایت کر گئے ہیں اور بدستور سرایت کرتے جا رہے ہیں اور معاشرے
کی وہ خود کفالتی حیثیت ایک بڑی حد تک ختم ہو گئی ہے یا ختم ہوتی جا رہی
ہے جو اس سے قبل یہاں کی نیم جاگیردارانہ معیشت کی سب سے بڑی خصوصیت
تھی۔ لیکن ان تبدیلیوں سے یہاں کی سوسائٹی، سماج اور مجلسی زندگی میں قبائلیت
اور فرقہ پرستی کی جگہ انفرادیت کا رجحان اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اس
سے مختلف عناصر، قبائل اور لسانی گروہوں کو باہم مربوط ہو کر ایک ہی قومیت
کی شکل اختیار کرنے میں اور زیادہ مدد ملی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اگرچہ
بلوچستان میں نصف درجن کے قریب زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن یہاں کا معاشرہ
لسانی اور نسلی تعصبات سے بڑی حد تک بچا ہوا ہے اور یہاں کے باشندوں
کے سیاسی اندازِ فکر میں، چاہے وہ کوئی سی زبان بولتے ہوں اور کسی بھی نسلی
گروہ سے تعلق رکھتے ہوں کچھ زیادہ فرق موجود نہیں ہے، بجز اس کے کہ بعض
پیشہ ورانہ اور خدمت گار طبقوں کو جن میں نقیب وغیرہ شامل ہیں یہاں کی

سوسائٹی میں وہ رتبہ حاصل نہیں ہے جو انسانیت اور مساوات کا تقاضا ہے لیکن زیرِبحث معاملہ کا تعلق مساوات سے نہیں بلکہ عصبیت سے ہے اور دنیا بھر کی سوسائٹیوں میں اس قسم کی عدمِ مساوات کی اصل وجہ نظامِ جاگیرداری ہے جو دنیا میں ہزاروں سالوں سے قائم چلا آتا ہے اور دنیا میں معتدبہ ترقی ہونے کے باوجود اس کو یکسر مٹانے میں ابھی تک زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ بلوچستان کے معاشرے میں اس قسم کی عدمِ مساوات کا وجود کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہے۔ البتہ یہاں کا سماج عصبیت سے اس قدر پاک ہے کہ غیر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ گزشتہ صدیوں میں بڑی رواداری کا برتاؤ کیا جاتا رہا ہے۔ خصوصاً ہندوؤں کو یہاں کے سوشل سسٹم کا ایک اہم جزو خیال کیا جاتا ہے۔

بلوچستان کے متعلق برطانوی دورِ اقتدار سے عام طور پر یہ غلط فہمی پھیلائی جاتی رہی ہے کہ یہاں کی آبادی اس قسم کے وحشی قبائل پر مشتمل ہے، جن کی معاشی زندگی کا دارومدار مال مویشیوں کی پرورش پر ہے۔ اور یہاں کے نظامِ سرداری کو بھی غالباً اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے جو افریقہ کے سیاہ فام توہم پرست وحشی قبائل میں مروّج ہے۔ برطانوی دورِ اقتدار میں جب جمہوری حقوق کے لئے تحریک شروع ہوئی تو ان مطالبات کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا گیا کہ یہاں کے باشندوں کو مدنیت، تہذیب اور تمدن سے کوئی واسطہ ہی نہیں اور وہ وحشیانہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قبائل کی اصطلاح زیادہ تر اس قسم کی آبادیوں کے لئے مستعمل ہوتی ہے جن کو صدیوں

کے دوران کسی قسم کے منظم نظامِ حکومت کے تحت زندگی بسر کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو۔ اور جن علاقوں میں صدیوں سے لاقانونیت کا بازار گرم رہا ہو۔ اس قسم کی آبادیاں نہ صرف تہذیب وتمدن، مدنیت اور اخلاق واطوار سے ناآشنا رہی ہیں بلکہ ان کو نظم ونسق اور ضابطے سے نہ کبھی واسطہ پڑا ہے اور نہ ان کے ذہنوں میں کبھی کسی ایسے ضابطہ کا تصور رہا ہے جسے دنیا کے لوگ نظامِ عدل کے نام سے جانتے ہیں۔ اس قسم کے علاقوں میں آج بھی تمام فیصلے بندوق کی گولی کے بل بوتے پر کیے جاتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال وہ آبادیاں ہیں جو شمال مغربی سرحدی صوبہ اور افغانستان کے درمیان ایک دشوار گزار خطے میں موجود ہیں۔ اور جو علاقہ غیر، آزاد قبائل کا علاقہ یا وزیرستان وغیرہ کے نام سے مشہور ہیں یہاں وزیری، مہمند، محسود، آفریدی، اورک زئی اور بنگش وغیرہ سکونت پذیر ہیں۔ ان علاقوں میں تاریخ کے کسی مرحلے پر کوئی منظم حکومت قائم نہیں رہی ہے اور یا پھر قبائل کی اصطلاح ان غیر متمدن قبائل کے لیے استعمال ہوتی ہے جن کا سب سے بڑا پیشہ بھیڑ بکریاں اور دوسرے مویشیوں کو پالنا ہے۔ یہ عموماً چراگاہوں کی تلاش میں دیس دیس مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ ان کا کسی مخصوص علاقہ سے ایسا تعلق نہیں ہوتا کہ جس کی بنا پر اس علاقے کو ان کا آبائی وطن قرار دیا جا سکے بجز اس کے کہ ان کی پیدائش ایک خاص علاقہ میں ہوئی ہے۔ اس قسم کے غیر متمدن قبائل ایشیا اور عربستان کے مختلف ممالک میں تقریباً ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ یہ ضابطہ کے تحت زندگی بسر کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔

لیکن جہاں تک بلوچستان کا تعلق ہے یہاں گزشتہ پانچ ہزار سال سے برابر منظم اور ترقی یافتہ حکومتیں قائم چلی آئی ہیں۔ یہاں کے باشندے زمانۂ قدیم سے منظم حکومتوں کے تحت زندگی بسر کرتے چلے آئے ہیں اور ہزاروں سالوں میں تاریخ کے کسی مرحلے پر یہاں کبھی کبھی کوئی ایسا حادثہ یا صورتِ حال پیش نہیں آئی کہ منظم حکومت کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہو اور اس کی جگہ لاقانونیت نے لے لی ہو اور یہاں کے باشندے سیاسی شعور سے پوری طرح بہرہ ور رہیں اور آمریت اور جمہوریت کے درمیان فرق کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور اسے اپنی زبان میں زبر واکگی اور استمان واکگی کا نام دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انگریزوں نے بلوچستان میں قدم رکھنے کے بعد اس علاقے کو کئی قسم کی علاقائی حد بندیوں، برطانوی بلوچستان، ایک بڑی ریاست، اس ریاست کے اندر چھوٹی ریاستوں، متجار علاقہ، اور قبائلی علاقوں میں تقسیم کر کے نہ صرف یہاں کے باشندوں کی اپنی منظم حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا بلکہ یہاں کی معیشت کو جان بوجھ کر اس حد تک تباہ کر دیا تھا کہ اس سے تمام علاقے میں قبائلی رجحانات پیدا ہو گئے تھے اور اس پر طرہ یہ کہ یہاں کے سرداری نظام کو جو بلوچستانی باشندوں کے سوشل سسٹم کا ایک اہم جزو ہے اس حد تک اپنے شاہی مفادات کے پیشِ نظر کچھ اس انداز سے ڈھال لیا تھا کہ اس کی اصل صورت مسخ ہو کر رہ گئی تھی۔ لہٰذا بلوچستان کے باشندوں کے لئے قبائل اور قبائلیت کے الفاظ قطعاً غیر موزوں، نامناسب اور ناجائز ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بلوچستان کے مخصوص جغرافیائی حالات اور اقتصادی وسائل کے پیش نظر یہاں کے باشندوں کی معیشت میں مویشی اور خصوصاً بھیڑ بکریوں کے گلّے ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود یہاں کے باشندے ان معنوں میں متحرک زندگی بسر نہیں کرتے جو اکثر خانہ بدوش قبیلوں کی خصوصیت ہوتی ہے۔ بلوچستان کے مختلف قبیلوں کا تعلق مختلف وادیوں سے ہے جہاں سے وہ شاذونادر ہی نقل مکانی کرتے ہیں اور عموماً ان کی نقل و حرکت کا دائرہ فقط ان کی اپنی وادی تک محدود رہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ بعض لوگ روزگار یا سردی سے بچنے کی خاطر موسم سرما میں سندھ یا کچھی کے میدانی علاقوں کا رخ کرتے ہیں اور ان میں سے اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو کچھی کے میدانی علاقہ میں اراضیات کے مالک ہوتے ہیں اور اپنی اراضیات کی نگہبانی کے لئے نقل مکانی کرتے ہیں۔ بسا اوقات کچھی کے میدانی علاقوں میں گھاس اس قدر وافر مقدار میں دستیاب ہوتی ہے کہ مویشیوں اور بھیڑ بکریوں کے مالکوں کے لئے ان علاقوں کی طرف نقل مکانی کرنا مفید بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔

بلوچستان میں آمدنی کا سب سے اہم وسیلہ قدیم زمانہ سے قابل کاشت اراضیات ہی خیال کی جاتی رہی ہیں اور جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے بلوچستان میں آب و اراضی کی تقسیم کچھ اس انداز سے عمل میں آتی ہے کہ تقریباً ہر شخص کے پاس کچھ نہ کچھ اراضی ہوتی ہے۔ یہاں اس قسم کے خاندانوں کی تعداد بہت ہی کم ہے جو اراضیات کے وسیع رقبوں کے مالک خیال کئے

جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان کے تمام علاقے باستثنائے کچھی کہ جس میں جاگیروں کے کچھ رقبے واقع ہیں. مالیہ دہ علاقے ہیں. اور اگر یہاں اراضیات کے بعض رقبے مالیہ سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہ اراضیات ابتدا میں سرکاری ملکیت تھیں اور بعد میں یہ اراضیات سرکار کی طرف سے بعض ممتاز خاندانوں کو ان کی خدمات کے صلے میں بطور جاگیر عطا کی گئی تھیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اراضیات متعلقہ خاندانوں کی اپنی ملکیت چلی آتی تھیں اور غالباً بعض نجی وجوہات ذاتی اثر و رسوخ یا فوجی خدمات کے عوض یہ اراضیات مالیہ سے مستثنیٰ قرار دی گئی تھیں. البتہ کچھی کے میدانی علاقے میں بعض ممتاز خاندان اور خصوصاً بعض قبائلی سردار وسیع جاگیروں کے مالک ہیں لیکن اول تو اس قسم کی جاگیریں بعض قبیلوں کی مشترکہ ملکیت ہیں اور ان سے ایک خاندان کی بجائے پورا قبیلہ استفادہ کرتا ہے اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ جاگیریں زیادہ تر سیلابہ اراضیات پر مشتمل ہیں اور آمدنی کے وسیلہ کی حیثیت سے ناقابلِ بھروسہ ہیں. اس تمام صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ بلوچستان کے باشندوں کی آمدنی میں کچھ زیادہ فرق موجود نہیں ہے. یہاں کا معاشرہ اگرچہ ایک خوشحال معاشرہ نہیں ہے لیکن اس صورتِ حال کی وجہ سے اس معاشرے میں وہ تکلیف دہ ناہمواریاں مفقود ہیں جو نظامِ جاگیرداری کی خصوصیت ہوتی ہیں علاوہ ازیں یہاں کا معاشرہ بنیادی طور پر ایک زرعی معاشرہ ہے اور یہاں کی مختلف آبادیاں، جو بادی النظر میں مختلف قبیلوں کے نام سے موسوم

ہیں اور جو یہاں کی وادیوں میں مستقل سکونت رکھتی ہیں، کمیون کی حیثیت رکھتی ہیں اور کمیون کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں جرائم کا رجحان مفقود ہوتا ہے اور یہ لوگ پُرامن پیشوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آبادی کا ایک بڑا حصہ تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ قسم کے پیشوں میں مشغول رہتا ہے اور انفرادی آزادی ان آبادیوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

بلوچستان کے دیہی سماج میں دنیا بھر کے معاشروں کی طرح ممتاز اور مراعات یافتہ طبقوں کا فقدان نہیں ہے اور یہاں کے سوشل سسٹم میں بعض خاندان امتیازی حیثیت کے مالک خیال کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے خود خان کا اپنا خاندان ہے، جو ایک عرصہ دراز سے بلوچ نظام قوم داری کا سربراہ چلا آ رہا ہے، اس کے علاوہ یہاں اَن گنت اس قسم کے خاندان بھی ہیں جو بلوچ نظام قوم داری کے رکن چلے آ رہے ہیں اور آج بھی یہاں کی سوسائٹی میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طبقے میں وہ خاندان شامل ہیں جو اکثر قبیلوں کے سربراہ ہیں اور پھر وہ علاقائی سردار ہیں جو مکران، خاران اور لسبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں جن میں جام کا خاندان شامل ہے۔ جو بلوچ نظام قوم داری میں لسبیلہ کی جٹ آبادی کی نمائندگی کا فرض انجام دیتا رہا ہے اور ان تمام خاندانوں میں پشتون قبیلوں کے سربراہ بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بلوچستان کے اہلِ زراعت و حرفت اور اہلِ تجارت کے سربراہوں کا شمار بھی کسی حد تک اسی زمرے میں آتا ہے۔ اس سلسلے میں باشندگانِ بلوچستان کے معاشرے کے اس اہم اصول کی وضاحت ضروری ہے، جس کے تحت سوسائٹی میں

ممتاز حیثیت حاصل کرنے کا دار و مدار دولت کی فراوانی، اراضیات کے وسیع رقبوں کی ملکیت یا برادری کی کثرت نہیں ہے۔ بلکہ ممتاز معاشرتی رتبہ حاصل کرنے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ متعلقہ خاندان میں کتنی جنگی صلاحیت ہے' اور بلوچستان کی تاریخ میں اس خاندان نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کے تحت بلوچستان میں بعض خاندانوں نے ممتاز حیثیت اور اونچا سوشل رتبہ حاصل کر لیا ہے۔

بلوچستان کے شمالی اضلاع میں پشتو زبان بولنے والے قبائل کی زبردست اکثریت ہے۔ لیکن اسے جغرافیائی اور اقتصادی عوامل کا کرشمہ سمجھنا چاہئے کہ یہ تمام افغان قبائل معاشرے کے تقریباً ان ہی بنیادی اصولوں کی پیروی کرتے ہیں جن پر بلوچ قوم کی عمارت استوار ہے۔ ان میں نظام سرداری زیادہ اہمیت رکھتا ہے جو خالصتاً ایک بلوچی ادارہ ہے۔ سیاہ کاری یا ننگ داری کے معاملہ میں قتل کا رواج بھی ایک خالص بلوچی رسم ہے۔ بلوچستان کے افغان قبائل کے برعکس صوبہ سرحد اور قندھار کی پشتون آبادیوں میں اس قسم کے ادارے اور رسم و رواج مفقود ہیں۔ اس صورتِ حال سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں کے بلوچ اور پشتون معاشرے میں کوئی بڑا فرق موجود نہیں ہے اور دونوں آبادیوں کے اخلاقی تصورات کی بنیاد ایک ہی معاشرے پر استوار ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شمالی بلوچستان کی پشتون آبادی میں نظامِ سرداری کو انگریزوں نے رائج کیا تھا ممکن ہے کہ یہ مفروضہ درست ہو لیکن یہاں کے بلوچ اور پشتون قبیلوں میں ایک ہی قسم کے جو رسم و رواج رائج ہیں اس کے لئے کوئی دوسری وجہ جواز موجود نہیں ہے اور نہ یہ رسم و رواج

انگریزوں کے رائج کردہ ہیں۔ بلوچستان میں مختلف زبانیں بولنے والے طبقوں کی حیثیت محض لسانی گروہوں کی ہے جو صدیوں کے رابطہ اور جغرافیائی اور اقتصادی عوامل کی بنا پر ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اس طرح مربوط ہو گئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

بلوچستان کے قومی معاشرے کا دوسرا کرشمہ یہ ہے کہ یہاں کے دو ممتاز و مقتدر قبیلے رئیسانی اور زرک زئی جو روایات کی بنا پر افغان اصلیت کے حامل خیال کئے جاتے ہیں، صدیوں کی تاریخی پختت وپزکی بنا پر بلوچ معاشرے میں کچھ اس انداز سے جذب اور مدغم ہو گئے ہیں کہ اب وہ چوٹی کے بلوچ قبیلے خیال کئے جاتے ہیں اور عملی طور پر ان کا تعلق براہوئی لسانی گروہ سے ہے۔ لیکن رئیسانی قبیلہ کا سردار اپنے گھر میں بلوچی بولتا ہے اور بلوچی ہی اس کی زبان ہے۔ یہ معاملہ فقط اس ادغام تک محدود نہیں ہے بلکہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان دو قبیلوں میں قبیلہ رئیسانی کا سردار سراوان کا اور قبیلہ زرک زئی کا سردار جھالاوان کا سرسردار یعنی سردار اعلیٰ کہلاتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے ان دونوں سرداروں کو بلوچ نظام قومداری میں ایک ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں علاقے سراوان اور جھالاوان جن کی آبادی براہوئی بولنے والے بلوچ قبائل پر مشتمل ہے۔ بلوچ نظام قومداری کے مرکز اور گڑھ خیال کئے جاتے ہیں۔ یہی کیفیت مکران کے گچکی خاندان کی ہے جس کی اصلیت اس کی اپنی روایات کے مطابق راجپوت ہے لیکن اس قبیلہ کے لوگ نہ صرف بلوچ خیال کئے جاتے ہیں بلکہ یہ ایک ایسے علاقے کے سردار ہیں جس کی آبادی کلیتاً بلوچی بولنے والے قبیلوں پر مشتمل ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں ایشیا کے مختلف ممالک پر چنگیزی مغلوں کا حملہ شروع ہوا تھا۔ ان کے فوراً بعد نقودری قبیلے بھی وسط ایشیا سے نکلے اور ۹۹-۱۲۹۸ء میں وہ خراسان میں نمودار ہوئے۔ چودھویں صدی کے وسط میں انہوں نے سیستان میں بودوباش اختیار کر لی۔ لیکن زیادہ تر خاران ہی ان کی آماجگاہ بنا۔ وہ سال کا کچھ حصہ دریائے ہلمند کے کنارے بسر کر کے اپنے مویشیوں کی پرورش میں مشغول رہتے تھے۔ یہ خانہ بدوش تھے۔ لیکن لوٹ مار ان کا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔ وہ لوگ ایک فطرت پرستانہ مذہب میں اعتقاد رکھتے تھے اور اپنے مُردوں کے لئے گنبد نما عمارتیں تعمیر کر کے ان کی لاشیں ان میں اسلحہ، زیورات، کپڑوں اور دوسرے اثاثوں سمیت رکھا کرتے تھے۔ مُردے کی انتڑیاں نکال کر ان کے پیٹ میں جَو بھر دیتے تاکہ لاش سڑنے نہ پائے اور خشک ہو سکے۔ چودھویں صدی کے پہلے نصف میں جب ایشیائی ممالک پر تیموری مغلوں کے حملے شروع ہوئے تو ان لوگوں میں سے ایک گروہ نے خاران میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ خاران میں گلوگر کے نزدیک گواجگ کا قصبہ ان کا صدر مقام تھا۔ خاران کا مشہور کنواں چاہ امیر جو ایک طرف گواجگ اور گلوگر کے مدفن اور دوسری طرف وادیٔ ہلمند کے بین درمیان واقعہ ہے انہی نقودریوں کے سردار کے حکم سے غالباً احداث کیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں جب کہ یزد میں اہلِ مظفر برسرِ اقتدار تھے تو ان نقودریوں نے اپنا لوٹ مار کا مشغلہ یزد اور پارس تک پھیلا دیا تھا۔ مظفر خاندان نے یزد کو ایک خود مختار ریاست کی حیثیت دی تھی۔ اس خاندان کے بانی نے ان نقودریوں کو کئی بار شکست دے کر ان کے جارحانہ اقدامات کے سدِباب کی کوشش کی اور

اس نے ان کے خلاف کئی لڑائیاں لڑیں۔ ان لڑائیوں میں سے ایک لڑائی کے دوران خاران کا نقودری سردار امیر نوشیرواں سخت زخمی ہوکر فوت ہوگیا اور نقودریوں نے اس کی لاش کو ماشکیل میں گلوگہ کے نزدیک اپنے قبائلی مدفن میں اپنے قاعدہ اور دستور کے مطابق دفن کر دیا۔ گلوگہ میں کئی گنبد ہیں۔ ان میں سے ایک گنبد، گنبدِ نوشیروان کے نام سے موسوم ہے۔ اس گنبد کی دیوار میں ایک کتبہ موجود ہے جس پر مزار امیر نقودر کے الفاظ کندہ ہیں۔ غالباً امیر نوشیروان کی وفات سے پہلے یہ گنبد تعمیر کیا گیا تھا جس میں اس کے باپ دادا کی لاشیں بھی رکھی گئی تھیں۔ اس کی لاش بھی اسی میں رکھی گئی تھی۔ یہ گنبد عموماً دو منزلہ ہوتے ہیں۔ ان نقودریوں کا قاعدہ اور دستور یہ تھا کہ تازہ لاش کو اوپر کی منزل میں رکھا کرتے اور پرانی لاشوں کی ہڈیوں کو نچلی منزل میں جمع کرتے تھے۔ اس قسم کے گنبد خاران میں کئی مقامات پر پائے جاتے ہیں۔

خاران کے نقودری بعد میں اسی سردار کی مناسبت سے، جو حاکمِ یزد کے ہاتھ سے ہلاک ہوگیا تھا نوشیروانی کہلائے اور اب بھی نوشیروانی کہلاتے ہیں۔ اس قبیلے کے ایک سردار میر نوروز خان کو جس کو انگریزوں نے جی۔ سی۔ آئی۔ ای کے خطاب سے نوازا تھا، لوٹ مار سے بڑی دلچسپی تھی۔ یہ بھی بلوچستان کے معاشرے کا ایک عجیب وغریب کرشمہ ہے کہ نوشیروانی جو خاران کے علاوہ مکران میں بھی پائے جاتے ہیں بلوچ قومیت میں کچھ اس انداز سے مدغم اور جذب ہوگئے ہیں کہ اب ان کی اصلیت قصہ پارینہ بن گئی ہے۔ ان کی زبان بھی بلوچی ہے۔ برطانوی دور میں مکران میں ایک عوامی بغاوت کے

دوران وہاں کے میر بلوچ خان نوشیروانی نے دوسرے نوشیروانیوں سے
مل کر گوک پروش کی لڑائی میں بہادری کے بڑے جوہر دکھائے تھے اور
سب کے سب شہید ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے اتحادی گچکی سردار زندہ سلامت
بچ کر آئے تھے۔ خاران کا علاقائی سردار اسی خاندان یا قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے
بلوچستان کی تاریخ میں اس خاندان کے اہم کردار کی کیفیت یہ تھی کہ بلوچ نظام
قوم داری کے ابتدائی دور میں جب خان میر احمد خان ثانی نے کچھی کے علاقے
پہ پے در پے حملے کیئے تو ان حملوں کے دوران خاران کا سردار میر بلوچ
خان اس کے شریک کار تھا۔ اس لحاظ سے سردار خاران کا شمار بلوچ نظام
قوم داری کے اولین اراکین میں ہوتا ہے۔

بلوچستان کی تاریخ میں "ایک ہزار" کا عدد بڑی اہمیت کا حامل ہے
اس سے بعض قبیلوں کی اصلیت پر روشنی پڑتی ہے اور اس عدد سے
ان کی ایک پُراسرار نسبت کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے
کہ جب سفید ہون قبائل نے شاہ ایران فیروز کے زمانہ میں ایران کو اپنا باجگزار
بنالیا تھا تو وہ کثیر تعداد میں بلوچستان میں داخل ہو گئے تھے اور ایک عرصہ
دراز تک بلوچستان میں ان کا زور قائم تھا۔ تقریباً تمام منگول قبیلوں کی یہ خصوصیت
ہے کہ ان کی فوجی یا قبائلی تنظیم ایک ہزار افراد کے یونٹ یا اکائی پر مبنی ہوتی
ہے۔ سفید ہون قبائل بھی منگ کے نام سے موسوم تھے جس کا مطلب منگولی
زبان میں ہزار ہے بلوچستان میں مینگل قبیلہ کے لوگ ان ہی سفید ہون کی اولاد
ہیں یہ لفظ منگ اور گل سے مرکب ہے اور گل کا لفظ بلوچی اور براہوی زبان

یں جماعت اور طائفہ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اسی بنا پر یہاں کی جٹ
آبادی کے لئے بھی جدگال کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو اسی جٹ گل کی کسی
قدر بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب چنگیزی اور تیموری
منگول قبائل بہ تعداد کثیر افغانستان کے مغربی علاقوں میں آباد ہو گئے اور ان کی
مناسبت سے غوریاں کے علاقے کا نام تبدیل ہو کر ہزارہ جات ہو گیا اور
اسی علاقے میں افغان قومیت کے جو لوگ آباد تھے انہوں نے بھی اپنی
قبائلی یا فوجی تنظیم کی بنیاد ہزار افراد کی اسی اکائی پر رکھی اور وہ زرک کہلانے
لگے۔ پشتو زبان میں ہزار کے لئے زر کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور زرخیل بھی
اسی زر یا ہزار کے عدد سے تعلق نسبتی رکھتا ہے۔ امیر تیمور لنگ کے زمانہ میں
سلیمان زرک ایک تاریخی شخصیت ہو گذرا ہے اور غالباً بلوچستان پر مغلوں کے
حملوں کے دوران اس کی برادری یا قبیلہ کے لوگوں نے جھالاوان کے علاقہ
زہری میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی جو ایک نہایت سرسبز اور شاداب
علاقہ ہے اور جس نے بلوچ نظام قبائلی کے دوران ایک اہم کردار ادا
کیا ہے۔ علاقہ زہری کا نام بھی اسی زر یا ہزار سے مشتق ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا
بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سفید ہون کا اصل علاقہ جو منگولیا میں واقع ہے
ذنگریہ کہلاتا تھا اور باغی کے مینگل قبیلہ کے لوگ ذگر مینگل کہلاتے ہیں اور یہ
لفظ بھی غالباً ذنگریہ کا مخفف ہے۔ آج ان دونوں قبیلوں یعنی مینگل اور زرک زئی
کا شمار براہوئی کے ممتاز قبیلوں میں ہوتا ہے اور زرک زئی قبیلہ کی مانند، مینگل
قبیلہ نے بھی بلوچستان کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ آخری منگول

قبیلہ جو تازہ یہاں وارد ہوا ہے کوئٹہ کی وہ آبادی ہے جو ہزارہ کے نام سے موسوم ہے۔

اس قسم کے تاریخی شواہد کی کمی نہیں ہے کہ بلوچستان میں سفید ہون کی آمد سے پیشتر یہاں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ سگیتھائی یا ساکاؤں پر مشتمل تھا جن کے زرعی آثار وسطی بلوچستان میں گبر بندوں کے نام سے موسوم ہیں اور دُور دُور تک پائے جاتے ہیں۔ وادی مشکے کے ساجدی قبیلہ کی اصلیت بھی ساگا تائی ہے اور اس قبیلے کا سردار خیل طائفہ ساکازئی کہلاتا ہے اور اب یہ ایک ممتاز بلوچ قبیلہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح وسطی بلوچستان کے بزنجو قبیلہ کے متعلق گمان ہے کہ اس کا تعلق بلوچستان کی اس قدیم آبادی سے ہے جسے عرب تذکرہ نویس زط کے نام سے جانتے تھے۔ یہ لوگ وادی نال میں بود و باش رکھتے ہیں۔ جہاں نال کا تاریخی قصبہ واقع ہے اور یہ ایک ممتاز براہوئی قبیلہ خیال کیا جاتا ہے۔ کوہستانی بزنجو بلوچی اور میدانی بزنجو براہوئی زبان بولتے ہیں۔

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ بلوچستان کی آبادی میں زبردست نسلی تنوع موجود ہے اور یہاں کی آبادی کو کسی مخصوص نسل کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

بلوچستان کا خطہ ایک طرف ایران کی سطح مرتفع جس کا خود وہ ایک حصہ ہے اور دوسری طرف وادیٔ سندھ اور پنجاب کے میدانی علاقوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ خطہ اپنے محل وقوع کی بنا پر قدیم زمانہ سے

ایرانی، باختری اور ہندی تہذیبوں کے لیئے سنگھم یا مقام اتصال کا کام دیتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں وہ غیر دشوار گذار قدیم راستے جو یہاں کے کوہستانی سلسلوں کی درمیانی وادیوں کو عبور کر کے ایک طرف ایران اور افغانستان اور دوسری طرف سندھ اور پنجاب کے زرخیز علاقوں میں داخل ہوتے ہیں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور جنوب میں ساحل سمندر نے بھی مواصلات کے ذریعے میں قدیم زمانہ ہی سے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان امور کی وجہ سے چاروں طرف کے مختلف ترقی یافتہ ممالک کے درمیان ہزاروں سال سے اکثر و بیشتر بلوچستان ہی کے توسط سے تہذیبی رابطہ قائم رہا ہے۔ اس قسم کے آثار و شواہد بھی موجود ہیں کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف اطراف کے ہمسایہ ممالک کے اندر جب بھی عوامی نقل و حرکت، مہاجروں اور حملہ آوروں کے طوفان اٹھے تو ان نئی آبادیوں کے سیلاب جو ہمسایہ ممالک میں سیاسی شکست و ریخت کے نتیجہ میں پیدا ہوئے تھے، زیادہ تر انہی شاہراہوں سے ہو کر گذرے جو بلوچستان کے مختلف علاقوں میں واقع ہیں۔ اس قسم کی پے در پے نقل و حرکت، عظیم ہجرتوں، قدرتی آفات اور حملوں کے نتیجہ میں جب بھی ان مختلف نسلی عناصر سے تعلق رکھنے والی آبادیوں کا گذر بلوچستان سے ہوا تو ان کے کچھ نہ کچھ حصے نے اپنے اصلی کاروان سے کٹ کر اسی سرزمین پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بلوچستان قدیم زمانہ سے کبھی ہندی کبھی باختری اور کبھی ایرانی تہذیبوں کے دائرے میں رہا ہے اور ان میں سے ہر ایک نے یہاں کی آبادی پر اپنے کچھ نہ کچھ نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ تمام ہل چل اور تبدیلیاں

جو مختلف ادوار اور زمانوں میں واقع ہوئیں، بلوچستان کی آبادی میں ایک زبردست نسلی تنوع پیدا کرنے کا باعث بن گئی تھیں اور اس تنوع کے ساتھ ساتھ تاریخی، جغرافیائی اور تہذیبی عوامل نے بھی اپنا اثر دکھانا شروع کیا تھا۔ غرض یہ نتیجہ نکلا کہ بمرور زمانہ نئے اور پرانے عناصر ایک دوسرے سے کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ اب ان کی اصلیت کی شناخت نا ممکن ہو گئی ہے اور نہ نسل کی بنیاد پر بلوچستان کے لئے کوئی موزوں اصطلاح وضع کی جا سکتی ہے یہاں کا معاشرہ اور کلچر ہی یہاں کی آبادی کی قومیت کی اساس ہے۔

بلوچستان کے طول و عرض میں بلوچ، براہوئی، پشتون جٹ اور دہوار وغیرہ کے نام سے جو مختلف طبقے اور آبادیاں زمانہ قدیم سے بود و باش رکھتی ہیں ان کی حیثیت نسلی نہیں ہے بلکہ یہ تمام آبادیاں مختلف الاصل عناصر پر مشتمل الگ الگ لسانی گروہوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگلے باب میں ان لسانی گروہوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ درحقیقت یہی لسانی گروہ اس معاشرے کے تار و پود اور تانے بانے ہیں کہ جن کے باہمی ربط و ضبط سے بلوچستان کے باشندوں کی قومیت وجود میں آئی ہے۔

دوسرا باب

لسانی گروہ

۱۔ بلوچ

بلوچستان کی سب سے بڑی آبادی زیادہ تر ان قبائل پر مشتمل ہے جو بلوچی زبان بولتے ہیں اور بلوچ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی آبادی بلوچستان کے تقریباً دو تہائی حصہ پر پھیلی ہوئی ہے اور ما سوائے خالص پشتون علاقوں کے یہ زبان تقریباً ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ان قبیلوں اور خاندان کے بعض افراد بھی بلوچی زبان بولتے ہیں۔ جو روایتی طور پر براہوئی قبیلے خیال کیے جاتے ہیں۔ بلوچستان کی حدود سے باہر سندھ ، پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کے بعض ان اضلاع میں بھی جو بلوچستان سے منصل ہیں۔ یا کبھی اس کا حصہ تھے ، بلوچ کثیر تعداد میں ایک عرصہ سے آباد چلے آتے ہیں۔ حتیٰ کہ متذکرہ بالا صوبوں کے اندرونی علاقوں میں بھی ان کی چھوٹی اور بڑی آبادیاں پائی جاتی ہیں۔ پاکستان بھر میں ان کی تعداد ایک کروڑ سے متجاوز ہے۔ ان کے علاوہ افغانستان اور ایران کے ان ولایات اور استانوں میں بھی بلوچ کثیر تعداد میں آباد ہیں جو بلوچستان سے منصل ہیں ۔۔ حتیٰ کہ شمال میں روس کی سرحد تک ان کی آبادی پھیلی ہوئی ہے۔

بلوچوں کی اس وسیع آبادی میں جو وسط ایشیا کے معتد بہ حصہ میں پھیلی ہوئی ہے سب سے بنیادی عنصر رند کا ہے اور بلحاظ نسل یہی عنصر ہے جو خالص بلوچ خیال کیا جاتا ہے لیکن بعض دوسرے عناصر بھی بمرور زمانہ بلوچ قومیت میں مدغم اور جذب ہو گئے ہیں۔ اور بلوچی زبان بولتے ہیں۔ ان موخرالذکر عناصر کی اصلیت ساکا، جٹ اور تاجک وغیرہ ہے۔ مکران میں یہ عنصر خصوصیت کے ساتھ غالب ہے جس کی ایک اچھی خاصی تعداد یا قبیلوں کے قبیلے یا تو جٹ اصلیت کے حامل ہیں یا پھر ساکا نژاد ہیں۔ ان قبیلوں میں مکران کے رئیس، سنگر، ہوت اور ساجدی قبیلے بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جن کی اصلیت ساکا یا جٹ ہے۔ لیکن وہ بلوچی زبان بولتے اور بلوچ خیال کئے جاتے ہیں۔ اس معاملے کا سب سے تعجب انگیز پہلو یہ ہے کہ مکران کا میروانی قبیلہ ایک براہوئی قبیلہ ہے اور اسی قبیلے کی ایک شاخ سے خان کا خاندان تعلق رکھتا ہے، لیکن میروانی قبیلہ کے افراد بلوچی زبان بولتے ہیں اور براہوئی زبان سے اس حد تک نا واقف اور نابلد ہیں کہ اس زبان کو کردگالی کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سفید ہون کے آنے سے پیشتر جنوبی بلوچستان کی آبادی ساکا نژاد قبائل پر مشتمل تھی لیکن سفید ہون کی آمد کے بعد بلکہ ان کے ساتھ جٹ بھی بڑی تعداد میں یہاں وارد ہوئے اور عربوں کے ابتدائی حملوں کے وقت بلوچستان کے اکثر حصوں پر یہی جٹ چھائے ہوئے تھے اور آبادی کا یہ وہی عنصر ہے جسے عرب تذکرہ نویسوں اور مورخین نے زط کا نام دیا ہے اور یہی وہ عنصر ہے جو بمرور زمانہ بلوچ قومیت میں مدغم

اور جذب ہوگیا اور جس نے بلوچی زبان اختیار کر لی۔ اس صورت حال سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ بلوچستان میں بلوچی زبان بولنے والی آبادی کی حیثیت ایک لسانی گروہ کی ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ بلوچ قومیت میں بنیادی عنصر رند کا ہے اور اس نے بعض دیگر عناصر کو اپنے اندر جذب اور مدغم کر لیا ہے۔ یہ وہ فارمولا ہے جو بلوچستان کے تمام لسانی گروہوں پر صادق آتا ہے۔

پروفیسر رالنسن وہ پہلا مؤرخ ہے جس نے سب سے پہلے یہ نظریہ پیش کیا کہ بلوچ بابل کے مشہور بادشاہ نمرود سے جو "بیلوس" کے لقب سے ملقب تھا نسلی رابطہ رکھتے ہیں اور کلدانی الاصل ہیں۔ مسٹر ہولڈچ نے بھی جزوی طور پر اس کی تائید کی ہے۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ عراق کی قدیم آبادی دراوڑ بعل پرست تھی اور سامی الاصل قبائل کے عراق پر حملوں کی وجہ سے عراق کی یہ قدیم دراوڑ آبادی جو بال دیوتا کی پرستار تھی نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئی اور اس کے ایک حصہ نے بلوچستان میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اس آبادی کے لوگ عراق سے نقل مکانی کرنے کے بعد ایران اور بلوچستان سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ یہ لوگ بال دیوتا کی مناسبت سے بلوچ کے نام سے موسوم ہوئے اور یہی بیلوس یا بلوچ نمرود کا بھی لقب تھا۔ عہد وسطیٰ کے عرب مورخین نے بھی بلوچوں کے عربی النسل ہونے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ غالباً ان عرب تذکرہ نویسوں کا خیال ان روایات پر مبنی ہے جو اس زمانہ میں مروج تھیں۔ خود بلوچوں کی روایات بھی یہی ہیں کہ ان کی اصلیت عرب

ہے اور انہوں نے اپنی رزمیہ منظوم داستانوں میں اس طرف پوری وضاحت کے ساتھ اشارہ کیا ہے کہ وہ حلب سے جو عراق میں واقع ہے نقل مکانی کر کے ایران اور اس کے بعد بلوچستان میں وارد ہوئے تھے۔ بلوچوں کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا امیر حمزہ کی اولاد ہیں اور ان کے مورث اعلیٰ کی ولادت ایک پری کے بطن سے ہوئی تھی جس سے امیر حمزہ رضی اللہ عنہ نے نکاح کر لیا تھا۔ جدید دور کے اکثر بلوچ مورخین نے اس نظریہ کی تائید میں کہ بلوچ بابل کے بادشاہ نمرود کی اولاد ہیں بڑا زورِ قلم صرف کیا ہے۔

مغربی ایشیا کے قدیم ترقی یافتہ ممالک اور خصوصاً سمیر اور چالڈیہ کی تہذیبوں اور ان کے قدیم باشندوں کے بارے میں تو اس قدر مواد فراہم ہو گیا ہے کہ ان کتابوں سے دنیا بھر کی لائبریریاں اور کتب خانے بھرے پڑے ہیں ان تہذیبوں کے بارے میں اگر کچھ لکھنے کی ضرورت ہو تو بہت کچھ مواد آسانی کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے اور اس موضوع پر درجنوں کتابیں، لائبریریوں کی خاک چھانے بغیر گھر بیٹھے لکھی جا سکتی ہیں۔ ان ممالک کے امراء، سلاطین کی شان و شوکت ان کے مذہبی عقائد، اور مذہبی رسومات، ان کی زراعت، اور صنعت و حرفت اور تجارت کے میدان میں ترقی، ان کا لٹریچر اور ادبیات، طرز معاشرت اور مجلسی زندگی، ان کی قومیت اور بلند و بالا عمارات کا طرزِ تعمیر، غرضیکہ ان قدیم لوگوں کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اب نظر سے اوجھل ہو۔ حتیٰ کہ علم الآثار کے علماء کا دعویٰ ہے کہ چودھویں صدی قبل مسیح کے مصر کی تاریخ ایشیا اور یورپ کے

کسی ملک کی چودھویں صدی عیسوی کی تاریخ سے کہیں زیادہ روشن، واضح اور پرشکوہ ہے۔ لیکن بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اب تک مصر و عراق اور سمیر و چالڈیہ کی تہذیبوں کے سلسلے میں مواد کے جو انبار لگ گئے ہیں۔ کیا اس مواد کے بل بوتے پر ذرہ بھر بھی ایسا ثبوت میسر ہے جس کی بنا پر بلوچوں کا نسلی رابطہ بابل کے بادشاہ نمرود کے ساتھ قائم کیا جا سکے اور عرب مؤرخین نے بلوچ کے لئے بلوص کا جو لفظ اس بنا پر کہ عربی زبان میں 'چ' کی بجائے 'ص' یا 'س' کا حرف مستعمل ہے۔ کیا اس بیلوص، بلوص یا بلوچ کی لفظی مماثلت ہی کو اس قدر کافی مواد تصور کیا جا سکتا ہے کہ صرف اس مماثلت کی وجہ سے بلوچوں کا نسلی رابطہ سمیر اور چالڈیہ کی قدیم تہذیبوں کے علم برداروں یا نمرود بیلوص سے قائم کیا جا سکے۔ میرے خیال میں ایسا کرنا صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ تمام قسم کے آثار و شواہد اور تاریخی مواد کو نظر انداز کر کے صرف من مانے طریقہ سے اپنی قوم کے لئے نئے سرے سے کوئی تاریخ تخلیق کی جائے یا پھر اس کا سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ فاضل مصنف محمد حسین عنقا مرحوم کی طرح کسی مستند تاریخی حوالہ کے بغیر کسی قوم یا شخصیت کو تاریخ میں سرفراز پاکر اسی سے اپنا یا اپنی قوم کا نسلی تعلق استوار کیا جائے۔ یہ دونوں طریقہ اختیار کرنے سے تاریخ نویسی میں آسانی تو ہو سکتی ہے لیکن علمی دنیا میں ان نظریات کو کوئی مقبولیت حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ مستند تاریخ اور افسانے میں بہت بڑا فرق ہے اور اس قسم کی تحریریں علمی تحقیق کے معاملے میں غلط فہمیوں کا باعث بن سکتی ہیں۔ اصل اور نقل میں فرق محسوس کرنا عام پڑھنے والے کے بس کی بات نہیں

ہے۔ یہ فرض تو صرف ایک محقق کا ہے۔

ابوالقاسم فردوسی نے اپنی منظوم رزمیہ داستان شاہنامہ میں جو تاریخی اعتبار سے بھی ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلوچوں کا بڑے کر و فر سے ذکر کیا ہے۔ وہ ان کا ذکر کوچ و بلوچ کے نام سے کرتا ہے۔

سپاہے ز گردان کوچ و بلوچ
سگالیدہ جنگ مانند غوچ

فردوسی نے سب سے پہلے کوچ و بلوچ کا ذکر کیکاؤس کے لشکریوں کے زمرے میں کیا ہے اور غالباً یہ وہی شاہ کیکاؤس ہے جو تاریخ میں کیخسرو کے نام سے مشہور ہے اور جس نے ۵۵۰ء سے لے کر ۵۳۰ء قبل مسیح تک ایران کی وسیع سرزمین پر حکومت کی تھی۔ شاہنامہ کے مطابق کیکاؤس کے لشکریوں کے کماندارِ اعلیٰ سیاؤش کی سرکردگی میں بلوچوں نے ترکستان کے بادشاہ افراسیاب کی فوجوں کے خلاف لڑائیوں میں حصہ لیا تھا۔ افراسیاب کا زمانہ اقتدار ۵۸۵ء سے لے کر ۵۵۰ء قبل مسیح تک تھا اور عام خیال یہ ہے کہ سیاؤش خود بھی ایک بلوچ خاندان کا چشم و چراغ تھا۔

فردوسی نے شاہنامہ میں دوسری بار بلوچوں کا ذکر ایران کے مشہور ساسانی بادشاہ انوشیروان خسرو اوّل کے عہد کے سلسلے میں کیا ہے جس کا عہدِ حکومت ۵۳۱ء سے لے کر ۵۷۹ء تک تھا۔ ان تذکروں کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دونوں بادشاہوں یعنی کیکاؤس اور انوشیروان خسرو اوّل کے زمانے کے درمیان پورے ایک ہزار سال کا فرق ہے۔

بہ رفت و آگاہی آمد بشاہ
کہ گشت از بلوچی جہانے تباہ

اس منظوم بیان میں بلوچوں کی لوٹ مار، قتل وغارت اور تباہی و بربادی کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے جس کی اطلاع ایک دہقان نے بطور فریادی شہنشاہ کو پہنچائی تھی اور شہنشاہ نے ان کی آبادی کا اس حد تک قلع و قمع کرنے کا حکم دیا تھا کہ ان کا ایک آدمی بھی بچ کر نہ جائے۔ اس کی فوری تعمیل کی گئی تھی۔ یہ وہ موقعہ تھا کہ شہنشاہ ایران انوشیروان خسرو اوّل ہندوستان کے سفر پر روانہ ہو کر جا رہا تھا کہ راستے ہی میں اسے بلوچوں کی اس لوٹ مار اور قتل و غارت کی اطلاع مل گئی تھی۔

شاہنامہ فردوسی کی رزمیہ منظوم داستان ۱۰۰۰ ہجری میں مکمل ہو گئی تھی۔ اس شاہکار کی بنیاد زیادہ تر خدا نامک اور تاج نامک جیسی مستند تاریخی تصنیفات پر رکھی گئی ہے، جو ساسانی شہنشاہان ایران کے دور میں لکھی گئی تھیں اور فردوسی کے زمانہ تک کہیں کہیں دستیاب تھیں۔ اس کے علاوہ فردوسی نے ان پختہ روایات پر بھی بھروسہ کر کے ان سے استفادہ کیا ہو گا جو اس کے زمانہ میں مشہور تھیں اور بہت ممکن ہے کہ مذکرہ بالا تاریخی کتب میں بھی بلوچوں کا ذکر کچھ اس ڈھنگ سے موجود ہو کہ جس طرح سے شاہنامہ کے فاضل مصنف نے ان کو نظم کا جامہ پہنا کر بیان کیا ہے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ فردوسی کے زمانہ میں بلوچ قبائل نے ایران کے ان علاقوں میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی جہاں وہ آج تک آباد چلے آتے ہیں۔ اسی زمانہ میں ایران

کے صوبہ کرمان میں ان کی موجودگی یقینی ہے اور فرق صرف یہ ہے کہ اس زمانہ میں وہ کوچ و بلوچ کے نام سے مشہور تھے۔ اس کی تصدیق نویں اور دسویں صدی کے تمام عرب مورخین کی تحریروں سے ہوتی ہے۔ غالباً فردوسی نے بلوچوں کے سلسلہ میں نہ صرف تاریخی مواد اور پختہ روایات سے کما حقہٗ فائدہ اٹھایا بلکہ وہ اپنے ذاتی مشاہدات کو بھی کام میں لایا ہوگا۔ اور یہ داستان پارینہ کچھ اس انداز سے نظم کی گئی کہ اس سے بلوچوں کی زندگی کی ایک ہو بہو جیتی جاگتی تصویر کھنچ گئی۔

ساتویں صدی میں جب عرب حملہ آور مکران اور جھالاوان میں داخل ہوئے تھے تو ان کی مڈھ بھیڑ ان علاقوں کے ان باشندوں سے ہوئی تھی جن کا تذکرہ انہوں نے زط اور ترک کے نام سے کیا ہے۔ اور بلا مبالغہ اس زمانہ میں ان علاقوں میں ابھی بلوچ وارد نہیں ہوئے تھے اور یہاں کلیتاً جٹ اور سفید ہون کا بول بالا تھا۔ جنہوں نے یہاں کے سابقہ اصلی باشندوں گدروزیائی اور اتھائی، اور ارابائی وغیرہ کو زیر کر کے ان علاقوں پر زبردستی اپنا تسلط جما لیا تھا۔ اس زمانہ کی تحریروں میں بلوچوں کا ذکر مفقود ہے اور نویں اور دسویں صدی کے عرب مورخین اور واقعہ نگاروں کی تحریروں میں بوص کے نام سے بلوچوں کا ذکر فقط ایران کے صوبہ کرمان کے تعلق سے ملتا ہے۔

ابو القاسم ابن حوقل کی اہم تصنیف کتاب المسالک والممالک ہے جو غالباً ۹۳۰ء میں مکمل ہوئی تھی۔ ابن حوقل نے بھی اپنی اس تصنیف

ہیں بلوچوں کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے: "کہ ان میں سے بہت سے لوگ اپنی عادات وخصائل میں عربوں سے ملتے جلتے ہیں اور مچھلی کھانے کے بڑے شائق ہیں اور ان میں سے کچھ لوگ کردوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔" وہ بلوچ کی وجہ تسمیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے:" بلوچی صحرائے کوفج میں بود و باش رکھتے ہیں اور کوفج فارسی زبان میں کوچی ہے اور یہ لوگ ان دونوں کو کوچی و بلوچی کہہ کر پکارتے ہیں:" ابن حوقل نے اپنی کتاب میں چ کے لئے دوسرے عرب محررین کے برعکس ج کا حرف استعمال کیا ہے اور اس کی مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات پوری طرح عیاں ہے کہ صحرائے کوفج میں بلوچوں کے ساتھ ایک دوسری آبادی بھی سکونت پذیر تھی۔ یہ صحرا کرمان میں واقع ہے اور اس زمانہ میں اس کے باشندے کوچ و بلوچ، یا کوچ و بلوچ کے نام سے مشہور تھے۔

تاریخ سیستان کے مستند جی۔ پی ٹیٹ نے اپنی تاریخ میں بلوچ کے عنوان کے تحت ایک ضمیمہ شامل کر لیا ہے اور اس ضمیمہ کا مصنف لکھتا ہے:۔ دسویں صدی عیسوی میں کرمان کی آبادی کرد، بلوچ، جٹ اور بعض دوسرے قبائل پر مشتمل تھی جو کوفص (کوفج) کہلاتے تھے جٹ عنصر جلد ہی اپنی منفرد حیثیت کھو بیٹھا اور وہ ایک طرف زراعت پیشہ طبقوں میں مدغم ہو گیا اور دوسری طرف بلوچ قبائل میں گھل مل کر ختم ہو گیا۔ کرد اور کوفص نے بہرکیف اپنی منفرد حیثیت برقرار رکھی وہ نہ صرف دوسروں کے ساتھ گھل مل جانے سے گریز کرتے تھے۔ بلکہ انہوں

نے زراعت پیشہ طبقوں سے بھی اپنے آپ کو علیحدہ رکھا۔ کرمان کے سلجوق حکمرانوں کی تاریخ مرتبہ محمد ابراہیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں قومیں یعنی کُرد اور کوفص کرمان کے علیحدہ علیحدہ علاقوں میں بود و باش رکھتی تھیں اور جیرفت کے جنوبی علاقوں اور کرانات کے اضلاع میں سکونت پذیر تھیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ یہ لوگ بڑے سرکش تھے۔ شمال میں خراسان اور مغرب میں فارس تک کے علاقے ان کی دست برد اور تاخت و تاراج سے محفوظ نہ تھے۔ یہ لوگ بڑی جنگی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی آزادی ڈائلمی خاندان کے حکمرانوں کے مقابلہ میں جنہوں نے کرمان کے صوبہ پر قبضہ کر رکھا تھا ایک بڑے عرصہ تک برقرار رکھی۔ ملک خورد سلجوق کرمان فتح کرنے کے بعد ہی ان لوگوں کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو سکا۔

اس کے بعد کرمان کے علاقہ گرم سیر میں سکونت رکھنے والے کوچ و بلوچ نکل آئے۔ راسوکان کا قلعہ ان کے قبضہ میں تھا اور جب ملک دینار غز نے یہ قلعہ فتح کر لیا تو یہ لوگ منوجان کی طرف کوچ کر گئے اس کے بعد کوچ و بلوچ قبیلوں کا ذکر ہُرمز کے حکمرانوں کے زمرے میں آتا ہے۔ اس زمانہ میں یہ لوگ ان علاقوں میں بود و باش رکھتے تھے جن کے اوپر ملک خورد سلجوق کے زمانہ میں کوفص قبیلوں کا قبضہ تھا۔"

مندرجہ بالا تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوفص اور بلوچ دو علیحدہ علیحدہ قومیں تھیں اور ان میں سے اول الذکر کوفص یا کوچ جیرفت

کے جنوبی علاقوں اور مکرانات کے اضلاع میں ساحل سمندر تک پھیلے ہوئے تھے جبکہ موخر الذکر بلوچ قبائل کرمان کے علاقہ گرم سیر میں بود و باش رکھتے تھے اور تاریخی حقیقت یہ ہے کہ ملک سلجوق خورد نے کرمان فتح کرنے کے بعد جیرفت کے جنوبی علاقوں اور ساحل سمندر تک مکرانات کے اضلاع پر حملہ کر کے ان کوفص قبیلوں کی طاقت کا خاتمہ کر دیا تھا جو قتل و غارت اور لوٹ مار کی بنا پر سلجوقی حکمرانوں کے لئے پریشانی کا باعث تھے. لیکن ان کی اچھی خاصی تعداد ان علاقوں میں ضرور بود و باش رکھتی تھی. بارھویں صدی عیسوی میں غز ترک شمال کی طرف سے بہ تعدادِ کثیر خراسان میں داخل ہو گئے. انہوں نے سلجوق اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور خراسان پر قابض ہو گئے لیکن خوارزم کے حکمران نے خراسان کو ان کی دست برد سے بچانے کے لئے قطائی کے خان سے امداد طلب کر لی اور ۱۱۶۷ء میں غز قبیلوں کو کرمان کی طرف دھکیل دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرمان کے بلوچ جو زیادہ تر گرم سیر میں آباد تھے. کرمان سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے اور یہاں سے نقل مکانی کرنے کے بعد ان علاقوں میں جا کر آباد ہوئے جہاں اس سے پہلے کوفص یا کوچ قبیلے سلجوق دورِ اقتدار میں آباد تھے. اس کے بعد بمرورِ زمانہ کوفص یا کوچ نے، جو بعد میں کوچ کے نام سے موسوم ہوا، اپنی منفرد حیثیت کھو دی اور بلوچ قومیت میں مدغم ہو گیا، اور اس کا نام بھی باقی نہ رہا۔ بلوچ قبائل بدستور ان علاقوں میں آباد رہیں جہاں وہ غز ترکوں کے دباؤ کے تحت کرمان کے ایرانی صوبہ سے نقل مکانی کر کے بہ تعداد کثیر وارد ہوئے تھے، جو

ان کی آمد سے پیشتر کو خص قبیلوں کا مسکن تھا۔ آج بھی سعودی عرب کے علاوہ مراکو اور لیبیا میں ایسے قبیلے موجود ہیں جو البلوشں کہلاتے ہیں خیال ہے کہ کرمان سے بلوچوں کی نقل مکانی مشرق اور مغرب دونوں طرف واقع ہوئی تھی۔

تاریخ سیستان کے ضمیمہ کا مصنف بلوچ کے عنوان کے تحت مزید لکھتا ہے "بلوچ قبیلوں کی قبائلی تنظیم بعینہ ان قبیلوں کی قبائلی تنظیم کی طرح ہے۔ جنہیں کلاسکی مصنفین نے اپنی تحریروں میں ساکا یا سیگتھائی قبیلوں کا نام دیا تھا۔ جو ایک زمانہ میں مغربی ایشیا کے ایک وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے تھے، حتیٰ کہ مشرقی یورپ میں بھی یہ لوگ پہنچ گئے تھے۔ خیال یہی ہے کہ یہ قبائل مشرقی ایرانی یا آریا نسل کے ان بیرونی طبقوں سے تعلق رکھتے تھے جن کا تہذیبی معیار ابھی کچھ زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا اور بلاشبہ موجودہ زمانہ کے بلوچ قبائل اسی قدیم قوم سے نسلی رابطہ رکھتے ہوں گے۔"

پہلی صدی ہجری کے نصف ثانی میں کربلا کا سانحہ جانکاہ پیش آیا اور اس کے نتیجہ میں کوفہ کے لوگ جنہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو یزید کے اقتدار کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب دی تھی اور واقعہ کربلا کے وقت ان کی اعانت کرنے سے گریز کیا تھا اس واقعہ کے تیسرے سال کربلا کے مقام پر جمع ہو گئے اور وہاں سے دمشق کی طرف کوچ کیا۔ اس اثنا میں خود یزید اور اس کا بیٹا فوت ہو چکے تھے اور خلافت کی باگ ڈور مروان بن حکم کے ہاتھ میں تھی۔ کوفیوں نے مروان کے ہاتھ سے شکست کھائی۔ اس کے

بعد المختار نے ابراہیم بن الاشتر کی اعانت سے جو امام علیہ السلام کا حامی
تھا، خاندان بنی امیہ کے خلفا کے خلاف اپنی جد وجہد جاری رکھی لیکن کوفے
کے قریب شکست کھائی۔ ان شکستوں کے نتیجہ میں بہت سے کوفی اور شامی
عرب و عراق سے بھاگ نکلے اور کرمان کا رُخ کیا جو خوارج کا ہیڈ کوارٹر یا صدر
مقام اور مرکز تھا۔ اسی طرح نجد کے بنی الوھلی بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے
جو امیر معاویہ اور حضرت علیؓ کی کشمکش کے دوران حضرت علیؓ کی فوج سے
جدا ہو گئے تھے۔ بنی آزاد بھی انہی ایام میں کرمان اور ہرمز کے درمیان آباد
ہو گئے تھے اور اسی زمانہ میں کرمان میں بلوچ بھی کثیر تعداد میں سکونت پذیر
تھے۔ گمان ہے کہ اس اختلاط کی وجہ سے عربوں کا ایک موثر عنصر بلوچ
آبادی میں سرایت کر کے ان میں مدغم ہو گیا ہوگا۔ عرب عنصر کی شمولیت
اور اسلام سے عقیدت مندی کی بنا پر بلوچوں میں عربی النسل ہونے کا
خیال پیدا ہو گیا ہوگا۔ جو ان کی رزمیہ داستانوں سے مترشح ہے۔ مزید براں
جیسا کہ اس سے پیشتر اشارہ کیا جا چکا ہے، کرمان کا صوبہ اس زمانہ میں خوارج
کا مرکز تھا۔ خوارجی بنی امیہ اور بنی عباس کے دورِ خلافت و حکومت میں کرمان
اور مکران کے ساحلی علاقوں میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ بلوچوں میں بھی
غالباً اس تحریک کو مقبولیت حاصل ہو گئی ہو گی، کم از کم وہ عنصر اس سے متاثر
تھا جو بلوچ قومیت کے ساتھ مدغم ہونے لگا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے
کہ اس تحریک کا جس کی بنیاد قرآنی اساسات پر رکھی ہوئی تھی سب سے بڑا
رہنما امیر حمزہ نامی ایک عرب نژاد شخص تھا۔ جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس

نے افغانی علاقہ کی وادی زرمت میں گردیز کے قصبہ کی بنیاد بھی رکھی تھی خارجیوں کے اس رہنما کی طاقت کا یہ حال تھا کہ خلفائے بغداد کے زمانے میں فقط طاقت کے بل بوتے پر مشرقی ایران کے اضلاع میں نظم ونسق قائم رکھا ہوا تھا۔ بلوچوں کی رزمیہ شاعری پندرھویں صدی عیسوی کی پیداوار ہے اور اس زمانہ میں غالباً انہی خارجیوں کے رہنما امیر حمزہ کی ایک دھندلی سی یاد بلوچ شعراء اور دوسرے لوگوں کے ذہنوں میں موجود تھی اور انہوں نے خوارجی امیر حمزہ کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا فرض کرکے بلوچوں کا مورثِ اعلیٰ قرار دیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا ایک پری کے ساتھ نکاح کرنے کا اسطوری قصہ بھی گھڑ لیا اور یہ اسی قسم کے روایتی تصورات تھے جن کی وجہ سے بلوچوں میں عربی النسل ہونے کا نظریہ مقبول ہوگیا جس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔

بہرکیف اس مسئلہ کو حل کرنے کا سہرا نسلیات وبشریات کے ممتاز عالم وماہر موسیو اجالوی کے سر ہے جو قومیت کے لحاظ سے فرانسیسی تھے اور جن کا شمار اس شعبہ کے جید اہلِ قلم حضرات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ڈیرہ اسماعیل خان اور ڈیرہ غازی خان کے اضلاع میں رہنے والے ساٹھ ایسے چیدہ چیدہ افراد کو چن لیا جو کلیتاً رند بلوچ طائفوں اور قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کی جسمانی ساخت اور کاسہ سر یا کھوپڑی کا مطالعہ کرکے ان کی جدید سائنسی طریقے سے پیمائش کی اور اسی عمل کو منتخب اور نمائندہ ساٹھ تاجکوں پر دہرایا جو ایرانی قومیت کے فرد تصور کیے جاتے ہیں اور ان کے مشرقی ایرانی اور آریا

نسل سے تعلق رکھنے میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔ اس سائنسی تجزیہ اور سیفالک پیمائشوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ دونوں گروہوں کے معاملہ میں سب سے اونچا انڈکس (پیمانہ) ۹۶ یا ۹۵ کا غیر معمولی عدد تھا۔ اور دونوں حالتوں میں نارمل انڈکس ۸۰٫۶ برآمد ہوا۔ ان سیفالک پیمائشوں اور سائنسی تجزیوں سے موسیو اجفالوی نے یہ رپورٹ مرتب کی کہ جہاں تک کھوپڑی کا تعلق ہے بلوچ یقینی طور پر بریکی سفالک ایرانی گروہ سے تعلق رکھتے رہے ہیں۔ اور ان کا ڈولیچو سفالک عرب گروہ کے ساتھ کوئی خونی اور نسلی رشتہ نہیں اور اس طرح یہ بات پوری طرح ثابت ہوگئی کہ بلوچ بہ لحاظ نسل آریوں کے ایرانی یا مشرقی ایرانی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے عربی النسل ہونے کا نظریہ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے اور بلوچی زبان کا شمار بھی مشرقی ایرانی زبانوں کے گروہ میں ہوتا ہے۔

(۲) براہوئی

تقریباً تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ آریوں کے حملوں سے پیشتر شمالی ہندوستان کی آبادی دراوڑوں پر مشتمل تھی جو ہندوستان کے طول و عرض میں سکونت پذیر تھے۔ آریوں نے شمالی ہندوستان میں بہ تعداد کثیر وارد ہونے کے بعد اس دراوڑ آبادی کو جنوبی ہندوستان کی طرف دھکیل دیا جہاں اب بھی ان کی گنجان آبادی موجود ہے اور جو مختلف دراوڑی زبانیں بولتے ہیں جن میں تامل، تلگو، مالی وغیرہ زبانیں اور بولیاں شامل ہیں جو اپنی اصل اور ارتقا میں آریائی زبانوں سے قطعاً مختلف ہیں۔

اور یہ تمام مؤرخین اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں براہوئی زبان کو پیش کرتے ہیں جو بلاشبہ اپنی اصل اور ارتقاء میں دراوڑی زبانوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور بمرور زمانہ اس نے اردگرد کی آریائی زبانوں سے بہت سے الفاظ مستعار لیے ہیں اور اپنے ارتقاء میں ان زبانوں سے کچھ نہ کچھ متاثر ضرور ہوئی ہے ان کا خیال ہے کہ جب شمالی ہندوستان سے یہاں کی دراوڑ آبادی جنوبی ہندوستان کی طرف منتقل ہوگئی تو ان کی ایک چھوٹی سی آبادی وسطی بلوچستان کے دشوارگذار کوہستانی علاقے میں رہ گئی اور اس دشوارگذار علاقے کی بنا پر آریوں کے دست برد سے بچ گئی۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ براہوئی قبائل ان قدیم دراوڑوں کی اولاد ہیں جو آریوں کی آمد سے پیشتر شمالی ہندوستان میں بلوچستان کی حدود تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ دراوڑ سے مراد زیادہ تر ایک ایسی آبادی ہے جو ایک دراوڑی زبان بولتی ہو۔ اس سے کسی نسلی گروہ کا اظہار مراد نہیں ہے۔ اکثر ماہرین بشریات و لسانیات اس سے یہی مراد لیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان قدیم کی دراوڑ آبادی آریوں سے بلحاظ نسل قطعاً ایک مختلف اصلیت کی حامل تھی اور ان کی جسمانی ساخت میں بڑا فرق تھا۔ لیکن بلوچستان کے قدیم باشندوں اور شمالی ہندوستان کی قدیم آبادی کے درمیان ان کی جسمانی ساخت میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں تھا اور وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے اس کی تصدیق ان ایک دو کاسہ سر سے ہوئی ہے جو جنوبی بلوچستان میں نال کے قدیم مدفن سے دریافت ہوئے تھے اور ان کی کھوپڑی کی ساخت ان لاشوں

کی کھوپڑیوں سے بڑی مشابہت رکھتی تھی جو عراق کے ایک قدیم مدفن سے کش کے مقام پر برآمد کی گئی تھیں گویا آریوں کے حملوں سے پیشتر ہندوستان سے لے کر عراق تک ایک ہی نسل کے لوگ آباد تھے اور یہ سب کے سب آبادیاں ڈولیچوسفالک گروہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ ہندوستان میں کچھ دوسرے نسلی گروہ بھی پائے جاتے تھے۔

پنجاب کی قدیم تاریخوں میں ہمیں ایک ایسی قوم کا ذکر ملتا ہے جو دراہو یا دراہیہ کے نام سے موسوم تھی اس قسم کے لوگوں نے اقتدار کی جنگ میں راجپوتوں کے خلاف کئی ایک معرکوں میں حصہ لیا تھا اور بدقسمتی سے ان کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ اس کے بعد یہ لوگ مزید مشرق کی طرف دھکیل دیئے گئے تھے اور بمرور زمانہ وہ دوسری آبادیوں میں کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ ان کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ ہندوستان میں راجپوتوں کا عہد اقتدار کچھ زیادہ دُور کے زمانہ سے تعلق نہیں رکھتا، عہدِ وسطیٰ ہی میں یہ لوگ ہندوستان اور خصوصاً پنجاب میں برسرِ اقتدار آئے تھے۔

اگرچہ حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے لیکن اس بات کا امکان موجود ہے کہ ہندوستان میں گپتا خاندان کے عہد حکومت میں پنجاب کے اندر دراہو یا دراہیہ قوم کے لوگ ایک سیاسی قوت کی حیثیت رکھتے تھے اور شاید یہاں ان کی اچھی خاصی تعداد آباد تھی۔

سکندر اعظم مقدونی نے جب ۳۳۰ء قبل مسیح میں ایران کے شہنشاہ داریوش اول کو شکست فاش دی تو بلوچستان پر بھی یونانیوں کا قبضہ ہو گیا اس

کی وفات کے بعد ۳۲۷ء قبل مسیح میں اس کے ایشائی مقبوضات کا وارث نکوتر سیلوکس بنا جو اس کا ایک بڑا فوجی جرنیل تھا۔ سیلوکس نے ہندوستان پر حملہ کرنے کی غرض سے دریائے سندھ کو عبور کر لیا لیکن ہندوستان کے نوجوان بادشاہ چندر گپتا موریا کے ہاتھوں ۳۱۱ء قبل مسیح میں شکست کھائی اور ۳۰۵ء قبل مسیح میں آریانا کا ایک بڑا حصہ اس کے قبضہ میں آگیا جس میں تقریباً تمام بلوچستان شامل تھا۔ اس خاندان کا اقتدار تقریباً ڈیڑھ سو سال تک بلوچستان پر قائم رہا۔ غالباً اسی خاندان کے دورِ اقتدار میں دراہر قوم کے لوگوں نے بلوچستان کے اندر ایک مناسب تعداد میں وارد ہو کر یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ براہوئی زبان کو بھی بمرور زمانہ کچھ نہ کچھ فروغ حاصل ہو گیا

ہندوستان کی تاریخ میں ہمیں راجپوتوں کے تین گروہوں کا ذکر ملتا ہے (۱) سورج بنسی (۲) چندر بنسی (۳) اگنی کولا۔ اول الذکر دو گروہ اپنے آپ کو سورج دیوتا اور چاند دیوتا کی اولاد ظاہر کرتے تھے۔ ویسے عام خیال یہ ہے کہ راجپوتوں کا نسلی تعلق سفید ہون سے تھا۔ تیسرے گروہ کا دعویٰ تھا کہ وہ آگ دیوتا کی اولاد میں اور ان کی پیدائش اگنی دیوتا سے ہوئی ہے۔

سمتھ کا بیان ہے کہ راجپوت اقتدار کے ابتدائی دور میں دراوڑ زبان بولنے والے قبیلوں کی ایک کثیر تعداد راجپوتانہ میں وارد ہوئی تھی اور ان میں بلا کی جنگی صلاحیت موجود تھی۔ راجپوتوں کا اپنا تعلق ہندوؤں میں ذات پات کی بنا پر کھتریوں سے تھا اور وہ کھتری سمجھے جاتے تھے۔ متذکرہ بالا دراوڑ زبان بولنے والے قبیلوں نے بھی ہندو مذہب قبول کر لیا تھا۔ اس

موقعہ پر برہمنوں نے کوہ ابو کے دامن میں ایک بہت بڑی آگ روشن کر دی اور نہایت پیچیدہ مذہبی رسومات ادا کر کے ان نو وارد قبیلوں کو بھی کھتری بنا لیا اور انہوں نے راجپوت قوم میں ضم ہو کر اپنی پیدائش کو اگنی دیوتا سے منسوب کر لیا۔ یہ بھریا بر کہلاتے تھے۔ گمان ہے کہ یہ دراہہ ہی تھے جو رفتہ رفتہ بھر کہلانے لگے اور راجپوت قوم میں ضم ہونے کی وجہ سے ان کی اپنی منفرد حیثیت باقی نہ رہی اور وہ بمرور زمانہ راجپوت ہی سمجھے جانے لگے۔ انہوں نے بھین مال میں جو کوہ ابو کے نزدیک واقع تھا چھٹی صدی عیسوی میں اپنی حکومت قائم کر لی اور ان کے قائد یا سردار نے راجہ کا لقب اختیار کر لیا۔

اسی دراہر یا دراہو قوم کی ایک چھوٹی سی آبادی نے جو بلوچستان میں آباد ہو گئی تھی۔ ایک عرصہ دراز کے بعد یہاں اپنا اقتدار قائم کر لیا اور وہ براہوئی کہلانے لگے۔ اسی زمانہ میں براہوئی زبان کو بھی کچھ نہ کچھ وسعت حاصل ہو گئی کیونکہ بعض بلوچ افغان اور دوسرے قبیلوں نے بھی اپنی زبان چھوڑ کر براہوئی زبان اختیار کر لی جو اسی دراہو کی مناسبت سے دراہوئی یا براہوئی کہلاتی ہے۔ مشرقی زبانوں میں د کا ب سے بدل جانا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔

بلوچستان میں روایتی طور پر فقط میروارڑی اور اس کی شاخیں براہوئی قبیلے خیال کی جاتی ہیں۔ ان میں قنبرانی، احمد زئی، سالانی، قلندرانی اور گرگناڑی شامل ہیں۔ خان کا اپنا خاندان احمد زئی کہلاتا ہے اور یہ سب کے سب خان کا اپنا

خاندان شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ سراوان اور جھالاوان کے ان تمام قبیلوں کی اصلیت جو براہوئی زبان بولتے ہیں۔ بلوچ، افغان، منگول اور جٹ ہے۔ مثلاً سراوان میں محمد شئی، لہڑی اور بنگلزئی قبیلوں کی اصلیت بلوچ ہے لیکن وہ براہوئی زبان بولتے ہیں اور براہوئی قبیلے خیال کئے جاتے ہیں جھالاوان اور نوشکی کے مینگل بلحاظ نسل سفید ہون یعنی منگول ہیں۔ اسی طرح زرک زئی اور رئیسانی قبیلوں کی اصلیت افغان ہے۔ لیکن وہ براہوئی زبان بولتے ہیں اور براہوئی سمجھے جاتے ہیں اس پر طرہ یہ کہ میروانی سب سے بڑا براہوئی قبیلہ ہے لیکن اس قبیلے کی اپنی زبان بلوچی ہے اور وہ براہوئی زبان کو کردگالی کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان تصریحات سے یہ بات واضح ہے کہ براہوئی بلحاظ نسل دراوڑ یا دراہوہیں اور انہوں نے بمرور زمانہ بعض دوسرے عناصر مثلاً منگول، بلوچ، افغان اور جٹ وغیرہ کو اپنے اندر ضم کر لیا ہے۔

مسٹر گریرسن اور برے دونوں نے براہوئی زبان کا پوری طرح جائزہ لیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ براہوئی زبان ارد گرد کی آریائی زبانوں سے کلیتاً مختلف ہے اور اس کا تعلق ان دراوڑی زبانوں سے ہے جو ابھی تک جنوبی ہندوستان میں بولی جاتی ہیں۔ مثلاً تامل، تلگو اور ملیالم وغیرہ بہرحال میں براہوئی زبان پر دہواری اور جھالاوان میں سندھی کا اثر نمایاں ہے۔

(۳) جٹ

موجودہ زمانے میں جٹ اور گجر جو جگدال اور جدگال بھی کہلاتے ہیں اور جاموٹ کے نام سے بھی موسوم ہیں۔ بلوچستان کے لسبیلہ اور کچھی کے

اضلاع میں بود و باش رکھتے ہیں. ضلع کچھی میں تحصیل بھاگ ان کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اس موضوع پر فاضل مؤرخ جی پی ٹیٹ نے تاریخ سیستان میں ایک ضمیمہ شامل کر لیا ہے جس سے جٹ آبادی کی اصلیت پر روشنی پڑتی ہے۔" ان سب لوگوں میں جنہوں نے اس مسئلہ کا بغور مطالعہ کیا ہے اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ جٹ اور گجروں کے اباؤ اجداد ایک خانہ بدوش گروہ سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے دریائے سیحون کے پار کے علاقے سے ہجرت کی اور غالباً یہ لوگ سفید ہون کے ساتھ قریبی واسطہ اور کچھ نہ کچھ خونی رشتہ رکھتے تھے جس کی نوعیت غیر واضح ہے۔ ان کے آباؤ اجداد کے وطن کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے وسط ایشیائی اور سیگھتائی اصلیت کا نظریہ سب سے پہلے کرنل ٹاڈ نے پیش کیا تھا۔ وہ ان کو کلاسیکی مصنفین کا سگیتھائی جٹو خیال کرتا ہے۔ حال ہی میں اس نظریہ نے کسی قدر مقبولیت بھی حاصل کر لی ہے۔ اگرچہ اس نظریہ کی تائید میں کوئی ثبوت بہم پہنچانا ایک دشوار مسئلہ ہے لیکن اس کے باوجود یہ امر قابل ذکر ہے۔ کہ سیحون پار کے علاقہ کا ایک حصہ جو سر دریا کے نام سے موسوم ہے چودھویں صدی عیسوی تک جٹہ کے نام سے موسوم تھا اس علاقے کو امیر تیمور لنگ کی فوجوں نے تاخت و تاراج کیا تھا جبکہ اس حملہ کے دوران دو غلات کا سرکردہ اس کا سب سے بڑا مخالف اور مدمقابل تھا اس نے گجرات کے میدان میں تیمور کی فوجوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا تھا لیکن شکست کھائی تھی، دریائے سیحون کے پار کے علاقوں کا محل وقوع بھی وہی ہے۔ جس کو کلاسیکی مصنفین نے سگیتھائی مسہ جٹو کا نام

دیا ہے۔

سرایچ رسلے کے سوا تمام مبصرین اس بات پر متفق ہیں کہ گجر اور جٹ ایک بیرونی گروہ کی اولاد ہیں۔ گجروں کی عجیب عادات و خصائل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد ایک خانہ بدوش آبادی سے تعلق رکھتے تھے یہ خیال بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ گجر ایک ایسی خانہ بدوش قوم ہے جس کا اصلی وطن سٹیپ کے میدان ہیں اور جو ہندوستان میں چھٹی صدی عیسوی میں داخل ہوئی تھی اور ہندوستان میں ان کی ہجرت کی وجہ غالباً (باختر میں ایرانیوں اور ترکستان کے ترکوں کے ہاتھوں جنہوں نے اسی مقصد کے لئے باہم اتحاد کر لیا تھا) سفید ہون کی شکست تھی۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ جٹ قوم کے لوگ سیستان کی بھی بود و باش رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ ہندوستان کے گجر اور سیستان کے گاؤدار آبادی کے درمیان باہمی تعلق کا جو امکان ہے وہ جٹ اور گجروں کو وسط ایشیا کے جبٹ نامی علاقہ کے ساتھ متعلق رکھنے کے سلسلے میں شواہد و اثبات کے درمیان ایک دلچسپ اور مفید کڑی ہے۔ گرشک کے شمال اور ہلمند کے مغربی علاقوں میں جو زمیندار کہلاتے ہیں گجر سکونت رکھتے ہیں۔ افغانستان کے قدیم مشرقی علاقوں میں جو وادیٔ سندھ میں واقع ہیں اور جو اس وقت پاکستان کا ایک حصہ ہیں گجر پائے جاتے ہیں۔ جٹ اس علاقہ میں بکثرت آباد ہیں جو بلوچستان کہلاتا ہے وادی کیچ میں وہ کسی زمانہ میں بڑے طاقتور تھے۔ ضلع کیچ کے علاوہ باہو اور دشتیاری کے اضلاع میں جو خلیج فارس کے ساتھ ساتھ واقع ہیں

اور جہاں بلوچستان اور ایران کی سرحد ملتی ہے۔ وہ بدستور سکونت پذیر ہیں۔ ان قبیلوں میں جو اپنے آپ کو بلوچ اور براہوئی کہتے ہیں۔ جٹ عنصر بدرجہ اتم موجود ہے اس بات کا امکان بھی ہے کہ جنوبی افغانستان کے بہت سے افغان قبیلوں کی اصلیت بھی جٹ ہے۔ ضلع کیچ میں جٹ قبیلوں کی بڑی تعداد میں وارد ہونے کی وجہ سے اس علاقے کے قدیم باشندے جو اوڑ کہلاتے تھے۔ مشرق کی جانب سندھ میں دھکیل دیئے گئے ہونگے یا جٹ کے ساتھ شامل ہو کر سندھ کی طرف نقل مکانی کر گئے ہوں گے۔

سترھویں صدی عیسوی تک قلات کا دارالخلافہ قلات نیچارہ تھا نیچارہ موجودہ وقت میں جھالاوان کا ایک بڑا قصبہ ہے جو چار سو مکانات پر مشتمل ہے اور کوہ رنغ کے جنوبی دامن میں واقع ہے۔ بلوچستان کے دوسرے قصبوں کے برعکس یہاں کے تمام مکانات دو منزلہ ہیں۔ کوہ رنغ سلسلہ کوہ براہوئی کی ایک شاخ ہے جس کی بلندی نو ہزار فٹ کے لگ بھگ ہے جب جٹوں نے اس علاقہ پر قبضہ کیا تو نیچارہ کا سردار بامر نامی ایک جٹ تھا اور یہاں کے باشندے بھی جٹ تھے۔ اسی جٹ آبادی سے اس علاقے کے موجودہ باشندوں نے وہ اراضیات بزورِ شمشیر حاصل کر لیں جن پر ان کا بدستور قبضہ ہے۔

نیچاری قبیلہ روایات کے بموجب الکوزئی افغان ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ یا سرکردہ الکو نے اپنے مویشیوں کے ساتھ بامر جٹ کی زندگی میں نقل مکانی کر کے نیچارہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ الکو کی قبر ابھی تک وہاں محفوظ ہے۔

اس قسم کے شواہد موجود ہیں کہ پندرھویں صدی تک جٹ لسبیلہ مکران خاران اور جھالاوان میں بہ تعداد کثیر آباد تھے اور انہیں سیاسی قوت حاصل تھی۔ اسی زمانہ میں ان علاقوں اور خصوصاً خاران میں خشک سالی کا ایک ایسا دور شروع ہوا کہ اس کی وجہ سے چراگاہوں کا دامن بتدریج تنگ ہو گیا اور انہی چراگاہوں پر براہوئی اور جٹ قبیلوں میں خونریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں کی جٹ آبادی نے شکست کھائی اور وہ منتشر ہو گئی۔ اس کی ایک بڑی تعداد سندھ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ان میں سے جو لوگ ٹھہرے رہے، وہ رفتہ رفتہ بلوچ اور براہوئی قبیلوں میں مدغم ہو گئے انہوں نے بھی بلوچی یا براہوئی زبان اختیار کر لی۔

سسی پنوں کی داستانِ عشق کے مطابق، جو غالباً عرب حملوں کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ پنوں ایک جٹ خاندان کا فرد تھا۔ وہ کیچ کے حاکم، جام کا بیٹا تھا۔ تجارت کے سلسلے میں سندھ میں آمد و رفت کے دوران سسی سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اس کے بعد اس پر جو مصائب و آلام گزرے، منظوم داستان میں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیچ میں پنو کی میری قلات پنو کے نام سے موسوم ہے اس کے کھنڈر اب بھی جس علاقے میں پائے جاتے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ یہی مقام اس علاقے کا صدر مقام تھا جو پنو کے باپ جام ہاری کی قیام گاہ ہوا کرتی تھی۔

(۴) پشتون

افغان پشتون، پشتانہ اور پٹھان چند ایسے نام ہیں جو فقط ایک ہی

قوم کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اس قوم کے لوگ افغانستان کے بعض اضلاع کے علاوہ پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبہ اور شمالی بلوچستان میں بود و باش رکھتے ہیں۔

تاریخی شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں پشتون قبائل افغانستان کے اس علاقے میں بود و باش رکھتے تھے جس کو کلاسیکی مصنفین نے پروپامیساد کا نام دیا تھا۔ قدیم زمانہ میں یہ عظیم قوم پرساتایہ کے نام سے موسوم تھی۔ پرانے زمانہ میں وہ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں بھی سکونت پذیر تھے جو اس زمانے میں گندارا کہلاتا تھا۔ اس علاقہ کا صدر مقام پرساپورا تھا جو مرور زمانہ بدل کر پشاور ہوگیا۔ پشاور آج بھی پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبہ کا صوبائی دارالحکومت ہے۔ اس کا شمار پاکستان کے قدیم شہروں میں ہوتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ظہورِ اسلام سے قبل وادی کابل اور پشاور میں ہندومت اور بدھ مت کو بڑا فروغ حاصل ہوگیا تھا۔ ان علاقوں میں متذکرہ بالا مذاہب کی وجہ سے مجسمہ سازی کے فن کو بڑی ترقی حاصل ہوئی جس کے نمونے وادی کابل اور وادی پشاور میں بڑی تعداد میں دریافت ہوئے ہیں۔ گندارا آرٹ آج بھی ماہرین کی توجہ کا مرکز ہے۔

ریورٹی کا خیال ہے کہ ابتدا میں افغانوں کی آبادی زیادہ تر اس علاقے میں پھیلی ہوئی تھی جو پشت کے نام سے موسوم ہے اور افغان اسے روہ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ عصرِ حاضر کے انکشافات سے قبل پشتون یا افغان قوم کے متعلق عام روایت یہ تھی کہ اس کی اصلیت بنی اسرائیل ہے اور یہ

بخت نصر کے عہدِ حکومت میں فلسطین سے ہجرت کر کے افغانستان کے صوبہ غوریاں میں آباد ہو گئے تھے جو ایک کوہستانی خطہ ہے۔ اکثر افغان مؤرخین عبدالرشید بن قیس کو افغانوں کا مورثِ اعلیٰ قرار دیتے تھے جس کی اولاد پھیل کر مختلف قبیلوں میں تقسیم ہو گئی اور یہ قبیلے اس کے بیٹوں کے ناموں سے مشہور ہو گئے۔ ان کا خیال ہے کہ عبدالرشید بن قیس پیغمبرِ اسلام کے عہد مبارک میں بقیدِ حیات تھا۔ تاریخ جہاں کشائے افغانی میں یہ نظریات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

عصرِ حاضر کے مؤرخ مندرجہ بالا نظریات سے متفق نہیں ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ افغان یا پشتون قوم کا تعلق آریا کے مشرقی ایرانی خاندان سے ہے۔ اس قوم کی زبان پشتو ہے جو قدیم ساکاؤں کی بہترین نمائندہ ہے۔ ساکا زبان کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں فارسی زبان کے دکا حرف ل سے بدل جاتا تھا۔ فارسی اور پشتو زبان کے مندرجہ ذیل مشترکہ الفاظ سے اس معاملے پر پوری روشنی پڑتی ہے۔

فارسی	اردو	پشتو
پدر	باپ	پلار
دیدن	دیکھنا	لدن
ده	دس	لس
دارم	رکھتا ہوں	لرم
دختر	لڑکی	لور

دست	ہاتھ	لاس
دیوانہ	پاگل	لیونے
دُم	دُم	لم

دھوار

ممتاز مؤرخ جی پی ٹیٹ لکھتا ہے :-

دہوار قلات اور اس کے مضافات میں بودو باش رکھتے ہیں. اور وادی مستونگ میں بھی پائے جاتے ہیں جو وسیع اراضیات کے مالک ہیں. وہ غالباً اس قدیم قوم کے پسماندگان میں سے ہیں. جن کی قدیم زمانہ میں ایک کثیر آبادی سطح مرتفع قلات پر قابض تھی. قدیم بستیوں، کاریزوں اور ڈھلوان کھیتوں کے لامحدود اور لاتناہی اور وسیع آثار سے جو پہاڑوں کے دامن تک ہر سمت میں پھیلے ہوئے ہیں. ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں ایک گنجان آبادی کی ضروریات کو پوری کرنے کے لئے پہاڑوں کے دامن کے علاوہ تنگ گھاٹیوں تک کو زیر کاشت لانے کی ضرورت تھی.

ہندوستان کی مردم شماری ۱۹۰۱ء کے مجلہ میں آر ہیوز بلر لکھتا ہے دہوار محنت کش اور پُرامن لوگ ہیں. ان کا نام اس حقیقت سے ماخوذ ہے کہ وہ دیہات یا کچی دیواروں کے مکانات کے مجموعہ میں رہتے سہتے ہیں وہ براہوئیوں کی طرح ہر سال میدانی علاقوں کی طرف نقل مکانی کر کے نہیں جاتے ہیں. اگرچہ وہ خان قلات کو فوجی خدمت کے لئے کوئی مقررہ لشکر مہیا نہیں کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ براہوئی خان کی بالادستی کو

بلا حیل وحجت تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی زبان فارسی ہے اور روایت یہی ہے کہ براہوئی خان نے کلیتاً دہواروں کی اعانت سے قلات کا تخت حاصل کیا تھا بنیادی طور پر ان کی اصلیت تاجک ہے۔ تاجک بدستور افغانستان کے شمالی اور مغربی علاقوں میں بود و باش رکھتے ہیں۔ عربوں نے اپنے ابتدائی حملوں میں تاجک کو کھلے میدانی علاقوں سے نکال باہر کیا تھا۔ لیکن سلسلہ کوہ سلیمان کے افغانوں کی مانند انہوں نے زیادہ دشوار گزار علاقوں میں اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھی۔ اس کے بعد انہوں نے دوبارہ میدانی علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن افغانوں کی کثرتِ تعداد کی تاب نہ لاکر دوبارہ پھیل جانے پر مجبور ہو گئے

ماضی میں دہواروں نے بہت سے افغان طائفوں کو جن میں تنہ بار کے ارد گرد کے علی زئی اور اسی طرح یوسف زئی طائفوں کو جو بعینہٖ انہی ناموں سے پشاور شہر کے شمال میں ٹڑانگ کی بستی میں سکونت رکھتے ہیں اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے کچھ اچکزئی احمدونی اور کئی دوسرے طائفوں کو بھی اپنے اندر مدغم کر لیا ہے۔ جبکہ کابلی زئی، مغل زئی، سیوازئی، ہوتی زئی، سولائی اور سارنگ زئی اپنی اصلیت پر خود روشنی ڈالتے ہیں۔"

گزٹیئر آف بلوچستان میں ساؤ دے لکھتا ہے کہ "دہوار بلوچستان کا تاجک عنصر ہے لیکن مسٹر لیچ کا بیان ہے کہ دہوار بلحاظ نسل ایک علیحدہ قوم نہیں ہیں بلکہ وہ قلات کے حاکمان ماسبق کی اولاد ہیں۔ جس نے بعد میں

اپنے رتبے کو فراموش کر کے زراعت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ دوسری طرف مسٹر بیتھم ان کی اصلیت کو یقینی طور پر تاجک تبلاتا ہے اور وہ ان ناموں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جن ناموں سے اس عظیم قوم کے لوگ مختلف ممالک میں رہتے ہیں مثلاً ایران میں تاجک بخارا میں سارت افغانستان میں دہگان اور بلوچستان میں دہوار"۔

تاریخ افغانستان میں مسٹر جی پی ٹیٹ لکھتا ہے:۔

"چاہے آپ ان کو دہوار کے نام سے پکاریں یا دہگان کا لقب دے دیں ان کی اصلیت تاجک ہے اور قوی امکان ہے کہ ان کا تعلق اس اصل قدیم مشرقی ایرانی یا آریا نسل سے ہے۔ جن کے درمیان زرتشت نے اوّل اوّل مذہب اوستا کی اشاعت کی تھی اور جن کے درمیان سکندر کے یونانی آباد ہو گئے تھے اور جن کو عرب فرزندانِ توحید نے قرآن یا خراج اور دونوں سے انکار کی صورت میں تلوار سے فیصلہ کی دعوت دی تھی"۔

پاٹنجر اپنے سفرنامہ میں دہواروں کے متعلق ایک طویل بحث کے بعد لکھتا ہے کہ "اگرچہ دہوار خان قلات کو جبکہ وہ لڑائی کے لئے جاتا ہے کوئی لشکر مہیا کرنے کے پابند نہیں ہیں لیکن شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ خان کی بیرونی مہمات شاذونادر دہواروں سے خالی رہی ہوں۔ ان لوگوں کی وفاداری خان کے نزدیک اس حد تک مسلم ہے کہ ان کا ایک دستہ دائمی طور پر خان کے محل میں متعین رہتا ہے اور قلات شہر کے دروازوں پر بھی

انہی کا پہرہ رہتا ہے۔"

جی پی ٹیٹ تاریخ سیستان میں لکھتا ہے۔

وادی دیزک میں جو ایران کے مشہور صوبہ کرمان کے بمپور نامی ضلع میں واقع ہے ایک بڑی آبادی رہتی ہے جو دہوار کہلاتی ہے۔ یوں تو یہ لوگ بلوچ سمجھے جاتے ہیں اور بلوچی زبان بولتے ہیں لیکن یہ لوگ ایک دوسری آبادی کے درمیان رہتے ہیں جس میں رند کا عنصر غالب ہے لیکن ان دونوں آبادیوں میں جو فرق ہے وہ صاف عیاں ہے۔ دہوار کچی مٹی کے بنے ہوئے مکانات کے مجموعہ میں رہتے ہیں۔ جو سرسبز اور شاداب کھیتوں کے درمیان واقع ہیں۔ اس کے برعکس ان کے خانہ بدوش ہمسائے علیحدہ علیحدہ یا گروہ کی صورت میں بکری کے بالوں سے تیار کئے ہوئے خیموں یا جھگیوں میں کھجور کے جھنڈ یا کھیتوں کی حدود سے باہر پہاڑوں کے دامن میں رہتے ہیں۔ ان دونوں آبادیوں کی جسمانی کیفیت اور شکل وصورت میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ قادر بخش جو دہواروں کا سرکردہ تھا۔ ۱۸۸۴ء میں دیسی بندوقوں سے مسلح ایک بڑا لشکر جمع کرنے میں آسانی سے کامیاب ہوگیا۔ لیکن بڈھا دلاور خان جو ایک بلوچ سردار تھا۔ ۱۸۹۰ء میں دہوار سرکردہ کی اعانت کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

دیزک کے دہواروں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس تاجک آبادی کی نسل سے ہیں جو کسی زمانہ میں خاران کے اندر ماشکیل کے جنوبی سمت میں دیغوار کے علاقے میں بودوباش رکھتی تھی۔ لیکن ایک طویل قحط کی وجہ سے جس کے

باعث پانی کے چشمے اور کاریزات خشک ہو گئیں وہ نقل مکانی کر کے مستونگ اور دیزک میں آباد ہو گئے۔

دیزک کے دہواروں پر ان کے ماحول کا اثر یوں نمایاں ہے کہ جونہی ان پر حکومت کی طرف سے دباؤ پڑتا ہے تو وہ پہاڑوں کا رخ کرتے ہیں۔ سوائے اس خصوصیت کے دوسرے طریقہ پر وہ ایک غیر متحرک دیہی آبادی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر حالات زراعت کے لیئے ناسازگار ہو جائیں تو امکان ہے کہ تاجک قبیلہ بھی کھیتی باڑی چھوڑ کر خانہ بدوشانہ زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے اور کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد وہ ان قبیلوں میں کچھ اس طرح گھل مل جائے کہ وہ اپنے آپ کو بلوچ یا براہوئی قبیلوں کا جزو لاینفک خیال کرنے لگے۔

مندرجہ بالا انسانی گروہوں کی زبان اور نسل میں جا ہے فرق موجود ہو لیکن اس کے باوجود صدیوں کے میل ملاپ۔ تاریخی عمل اور جغرافیائی عوامل نے ان کو کچھ اس طرح باہم ملا دیا اور ان کے فلسفہ زندگی، امنگوں، تمناؤں میں کچھ اس حد تک یکسانیت پیدا ہو گئی ہے کہ اب وہ ایک ہی قومیت کے اجزا تصور کئے جاتے ہیں اور اس میں سب سے زیادہ ان کے کلچر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

تیسرا باب

پتھر اور کانسی کا دور

ابتدائی دور

بلوچستان میں ہمیں قدیم انسانوں کی ایک ایسی غیر متمدن اور ابتدائی سوسائٹی کے متعلق معلومات فراہم ہوگئی ہیں جس کی معیشت کا دار و مدار کلیتاً مویشیوں کی پرورش پر تھا۔ اس ابتدائی قدیم آبادی کو یہاں کی مختلف سرسبز اور شاداب وادیوں میں اپنے مویشیوں کے گلوں کے لئے گھاس اور پانی بافراط میسر اور دستیاب تھا۔ وہ ایک قسم کے پہاڑی بیلوں کے گلے رکھتے یا ان کا شکار کرتے تھے۔ وہ گائے بیلوں کی ایک عمدہ نسل سے بھی واقف تھے اور بھیڑ بکریوں کے بڑے بڑے ریوڑ بھی پالتے تھے۔

یہ گڈریئے جھگیوں میں زندگی بسر کرتے تھے جو ابتداء میں لکڑیوں کو جوڑ کر بنائی جاتی تھیں۔ بعد میں اس قسم کی جھگیاں کچی اینٹوں سے تعمیر کی جانے لگی تھیں۔ وہ مٹی کے برتن بنانے کے فن اور ان کے استعمال سے واقف تھے اور پتھر کے بھدے برتن بنا کر استعمال کرتے تھے۔ وہ مزری کی جھاڑیوں سے ٹوکریاں اور مویشیوں کے چمڑے سے تھیلے اور مشکیزے تیار کرتے تھے وہ محدود پیمانے پر کاشتکاری بھی کرتے تھے۔ ان کی پسائی کے مستطیل پتھر

کچھ زیادہ بڑے نہیں تھے اور ان پر بڑے پیمانے پر گندم اور جو یا کسی دوسرے اناج کی پیداوار نہیں ہو سکتی تھی۔ خیال ہے کہ وہ روٹی کم اور گوشت زیادہ استعمال کرتے تھے [1]

وہ پتھر کے چقماقی اوزار استعمال کرتے تھے جن کے لئے پتھر مقامی طور پر دستیاب تھا۔ ان اوزاروں میں کلہاڑی، تیشے، چاقو، چھریاں، برمے، کرچائی کرنے، چھیلنے کے اوزار بسولیاں اور درانتی شامل تھے۔ پتھر کے چھوٹے چھوٹے مستطیل ٹکڑوں کو ایک کنارے سے دندانہ دار شکل دے کر ہڈی کے دستوں میں نصب کیا جاتا تھا۔ جن کی لمبائی میں چھید ڈالا جاتا تھا اور اس طرح یہ کنگھے کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ ان سے فصلوں کی کٹائی کا کام لیا جاتا تھا جن میں زیادہ تر گندم اور جو کی فصلیں شامل تھیں۔ کلہاڑی اور تیشوں جیسے بھاری اوزاروں میں درمیانی حجری دور کے اوزاروں کا انداز نمایاں تھا لیکن اس دور میں زیادہ تر متاخر حجری اوزار استعمال کئے جاتے تھے جو ابتدائی اور درمیانی حجری اوزاروں کی نسبت بہتر تھے۔ ان ہلکے پھلکے اوزاروں میں ہلال نما، مربع، منحرف اور تکونی اوزار زیادہ مقبول تھے۔ بعض مربع منحرف قسم کے اوزاروں کی نشست اوپر سے خالی ہوتی تھی۔ ہڈی کے اوزاروں میں چمڑے میں سوراخ کرنے اور سینے کی سوئیاں شامل تھیں۔ اس کے علاوہ ہڈیوں سے ایک قسم کا چمچہ نما اوزار بھی تیار کیا جاتا تھا۔ جس سے رنگ تیار

---

1 - EXCANATIONS IN QUETTA VALLEY - FAIRSERVIS ABID

کہنے میں مدد لی جاتی تھی۔ یہ رنگ و روغن اس دور کے باشندوں کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا تھا۔ اس دور کی ابتدا چھ ہزار برس قبل مسیح بلکہ اس سے بھی پہلے ہوئی تھی۔ یہ ایک طویل دور تھا۔ بلوچستان میں اس دور کی باقیات اور شواہد کوئٹہ شہر کے نزدیک کلی گل محمد[1] اور کچھی میں ڈھاڈر کے نزدیک مہر گڑھ[2] کی قدیم بستیوں میں دریافت ہوئے ہیں۔

اس قسم کی آبادیوں کے آثار مشرق قریب کے ممالک میں بھی دریافت ہوئے ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ نے اردن میں جریکو (ٹمبرا) کی قدیم بستی کی ابتدائی آبادی کے لئے ریڈیو کاربن سی ۱۴ کے طریقہ سے سات ہزار قبل مسیح کا زمانہ متعین کیا ہے جس کے دوران اس بستی کی بنیاد پڑی تھی۔ یہ بستی تقریباً آٹھ ایکڑ زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اردگرد پتھروں سے شہر پناہ قسم کی ایک دیوار تعمیر کی گئی تھی اور اس دیوار کے اردگرد ۲۷ فٹ چوڑی اور ۵ فٹ گہری خندق بھی کھودی گئی تھی۔ اس بستی کے ابتدائی باشندوں کا گزارہ خود رو گھاسوں کے بیج اور شکار پر تھا۔ یہ لوگ قریب کے ایک صاف اور شفاف پانی کے چشمے سے زمین کے متعدد ٹکڑے سیراب کر کے ان میں اسی خود رو گھاس کی بیج بویا کرتے تھے۔ وہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور دوسرے مویشیوں کے گلّے بھی پالتے تھے۔ جن کے لئے چارہ پیدا کرنے

---

[1] EXCANATIONS IN QUETTA VALLEY - FAIRSERVIS.

[2] SOUTH EAST ASIA ARCHAEOLOGY 1973 JARIGE

کی غرض سے وہ اسی چشمے کے پانی سے قریب کے مرغزاروں کو سیراب
بھی کیا کرتے تھے۔ یہ چشمہ ان کے لئے پینے اور نہانے دھونے کے علاوہ
آبپاشی کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ لیکن وہ پتھر کی کلہاڑیوں اور مٹی کے برتن
بنانے کے فن اور استعمال سے ناواقف تھے[ا] تقریباً ایک ہزار سال
بعد یہاں کچھ نئے لوگ آئے۔ انہوں نے جریکو کی پرانی بستی کے قریب
ایک دوسری بستی جریکو (نمبر ۲) کی بنیاد ڈالی۔ یہ لوگ بھی اپنے پیشروؤں
کے طریقہ پر زندگی بسر کرتے تھے اور برتن بنانے کے فن سے ناآشنا
تھے۔ ۴۷۵۰ قبل مسیح میں کردستان میں جرموکی قدیم بستی کی بنیاد پڑی
جرموکے کاشتکار اسی قسم کے گھاس کے بیج جمع کرکے ان کو اپنے
کھیتوں کے ٹکڑوں یا پلاٹوں میں بویا کرتے تھے۔ یہ بیج اس علاقے میں آج
بھی بوئے جاتے ہیں۔ وہ گائے بیلوں کے گلوں کے علاوہ بھیڑ بکریوں کے
ریوڑ بھی پالتے تھے۔ وہ پتھر کے بھاری کلہاڑے اور تیشے بھی اوزاروں کے
طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہ اناج کی پسائی کے لئے مستطیل پتھر بھی کام
میں لاتے تھے۔ لیکن برتن بنانے کے فن سے وہ بھی ناآشنا تھے۔ وہ پتھر کے
علاوہ غالباً لکڑی کے برتن بنا کر استعمال کرتے تھے۔[۲] اگرچہ ماہرین
آثار قدیمہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بلوچستان کے اس دور کے باشندوں
کے گزارے میں شکار بھی ایک اہم حصہ تھا۔ اور وہ بھی خودرو جنگلی گندم اور

ا ۲ WHAT HAPPENED IN HISTORY CHAPTER III
BY GORDON CHILD.

جَو کے بیج اکٹھے کر کے ان کو اپنے کھیتوں میں بویا کرتے تھے۔ جیریکو کی مانند مہر گڑھ کی ابتدائی چھوٹی چھوٹی بستیاں ایک وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ ہزاروں سال کے دوران شمال سے جنوب کی طرف منتقل ہوئے تھے۔ [1]

دَور دوم

تقریباً ساڑھے چار ہزار سال قبل مسیح میں بلوچستان کے باشندوں نے کسی قدر ترقی کر لی تھی اور وہ اپنی اجتماعی زندگی کے دوسرے دَور میں برتن بنانے کے فن سے واقف ہو گئے تھے۔ اس دور کے باشندے ہاتھ کے بنائے ہوئے بھدے برتن استعمال کرتے تھے۔ ان کی نقاشی کا طریقہ بھی کچھ زیادہ وسیع نہ تھا۔ وہ سیدھے ترچھے افقی دنری عمودی اور آویزاں متوازی اور متقاطع خطوط سے نہایت سادہ ہندسی اشکال میں نقاشی کیا کرتے تھے۔ بعض برتنوں کی سطح کو ہڈی کے ایک اوزار سے رگڑ کر چکنا بنا لیا جاتا تھا۔ اور اس کے بعد عموماً ان کی سرخ زمین پر ایک ہی سیاہ رنگ سے نقاشی کی جاتی تھی۔ زیادہ تر برتن اس قسم کے تھے جن کو مزری کی ٹوکریوں کے اندر گھڑ لیا جاتا تھا اور سوکھنے کے بعد ان کو ٹوکریوں سمیت بھٹیوں میں ڈال کر آگ کی تپش دی جاتی تھی۔ ٹوکریاں

---

[1] SOUTH EAST ASIA ARCHAEOLOGY 1973-
MEHRGARH BY JARIGE.

تو آگ میں جل جاتی تھیں۔ لیکن ان کے نشانات پکنے کے بعد ان برتنوں پر باقی رہ جاتے تھے۔ اس دور کے باشندوں کی زندگی بھی پہلے دور کے باشندوں کے طرز پر گذرتی تھی۔ وہ بدستور مویشیوں کے گلے اور بھیڑ اور بکریوں کے ریوڑ پالتے تھے اور وہی ہلکے پھلکے چقماقی اوزار استعمال کرتے تھے جو اس سے پہلے کے دور میں رائج اور مستعمل تھے پہلے دور کے اوزاروں کی مانند ان کی کلہاڑیاں اور تیشے مخروطی یا گاودم کی شکل کے ہوتے تھے۔ ۱ؔ

بلوچستان کے گرم اور سرد علاقوں میں اس دور کے باشندے ایک سے زیادہ کمروں پر مشتمل مکانوں میں زندگی بسر کرتے تھے اور آبادی نے [illegible] مستقل صورت اختیار کر لی تھی جس کے شواہد کچھی میں ڈھاڈر کے [illegible] دیب مہر گڑھ کی قدیم بستی میں دریافت ہوئے ہیں۔ لیکن وسطی بلوچستان اور لورالائی کے اس دور کے باشندے بدستور نیم قبائلی طرز پر خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے تھے اور وہ کچی اینٹوں سے تیار کئے ہوئے مکان یا جھگیوں کی بجائے اس قسم کی جھگیوں میں زندگی بسر کرتے تھے جو درختوں کی قدرتی شاخوں سے تیار کی جاتی تھیں اور ان کے اوپر گھاس

۱ؔ EXCAVATIONS AND RE CONNAISSANCE IN KALAT_ MISS BEATRICE DE CARDI

پھوس یا چٹائیاں ڈال دی جاتی تھیں۔ اس دور میں تقریباً ہر جگہ پارچہ بافی کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اگرچہ ابتدا میں اس دور کے باشندے ہاتھ کے بنائے ہوئے منقوش اور غیر منقوش برتن استعمال کرتے تھے۔ جن کا استعمال محدود تھا لیکن بمرور زمانہ رفتہ رفتہ ہاتھ کے بنائے ہوئے برتنوں کے ساتھ ساتھ چاک پر تیار کیے ہوئے برتن بھی بنائے اور استعمال کیے جاتے تھے جن کی زمین عموماً سرخ ہوتی تھی اور ان پر ایک ہی سیاہ رنگ میں ہندسی اشکال کی نقاشی کی جاتی تھی [۱]

دَور سوم

تقریباً چار ہزار قبل مسیح کے شروع میں بلوچستان کے ان قدیم باشندوں نے اپنی اجتماعی زندگی کے تیسرے دَور میں اور زیادہ ترقی کی تھی۔ وہ اپنے مکانوں کی دیواروں کی بنیاد میں دو فٹ زمین کے اندر قدرتی پتھر استعمال کرتے تھے اور پتھروں کے درمیان جو شگاف رہ جاتے تھے ان میں چھوٹے چھوٹے پتھر دے کر ان غیر تراشیدہ پتھروں کو مٹی کے گارے سے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا جاتا تھا۔ جس کے شواہد وسطی بلوچستان میں دریافت ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کچی اینٹوں سے دیوار کھڑی کر کے مناسب بلندی پر چھت ڈال دی جاتی تھی [۲] غالباً شمالی بلوچستان

---

[۱] SOTH EAST ASIA ARCHAEOLOGY MEHRGARH BY JARIGE

[۲] PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO.2 BEATRIG PAGE NO. 93

میں مکانوں کی دیواروں کی بنیاد میں قدرتی پتھر استعمال کرنے کا دستور شروع نہیں ہوا تھا اور اس علاقے کے اس دور کے باشندے اپنے مکانوں کی دیواریں بدستور کچی اینٹوں سے تعمیر کرتے تھے۔

تہذیبی ترقی کے اس دور میں اگرچہ ہاتھ کے بنائے ہوئے منقوش اور غیر منقوش برتن استعمال کئے جاتے تھے جو اس سے پہلے کے دور میں رائج اور مستعمل تھے۔ لیکن ہاتھ کے بنائے ہوئے برتنوں کے ساتھ ساتھ چاک پر تیار کئے ہوئے عمدہ قسم کے برتن بھی بنائے اور استعمال کئے جاتے تھے۔ ان برتنوں میں وہ نازک اور نفیس برتن زیادہ اہم تھے۔ جن کی سطح پر متوازی پٹیاں ڈال کر ان کے درمیانی رقبہ میں انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کی تصویریں قطاروں میں منقش کی جاتی تھیں۔ ان تصویروں میں انسانوں کا رُخ دائیں اور حیوانوں کا رخ بائیں طرف کو ہوتا تھا اور حیوانوں کی تصویرکشی میں کسی قدر جھکاؤ پیدا کیا جاتا تھا۔ ان تصویروں کے پس منظر کے طور پر متوازی پٹیوں کے بیرونی حصوں میں بڑے خوبصورت انداز میں ہندسی اشکال کی نقاشی کی جاتی تھی۔ اس قسم کے برتنوں پر نقاشی کے کل چار نمونے دریافت کئے گئے ہیں۔ اس دور میں اس کی پہلی قسم یا نمونہ رائج تھا۔

ل EXCANATIONS IN QUETTA VALLEY - FAIRSERVIS AND ALSO PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO. 2 PAGE NO. 30

اس دور میں ہلکے پھلکے چقماقی اوزاروں کا استعمال رو بہ تنزل تھا اور ان کی بجائے پتھر کے لیے اوزار اور ہتھیار بنائے اور استعمال کئے جاتے تھے۔ ممتاز فرانسیسی خاتون ماہر علم الآثار مس بیٹرس ڈی کارڈی نے وسطی بلوچستان میں انجیرہ کی قدیم بستی پر تحقیق و تفتیش کے دوران چقماقی اوزاروں کی ایک باقاعدہ صنعت کا کھوج لگایا تھا جو مختلف قسم کے اوزار اور ہتھیاروں کے پھلوں پر مشتمل تھی [1]

اس دور میں پارچہ بافی کی صنعت کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ اونی سوتی اور غالباً ریشمی کپڑے تیار کئے جاتے تھے۔ سوت کاتنے اور کپڑوں کی بنائی کے دوران دھاگوں کو ٹھونکنے کے لئے ہڈی کے اوزار استعمال کئے جاتے تھے۔ غالباً اس دور میں دھاتوں کا استعمال بھی شروع ہو گیا تھا اور محدود پیمانے پر تانبہ اور کانسی کے اوزار بنائے اور استعمال کئے جاتے تھے [2]

دور چہارم

تقریباً ساڑھے تین ہزار قبل مسیح میں بلوچستان کے ان قدیم باشندوں نے اپنی اجتماعی زندگی کے چوتھے دور میں خوب ترقی کی تھی

---

[1] PAKISTAN ARCHAELOGY NO 2 PAGE 123

MISS BEATRICE DE CARDI -

[2] EXCAVATIONS IN QUETTA VALLEY. FIARSAVIS.

وہ اپنے مکانوں کی دیواروں کی بنیاد میں دو فٹ زمین کے اندر مربع نما
تراشیدہ پتھر استعمال کرتے تھے جن میں اس قسم کے شگاف مفقود
تھے کہ جن میں چھوٹے چھوٹے پتھر دینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس
طرز تعمیر کے شواہد وسطی بلوچستان میں انجیرہ کی قدیم بستی سے دریافت
ہوئے ہیں لیکن شمالی بلوچستان میں اس مرحلہ پر مکانوں کی دیواروں کی بنیاد
میں غیر تراشیدہ قدرتی پتھر استعمال کئے جاتے تھے۔ جن کے درمیانی
شگافوں میں چھوٹے چھوٹے پتھر دیئے جاتے تھے۔ اور اس کے بعد کچی
اینٹوں سے دیواریں تعمیر کی جاتی تھیں۔ اس دور میں ہاتھ کے بنائے ہوئے
برتن رو بہ زوال تھے اور کمہار کے چاک پر تیار کئے ہوئے عمدہ برتنوں
کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس دور کے برتنوں کی سطح یا ان کے
اندر متوازی چوڑی پٹیاں ڈال کر ان کے درمیانی حصے میں ہندسی اشکال میں
ایک یا کئی رنگوں سے نقاشی کی جاتی تھی۔ اسی زمانے میں جنوبی بلوچستان
میں نال کلچر کی بنیاد پڑی تھی جس کا دائرہ جنوب میں ساحل سمندر تک پھیل
رہا تھا۔ اور نال کی ظروف گلی کے ابتدائی نمونے منظر عام پر آ گئے تھے[لے]۔
اس دور کے منقوش برتنوں میں وہ برتن زیادہ اہم تھے جن کی
ساخت اور بناوٹ بڑی عمدہ ہوتی تھی۔ ان برتنوں کی سطح پر دو متوازی

لے PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO. 1 PAGE NO 30
FAIRSIRVISE

پٹیاں ڈال کر ان کے درمیانی حصہ میں انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کی
منسلک تصویریں کچھ اس انداز سے منقش کی جاتی تھیں کہ حیوانوں کے جسم
غائب تھے اور فقط ان کا سر سینگوں سمیت نظر آتا تھا یا پھر آگے چل کر ان
برتنوں کی سطح پر اس طرز سے نقاشی کی جاتی تھی کہ ان حیوانوں کا جسم اور
سر دونوں غائب تھے اور فقط ان کی سینگیں ہی نظر آتی تھیں۔ یہ اس مخصوص
ظروف گلی کی دوسری اور تیسری اقسام تھیں[۱] اگرچہ اس دور میں بھیڑ بکریوں
اور دوسرے مویشیوں کی پرورش کو بدستور بڑی اہمیت حاصل تھی۔ لیکن زراعت
کا پیشہ بھی اہمیت حاصل کرنے لگا تھا۔ اس دور میں دھاتوں کا استعمال
عام ہو گیا تھا۔ پتھر کے بنائے ہوئے چقماقی اوزار متروک ہو گئے تھے اور ان
کی جگہ تانبہ اور کانسی کے اوزاروں نے لی تھی۔[۲]

ماہرین آثار قدیمہ نے متذکرہ بالا چاروں ادوار کے کلچر کو کلی گل محمد کے
کلچر کا نام دیا ہے۔ جس کی باقیات اور آثار سب سے پہلے کوئٹہ شہر کے نزدیک
کلی گل محمد کی قدیم بستی میں دریافت کئے گئے ہیں۔[۳] یہ ایک وسیع کلچر تھا جس

۱۔ SOUTH EAST ASIA ARCHAEOLOGY 1973 JARIGE.

۲۔ EXCAVATIONS AND RECONNAISSANCE IN KALAT BY MISS BEATRICE DE CARDI

۳۔ PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO I PAGE 29-30 BY FAIRSERVIS

کے آثار ژوب، لورالائی کے اضلاع، وادی کوئٹہ، سراوان، جھالاوان کے علاوہ جنوب مغربی مکران میں مبور سے لے کر مغربی بلوچستان میں خاران تک کی قدیم بستیوں میں دریافت کئے گئے ہیں [1]

دورِ پنجم

تقریباً سوا تین ہزار قبل مسیح میں بلوچستان میں ایک عبوری دور کا آغاز ہوگیا تھا۔ یہ ایک مختصر دور تھا جس کے دوران برتنوں کو آگ کی تپش دے کر پکانے کے فن میں کسی قدر تبدیلی آئی تھی۔ اس دور میں وہ برتن زیادہ مقبول تھے جن کے اوپر دو رنگوں کی بجائے ایک ہی رنگ میں نقاشی کرکے دو متوازی پٹیوں کے درمیانی رقبہ میں منسلک حیوانوں کی تصویر کشی میں یہ انداز اختیار کیا جاتا تھا کہ ان کے جسم اور سر غائب کئے جاتے تھے اور فقط ان کی سینگوں کا ایک سرا خم کی شکل میں نظر آتا تھا۔ ان برتنوں کو آگ کی اتنی زیادہ تپش دی جاتی تھی کہ ان کا سُرخ رنگ گہرے سواری رنگ میں تبدیل ہو جاتا تھا اور ان کے سیاہ نقوش سُرخ نقوش کی شکل اختیار کرتے تھے۔ یہ ان برتنوں کی چوتھی قسم تھی کہ جن کی سطح پر دو متوازی پٹیوں کے درمیان انسانوں، حیوانوں اور پرندوں کی نقاشی قطاروں میں کی جاتی تھی۔ ان کے

---

[1] EXCAVATION AND RECONNASANC IN KALAT BY DE CARDI PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO 2 PAGE 111, 121

نمونے سب سے پہلے مس دی کاردی نے قلات کے نزدیک طوغو کی قدیم بستی سے دریافت کئے تھے۔ اسی وجہ سے ظروف گلی کی یہ چاروں اقسام طوغو کی ظروف گلی کے نام سے موسوم ہیں۔[1]

آگ کی زیادہ تپش دینے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس دور کے کوزہ گروں نے اپنے برتنوں کے بے قاعدہ رنگوں کو باقاعدہ رنگوں کی صورت دینے کی کوشش کی تھی اور تجربہ کے بعد انہوں نے آگ کی تپش پر قابو حاصل کرلیا تھا۔ اس کا ثبوت سرخ اور بھورے رنگ کے برتن ہیں جو اس دور کے بعد مستعمل تھے۔ ان برتنوں کو آگ کی اس قدر زیادہ تپش نہیں دی جاتی تھی کہ جس سے وہ جل کر سیاہ پڑجاتے بلکہ فقط اتنی تپش دی جاتی تھی کہ جس سے مطلوبہ رنگ باقاعدہ صورت اختیار کرتا تھا۔ گویا کوزہ گروں کو اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس عبوری دور کے شواہد کچھی میں ڈھاڈر اور جالاوان میں انجیرہ کی بستی سے دریافت ہوئے ہیں۔[2]

دورِ ششم

۳۰۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ بلوچستان کے طول وعرض میں ترقی اور خوشحالی کا ہمہ گیر دور شروع ہوگیا تھا۔ ہمہ گیر ترقی کا یہ دور فقط بلوچستان

---

[1] SOUTH EAST ASIA ARCHAEOLOGY 1973
MEHRGERH BY JARIGE

[2] ABID.

کی حدود تک محدود نہ تھا بلکہ اس ترقی یافتہ دور کے شواہد ایران میں شہر سوختہ جنوبی افغانستان میں منڈی گگ دورِ سوم، ترکمانیہ میں تپہ نماز گاہ اور وادی سندھ میں رحمان ڈیری کی قدیم بستیوں سے دریافت ہوئے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ترقی کا یہ دَور ایشیا کے ایک وسیع علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ بلوچستان کے ان قدیم باشندوں نے اس زمانہ میں صرف گلہ بانی کی بجائے بڑے پیمانے پر زراعت کی طرف اپنی پوری توجہ مبذول کر لی تھی۔ اگرچہ بھیڑ بکریوں اور دیگر مویشیوں کی پرورش کو ان کی معیشت میں بدستور اہمیت حاصل تھی۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ زراعت کو اس زمانہ میں بڑا عروج حاصل ہوگیا تھا۔ خیال ہے کہ عام آدمی کی معیشت میں زراعت پر زیادہ سے زیادہ انحصار اور کوزہ گری کے فن میں ترقی ایک ساتھ شروع ہوگئی۔ وادیوں میں پانی کی فراوانی اور قابل کاشت اراضیات کے وسیع زرخیز رقبوں کی جاذبیت آبادی میں زبردست اضافہ کا باعث بن گئی۔ بستیوں کی وسعت بڑھ گئی اور ان کی تعداد میں بھی زبردست اضافہ ہوگیا۔ آبادی میں یہ غیر معمولی اضافہ فن میں بھی خاطر خواہ ترقی کا موجب بن گیا[2]

---

[1] SOUTH EAST ASIA ARCHAEOLOGY 1973.
MCHRGARH BY JARIGE

[2] EXCANATIONS QUETTA VALLEY.
FAIRSERVIS PAGE NC. 359

یہ صورتحال آبادی میں نقل وحرکت پیدا ہونے اور نئے نئے خیالات کے پھیل جانے کا نتیجہ تھی جو اس زمانہ میں سطح مرتفع ایران میں ہر جگہ وقوع پذیر ہو رہی تھی۔ اس مسلسل تہذیبی ترقی کے ابتدائی مرحلوں میں کمہار کے چاک پر تیار کیا ہوا ایک عمدہ برتن، جس کی سرخ زمین پر سیاہ رنگ میں نقاشی کی جاتی تھی۔ مقامی طور پر بنایا جاتا تھا یا تاجر لوگ اپنے ساتھ لے آتے تھے۔ اس برتن سے عام لوگوں کی معیشت میں اس طریق پر تبدیلی کی عکاسی ہوتی ہے کہ اب کلیتاً گلہ بانی کی بجائے زراعت پر انحصار کیا جاتا تھا۔ ہاتھ کے بنائے ہوئے وہ برتن جن کے اوپر ٹوکریوں کے نشانات ثبت ہوتے تھے رو بہ تنزل تھے اور ان کی بجائے کمہار کے چاک پر تیار کیے ہوئے عمدہ منقوش برتنوں کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔[۵]

عراق کے برتنوں کا اسلوب نقاشی جو حلب کے برتنوں پر عموماً پایا جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مشرق کی طرف دور دور تک سرایت کر گیا تھا۔ کیونکہ بلوچستان کے علاوہ سندھ میں بھی اس قسم کا اسلوب نقاشی چاک پر تیار کیے ہوئے ایک زردی مائل سفید رنگ کے برتن پر پایا جاتا ہے یہ غالباً مغرب کی طرف سے آئے ہوئے اثرات کا ایک طرفہ نتیجہ تھا جو یہاں کے سرحدی علاقوں پر مرتب ہو رہے تھے اور ان کو مقبولیت حاصل ہو رہی تھی۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ کہ ان برتنوں کے ساتھ

---

[۵] EXCANATIONS IN QUETTA VALLEY - FAIRSERVIS

ساتھ تانبہ کا استعمال بھی عام ہو رہا تھا[1]

بلوچستان کا ایران سے گہرا تعلق اور رابطہ اس دور کے ظروف گلی کے رنگا رنگ اور گوناگوں اسلوب نقاشی کی وسعت اور کثرت سے خصوصیت کے ساتھ عیاں ہے۔ بلوچستان کے اس ترقی یافتہ دور کے کوزہ گروں نے عراق میں العبید کے کوزہ گروں اور ایران میں میک ڈون کے زردی مائل سفید ظروف گلی کے سوبوں کے فنکاروں کا شوخ اسلوب نقاشی اختیار کرکے ماہرین کے لئے آبادی کی وسعت اور فن کی ترقی کے زمرے میں ایک قسم کا پیمانہ فراہم کردیا ہے کہ جس کے بل بوتے پر آبادی کی کثرت اس کی وسعت اور تہذیبی ترقی کے بلند معیار کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے[2]

اس زمانے میں بلوچستان کی مختلف وادیوں میں بڑی بڑی بستیاں موجود تھیں جن میں سے بعض بستیوں کے اردگرد شہرپناہ تعمیر کی گئی تھی۔ ان بستیوں کی آبادی اس قدر زیادہ گنجان تھی کہ جس کی مثال فقط جدید زمانہ میں ملتی ہے۔ ان بستیوں کے مکانات چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے۔ مکانوں کی دیواروں کی بنیاد میں دو فٹ تک زمین کے اندر اور دو فٹ فرش کے اوپر مربع نما تراشیدہ پتھر استعمال کئے جاتے تھے۔ اس کے بعد معیاری حجم کی اینٹوں سے دیوار تعمیر کرکے چھت ڈالی جاتی تھی۔ شہتیروں کا قطر عموماً

ح ۲ EXCANATIONS IN QUETTA VALLEY - FAIRSERVIS.

نو انچ اور بتوں کا قطر پانچ چھ انچ کے لگ بھگ ہوتا تھا۔ جو عموماً غیر تراشیدہ اور گول ہوتے تھے۔ دیواروں پر لپائی گھارے میں بھوسہ ملا کر کی جاتی تھی۔ مکانوں کی درمیانی گلیاں عموماً تنگ اور پیچ دار ہوتی تھیں۔ آمنے سامنے کے کمروں کے درمیان کاریڈار تعمیر کرنے کا بھی رواج تھا۔ غالباً زلزلوں سے بچنے کی خاطر چھوٹے چھوٹے کمرے اور موٹی دیواریں تعمیر کی جاتی تھیں۔ کاریڈاروں کے دونوں سرے پر مستطیل پتھر نصب کئے جاتے تھے دروازوں کے چوکھٹوں کے نیچے بھی پتھر کے سلیب لگا دیئے جاتے تھے، دروازوں کے پیر عموماً ایک چھوٹے سے گول پتھر کے اوپر گھومتے تھے جس کے عین وسط میں اس مقصد کے لئے چھید ڈالا جاتا تھا۔ کمروں کے فرشوں کو تراشیدہ پتھروں سے پختہ بنایا جاتا تھا۔ پانی پینے کے کنوؤں کو مناسب گہرائی تک پتھروں سے پختہ بنایا جاتا تھا۔ انگیٹھیاں کمروں کے فرش کے اندر کھودی جاتی تھیں جو عموماً گول یا مربع نما ہوتی تھیں۔ تقریباً ہر گھر میں روٹی پکانے کے لئے پکائی ہوئی مٹی کے تنور ہوتے تھے جن میں سے بعض کو باہر کی طرف سے اور بعض کو اندر کی طرف سے لکڑی ڈال کر گرم کیا جاتا تھا۔[۱]

اگرچہ اس زمانہ میں بھی بھیڑ بکریوں اور دیگر مویشیوں کو عام آبادی کی معیشت میں بدستور اہمیت حاصل تھی لیکن زراعت کا کردار بھی زیادہ اہم تھا۔[۲]

---

[۱] [۲] EXCANATIONS IN QUETTA VALLEY - FAIRSERVIS

اس زمانہ میں شمالی بلوچستان پر کوئٹہ کلچر کے لوگوں کو سیاسی غلبہ حاصل تھا اور ان کی حد جنوب میں قلات شہر کے عین جنوب تک تھی اور اس کے بعد نال کلچر کے لوگوں کی حد شروع ہوتی تھی۔ جنوبی بلوچستان میں عین ساحل سمندر تک نال کلچر کے لوگ برسر اقتدار تھے۔ اسی زمانے میں سوراب کا علاقہ بڑا سرسبز اور شاداب تھا۔ اس علاقے پر کبھی شمالی بلوچستان کے کوئٹہ کلچر کے لوگ تہذیبی یا سیاسی برتری حاصل کرتے تھے اور آگے بڑھ کر انجیرہ کی بستی تک اپنا تسلط قائم کر لیتے تھے اور کبھی نال کلچر کے لوگ اس علاقہ پر اپنا تہذیبی یا سیاسی غلبہ حاصل کر کے منگوچر میں موریز شاہ کی قدیم بستی تک حد بڑھا لیتے تھے۔ اس کے باوجود گزشتہ ادوار میں دونوں ریاستوں کے باشندوں کے درمیان تجارتی اور تہذیبی رابطہ قائم چلا آتا تھا لیکن اس ترقی یافتہ دور میں جس کی طوالت صدیوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں آبادیوں کے درمیان تعلقات کلیتاً منقطع ہو گئے جس کی وجوہات غیر معلوم ہیں۔ لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ دونوں ریاستوں کے سرحدی باشندوں کے درمیان لڑائی اور جنگ کی وجہ سے یہ تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ غالباً وہ تنازعہ تھا جو اس متدعویہ علاقے پر دونوں طرف کے سرحدی باشندوں کے درمیان چلا آتا تھا۔[1]

---

[1] EXCAVATIONS AND RECONNAISSANCE IN KALAT BY BEATRICE DE CARDI PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO. 2 PAGE 114, 115

دورِ ہفتم

تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل مسیح میں شمال مغرب کی جانب سے ایک تازہ آبادی ژوب میں رانا منڈی کے دورِ سوم (c) میں شمالی بلوچستان میں داخل ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے وادی کوئٹہ میں داخل ہوکر دمب سادات کی قدیم بستی پر قبضہ کرلیا۔ اس سے پیشتر انہوں نے اپنے آپ کو وادی کوئٹہ کے قریب دجار میں جمالیا تھا اور وادی کوئٹہ کے اصل باشندوں کے ساتھ ان کے تجارتی روابط بھی قائم ہوگئے تھے۔ خیال ہے کہ وسطی بلوچستان کے علاوہ کچھی کی بعض سرحدی بستیوں تک انہوں نے اپنا اقتدار بڑھا دیا تھا یا پھر ان علاقوں کے باشندوں کے ساتھ اپنے تجارتی روابط قائم کرلئے تھے۔ وسطی بلوچستان میں نال کے قریب سورد مب کی قدیم بستی میں بھی اس تازہ آبادی کی ایک نوآبادی کے آثار دریافت ہوئے ہیں۔ خیال ہے کہ اس سیاسی تسلط یا تجارتی روابط کی وجہ سے شمالی اور جنوبی بلوچستان کے درمیان تعلقات دوبارہ بحال ہوگئے تھے۔ اس تازہ آبادی کے آثار جنوبی افغانستان میں منڈی گگ ترکمانیہ میں تپہ نمازگاہ اور ایران میں سوس کی قدیم بستیوں میں دریافت کئے گئے ہیں۔ ان لوگوں کا تعلق ایک ایسی تہذیب سے تھا جو اس زمانہ میں ایشیا کے ایک بڑے حصہ میں پھیلی ہوئی تھی۔[۱] منڈی گگ پیران کا حملہ اس کے دورِ چہارم میں ہوا تھا۔

۱۹۵۰ء میں الکاک نے دمب سادات کی قدیم بستی سے ایک ایسا

---

[۱] EXCANATIONS AND RECONNAISANCE IN KALAT. DE CARDI

چبوترا دریافت کیا تھا۔ جس کے اردگرد دیوار تعمیر کی گئی تھی۔ اس کے دو کونوں میں دو موریوں کے آثار بھی ملے جن کا پانی بہہ کر ایک چھوٹے سے تالاب میں جمع ہو جایا کرتا تھا اور اس تالاب کو بھی پتھروں سے پختہ بنا لیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مذہبی نوعیت کی عمارت تھی اور اشنان کا پانی دونوں موریوں سے نالیوں کے ذریعے بہہ کر اسی تالاب میں جمع ہو جایا کرتا تھا[۳۴]

اس مذہبی چبوترے کے ایک کونے میں اس کی دیوار کی بنیاد میں ایک انسانی سر بھی دفن کر دیا گیا تھا جو بڑی خستہ حالت میں تھا۔ خیال ہے کہ اس تازہ آبادی نے کوئٹہ کے اصلی باشندوں (دمب سادات دورِ اوّل) کو شکست دینے کے ابدان کے سردار یا حکمران کو ہلاک کر دیا تھا یا اس کی قربانی دی تھی اور اس کے سر کو یادگار کے طور پر اس مذہبی عمارت کی بنیاد میں دفن کر دیا تھا[۳۵]

کوئٹہ کلچر سے متعلق کوئٹہ کے اصلی باشندوں کی شکست کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حملہ آوروں کی نسبت ان کے پاس تانبہ کے مہلک ہتھیاروں کی کمی تھی۔ انہوں نے بلوچستان کے اکثر علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد اپنی تہذیبی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ ان کا تہذیبی معیار بھی بلند تھا۔ انہوں نے کوزہ گری کے فن اور دوسری صنعتوں میں بھی بڑی ترقی کی تھی۔ برتنوں کے اوپر ان

---

[۳۴] [۳۵] EXCANATIONS IN QUETTA VALLEY - FAIR SERVIS.

کی نقاشی کا اسلوب بھی بڑا ترقی یافتہ تھا اور ان کے برتن بھی کمہار کے چاک پر بنتے تھے جو ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے بھی بڑے عمدہ قسم کے تھے۔ دونوں آبادیوں کے طرز نقاشی میں نمایاں فرق یہ تھا کہ کوئٹہ کلچر کے کوزہ گر اپنے برتنوں کے اوپر ہندسی اشکال کی نقاشی خطوط مستقیم ہی سے مرتب کرتے تھے۔ ان کے برعکس اس تازہ آبادی کے فنکار اپنے برتنوں کے اوپر قوسی اور لہریادار خطوط میں نقاشی کیا کرتے تھے۔[۱]

اسی زمانہ میں نال کلچر کے پہلو بہ پہلو کلی کلچر کو وسطی اور جنوبی بلوچستان میں فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ نال کلچر زوال سے دوچار ہو گیا اور اس کی جگہ کلی کلچر نے لے لی۔ کلی کلچر کے آثار کلی اور مہی کے علاوہ جنوبی بلوچستان کی کئی قدیم بستیوں سے دریافت ہوئے ہیں۔ ان دو قدیم بستیوں میں اول الذکر مکران کی تحصیل کولواہ اور موخر الذکر جھالاوان کی تحصیل مشکے میں واقع ہے۔ کلی کلچر کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ وادی سندھ کے ہڑپہ کلچر کا ہمعصر تھا اور دونوں ایک ہی زمانہ سے تعلق رکھتے تھے۔[۲] بلوچستان کے اس دور کے باشندے پچھلے دور کے باشندوں سے کہیں زیادہ زراعت پر انحصار رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں بھی اگرچہ بھیڑ بکریاں اور دوسرے مویشی بڑی اہمیت رکھتے تھے لیکن زراعت کا کاروبار اپنے عروج پر تھا۔[۳]

ا۔ EXCANATIONS IN QUETTA VALLEY. FAIRSERVIS.

۲۔ PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO. 2 PAGE 167 DE CARDI.

۳۔ FAIRSERVIS.

بلوچستان کی آبادی تہذیبی ترقی کے متذکرہ بالا دونوں ادوار میں بہت زیادہ گنجان تھی۔ اس زمانہ میں آبادی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس کی مثال فقط جدید زمانہ ہی میں ملتی ہے۔ گمان ہے کہ زراعت پر تکیہ اس سے کہیں زیادہ کیا جاتا تھا کہ جس کی اجازت یہاں کے وسائل دے سکتے تھے۔ موسیو کسال نے جھالاوان میں اور ناچ کی قدیم بستی سے برتنوں کے ٹکڑوں پر ایک قدیم رسم الخط کے چند حروف دریافت کر لئے تھے جو حرفی علامات کی صورت میں برتنوں کے ان ٹکڑوں پر ثبت کر دیئے گئے تھے۔ ان علامات کے مجموعے بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مزید براں ہر جگہ مسلسل ترقی کے آثار دریافت ہوئے ہیں اور تہذیبی ترقی کو کسی بھی مرحلہ پر رکاوٹ درپیش نہیں آئی تھی۔ ان وجوہات کی بنا پر گمان کیا جاتا ہے کہ بلوچستان کے اس زمانہ کی آبادی کو سیاسی اور اقتصادی استحکام حاصل تھا[1]۔ ایک قدیم رسم الخط کی دریافت سے تہذیبی ترقی کے بلند معیار کی عکاسی ہوتی ہے۔[2]

مذہب

بلوچستان کے قدیم باشندوں کی تہذیبی ترقی کے ابتدائی چاروں ادوار میں ان کے مذہبی معتقدات کے بارے میں کوئی آثار و شواہد دریافت نہیں

---

[1] FAIRSERVIS.

[2] PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO.3 PAGE 19

NINDOWARI BY MONS:- JEAN-MARIE CASAL.

ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی اجتماعی زندگی کے آخری دو ترقی یافتہ ادوار میں
ان کے مذہبی معتقدات کے بارے میں معلومات فراہم ہو چکی ہیں ان
دونوں ادوار کے باشندے زرخیزی کے ایک مذہبی شعار میں اعتقاد
رکھتے تھے اور ماتا دیوی کو ہی رب البشر تسلیم کرتے تھے انہوں نے
مذہبی رسومات ادا کرنے کے لئے معبد خانے تعمیر کئے تھے جہاں سے
ماتا دیوی کے مجسمے یا بُت، بیلوں کے مجسموں کے ساتھ یکجا دریافت کئے
گئے ہیں۔ ان معبد خانوں میں زمین کی زرخیزی کے لئے دعا و مناجات
کرکے رسومات ادا کرتے تھے۔ زرخیزی کا یہ مذہبی شعار زراعت ہی سے
ماخوذ تھا جس پر اس زمانہ کے لوگ ضرورت سے زیادہ انحصار رکھتے
تھے۔ ابتدا میں یہ مذہبی رسومات سادہ ہی ہوا کرتی تھیں لیکن آخری دور
میں ان میں وسعت پیدا ہو گئی تھی۔

سٹوارٹ پگٹ نے سب سے پہلے وادی ژوب میں پیریانو غنڈی
کی قدیم بستی سے ماتا دیوی کے مجسمے دریافت کرکے اس دیوی کو ژوب
کی دیوی کا نام دیا تھا۔[1] مسٹر کسال نے جھالاوان کی وادی اورناچ
میں نندوانی کی قدیم بستی میں ایک معبد خانہ کا کھوج لگایا تھا جو ایک
طویل و عریض چبوترے کے اوپر پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس معبد خانہ
کے اندر سے بھی ماتا دیوی اور سانڈھوں کے مجسمے دریافت کئے گئے تھے۔[2]

ANCIANT INDIA. BY PIGGUT.

٢ NINDWANI. BY CASAL PAKISTAN ARCHAEOLOGY SERVIES NO.3

الکاک نے وادی کوئٹہ میں دمب سادات کی قدیم بستی میں ایک مذہبی نوعیت کے چبوترے سے مٹی ہٹا کر اسے اجاگر کر دیا تھا۔ جس کے اردگرد چاردیواری تعمیر کی گئی تھی۔ اس عمارت سے کئی ماتا دیوی اور سانڈھوں کے مجسمے برآمد کئے گئے تھے[1]۔ اس رسم بارآوری اور زرخیزی کے شواہد ژوب میں مغل غنڈی کی قدیم بستی سے دریافت ہوئے ہیں جہاں ایک مجسمہ میں پتھر کے آلۂ تناسل کے علاوہ ایک نسوانی مورتی ملی تھی جو رانوں اور عورت کی اندام نہانی کی مبالغہ آمیز شکل پر مشتمل تھی[2]۔ دمب سادات کی قدیم بستی سے سانڈھوں کے جتنے منقوش مجسمے دریافت ہوئے تھے ان کی پیشانی پر عین سینگوں کے درمیان ایک بیضوی دائرہ منقش کر کے اُسے صنف مادہ کے حیوانی آلۂ تناسل کی شکل دی گئی تھی۔ ان نقوش سے شیومت کی یونی علامات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے[3]۔

طریقہ تدفین

قدیم زمانہ میں بلوچستان کے اندر تدفین کے تین طریقے رائج تھے۔

(۱) مکمل تدفین اس طریقہ کے تحت مردوں کی سالم لاش کو پہلو یا پیٹ

---

[1] FAIRSERVIS - EXCAVATIONS IN QUETTA VALLEY.

[2] ANCIENT INDIA - STUART PIGGUT.

[3] FAIRSERVIS - EXCAVATIONS IN QUETTA VALLEY.

کے بل لٹا کر دفن کیا جاتا تھا۔ عموماً ان کے گھٹنے آگے کی طرف اور ٹانگیں پیچھے کی طرف پھیلا دی جاتی تھیں۔ قبر زمین کے اندر نہیں کھودی جاتی تھی بلکہ زمین کی سطح کے اوپر کچی اینٹوں سے ایک تابوت نما صندوق تعمیر کیا جاتا تھا۔ نال کے مدفن سے ایک قبر میں ایک سے زیادہ لاشیں دفن کرنے کے شواہد ملے ہیں۔ مثلاً مرد، عورت اور بچہ ایک قبر میں دفن کئے جاتے تھے۔ غالباً یہ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ غالباً مرد اور اس کی عورت اور ان کی اولاد ایک قبر میں دفن کی جاتی تھی۔ ان لاشوں کے ساتھ مختلف قسم کے بیشمار برتن، اسلحہ، اوزار، زیورات اور کھلونے دفن کئے جاتے تھے۔ کھانا بھی زادِ راہ آخرت کے طور پر قبر میں رکھا جاتا تھا۔ برتنوں کے ساتھ مردوں کے لئے ان کا اسلحہ مثلاً کلہاڑی اور نیزہ وغیرہ عورتوں کے لئے ان کے زیورات کاریگروں کے لئے ان کے اوزار بچوں کے لئے کھلونے اثاثہ قبر کے طور پر دفن کئے جاتے تھے۔[۱] کلی کی قدیم بستی کے مدفن میں ایک ایسی لاش ملی تھی جس کے ساتھ رنگائی کا سرخ مسالہ اور مسالہ پیسنے کا ایک سلیب، تانبہ کے دو اوزاروں کے پھل، تین چپٹی کلہاڑیاں، دو لبوبلیاں اور پتھر کا ایک باٹ دفن کئے گئے تھے۔[۲]

ے۱ MEMOIRS ON EXCAVATION OF SOVDAN. HARGREAVES.

ے۲ ANCINT INDIA - BY PIGGUT.

اس زمانے کے لوگ حیات بعد ممات میں اعتقاد رکھتے تھے ان کا خیال تھا کہ مردے مرنے کے بعد بھی تعلقات رکھ سکتے ہیں اور اپنی مرغوب اشیاء اسی طرح استعمال کر سکتے ہیں جیسا کہ وہ زندگی میں استعمال کر سکتے تھے۔

نال کے مدفن سے اس قسم کے شواہد دریافت ہوئے ہیں کہ دم نکلنے سے ذرا پہلے مرض الموت کے مریضوں کے منہ میں ایک چپٹی ٹھیکری رکھی جاتی تھی تاکہ مرنے کے بعد ان کی روح ان کے جسم سے نکلنے نہ پائے۔[1]

(۲) جزوی تدفین:۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد مردے کو کھلی فضا میں رکھا جاتا تھا۔ جب اس کا گوشت پوست پرندوں کی نذر ہو جاتا تھا تو اس کے بعد اس کی ہڈیوں کو جمع کر کے تدفینی برتنوں میں ڈال دیا جاتا تھا اور ان برتنوں کو مدفنوں میں دفن کیا جاتا تھا۔ اس طریقہ کے شواہد نال کے مدفن کے علاوہ مہرگڑھ کے مدفن سے بھی دریافت ہوئے ہیں۔[2]

(۳) خاکستری تدفین:۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ مردوں کو جلانے کے بعد ان کی ہڈیاں راکھ سمیت جمع کر کے برتنوں میں ڈالی جاتی تھیں۔ اور ان برتنوں کو جو تدفینی مقاصد کے لئے بنائے جاتے تھے مدفنوں میں دفن کیا جاتا تھا۔ موسیو کسال نے نندوانی کی قدیم بستی پر باقیاتی تفتیش و تحقیق کے دوران اس قسم کے کئی طویل و عریض کمروں کے آثار

ے۱:- HARGREAVES.

ے۲:- MEHRGARH JARIGE

دریافت کئے تھے جو غالباً مدفن کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے ان میں سے ایک کمرہ کی لمبائی بیالیس فٹ اور چوڑائی اٹھارہ فٹ تھی۔ اس کمرہ کے فرش میں آگ جلا کر اسے اس قدر تپش دی گئی تھی کہ اس کا فرش جل کر سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد بنیاد کھودے بغیر اینٹوں سے دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ اس کے فرش میں کوئی تیس کے قریب برتن قطاروں میں دفن کئے گئے تھے جن کے اندر راکھ بھری ہوئی تھی۔[1] خاکستری تدفین کے شواہد ژوب میں پیریانو غنڈی کی قدیم بستی سے دریافت ہوئے ہیں۔[2]

صنعت و حرفت

(۱) کوزہ گری :- تہذیبی ترقی کے ابتدائی ادوار میں ظروف سازی کا فن کچھ زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا۔ ان ادوار میں ہاتھ کے بنائے ہوئے برتن استعمال کئے جاتے تھے۔ جو بناوٹ کے لحاظ سے فقط چند ہی قسم کے منقوش اور غیر منقوش برتنوں پر مشتمل تھے۔ اگرچہ چاک پر تیار کئے ہوئے برتن بھی بنائے جاتے تھے لیکن ان برتنوں پر نقاشی کا اسلوب کچھ زیادہ وسیع نہ تھا۔ لیکن تہذیب کے ترقی یافتہ دور میں چاک پر تیار کئے ہوئے برتن بیشمار برتنوں پر مشتمل تھے اور ان پر ایک دو یا کئی رنگوں

---

[1] :- PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO. 3 CASAL.
[2] :- ANCIENT INDIA STUART PIGGUT and ALSO EXCAVATIONS IN QUETTA VALLY - FAIRSERVIS.

سے نقاشی کی جاتی تھی جس کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ ان کی ساخت بھی نہایت
نفیس اور نازک ہوتی تھی۔ جن میں اَن گنت قسم کے نمائشی اور گھریلو استعمال
کے برتن شامل تھے۔ بعض برتن تو مختلف سائز کے سیٹوں پر مشتمل تھے۔ عموماً
برتنوں کی سطح پر یا ان کے اندر متوازی پٹیاں ڈال کر ان کے درمیانی حصوں
میں اَن گنت قسم کی ہندسی اشکال کی نقاشی کی جاتی تھی اور یہ ہندسی اشکال
مختلف پیرائے پر افقی، وتری، عمودی، آویزاں خطوط، شطرنجی خانوں، چھوٹے
بڑے مربعوں، نصف مربعوں۔ مدارجی گول یا بیضوی دائروں، نصف دائروں
مثلث نما معکوس یا متبادل کونوں، مستطیل اشکال، باریک متوازی خطوط اور
خطوط متقاطع لکیریوں اور لہریادار خطوط کی مدد سے مرتب کی جاتی تھیں
جو بڑی دیدہ زیب اور دل آویز ہوا کرتی تھیں۔ ان برتنوں کے اوپر ہندسی
اشکال کے ساتھ بیل بوٹوں اور حیوانوں کی نقاشی بھی کی جاتی تھی۔ نباتاتی
نقاشی میں پھول پتیوں کی نقاشی کے ساتھ پیپل کے پتوں کی مختلف پیرائے
میں نقاشی کی جاتی تھی۔ حیوانی نقاشی میں بیلوں (سانڈھوں) کی تصویر کشی میں
بڑا اہتمام دکھایا جاتا تھا۔ غالباً پیپل کے درختوں اور بیلوں کو قدیم زمانہ کے
لوگوں کے نزدیک مذہبی تقدس حاصل تھا۔ ان کے علاوہ پہاڑی بکروں
اور صحرائی غزالوں کی تصویر کشی بھی کی جاتی تھی۔ بعض حیوانوں کی نقاشی قدرتی
انداز میں کی جاتی تھی لیکن بعض حیوانوں کی نقاشی کے دوران ان میں شوخی
اور تصنع پیدا کیا جاتا تھا۔ پرندوں کی نقاشی میں بھی یہی طریقہ اختیار کر کے
بعض پرندوں کو قدرتی انداز میں اور بعض کو پرواز کی حالت میں دکھایا

جاتا تھا۔

حیوانوں کی نقاشی کا طریقہ یہ تھا کہ برتنوں کے اوپر متوازی پٹیاں ڈالنے کے بعد ان کی درمیانی حدود میں حیوانی اور ھندسی اشکال کے لئے علیحدہ علیحدہ خانے متعین کئے جاتے تھے۔ ان خانوں میں حیوانوں کی تصویر کا پورا خاکہ کھینچنے کے بعد اس کے اندرونی حصوں میں کوئی گہرا رنگ بھر دیا جاتا تھا اور حیوانوں کے خاکے سے باہر کی حدود میں کوئی ہلکا سا رنگ بھر دیا جاتا تھا یا پھر اسے خالی چھوڑ کر ہندسی اشکال کے خانوں کی تکمیل کی جاتی تھی جو حیوانوں کی تصویر کے لئے پس منظر کا کام دیتی تھیں۔ لیکن بعض اوقات حیوانوں کے خاکوں سے باہر کی حدود میں باریک متوازی خطوط کھینچ کر ان کو حیوانوں کی تصویروں کے خاکوں کے قریب تک اس انداز سے پھیلا دیا جاتا تھا کہ یہ خطوط ایک دوسرے کو کاٹنے کے بعد ایک جالی کی شکل اختیار کرتے تھے۔ حیوانوں کا رُخ عموماً دائیں طرف کو رکھ کر ان کو جارحانہ انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ یا پھر ان جانوروں کی تصویر کشی کرتے وقت ان کو آمنے سامنے یا مخالف سمتوں میں منقش کر کے ان کی تصویروں میں اس حد تک شوخی پیدا کی جاتی تھی کہ ان جانوروں کی دمیں اوپر کی طرف اٹھنے کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ الجھ جاتی تھیں، جس سے ایک غیر فطری کیفیت پیدا ہو جاتی تھی خال دار جانوروں میں چیتے کی نقاشی کے دوران بھی اس قسم کی شوخی پیدا کی جاتی تھی کہ اس کی دُم بل کھا کر اوپر کی جانب اٹھنے کے بعد اس کا سرا نیچے کی طرف خم کی صورت میں مڑ جایا کرتا تھا۔ اس قسم کی

بناوٹ. تصنع اور شوخی نال کلچر کی ظروف گلی کی حیوانی نقاشی میں اختیار کی جاتی تھی. کلی کلچر کی ظروف گلی کی نقاشی میں قدرتی انداز اختیار کیا جاتا تھا. بیلوں کی نقاشی کرتے وقت ان کے جسم کو غیر ضروری طوالت دی جاتی تھی. اس کی تھوتھنی چھوٹی ہوئی ہوتی تھی. اس کی سینگیں مدور اور گول اور اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور گول ہوتی تھیں. اسے نباتاتی نقاشی کے پس منظر میں لکڑی کی ایک خوبصورت میخ سے باندھا ہوا دکھایا جاتا تھا اور اس کی پشت پر ایک سفید جال بنا دی جاتی تھی. کلی کلچر کی حیوانی نقاشی میں پہاڑی بکروں اور غزالوں کی نقاشی قدرتی انداز میں کی جاتی تھی عموماً ان کے جسم بڑے لاغر نظر آتے تھے. کوئٹہ کلچر کی حیوانی نقاشی میں بیلوں کی آمنے سامنے تصویر کشی کر کے ان کے گول مدور سینگوں کو آپس میں کچھ اس انداز سے الجھایا جاتا تھا کہ وہ دونوں جانوروں کے درمیان ایک گول دائرہ کی صورت اختیار کرتی تھیں. عموماً بیلوں کی نقاشی میں ان کی سینگیں گول مدور ہوتی تھیں اور ان کے کوہان اوپر کی جانب اٹھے ہوئے نظر آتے تھے. بیلوں پہاڑی بکروں اور صحرائی غزالوں اور پرندوں کی تصویروں میں ان کے جسم پر ہندسی اشکال کی نقاشی کی جاتی تھی. بیلوں کے جسم پر عموماً سفید پٹیاں ڈالی جاتی تھیں مچھلیوں کی تصویر کشی کچھ اس انداز سے کی جاتی تھی کہ وہ پانی میں ہریالی کے درمیان ایک دوسرے کے پیچھے تیرتی ہوئی نظر آتی تھیں. برتنوں پر بل کھلتے ہوئے سانپوں کی تصویر کشی بھی کی جاتی تھی. بعض تصویروں میں ان کے دو سر منقش کیے جاتے تھے. بعض برتنوں پر اس قسم کے

خطوط ابھارے جاتے تھے جو بل کھاکر سانپوں کی شکل اختیار کرتے تھے۔ اس زمانہ میں سانپوں کو بھی غالباً مذہبی تقدس حاصل تھا۔

بعض برتنوں پر جبکہ وہ ابھی گیلے ہوتے تھے تانبہ کے ایک اوزار سے ان کی سطح پر مختلف انداز سے چھوٹے چھوٹے چھید یا ترچھی سیدھی لکیریں ڈالی جاتی تھیں یا پھر کنگھے کی قسم کے آلہ سے ان میں لکیریں ڈالی جاتی تھیں اور پکنے کے بعد اس قسم کے چھید یا لکیریں ان برتنوں کے لئے نقوش کا کام دیتی تھیں۔

ہندسی نقاشی میں زیادہ مقبول اس قسم کے دائرے تھے جن کی قوسیں ایک دوسرے کو چار جگہوں پر کاٹ کر پھول کی پتیوں کی شکل اختیار کرتے تھے

تانبہ کے برتنوں کا کوئی نمونہ دریافت نہیں ہوا ہے۔ البتہ سنگِ جراحت کے برتن اس زمانے میں ضرور بنائے جاتے تھے جو عموماً پیالوں پر مشتمل ہوتے تھے۔

(۲) ہتھیار اور اوزار :- تہذیبی ترقی کے ابتدائی مرحلوں میں پتھر کے ہلکے پھلکے چقماقی اوزار بنائے جاتے تھے جو ہلال نما، مربع منحرف یا مثلث اور تکونی ہتھیاروں پر مشتمل تھے۔ بمرور زمانہ ان ہلکے پھلکے ہتھیاروں کا استعمال کم ہوگیا اور ان کی جگہ پتھر کے لمبے ہتھیاروں نے لے لی۔ پتھر کی کلہاڑیاں اور تیشے ابتدا ہی سے مستعمل تھے جن میں ابتدائی حجری اوزاروں کا پہلو نمایاں تھا۔ درمیانی حجری اوزاروں میں چاقو چھرے، چھینی، چھیلنے اور کرچائی کے اوزار برمے اور پتھر کے گولے

شامل تھے جو غالباً ہتھوڑے کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ دھان کوٹنے کے لمبے اور موٹے اوزار، سوراخ کرنے کے اوزار اور ہتھیاروں میں تیر کے پھل قابلِ ذکر ہیں لیکن تہذیب کے ترقی یافتہ دور میں دھاتوں کا استعمال عام ہوگیا تھا۔ جس کی وجہ سے پتھر کے اوزار اور ہتھیار متروک ہو گئے تھے اور ان کی جگہ تانبہ اور کانسی کے ہتھیاروں نے لے لی تھی۔ ان اوزاروں اور ہتھیاروں میں چپٹی کلہاڑیاں، چاقو، چھرے، درانتیاں، آری، سوت کاتنے کے تکلے، منکے، سوراخ کرنے اور تراشنے کے برمے اور اوزار۔ ہتھیاروں کے زمرے میں خنجر، نیزوں کے پھل، بھالے اور تیروں کے پھل شامل ہیں۔ ہڈی کے اوزاروں میں چمڑہ میں سوراخ کرنے کے اوزار اور مخروطی قسم کے ایسے لمبے اوزار قابلِ ذکر ہیں۔ جو ایک سرے سے ذرا موٹے اور گول ہوتے تھے۔ دوسرا سرا بتدریج باریک ہو کر نوک کی صورت اختیار کرتا تھا۔ اس قسم کے ہتھیار غالباً پارچہ بافی میں استعمال کئے جاتے تھے۔ ہڈیوں سے چمچہ کی قسم کا ایک اوزار بھی بنایا جاتا تھا جو غالباً رنگ و روغن کی تیاری میں کام دیتا تھا۔ اس قسم کے ہتھیاروں اور اوزاروں کے نمونے تقریباً بلوچستان کی تمام قدیم بستیوں میں دریافت کئے گئے ہیں۔[1]

---

[1] :- EXCAVATIONS IN QUETTA VALLEY_ FAIRSERVIS AND ALSO EXCAVATIONS AND RECONNAISSANCE IN KALAT _ BEATRICE DE CARDI.

(۳) دوسری مصنوعات :- اس زمانہ میں سب سے اہم صنعت زیورات کی تھی۔ مٹی کی منقوش اور غیر منقوش چوڑیاں بڑے پیمانے پر بنائی اور استعمال کی جاتی تھیں۔ سیپ اور گھونگھے کی چوڑیاں بھی بنائی اور استعمال کی جاتی تھیں۔ بٹن پتھر کے بنائے جاتے تھے۔ منکوں کی صنعت بہت اہم تھی۔ منکے سنگِ لیشب، سنگِ سلیمان، عقیق، لاجورد، فیروزہ، سیپ اور گھونگے سے بنائے جاتے تھے جو عموماً ہار کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے۔ یہ عموماً گول چپٹے یا استوانی شکل کے ہوتے تھے۔ دھاگے میں پرونے کے لئے ان میں سوراخ بھی کیا جاتا تھا۔ بسبید میں بالاکوٹ کی بستی سے ہاتھی دانت کی چوڑیاں اور منکے دریافت ہوئے ہیں۔

مہریں :- قدیم زمانہ میں مہروں کا استعمال عام تھا۔ یہ مستطیل مربع، چپٹی شکل کی ہوتی تھیں۔ مہریں زیادہ تر مٹی کی بنائی جاتی تھیں۔ مٹی کے علاوہ ٹائیٹ اور تانبہ کی مہریں بھی بنائی جاتی تھیں۔ ان میں دھاگہ ڈالنے کے لئے لمبائی میں سوراخ بھی کیا جاتا تھا۔ بلوچستان کی قدیم بستیوں سے جو مہریں برآمد ہوئی ہیں ان پر کوئی تصویر یا تحریر موجود نہیں ہے بلکہ فقط ان پر ہندسی اشکال کندہ کی گئی ہیں۔

(۴) سامان آرائش :- کلی کی قدیم بستی سے سفید پتھر کے چھوٹے چھوٹے برتن دریافت کئے گئے تھے جن کا قطر دو تین انچ اور اونچائی چند انچ کے لگ بھگ تھی۔ ذرا بڑے برتنوں کا قطر چار انچ کے برابر تھا۔ ان میں چار چار خانے بنائے گئے تھے۔ ایک مربع نما برتن

چار خانوں پر مشتمل تھا۔ خیال ہے کہ قدیم زمانہ کے لوگ ان برتنوں میں
بناؤ سنگھار کی اشیاء یعنی کاجل کریم، سندور، تیل، عطریات وغیرہ رکھا
کرتے تھے۔ میہی کی قدیم بستی سے کانسی کے بنائے ہوئے دو گول آئینے
بھی دریافت کئے گئے تھے جن میں سے ایک آئینہ کے لئے انسانی مجسمہ
کی طرز پر نشست بنائی گئی تھی جس کے ہاتھ کولھوں پر رکھے ہوئے تھے
اس آئینے میں دیکھنے والے کے چہرے کا عکس اس انسانی مجسمہ کے لئے
سر کا کام دیتا تھا۔ یہاں سے بالوں میں لگانے کے دو پن بھی دریافت کئے
گئے ہیں جو کانسی کے بنے ہوئے ہیں۔ اور ان کے ایک سرے پر منکہ کا
چپٹا نگمہ بھی نصب کر دیا گیا تھا جو لاجورد سے تراش کر بنایا گیا تھا۔[۱]

(۵) **کھلونے**:۔ قدیم زمانہ کے لوگ بھی بچوں کے لئے کھلونے
بنانے کا شوق رکھتے تھے۔ ان میں مکانوں کے ماڈل جن میں دروازہ اور
کھڑکیاں ہوتی تھیں۔ جھنجھنے، گڑیاں، سیٹی دینے والی چڑیاں اور بیل
گاڑیاں قابل ذکر ہیں۔ یہ سب کے سب مٹی سے بنائے جاتے تھے جھنجھنو
میں کئی چھوٹے چھوٹے سوراخ کرکے ان کے گرد ایک دائرہ منقش کیا
جاتا تھا اور ان کے اندر پکنے سے پہلے باریک پتھر ڈالے جاتے تھے اور
پکنے کے بعد یہ بجتے تھے۔ اسی طرح سیٹیوں میں پھونک مار کر آواز پیدا کی
جاتی تھی۔ مکانوں کے ماڈل بھی منقش ہوتے تھے جن میں روشن دان اور

---

[۱] ANCIENT INDIA BY STUART PIGGUT.

دریچے بھی ہوا کرتے تھے۔ ؎

(۶) کھیل :۔ کھیلوں کے زمرے میں فقط اسٹاپو کے شواہد دریافت ہوئے ہیں جو عموماً پختہ مٹی کے بنائے جاتے تھے۔

سواری اور باربرداری کے جانور

قدیم زمانہ کے جانوروں میں غالباً بیلوں اور سانڈھوں کو مذہبی اعتبار سے تقدس حاصل تھا جس کی وجہ سے قدیم زمانہ کے لوگ اپنے برتنوں پر ان کی تصویر کشی اور ان کے مجسموں کی تیاری میں بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ اگرچہ برتنوں پر گھوڑوں، اونٹوں اور گدھوں کی تصویر کشی نہیں کی جاتی تھی۔ لیکن ان جانوروں کے مجسمے قدیم بستیوں سے دریافت ہوئے ہیں۔ خیال ہے کہ تہذیبی ترقی کے ابتدائی مرحلوں ہی سے گھوڑے، گدھے اور اونٹ سواری اور باربرداری کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ پیرک کی قدیم بستی سے جو سبی کے قریب واقع ہے۔ گھوڑوں کے منقوش مجسمے دریافت ہوئے ہیں۔ اونٹوں کے مجسمے دو کوہان والے اونٹوں (ڈبیرک) پر مشتمل تھے۔ دو کوہان والے اونٹ زیادہ طاقتور اور قوی ہوتے ہیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں یہ شاذ و نادر ہی باربرداری یا سواری کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ گھوڑے کے مجسمے وادی کوئٹہ میں

؎ EXCAVATIONS IN QUETT VALLEY BY FAIRSERVIS.

دمب سادات سے بھی دریافت کئے گئے تھے۔[1] پیر گڑھ کی قدیم بستی سے بھینس کے شواہد بھی دریافت ہوئے ہیں۔

قومیت

علم الآثار کے ممتاز ماہر ہارگریوز نے نال کے مدفن سے ایک ایسا کاسۂ سر دریافت کیا تھا جس پر موم کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس کاسۂ سر کی پیمائش کی گئی اس کی لمبائی چوڑائی کا انڈکس ستر کا عدد تھا۔ عراق میں کش کے مدفن سے برآمد شدہ کاسۂ سروں کی لمبائی چوڑائی کا انڈکس بھی یہی ستر تھا۔ گویا یہ کاسۂ سر ڈولیچو سفالک گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ بلوچستان کے قدیم زمانہ کے باشندے بحیرہ رومی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نسل کے لوگ اس زمانہ میں عراق سے لے کر ہندوستان تک پھیلے ہوئے تھے۔[2]

ہمسایہ ممالک سے روابط

زمانہ جدید میں درہ بولان رابطے کے ایک وسیلہ کے طور پر بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس کے کردار سے شمالی بلوچستان اور خصوصاً

---

[1] PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO.7 PAGE 90 PRIMTONERY REPORT OF EXCAVATIONS AT PIRAK BY MONS JEAN-MARIE CASAL.

[2] MIEMORES ON EXCAVATION AT SORDAMB NAL - HARGREAVES.

وادی کوئٹہ کے آثار قدیمہ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جو ایک طرف بلوچستان اور دوسری طرف سطح مرتفع ایران ، افغانستان اور سندھ کے درمیان ان علاقوں کے باہمی تعلقات کے مطالعہ کا موجب بن سکتے ہیں ۔ لیکن فیر سروس کا خیال ہے کہ آثاری شواہد سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شمالی بلوچستان کے تعلقات افغانستان، سندھ اور پنجاب کی بجائے جنوبی بلوچستان اور سیستان سے قائم تھے ۔ اس زمانہ میں جنوبی بلوچستان کا رابطہ عراق سے بھی قائم تھا ۔ اس زمانہ میں جنوبی بلوچستان کے کل کلچر کے باشندے بناؤ سنگھار کی اشیاء رکھنے کی خاطر چار خانوں پر مشتمل سفید پتھر کے جو خوبصورت برتن بناتے تھے ان کا ایک نمونہ ایک عراقی شہزادی کی قبر سے برآمد کیا گیا تھا ۔ خیال ہے کہ جدید دور ہی میں انگریزوں کی فوجی حکمت عملی کی بنا پر درہ بولان کی اہمیت بڑھ گئی تھی ۔ ورنہ آثار و شواہد سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں شرقی اور شمالی درے ہی متذکرہ بالا علاقوں کے درمیان رابطہ کے وسیلہ کی حیثیت سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے [۱]

بنیادی تبدیلیوں کے آثار

اگرچہ بھیڑ بکریاں اور مویشی تہذیبی ترقی کے آخری دور میں بدستور اہمیت کے مالک تھے ۔ لیکن اغلب ہے کہ اس دور میں زراعت کا کاروبار

ا :- EXCAVATIONS IN QUETTA VALLEY

PAGE NO. 359 BY FAIRSERVICE .

اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ ماتا دیوی کے چھوٹے چھوٹے مجسموں سے جو زرخیزی
پرستی کی علامات تصور کئے جاتے ہیں۔ زراعت کے کردار کی اہمیت
بڑھ جاتی ہے۔ اگرچہ زرعی پیداوار کے زمرے میں بہت کم شواہد دریافت
ہوئے ہیں لیکن گمان غالب ہے کہ اُس زمانے میں گندم اور جو کی کاشت
ہوتی تھی۔ سنہ ۲ ہزار قبل مسیح کے لگ بھگ چاول کی کاشت کے شواہد بھی دریافت
ہوئے ہیں۔ یہ زراعت پر کامل انحصار اور زرخیزی کے مذہبی شعار سے جو
زراعت پر کلیتاً تکیہ کرنے کا نتیجہ اور اس سے ماخوذ تھا۔ آگے چل کر مذہبی
رسومات کی ہیئت میں وسعت پیدا ہوگئی جو بلوچستان کے زمانہ ماقبل
تاریخ کے آخری دور کے آخری زمانہ کا طرہ امتیاز تھا۔ ماتا دیوی کے مجسموں
سانڈھوں کے مجسموں، معبد خانوں کی بلند و بالا اور وسیع عمارات، ایک انسانی
قربانی ایک مذہبی عمارت اور اس میں دو موریوں کی موجودگی جسے
ایک چھوٹے سے تہ خانہ نے تقدس بخشا تھا۔ ایسے شواہد ہیں کہ جن سے
مذہبی رسومات میں وسعت کی حدود کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے کلچر کی اس
ماہیت سے کہ جس کے تحت مذہبی رسومات میں وسعت پیدا ہوگئی ایک
بنیادی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے جو اس زمانہ میں بلوچستان میں واقع ہوئی تھی [1]

ایرانی اثرات

پیشتر ازیں پچھلے اوراق میں مصنوعات کے جن اجتماعات پر بحث

لے۔ EXCAVATIONS IN QUETTA VALLEY —
FAIRSERVIS. تر ABID.

کی گئی ہے وہ ایران سے ماخوذ تھے۔ یہ سچ ہے کہ برتنوں پر نقاشی کے بعض عناصر اس قسم کے اسلوب نقاشی سے ماخوذ ہیں جو تہذیب وادی سندھ کی خصوصیات میں سے ہیں۔ مثلاً برما بیل اور پیپل کے پتوں کی نقاشی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ سطح مرتفع ایران کے پہاڑی بکروں اور صحرائی غزالوں کی نقاشی بھی کی جاتی تھی۔ اس کا ایرانی رخ پوری طرح عیاں اور واضح ہے۔ بلوچی کوزہ گری کی ایرانی خصوصیت ان مسلسل رابطوں سے اور زیادہ بڑھ گئی تھی جو ایک طرف شمالی اور جنوبی بلوچستان اور دوسری طرف سیستان میں ایرانی کلچروں کے ساتھ قائم و دائم چلا آتا تھا اس قسم کی خصوصی ظروف گری کی وسیع پیمانے پر تقسیم سے جیسا کہ نال کوئٹہ اور آمری کی ظروف گری کی ہے۔ ان رابطوں کی وسعت کی پوری طرح نشان دہی ہوتی ہے۔[1]

مقامیت پرستی کا رجحان

اگرچہ یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ یہاں کے فنِ کوزہ گری پر ایران کے اثرات بڑے پیمانے پر مرتب ہوئے تھے لیکن بلوچستان میں ایک دوسرا عامل بھی فن پر بہت کچھ اثر انداز ہونے میں ممد و معاون ثابت ہوا تھا۔ یہ عامل مقامیت پرستی کا رجحان تھا۔ بلوچستان کے جغرافیائی حالات

---

[1] EXCANATION IN QUETTA VALLEY – SUMMARY BY FAIRSERVIS.

کے متعلق عام خیال کے برعکس یہاں بہت کم علاقے ایسے ہوں گے جنہیں
الگ تھلگ شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس تقریباً تمام زرخیز علاقے
نہایت آسان تجارتی راستوں سے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط چلے
آتے ہیں لہٰذا یہ بات مسلمہ ہے کہ مقامیت پرستی کا رجحان پیدا کرنے میں
جغرافیائی علیحدگی کو کوئی دخل حاصل نہ تھا بلکہ تہذیبی عوامل مثلاً علاقائی
سیاست، نکاسں کے اقتصادی راستے اور سماجی وفاداریاں ہی وہ عوامل
تھے جنہوں نے زمانہ ماقبل تاریخ کے نسبتاً یکساں تہذیبی پہلو پر اپنا یہ
اثر ڈالا تھا۔ تہذیبی ترقی کے آخری دو ادوار کے وسط میں مقامیت پرستی
کا رجحان بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ کیونکہ اس قسم کا رجحان مقامی اسالیب
میں کسی قسم کی سخت تبدیلی کے بغیر ہی رابطہ کی اجازت دیتا تھا مصنوعات
کے اس مجموعہ سے جن کی بنیاد ایران کی تہذیبی روایات پر استوار ہے حیران
کن انداز سے شاخیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ ہر ایک مقامی اکائی اپنی ابتدائی
صورت اپنی ایرانی وراثت سے حاصل کرتی ہے۔ ژوب لورالائی میں سب
سے زیادہ قوی حصہ اس قسم کی ظروف گلی پر مشتمل ہے جن کی سُرخ زمین
پر سیاہ رنگ میں نقاشی کی جاتی تھی اور یہی وہ ظروف گلی ہے کہ سب سے
پہلے کمہار کی چاک پر تیار ہونے لگی تھی۔ آمری روایت وادی کوئٹہ، جنوبی
بلوچستان اور سندھ میں سب سے زیادہ قوی ہے۔ ایران کے متاخر دور
کی کوزہ گری کے اسلوب نقاشی کو وادی کوئٹہ میں خاص طریقہ سے کام میں
لایا جاتا تھا جنوبی بلوچستان میں دو رنگوں سے منقوش ظروف گلی اپنا خاص

مقام رکھتی ہے۔ سندھ میں ہڑپہ کلچر سے متعلق سُرخ زمین پر سیاہ رنگ سے منقوش ظروف اپنے مخصوص نباتاتی ڈیزائنوں کے ساتھ منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ ان تینوں علاقوں کے برتنوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ بلوچستان میں فقط دوسرے امور میں فرق کی علامت قرار دیا جاسکتا ہے۔ جو غالباً مذہبی سومات سیاست اور مصنوعات کے فن سے تعلق رکھتے تھے۔ سندھ میں یہ اسالیب بتدریج مقامی کلچر میں مدغم ہو گئے۔ وادی سندھ میں اس کلچر کی بنیاد اس معیشت پر رکھی ہوئی تھی۔ جس کا تعلق ہندوستان کے گرم مرطوب منطقہ سے تھا۔ غالباً ادغام کا ایک وسیع عمل شروع ہوا جس کا نتیجہ ہڑپہ تہذیب کی صورت میں نمودار ہوا۔[1]

یہی وہ نکتہ ہے جس کی بنا پر وادیٔ کوئٹہ کی تہذیبی ترقی، آخری دور میں مذہبی رسومات اور دوسرے امور میں وسعت پیدا ہونے کے مطلب و معنی پوری طرح واضح ہوجاتے ہیں۔ اس مرحلہ پر کلچر کی ایرانی خصوصیات سوسائٹی سے مفقود ہوجاتی ہیں اور ایک دوسری خصوصیت جو ہندوستانی اثرات پر مشتمل ہے۔ مذہبی رسومات، تعمیرات اور مصنوعات میں اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ بلوچستان میں ان کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ یہ اثرات ایک طرف جنوبی بلوچستان میں کلی اور مہی پر اور دوسری طرف شمال میں دابر کوٹ

ا۔ EXCAVATIONS IN QUETTA VALLEY - SUMMARY BY FAIRSERVIS.

پر براہ راست تھے۔ ان اثرات سے زراعت پر اس سے کہیں زیادہ تکیہ
کرنے کا رجحان پیدا ہوا جتنا کہ یہاں کے وسائل اس کی اجازت دے سکتے
تھے۔ اس مرحلہ پر ایک طویل اور شدید قحط اور خشک سالی نے کہ جس کا
زور رسوماتی قربانیوں سے بھی نہ ٹوٹ سکا۔ آریوں کے مسلح حملوں سے پیشتر
ہی زندگی کے اقتصادی وسائل کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ بات یقینی ہے
کہ اس زمانہ میں جو لوگ بھی حملہ آوروں کی صورت میں بلوچستان میں داخل
ہوئے تھے۔ انہوں نے بلوچستان کی سرزمین کو لوٹ مار کے لئے منفعت
بخش نہ پایا ہوگا۔ [۱]

تازہ آبادیوں کا ورود

دو ہزار سال قبل مسیح کے اوائل میں مغرب کی طرف سے ایک تازہ
آبادی وادی کیچ میں وارد ہوئی اور مکران سے کلی کلچر کا خاتمہ کر کے اپنی
تہذیبی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اس تازہ آبادی کے شواہد وادی کیچ میں
شاہی تمپ کی قدیم بستی سے دریافت کئے گئے ہیں۔ وہ دھاتوں کے
استعمال سے پوری طرح واقف تھے اور تانبہ اور کانسی کے ہتھیار اور اوزار
استعمال کرتے تھے۔ وہ تانبہ کی مہریں بناتے تھے۔ ان کے برتنوں کی ساخت
ناقص اور بناوٹ فقط چند برتنوں تک محدود تھی۔ اور ان کی نقاشی کا اسلوب

۱:- EXCAVATIONS IN QUETTA VALLEY -
SUMMARY BY FAIRSERVIS.

بھی فقط چند ہی ہندسی اشکال تک محدود تھا۔ شاہی تمپ کے مدفن سے ایسی کئی لاشیں ملی ہیں۔ جن کے ساتھ بے شمار برتن اور شام غریباں کا کھانا دفن کر دیا گیا تھا۔ ایک لاش کے ساتھ پچاس تک برتن دفن کر دیئے گئے تھے ایک جنگجو شخص کے ساتھ اس کی کلہاڑی اور نیزہ بھی دفن کئے ہوئے ملے تھے۔[1]

سقوط تہذیب کے بعد ایک طرف لورالائی اور کچھی میں اور دوسری طرف لسبیلہ اور مکران کے ساحلی علاقوں میں ہڑپہ کلچر کے لوگوں نے وارد ہو کر ساحلی پٹی کی بندرگاہوں پر قبضہ کر کے اپنی تہذیبی سرگرمیاں شروع کی تھیں اگرچہ راناغنڈی کی قدیم بستی کے دورِ چہارم میں آتش زنی، لوٹ مار اور قتل و غارت کے آثار دریافت ہوئے ہیں۔ یہی کیفیت لورالائی میں دابرکوٹ میں پائی گئی ہے۔ لیکن لسبیلہ میں نال کلچر اور ہڑپہ کلچر کی آبادیوں کے درمیان پانچسو سال کا ایک خلا معلوم کر لیا گیا تھا۔ اسی طرح کچھی میں مہرگڑھ کی قدیم بستی اور نوشیرو کی قدیم بستیاں ایک دوسرے سے قریب ہی واقع ہیں۔ نوشیرو کی قدیم بستی کی سطح پر ہڑپہ کلچر کی باقیات موجود ہیں۔ لیکن مہرگڑھ کی قدیم بستی کے باشندوں کے ساتھ کسی قسم کے رابطے کے آثار دریافت نہیں ہوئے ہیں۔ فیرسروس کا خیال ہے کہ بلوچستان کی سوسائٹیوں کے معدوم ہونے کے بعد ہی ہڑپہ کلچر کے لوگ ان علاقوں میں وارد ہوئے تھے۔[2]

---

۱ ANCIENT INDIA - STUART PIGGUT.

۲ EXCAVATION IN QUETTA VALLEY - FAIRSERVIS.

مندرجہ بالا قحط اور خشک سالی کے بعد بلوچستان کی آبادی میں یک لخت کمی واقع ہوئی جس کے شواہد وادی کوئٹہ سے دریافت کیے گئے ہیں اور ایک طویل عرصہ کے بعد اسلامی فتوحات کے دور ہی میں جبکہ یہاں ایسے لوگ وارد ہو گئے جو انجینئری کے فن میں بڑے ماہر تھے یہاں کے آبی وسائل دوبارہ بحال کر دیئے گئے اور آبادی میں دوبارہ اضافہ ہو گیا اور وہ اتنی گنجان ہو گئی جتنی زمانہ ماقبل تاریخ کے ترقی یافتہ اور خوشحال ادوار میں تھی۔[1]

باور کیا جاتا ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح میں ایران اور ہندوستان پر آریوں کے حملے شروع ہو گئے تھے اور ان کی ایک شاخ گدروزیائی نے بلوچستان کے سمندر سے بہرہ مند کوہستانی وادیوں میں داخل ہو کر یہاں سکونت اختیار کر لی تھی۔ لیکن علم الآثار کے بل بوتے پر بلوچستان میں آریوں کی کوئی بستی دریافت نہیں ہوئی ہے۔

---

[1] ۱- EXCAVATIONS IN QUETTA VALLEY — FAIRSERVIS.

چوتھا باب

آریا

اگرچہ آریوں کے اصلی وطن کے بارے میں جہاں سے یہ لوگ پہلے پہل روانہ ہوئے تھے مورخین میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے. لیکن اس کے باوجود کچھ اس قسم کی علامات اور اشارات موجود ہیں جن سے اس معاملہ میں کچھ نہ کچھ رہنمائی ہوتی ہے. آریا قبائل درحقیقت ایک ایسے خطہ میں بود و باش رکھتے تھے جس کی آب و ہوا بری تھی کیونکہ وہ لوگ سال میں فقط دو یا تین موسموں سے واقف تھے ان کی زبان سے ظاہر ہے کہ وہ سٹیپ کی طرح کے ایک لق و دق میدانی علاقے میں سکونت پذیر تھے. جہاں نہ پہاڑ تھے. اور نہ بڑے بڑے جنگل بلکہ اس علاقے میں فقط صنوبر اور بید مجنوں کے درخت نشو و نما پا سکتے تھے. ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ آریا لوگ شمال کی جانب سے وارد ہوئے تھے. چونکہ اس قسم کے خانہ بدوش قبائل عموماً ایک وسیع خطہ میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں. لہذا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا اصلی وطن خراسان کے عین شمال میں سٹیپ کے میدانوں کے مغربی جانب واقع تھا. جو اس زمانہ میں غالباً ایک زرخیز علاقہ تھا اور یہ علاقہ جنوبی روس کے

میدانوں سے متصل ہونے کے علاوہ ان سے بہت کچھ مشابہت رکھتا تھا جہاں پانی کے وسائل زیادہ بہتر تھے۔ بعض دوسرے مورخین کا خیال ہے کہ بحیرہ کیسپین کے جنوبی اضلاع ہی ان کا اصلی وطن تھا۔[۱]

آریوں کی ایرانی شاخ جو اسی زمانہ میں اپنے اصلی وطن سے روانہ ہونے کے بعد ایران کے طول وعرض میں پھیل گئی تھی سب سے پہلے تہذیب وتمدن سے آشنا ہوئی۔ یہ لوگ ایک خدائے واحد لاشریک پر اعتقاد رکھتے تھے۔ آریوں کی اپنی ایک روایت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے اصلی وطن کو اس بنا پر ترک کر دیا تھا کہ بدی کی طاقتوں نے اسے ایک برفانی علاقہ بنا کر سکونت کے ناقابل بنا دیا تھا۔ خیال ہے کہ ان کے اصلی وطن کی آب وہوا میں اس قسم کی تبدیلی واقع ہوئی کہ وہاں برف معمول سے زیادہ پڑنے لگی اور شدید برفباری کی وجہ سے وہ علاقہ اس قدر زیادہ سرد ہو گیا کہ اس کے نتیجے میں آریا قبائل کو اپنے اصلی وطن سے ہجرت اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اسی طرح جس طرح کہ قحط اور طویل خشک سالی کی وجہ سے بعض منگول قبائل اپنے اصلی وطن سے مغرب کی طرف زیادہ سرسبز وشاداب علاقوں میں نقل مکانی اور ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور ان ممالک کی ترقی یافتہ تہذیب وتمدن کو تباہ وبرباد کر دیا جن کو انہوں نے اپنی ہجرت کے دوران اتفاقاً روند ڈالا تھا۔[۲]

---

[۱] [۲] HISTORY OF PERSIA - SYKS.

آریوں کی بعض روایات سے ان کے اصلی وطن کا حوالہ بھی ملتا ہے جس کو وہ لوگ آریانم ۔ دائیجو کا نام دیتے تھے جب شدید برفباری نے ان کو اپنی ارضی جنت چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تو وہ لوگ سب سے پہلے سگدا (سگدیانا) اور مورو (مرگیانا) میں داخل ہو گئے جو موجودہ زمانہ میں بخارا اور مرد کہلاتے ہیں۔ ٹڈی دل نے ان کو سگدا سے نکال باہر کر دیا اور مخالف قبائل نے ان کو بخدیا کی طرف دھکیل دیا جس کا مطلب اونچے پرچموں کا ملک ہے۔ بخدیا یعنی بلخ سے نسایا کی طرف انہوں نے اپنی نقل وحرکت جاری رکھی جو عسکر آباد کے جنوب میں واقع تھا اور اپنے اس طویل سفر کے مزید مرحلوں میں وہ لوگ ہارویو (ہرات) اور وائیکریتا (کابل) جا پہنچے جو مجروح کرنے والے سایوں کی سرزمین تھی۔[1]

بعد کے وقائع نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے ان ممالک کو جہاں پہلے پہل آریوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان ممالک میں سے ایک گروہ آراوائیتی (اراخوزیا) ہائیومنت (ہلمند) اور ہپتا ہندو یعنی پنجاب پر مشتمل تھا اور دوسرے گروہ میں اردوا (طوس) دہرکانا (گرگان) رہگیا (رے) ورینا (گیلان) اور مغرب میں بعض دوسرے اضلاع شامل تھے۔ اس تقسیم سے غالباً ایرانی اور ہندی آریوں میں امتیاز پیدا کرنا مقصود تھا۔[2]

ئے:- A HISTORY OF PERSIA _ SYKES.

ئے ABID

باور کیا جاتا ہے کہ ماد جنوبی روس ہی سے ایران میں داخل ہوئے تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ ارارتو (ارارات) کی سلطنت نہایت مستحکم اور ناقابل تسخیر ہے تو وہ اس سے ہٹ کر آگے بڑھے اور سطح مرتفع ایران کے مغربی دامن میں آباد ہو گئے۔ اور وہاں سے خلیج فارس تک پھیل گئے۔ آریوں کا ایک دوسرا گروہ جو پارسی تھا خراسان کے شمال میں واقع سٹیپ کے میدانوں سے روانہ ہونے کے بعد ایران میں داخل ہوا۔۔۔ اس کے بعد یہ پارسی کرمان کے صوبے کو عبور کر کے زندہ رود کے قرب و جوار سے ہو کر پارس میں وارد ہوئے جہاں ماد پہلے ہی سے سکونت اختیار کر کے خلیج فارس تک پھیل گئے تھے۔ آریوں کی ایک تیسری شاخ ایریا باختر سے جنوب مشرق کا رخ اختیار کر کے کوہ ہندوکش کو عبور کرنے کے بعد حملہ آوروں کی حیثیت سے پنجاب میں داخل ہو گئی اور اسے فتح کر لیا۔[1]

آریوں کے ان تینوں بڑے گروہوں کے پیچھے ہر کانی (گرگانی) چلے آئے اور آگے بڑھ کر استر آباد کے جدید ضلع میں فروکش ہوئے اور اسی علاقے میں سکونت اختیار کر لی۔ اسی اثنا میں پارسیوں کے پیچھے پیچھے کارمانی وارد ہوئے اور اس عظیم صوبے کو اپنا وطن قرار دیا جو ابھی تک ان کی مناسبت سے کرمان کہلاتا ہے۔ اس کے بعد ونگیانائی، اراخوزی اور گدروزیائی قبیلوں کا کارواں چلا آیا۔ یہ قبیلے (ونگیانا) سیستان، اور جدید

---

[1] A HISTORY OF PERSIA - SYKES.

بلوچستان اور جنوبی افغانستان کے ایک بڑے حصے پر آباد ہو گئے۔ آخر میں مرو کے مرگیانا اور بلخ کے باختری قبائل وارد ہوئے اور انہی ناموں کے علاقوں میں مستقل سکونت اختیار کر لی[1]

خیال کیا جاتا ہے کہ آریانم۔ وائیجو سے مراد آذربائیجان (اترا پاتن) کا شمالی علاقہ ہے۔ لیکن ممتاز مورخ مارگا اس نظریئے کا بڑا سخت مخالف ہے اس کا موقف یہ ہے کہ اگر آریا قبائل آذربائیجان کے شمالی علاقہ کے باشندے تھے۔ تو اس صورت میں ان کا رابطہ آرمینیا کے باشندوں کے ساتھ قائم ہونا ضروری تھا جو لکھنے اور پڑھنے کے فن سے آشنا اور نسبتاً زیادہ مہذب اور متمدن تھے۔[2]

آریا حملہ آور، غیر متمدن، غیر مہذب، خانہ بدوش قبائل پر مشتمل تھے جن کی معیشت کا دارومدار کلیتاً گلہ بانی پر تھا۔ وہ گھوڑے، دوسرے مویشی بھیڑ بکریوں کے بڑے بڑے ریوڑ اور نگہبان کتے رکھتے تھے وہ ایک قسم کی بھدی بھاری گاڑیوں میں سفر کرتے تھے کہ جن کے ورے اور پہیے نہایت ناقص طریقے پر ایک ہی لکڑی کے تنے سے تراش کر بنائے جاتے تھے۔ یہ ایک قسم کی ناقص سواری تھی۔ شادی کا دستور یہ تھا کہ دلہن کو دولہا اغوا کیکے لے جاتا تھا۔ خاندان کی بنیاد پدر سری نظام پر رکھی ہوئی تھی۔ آریوں

---

[1] A HITORY OF PERSIA - SYKES.

[2] ABID.

میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا رواج تھا۔ وہ ایک قسم کا نشہ آور مشروب سوم رس پیا کرتے تھے جو گھوڑی کے دودھ سے تیار کیا جاتا تھا۔ وہ لوگ سونا چاندی، الیکڑم، تانبہ اور کانسی کے استعمال سے واقف تھے۔ ان کی نقاشی چند مختصر اور سادہ، ہندسی خطوط اور تصویر کشی تک محدود تھی وہ لکھنے پڑھنے کے فن سے بالکل بے بہرہ تھے انہوں نے رفتہ رفتہ بتدریج بادیہ گردی اور صحرانوردی ترک کرکے وہ نشینی اختیار کرلی اور بمرور زمانہ رفتہ رفتہ زراعت اور کاشتکاری کا فن بھی سیکھ لیا۔ انہوں نے بمرور زمانہ گاؤں اور قصبے تعمیر کیے۔ ان میں سے کئی بستیوں نے رفتہ رفتہ بتدریج شہروں کی صورت اختیار کرلی۔ وہ لکھنے پڑھنے کے فن سے بھی واقف ہوگئے۔[۱]

یہ آریا قبائل ایسے خاندانوں کا مجموعہ ہوتے تھے۔ جن کا باہمی ربط و ضبط بڑا ڈھیلا ڈھالا ہوتا تھا لیکن خطرے کے وقت یہ لوگ بڑی عجلت کے ساتھ باہم متحد ہوجایا کرتے تھے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ وہ نہایت اچھے شاہسوار تھے اور بلا کی جنگجویانہ صلاحیت رکھتے تھے۔[۲]

آریوں کے ابتدائی دور کی سماجی سرگرمیوں پر نظر دوڑانے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ان کی عبادت فقط حمد و ثنا اور دعا و مناجات تک محدود تھی۔ وہ مناظر قدرت کی پرستش کیا کرتے تھے۔ مثلاً روشن آسمان روشنی، آگ، ہوائیں، آسمانی بجلی اور بارش ان کے نزدیک مافوق الفطرت

۱ھ:- A HISTORY OF PERSIA _ SYKES.

۲ھ:- ABID

ہستیوں کی حیثیت رکھتی تھی ۔ اس کے برعکس قحط اور تاریکی ارواحِ بد یا شیطانی قوتوں کا مظہر تھی ۔ اس نظامِ کثرت پرستی میں آسمان کو بڑی فوقیت حاصل تھی۔ سورج ان کے عقیدہ کے مطابق آسمان کی آنکھ کے مترادف تھا اور آسمانی بجلی کو آسمان کا بیٹا تصور کیا جاتا تھا۔ آریا لوگ بدی کی قوتوں کی ابدیت میں اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ اس کے برعکس ان کا عقیدہ تھا کہ نیکی کی قوتیں بدی کی قوتوں کا مقابلہ کر کے ان پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ لیکن ایسا کرنے کے لئے نیکی کی قوتوں کو عام لوگوں کی حیوانی قربانیوں، حمد و ثنا، دعا و مناجات اور مقدس ہوم رس کے نذرانوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ عام لوگ یہ امور سرانجام دے کر بابرکت دیوتاؤں کی مدد کرتے ہیں جو ان کی طرف سے قحط اور تاریکی کی قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار ہو کر ان کو شکست دینے میں مصروفِ کار تھے۔[۱]

روشن آسمان کے ساتھ دوسری وابستہ قوت نیلگوں فلک تھی جس کو میتھرا کے روپ میں تشخص کا جامہ پہنایا گیا تھا۔ فضائے بسیط اور آسمان دونوں سمیعٌ بصیر تھے جو ہر بات کو سننے اور ہر چیز کو دیکھنے کی بدرجہ اُتم صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ آگ کی اصلی صورت آسمانی بجلی تھی جو اس جنگ میں جو روشنی اور تاریکی کی قوتوں

۱۔ A HISTORY OF PERSIA - SYKES.

کے درمیان جاری تھی ایک ابدی کردار ادا کرتی تھی۔ یہی وہ قدرتی مناظر تھے جن کی تعریف و توصیف کو آریا لوگ اپنی شاعری کا موضوع بنا کر اپنی فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

ایرانی اور ہندی مقدس کتابوں میں دیوتا کے لیے ایک اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً ایک نام آسوری تھا جو برتر و بالا کے معنی دیتا ہے۔ یہ سنسکرت میں آسورا اور اوستا کی زبان میں آہرا کہلاتا ہے۔ اسی طرح ایک نام دائیوا تھا۔ یہ سنسکرت میں دیوا اور اوستا کی زبان میں دیو استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی آسمانی ہستی کے ہیں۔[1]

ویدوں کے ابتدائی زمانہ میں بھی دیوتاؤں کے دو گروہوں اہُرا اور دائیوا کے متعلق عام عقیدہ تھا کہ یہ دیوتا قبائلیوں کی جانب سے تقدس پانے کے معاملے میں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ ہندوستان میں دائیوا کو برتری حاصل ہوگئی اور آسورا کو بدی کا دیوتا تصور کیا جانے لگا۔ اس کے برعکس ایران میں اہُرا کو برتری حاصل ہوگئی اور یہ اہُرا کے متعلق تھا کہ جس کے زمرے میں ایرانیوں کے مذہبی شعور میں وسعت پیدا ہوگئی اور دیو کو وہی درجہ دیا گیا جو ہندوستان میں آسورا کو حاصل ہوا۔[2]

ویدوں میں ابتدائی دور کے آریا قبائل کی سیاسی اور عسکری سرگرمیوں

---

[1] :- HISTORY OF PERSIA _ SYKES.

[2] ABID

کا بھی کچھ نہ کچھ ذکر ملتا ہے۔ ان میں سب سے اہم واقعہ دسوں کی جنگ ہے۔ آریوں کے دس قبیلوں نے جو دریائے سندھ کے دونوں طرف آباد تھے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک دشمن قوم کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا تھا اور ایک خونریز جنگ میں اسے عبرت ناک شکست دی تھی۔ یہ دشمن ملک یا قوم ہندوستان کے اصلی باشندوں کے ہو سکتے تھے جن کو آریا لوگ داسیو یعنی دیسی کہہ کر پکارتے تھے اور جن کو وہ ملیچھ خیال کرتے تھے۔ یہ لڑائی ایک دریا کے کنارے ہوئی تھی جو پروشنی کہلاتا تھا۔ یہ دریا غالباً راوی تھا۔ دسوں کی جنگ کے سلسلے میں ویدوں میں آریوں کے جن دس قبیلوں کا ذکر ملتا ہے وہ یہ تھے۔

(۱) اَکِی نا (۲) بھالانا (۳) درھوتو (۴) پیوا (۵) وشانان (۶) یادو (۷) پورو (۸) آنو (۹) توروا شا (۱۰) پکتا۔[۱]

ویدوں میں آریوں کی جانب سے ہندوستان کے اصلی باشندوں کا جس نفرت انگیز الفاظ میں ذکر ملتا ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ آریوں نے ہنپا ہند و فتح کر کے وہاں کے اصلی باشندوں کو زیر کرنے میں بربریت کا مظاہرہ کیا تھا اور ان کے تمام سیاسی و سماجی اداروں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا لیکن ویدوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کے اصلی باشندوں نے بیرونی حملوں سے بچاؤ کی خاطر ہی ہر قسم کے انتظامات

---

[۱] تاریخ افغانستان۔ احمد علی کہزاد

کر رکھے تھے اور ان کو زیر کرنے میں آریوں کو بڑی دقت پیش آئی تھی۔ مثلاً رگ وید میں ان بستیوں کے لئے جن کو آریوں نے تاخت و تاراج کیا تھا پور کا لفظ ملتا ہے جس کا مطلب شہر پناہ کے اندر بسی ہوئی آبادی یا قلعہ کے ہیں۔ ایک شہر کو پرتھوی (وسیع) اور یوروی (چوڑا) کہا گیا ہے۔ بعض قلعوں کو فولاد کا بنا ہوا یعنی نہایت مضبوط اور مستحکم بتایا گیا ہے۔ بعض قلعوں کو ست بھوجا یعنی سو دیواروں والا کہا گیا ہے۔ بعض موسمی قلعوں والی بستیوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جن کے اردگرد غالباً خندقیں کھودی گئیں تھیں اور یہ خندقیں بارش کے موسم میں پانی سے بھر کر ایک عرصہ تک قلعہ کا کام دیتی تھیں۔ آریوں کے اندر کو پورم دارا یعنی قلعہ شکن بھی کہا گیا ہے۔ رگ وید میں یہ بیان بھی ملتا ہے کہ اندر نے اپنے زیر حمایتی دیوداس کے لئے نوے قلعے فتح کئے تھے جن پر ایک مقامی سردار سمبارا کی عملداری تھی اور جن کو اس نے جلا کر بھسم کر دیا تھا۔[1]

تاریخ افغانستان مطبوعہ کابل کے مصنف احمد علی کہزاد کا بیان ہے کہ تقریباً چودھویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ آریوں کا ایک گروہ جو بھارت کہلاتا تھا۔ اپنے مال مویشی لے کر باختر سے نکل کھڑے ہوئے اور کابل کے علاقہ سے گذرنے کے بعد انہوں نے دریائے ارغنداب کو عبور کیا اور اس کے بعد درہ بولان اور درہ خیبر کے آس پاس کی وادیوں میں

---

[1] تہذیب وادی سندھ۔ ادریس صدیقی۔

پھیل گئے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے دریائے سندھ کی وادی میں داخل ہو کر سندھ اور پنجاب کا علاقہ جہاں اس زمانہ میں سات دریا بہتے تھے۔ وہاں کے مقامی باشندوں سے بزور شمشیر حاصل کر لیا اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ویدوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آریا پہاڑوں سے واقف ہو گئے تھے اور دریائے سندھ کو سندھو کہہ کر پکارتے تھے۔[۱]

تقریباً تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ متاخر دور کے آریوں نے ایشیا میں آریانا کے نام سے جو وسیع مملکت قائم کی تھی اس میں بلخ بخارا۔ مرو۔ کابل۔ ہرات۔ خراسان۔ پارس۔ کرمان۔ گندارا۔ اراخوزیا۔ اور گدروزیا شامل تھے۔

مالبعد کی ایک آبادی

علم الآثار کی رو سے آریا لوگ نہ صرف بلوچستان بلکہ وادی سندھ میں بھی ابھی تک شناخت نہیں کئے جا سکے ہیں۔ بلوچستان میں ابھی تک کوئی ایسی بستی دریافت نہیں ہوئی ہے جس پر آریوں کی ایک بستی ہونے کا گمان کیا جا سکے۔ جھالاوان میں نال کے قریب سور دمب کے قدیم مدفن پر بعض علمائے علم الآثار نے اشارتاً آریوں کے قبرستان ہونے کا شبہ ظاہر کیا تھا۔[۲] لیکن سور دمب کے اس قدیم مدفن کا تعلق تانبہ اور کانسی کے دور سے ہے

---

[۱] تاریخ افغانستان۔ احمد علی کہزاد۔

[۲] تہذیب وادی سندھ۔ ادریس صدیقی۔

اور یہاں سے کوئی ایسے آثار دریافت نہیں ہوئے ہیں کہ جن کی بنا پر اس مدفن کو آریوں کا قبرستان قرار دیا جا سکے۔ البتہ بلوچستان میں ایک دوسری آبادی کے آثار دریافت ہوئے ہیں جو آریوں کے مسلمہ حملوں سے بہت عرصہ بعد میں غالباً ایران کی طرف سے نقل مکانی کر کے یہاں وارد ہوئی تھی اور یہاں اپنی ثقافتی سرگرمیاں جاری رکھی تھیں۔ علم الآثار کی ممتاز عالمہ فرانسیسی خاتون مس بیٹرس ڈی کارڈی نے سب سے پہلے ان کی ایک بستی کے آثار باغبانہ کی وادی میں دریافت کئے جو خضدار کے شمال میں واقع ہے اور یہ قدیم بستی دمب بونڈو کے نام سے موسوم ہے۔[1] لسبیلہ میں ہڈت شہر کی بستی کا تعلق اگرچہ کانسی کے دور سے ہے۔ لیکن اس قدیم بستی کے ایک حصہ پر ان کی مصنوعات ظروف گلی کے بعض نمونے دریافت ہوئے ہیں جن کا جائزہ علم الآثار کے ممتاز ماہر مسٹر فیئر سروس نے لیا تھا۔[2] لسبیلہ کے علاوہ مکران کی وادی کیچ میں بھی بعض مقامات سے ان کی مصنوعات کا سراغ لگایا گیا ہے۔ جھالاوان میں درہ مولا کے نزدیک جبل کے گاؤں کے ساتھ پہاڑی ٹیلوں کے اوپر ایسے کئی قلعوں کا کھوج لگایا گیا ہے جو وزنی پتھروں سے تعمیر کئے گئے تھے۔ ان میں سے بعض قلعوں کے اندر سے اسی آبادی کی ظروف گلی کے نمونے ٹھیکریوں کی صورت میں ملے تھے۔ وادی سوراب

---

[1] PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO. 1

[2] PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO. 1

بن علی زئی کے قدیم ٹیلہ کے اوپر آزمائشی کھدائیوں کے دوران انہی کی ظروف گلی کے نمونے دریافت ہوئے تھے۔ اسی طرح سراوان کے بعض مقامات سے بھی ان کی موجودگی کے آثار دریافت ہوئے ہیں۔[۱] ان کی ظروف گلی کی ٹھیکریاں وادی کوئٹہ میں ایک ٹیلہ کے اوپر سے ملی ہیں۔ جس کا جائزہ ممتاز ماہر علم الآثار مسٹر فیئر سروس نے لیا تھا۔[۲] علم الآثار کے اسی ممتاز عالم نے ژوب اور لورالائی کی بعض قدیم بستیوں کی اوپر کی سطح سے ان کے آثار ٹھیکریوں کی صورت میں دریافت کئے تھے۔[۳] اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی ایک وسیع آبادی بلوچستان میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔

ان کے برتن زیادہ تر کمہار کے چاک پر تیار کئے جاتے تھے۔ لیکن ایسے برتنوں کی بھی کمی نہ تھی جو ہاتھ سے گھڑ لئے جاتے تھے۔ ان کے برتنوں کی ساخت کچھ زیادہ عمدہ بھی نہ تھی۔ ان کی طرز نقاشی کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے برتنوں کی سطح اور ان کے اندر ہندسی اشکال کی نقاشی کے دوران خطوط پیچاں کا استعمال بڑے پیمانے پر کرتے تھے۔ نباتاتی نقاشی

ا۔ PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO.1 BRITISH EXPEDITION TO KALAT. 1948 - 1957. (BEATRICE DE CARDI)

۲۔ EXCAVATIONS IN QUETTA VALLEY - FAIR SERVIS.

کے علاوہ حیوانی نقاشی میں وہ زیادہ تر گھوڑے اور شاہسوار کی تصویر کشی بھی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے برتنوں کی سطح اور ان کے اندر بیل بوٹوں کے ساتھ ساتھ قدرتی منظر کشی میں پرندوں اور کچھوؤں کی تصویر کشی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔[1]

جھالاوان اور ناچ کی وادی میں بلوچستان کے ان باشندوں نے جن کا تعلق تانبہ اور کانسی کے دور سے تھا اور جو کلی میہی کلچر کے علم بردار تھے۔ نندوانی کی بستی بسا کر وہاں پتھروں سے تعمیر کئے ہوئے ایک لمبے چوڑے چبوترے کے اوپر ایک معبدخانہ تعمیر کیا تھا اور اس کی تعمیر میں بھی بڑے بڑے وزنی پتھر استعمال کئے تھے جو بستی کے عین مرکز میں واقع تھا۔ علم الآثار کے ممتاز عالم موسیو کسال نے اس معبدخانے کے اندر سے اپنی تفتیش کے دوران برہما بیل یعنی سانڈھوں کے مجسموں کے علاوہ ماندیوی کے مجسمے بھی دریافت کئے تھے۔ اس دیوی سے زرخیزی پرستی کے ایسے معتقدات منسوب تھے کہ جن کی بنا پر اس زمانہ کے لوگ دعا و مناجات کے علاوہ نہایت پیچیدہ مذہبی رسومات ادا کرتے تھے اور یہی بلوچستان کے باشندوں کا مذہب تھا۔[2]

ے۱۔ PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO. 1 — MISS BEATRICE DE CARDI.

ے۲ PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO. 3 JEAN MARIE CASAL.

بوچستان کی اس مابعد کی آبادی کے ایک گروہ نے وادی اور ناچ میں داخل ہو کر نند دانی کی قدیم بستی کے قریب جو سینکڑوں سال پہلے اجڑ گئی تھی ایک نئی بستی بسائی جو نند دانی کی قدیم بستی کی مانند ایک بڑے رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس مابعد کی آبادی نے بھی ایک تین منزلہ مینار نما بھاری بھرکم عمارت کھڑی کر دی جو بستی کے عین مرکز میں واقع تھی۔ اور جس کی تعمیر میں وزنی پتھر استعمال کئے گئے تھے۔ اگرچہ اس دوسری عمارت سے کوئی حیوانی یا انسانی مجسمہ دریافت نہیں ہوا ہے۔ لیکن موسیو کسال کا خیال ہے کہ یہ دوسری عمارت بھی ایک معبد خانہ تھی جو مقدس مقامات کی دیرپا حیثیت اور ان کی پائیداری کا بین ثبوت ہے[لے]

ممتاز خاتون مس بیٹرس ڈی کارڈی کا خیال ہے کہ اس مابعد کی آبادی کا تعلق ایران کے متاخر دور کی تہذیبوں سے ہے جس کے دوران لوہے کا استعمال شروع ہو گیا تھا۔ اس ممتاز خاتون نے بلوچستان کی اس مابعد کی آبادی کے لئے ۱۱۰۰ء قبل از مسیح کا زمانہ تجویز کیا ہے اس نے اس مابعد کی آبادی کے برتنوں کی ساخت اور ان کے اسلوب نقاشی کو بھی ان برتنوں اور ان کے اسلوب نقاشی

لے PAKISTA ARCHAEOLOGY NO. 3

JEAN MARIE CASAL

سے متعلق قرار دیا ہے جو اس زمانہ میں ایرانی بلوچستان میں بنائے اور استعمال کئے جاتے تھے اور جن کے نمونے بمپور سے دریافت کئے گئے ہیں۔ ؎

؎ :- PAKISTAN ARCHAEOLOGY NO. 1
MISS BEATRICE DE CARDI.

پانچواں باب
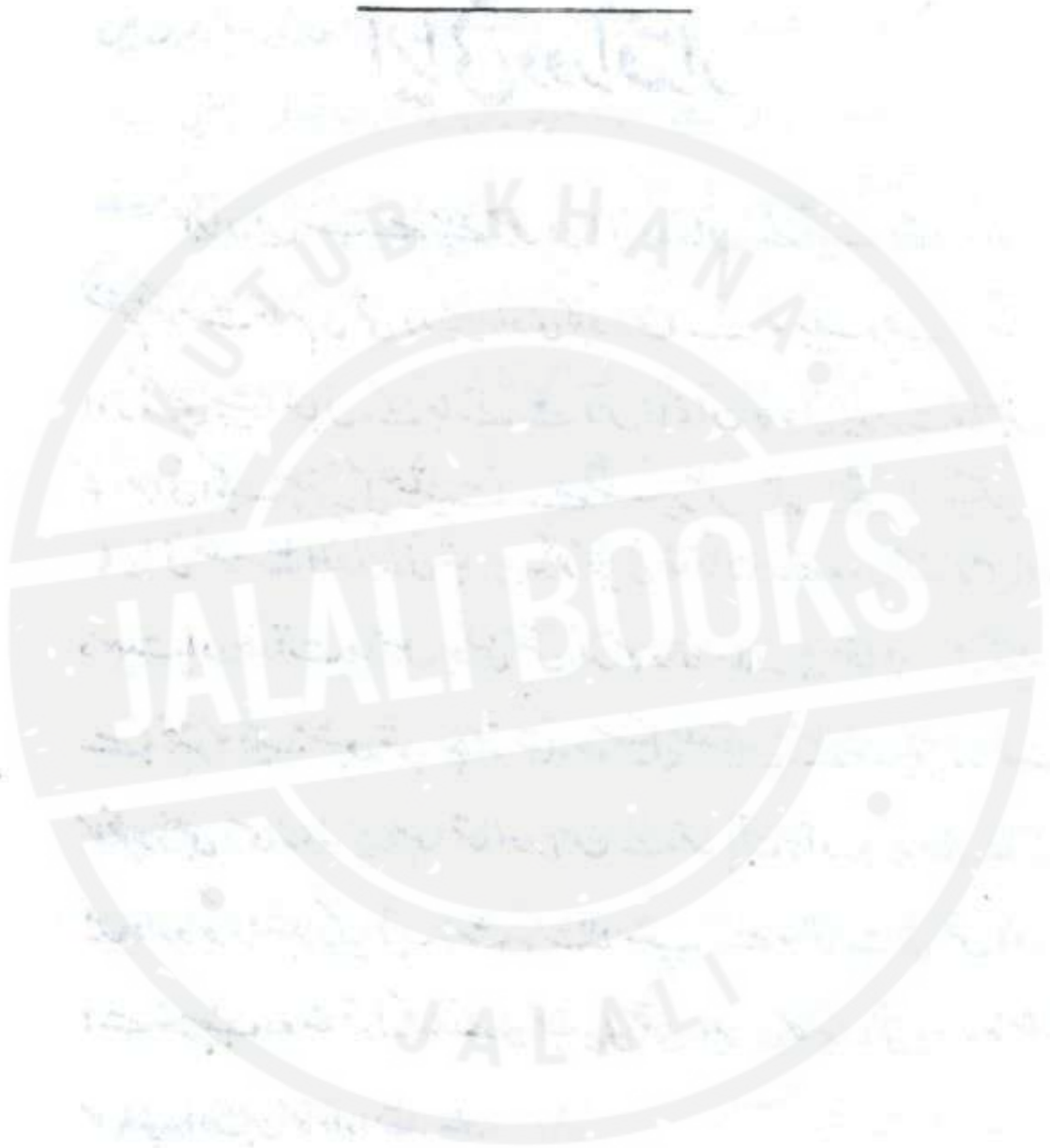
ایرانی دورِ اقتدار

ایران میں سب سے پہلے جس ایرانی خاندان نے ایک باقاعدہ اور منظم حکومت قائم کی تھی وہ پیشدادی کہلاتا تھا ــــ جو بیک وقت بادشاہ اور مذہبی پیشوا خیال کئے جاتے تھے۔ اس خاندان کا بانی کیومرث تھا جس کو ایرانی ایک پیغمبر کی حیثیت سے تسلیم کرتے تھے۔ لیکن ایرانی حکومت اور ایرانی تہذیب کو کیانی خاندان کے دورِ اقتدار میں ہی وسعت اور طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ ان کا دارالخلافہ بلخ تھا جو زمانہ قدیم سے باختر کا ایک مشہور شہر چلا آتا تھا۔ کلاسیکی مصنفین کے مطابق زرتشت کا ظہور بھی اسی زمانہ میں ہوا تھا اور اس نے اتراپاتن (آذربائیجان) سے بلخ میں وارد ہو کر مشہور کیانی بادشاہ گشتاسپ سے ملاقات کی تھی اور اسے مذہب اوستا قبول کرنے کی تلقین کی تھی۔ ایران کا یہ کیانی بادشاہ اسفندیار کا باپ اور بہمن کا دادا تھا۔ لہ

اس دور کے سیاسی حالات کی صحیح تصویر شاہنامہ فردوسی میں ملتی ہے

لہ ۱- SEISTAN – G.P. TATE

جبکہ ایران کو ترکستان کے تاتاریوں سے خطرہ درپیش ہوتا ہے اور اس خطرہ کو رفع کرنے میں خراسان کے مشہور پہلوان رستم کے خاندان نے جو کردار ادا کیا تھا۔ وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مشہور کیانی بادشاہ فریدون جب ضحاک تازی پر فتح پا لیتا ہے تو اس موخرالذکر بادشاہ کی اولاد غور کی پہاڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے اور فریدون کی اطاعت قبول کر لیتی ہے۔ فریدون رستم کے مورثِ اعلیٰ گرشاسپ کی مدد سے اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنی سلطنت کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ خراسان کا صوبہ ایرج کے حصہ میں آیا، جس میں سندھ و ہند بھی شامل تھے۔ گرشاسپ نے کابل و زابل اور سیستان پر جو اس زمانہ میں زرنج کہلاتا تھا۔ فریدون کی جانب سے حکومت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کہا جاتا ہے کہ کابل اور زابل کا انتظام حکومت جس میں سندھ و ہند بھی شامل تھے بعد میں سام کے سپرد ہوا سام کی وفات کے بعد اس کا بیٹا زال زرنج سے جس کی بنیاد گرشاسپ نے رکھی تھی کابل چلا گیا اور وہاں اس کی ملاقات مہراب شاہ سے ہوئی جو ایران کے مشہور بادشاہ ضحاک کی نسل سے تھا اور اس زمانہ میں شہنشاہانِ ایران کا باجگذار تھا۔ مہراب شاہ نے اپنی بیٹی زال کے نکاح میں دے دی اور اسی لڑکی کے بطن سے رستم پیدا ہوا۔ یہی مہراب شاہ تھا جس نے پہلے کیانی بادشاہ کیقباد کی فوجوں کے ساتھ مل کر ترکستان کے بادشاہ افراسیاب کی ترک فوجوں کے خلاف پے در پے کئی لڑائیوں میں حصہ لیا تھا اور ان کو شکست دی تھی۔

شاہنامہ فردوسی میں مکران کا ذکر بھی بڑے طمطراق سے کیا گیا ہے
شاہنامہ کے مطابق ایران کے مشہور کیانی بادشاہ کیخسرو نے فغفور چین اور
شاہ مکران کے نام پیغام بھیجا کہ وہ اس کی اطاعت گذاری کا دم بھر کر خراج
دیا کریں۔ فغفور چین کی طرف سے کیخسرو کو جو جواب ملا وہ اطمینان بخش
تھا اور اس نے اطاعت قبول کر کے خراج دینے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔
اور کیخسرو کی خدمت میں بیش قیمت تحفہ تحائف بھی ارسال کیے تھے۔ لیکن شاہ
مکران نے کیخسرو کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس انکار
کی بنا پر کیخسرو نے مکران پر فوج کشی کی۔ اس فوج کشی کے نتیجہ میں شاہ مکران
جنگ میں کام آیا اور ایرانی فوج نے مکران کو خوب تاخت و تاراج کیا۔
مکران میں جو روایات مشہور ہیں ان کی بنا پر گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ علاقہ
کیکاوس کیخسرو، لہراسپ، گشتاسپ ہما اور داراب کے زمانہ میں انہی
ایرانی بادشاہوں کے زیر فرمان تھا۔ [1]

ایران کا ہخامنشی خاندان درحقیقت اسی کیانی خاندان کا ایک سلسلہ
تھا۔ جس نے بلخ سے اپنا دارالسلطنت پسا گرد وا در شستر میں منتقل کر دیا
اس زمانہ میں ایران پر آسوریوں کا اقتدار قائم ہوا تھا۔ اس کے بعد ایران
کو میڈیا (مدائن) کی زنجیر غلامی میں گرفتار ہونا پڑا۔ یہ آسوری اور میڈیا اس

---

[1] :۔ شاہنامہ فردوسی

[2] SEISTAN - G.P. TATE

قدر طاقتور تھے کہ انہوں نے اپنا اقتدار مشرق میں دریائے سندھ تک پھیلا دیا تھا۔ آخر ایران کے شہنشاہان ہخامنشی نے دوبارہ ایران پر اپنا تسلط جمالیا۔ دارالحکومت کی تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ آسور اور میڈیا کے اقتدار کا ایران سے خاتمہ تھی جس کی بنا پر شہنشاہان ایران کے تعلقات روم کے ساتھ استوار ہو گئے تھے۔ جو ایران کی مغربی سرحد پر ایک نہایت منظم اور طاقتور حکومت تھی۔

ایران میں دولت ہخامنشی کا بانی کرش بزرگ تھا جس نے ۵۵۰ قبل مسیح میں میڈیا کی سلطنت فتح کر کے اس خاندان کی بنیاد ڈالی ہخامنش اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ تھا۔ جس کے نام کی وجہ سے اس خاندان نے ہخامنشی کے نام سے شہرت پائی۔ کرش بزرگ اور داریوش اول اس خاندان میں بڑے باتدبیر بادشاہ ہو گزرے ہیں۔ جنہوں نے ایرانی شہنشاہیت کو بڑی وسعت دی اور اپنی حکومت کو مشرق میں دریائے سندھ اور مغرب میں دریائے نیل تک بڑھا دیا۔ سکندر اعظم مقدونی نے ۳۳۱ قبل از مسیح میں ایران پر حملہ کر کے داریوش سوم کو شکست فاش دی اور اس سے خاندان ہخامنشی کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا تقریباً ایک سو سال تک ایران میں کوئی دوسرا خاندان نہ ابھر سکا۔ [1]

---

[1] ایران بعہد ساسانیان۔ پروفیسر آرتھر کرسٹن سین۔ ترجمہ:۔ ڈاکٹر محمد اقبال

چھٹا باب

سکندرِ اعظم مقدونی

سکندر مقدونیہ کے حکمران فیلقوس کا بیٹا تھا۔ ایامِ شہزادگی ہی میں اس نے اپنی بلند پایہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس زمانہ میں یونان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں ایرانی جا و بیجا مداخلت کرتے رہتے تھے سکندر اپنے باپ کی وفات کے بعد مقدونیہ کا حکمران بنا۔ اس نے تمام یونانی ریاستوں کو جو عموماً ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتی تھیں متحد کر کے ایک مستحکم اور طاقتور سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد اس نے ایرانیوں کی یونان میں جا و بیجا مداخلت کا بدلہ لینے کی خاطر ایران پر حملہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔[1] ۳۳۴ء قبل مسیح میں اس نے اپنی مہم کا آغاز کرتے ہوئے ایران کے بیرونی مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔ ۳۳۱ء قبل مسیح میں یونانی فوج ایران کی حدود میں داخل ہو گئی۔ شہنشاہ ایران داریوش سوم نے جو ایک قابل حکمران تھا اپنی سلطنت کے اطراف

---

[1] AFGHANISTAN – DUPREE.

سے ایک زبردست فوج جمع کر کے اس کے مقابلے پر نکل آیا۔ ایرانی فوج نے اربیلہ کے نزدیک گوگا مالا کے مقام پر یونانی فوج کا مقابلہ کیا۔ اس موقع پر ایرانی سرداروں نے بڑی جراٴت مندی کا ثبوت دیا اور جان توڑ کر لڑے۔ خصوصاً مشرقی ایران کے ساکا اور باختری دستوں نے رات بھر مزاحمت کی اور دہشت طاری کرنے والی اپنی روایتی خوفناک جنگی چالوں کا بڑی خوبی سے مظاہرہ کیا لیکن سکندر کی فوجی حکمت عملی کی وجہ سے ان کی کوئی چال کارگر ثابت نہ ہوئی۔ ایرانیوں نے شکست کھائی اور داریوش ہمدان کی طرف بھاگ نکلا۔ ؎

سکندر مفرور بادشاہ کے تعاقب میں بابل سوسں اور تخت جمشید کی طرف بڑھا اور تخت جمشید کے محلات میں اس نے آگ لگوا دی اور اس خوبصورت شہر کو جلا کر خاک کا ڈھیر کر دیا۔ اس کے بعد وہ مشہد پہنچا۔ یہاں اس کو اطلاع ملی کہ باختر کے سٹریپ بیسوس ایریا (ہرات) کے سٹریپ ستی برزین اور اور ایک دوسرا سٹریپ برزین تی کو ساتھ ملا کر داریوش سوم کو دامغان میں قتل کر کے ایران کے مشرقی سٹریپوں کا اردشیر کے نام سے حکمران بن بیٹھا ہے اب سکندر نے بیسوس کو سزا دینے کی خاطر اس راستے پر کوچ کرنا شروع کر دیا جس پر موجودہ زمانہ میں فراح قندھار اور کابل واقع ہیں۔ وہ کوہ ہندوکش کو عبور کر کے

؎ :- THE PATHAN _ ALOFE CAIROE.

ثمرقند سے بھی آگے بڑھ کر دریائے جیحوں کے کنارے تک اپنی پیش قدمی جاری رکھنا چاہتا تھا۔ ایریا کے سٹریپ ستی برزین نے سکندر سے معافی مانگ لی۔ سکندر نے نہ صرف اس کو معاف کر دیا بلکہ اس کو اس کے عہدے پر بھی برقرار رکھا۔ سکندر بلخ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اس کو ستی برزین کی بغاوت کی خبر ملی۔ وہ برق رفتاری سے پیچھے مڑا لیکن ایریا کا یہ باغی سٹریپ بڑی مشکل سے جان بچا کر بیسوس سے جا کر ملا۔ اسی دوران اس نے درنگیانا کے (سیستان) سٹریپ برزین تی کے خلاف فوجی نقل و حرکت شروع کر دی جو دارایوش سوم کے قتل میں ملوث ہو گیا تھا۔ برزین تی سکندر کی پیش قدمی سے گھبرا کر اراخوزیا کے صوبے کی طرف بھاگ نکلا۔ لیکن اس صوبے کے ارباب اقتدار نے سکندر سے خوف کھا کر اسے گرفتار کر لیا اور پابجولاں سکندر کے پاس بھیج دیا۔ سکندر نے اسے قتل کر دیا۔[۱]

اس موقع پر سکندر نے گدروزیا کے صدر مقام پورا میں قیام کیا ۳۳۰ قبل مسیح کے موسم خزاں میں اس نے شمالی گدروزیا کے آریاسپا قبائل کے خلاف فوج کشی کی جو اس علاقے کی دشوار گذار وادیوں میں بود و باش رکھتے تھے اور ایرانیوں نے انہیں کسی موقع پر بھی زیر نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے مقامی سرداروں کی حکومت کے تحت زندگی بسر کرتے تھے۔ ان خانہ بدوش قبائل کی حکومت یونان کی کھلی کونسلوں سے ملتی جلتی تھی۔ آرین کا بیان ہے کہ سکندر ان کی اسمبلی سے اس قدر متاثر ہوا کہ

---

۱ :- AFGHANISTAN - DUPREE

اس نے ان کو اپنی مرضی کے مطابق یونانی افسروں کی مداخلت کے بغیر زندگی گذارنے کی اجازت دے دی۔[1]

سکندر بیسوس سے نمٹنے کا پکا ارادہ رکھتا تھا۔ اسی دوران کارمانیہ گدروزیا اور اراخوزیا کے سٹریپوں نے ایک ایک کر کے سکندر کی اطاعت قبول کر لی۔ سکندر اب بیسوس کی سرگرمیوں کا خاتمہ کرنے کی خاطر دوبارہ کوچ کر کے دریائے ہلمند اور ارغنداب کے کنارے کنارے سفر کرتے ہوئے قندہار اور غزنی سے ہو کر کابل پہنچا۔ ان تینوں مقامات پر اس نے اپنے نام سے بستیاں بسائیں۔ یہاں سے بلخ کی طرف روانہ ہو گیا۔ بیسوس اور اس کے دونوں اتحادی آکسیارتی اور سپیتامن جو سغدیانا سے تعلق رکھتے تھے تنگ تاشقرمان کے مقام پر اس کے منتظر تھے۔ سکندر نے دراپ ساکا کی جانب سے ان پر اچانک حملہ کر کے ان کو شکست دی اور وہ جیحوں پار کر کے سغدیانا کی طرف بھاگ نکلے۔ اسی اثنا میں ایریا میں ستی برزین کی بغاوت کی اطلاع ملی اور سکندر کے ایک فوجی افسر نے بغاوت کو فرو کر کے ستی برزین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔[2]

سکندر کی فوج نے کیلفٹ کے مقام پر دریائے جیحوں پار کر لیا۔ اس اثناء میں سپیتامن نے سکندر کی پیش قدمی سے گھبرا کر بیسوس کو اس کے حوالے کر دیا اور خود شمال کی طرف بھاگ نکلا۔ بیسوس کو بڑی اذیتوں کے بعد ہمدان میں سکندر کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔[3]

---

[1] AFGHANITAN — DUPREE.

[2] ABID.

[3] ABID.

اس کے بعد سکندر سغدیانا کی طرف آگے بڑھا لیکن سغدیانا کے باشندوں نے بڑی سخت مزاحمت کی۔ اس کے باوجود سکندر نے ثمرقند پر قبضہ کر لیا اور بجند کے مقام پر ایک بستی بسائی۔ اسی دوران سپیتامن کے قبائلیوں نے یونانیوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور ثمرقند کا محاصرہ کر لیا۔ اس کشمکش کے دوران سکندر کے سر میں چوٹ لگی اور ثمرقند میں اس کے فوجی دستوں کے سپاہ سالار نے سپیتامن کے قبائلیوں کے ہاتھوں شکست کھائی۔ یہ سکندر کی پہلی بڑی شکست تھی۔ [لے]

اپنی فوج کو بچانے کی خاطر سکندر بہ نفس نفیس ثمرقند پہنچا لیکن قبائلی اس کی آمد سے پیشتر محاصرہ اٹھا کر غائب ہو گئے تھے اس نے ۳۲۹-۲۸ ق م قبل مسیح کا موسم سرما زریاسپا میں گذارا۔ جبکہ اس کا حریف سپیتامن بخارا میں ٹھہرا رہا۔ یونانی فوج کے پانچ کالم سپیتامن کی تلاش میں سغدیانا میں داخل ہو گئے اور دونوں فریقوں کے درمیان کئی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں۔ لیکن یونانیوں پر قبائلیوں کے حملے برابر جاری رہے اور ہر طرف سے انہوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ اسی اثناء میں سکندر کی فوجوں کے دباؤ کے تحت سپیتامن کو اس کے اتحادیوں نے ایک ایک کر کے چھوڑ دیا اور جب ساکا قبیلوں کو اس کی پسپائی اور سکندر کی موجودگی کا علم ہو گیا تو انہوں نے اس کا سر کاٹ کر سکندر کے پاس بطور تحفہ بھیج دیا۔ سکندر نے ۳۲۸-۲۷

لے AFGHANISTAN - DUPREE

قبل مسیح کا موسم سرما بخارا میں گزارا۔[1]

۳۲۶ قبل از مسیح کے موسم بہار کے آغاز پر سکندر سغدیانا کی کئی بستیوں کو اطاعت قبول کرنے پر آمادہ کرنے میں مصروف رہا اور کئی گوریلوں نے سغدیانا کے ایک دشوار گذار پہاڑ کو اپنا مرکز بنا کر یونانیوں کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر دی۔ لیکن سکندر کی فوجوں نے لوہے کے میخوں اور رسیوں کی مدد سے رات کے اندھیرے میں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر گوریلوں کو حیرت میں ڈال دیا اور وہ اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔[2]

سکندر نے ہندوستان کی طرف کوچ کرنے سے پیشتر باختر، مرو اور ترمز کے مقامات پر بستیاں بسائیں اور اس کے بعد بامیاں اور گوربند کی وادی سے ہو کر جلال آباد پہنچا اور اس کے بعد باجوڑ اور سوات کے راستے گندھارا کے صوبے میں داخل ہو کر اسے تاخت و تاراج کیا۔[3]

ٹیکسلا کے حکمران امبھی نے پہلے ہی سے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ پنجاب کا حکمران راجہ پورس ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ جس میں ہاتھی بھی شامل تھے جہلم کے کنارے اس کے مقابلے پر آیا۔ اس نے سکندر کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑی تیاری کی تھی۔ جب سکندر دریا کے کنارے پہنچا تو اس وقت سخت بارش ہوئی تھی اور دریا میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ راجہ پورس

---

[1] :- AFGHANISTAN — DUPREE

[2] :- ABID.　　[3] ABID.

کا خیال تھا کہ سکندر دریا پار نہ کر سکے گا۔ لیکن سکندر نے صبح سویرے جبکہ اندھیرا چھایا ہوا تھا دریا پار کر لیا۔ سب سے پہلے راجہ پورس کا بیٹا چند دستوں کے ساتھ گھوڑے دوڑاتا ہوا اس کے مقابلے پر آیا۔ لیکن اسے پسپا کر دیا گیا۔[1] اس کے بعد یونانی اور ہندی فوج کے درمیان زبردست جنگ چھڑ گئی۔ ابتدا میں ہاتھیوں کو دیکھ کر یونانی سوار دستوں کے گھوڑے بدکنے لگے۔ لیکن یونانی شہسواروں نے ان پر جلدی قابو پالیا اور ہاتھیوں کے خلاف پھرتی سے نیزے استعمال کرنے لگے اُدھر ہاتھیوں کے پیر کیچڑ کی وجہ سے پھسلنے لگے اور پھر برابر پھسلتے چلے گئے اِدھر راجہ پورس کے تیر انداز اپنی لمبی لمبی کمانوں کو بھی استعمال نہ کر سکے۔ کیونکہ ان کو زمین پر ٹکا کر چلایا جاتا تھا لیکن زمین گیلی تھی اور یہ زمین پر ٹکائی نہیں جا سکتی تھیں۔ لڑائی کا فیصلہ یونانیوں کے حق میں ہو گیا۔ راجہ پورس زخمی ہو کر ہاتھی سے گر پڑا۔ اسے فوراً گرفتار کر کے سکندر کے سامنے پیش کیا گیا۔ سکندر نے اس سے دریافت کیا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ راجہ پورس نے جو ایک حقیقی بادشاہ تھا برجستہ جواب دیا کہ وہ سلوک جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ سکندر راجہ پورس کے اس جواب سے اس قدر محظوظ ہوا کہ اسے فوراً اس کی حکومت پر دوبارہ بحال کر دیا۔[2]

---

[1] EARLY HISTORY OF INDIA - SMITH.

[2] ABID.

سکندر تمام شمالی ہندوستان کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس کی فوج نے اس کا ساتھ نہ دیا کیونکہ ان کو اپنے وطن سے نکلے ہوئے کئی سال گذر چکے تھے اور وہ مزید آگے بڑھنے کے لئے تیار نہ تھے۔ سکندر کو مجبوراً واپس وطن جانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ لیکن اس سفرِ واپسی کے لئے اس نے وہ راستہ اختیار نہ کیا جس سے وہ چل کر آیا تھا۔ وہ دریا دُن کے راستے کشتیوں کے ذریعے سفر کر کے سمندر تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس اثناء میں قرب و جوار کے کئی حکمران بیش قیمت تحفے تحائف لے کر اس کے دربار میں پہنچے اور اطاعت قبول کر لی۔ اس کے علاوہ اس نے راجہ پورس اور اس کے رشتہ دار ابھی کے درمیان رشتے ناطوں کے ذریعے صلح کرائی جو ایک عرصے سے ایک دوسرے کے مخالف چلے آتے تھے۔ اس نے راجہ پورس کو اپنے ہندی مقبوضات کا بھی حکمران اعلیٰ بنا دیا۔ [لہ]

اس موقع پر سکندر کی فوج چناب کے کنارے تک جا پہنچی تھی اس دریائی سفر کو شروع کرنے کی غرض سے سکندر کو دوبارہ دریائے جہلم کے کنارے اس مقام پر آنا پڑا جہاں سے اس نے دریا عبور کیا تھا۔ اس عظیم سفر کے لئے زبردست تیاریاں کی گئی تھیں اور کشتیوں کا ایک بہت بڑا بیڑہ تیار کیا گیا تھا جو زیادہ تر مقامی طور پر حاصل کی گئی تھیں۔ یہاں سے بھاری بھرکم بیڑے کا دریائی سفر بڑے منظم طریقے سے شروع ہوا۔ اس بیڑے کی

لہ:- AN EARLY HISTORY OF INDIA_ SMITH.

حفاظت کے لئے دریا کے دونوں جانب سوار اور پیدل دستوں نے
بڑی تعداد میں کوچ کرنا شروع کر دیا اور دریا کے دونوں جانب آس پاس
کی بستیوں کے لوگ بڑی تعداد میں قطار باندھ کر سکندر کی فوج کا نظارہ کرنے
لگے۔ دریائے جہلم کے بعد دریائے سندھ کے ذریعے سکندر کی فوج نے اپنا
سفر جاری رکھا اور دریائے سندھ کے ڈیلٹے میں واقع ٹپالہ کے مقام تک
پہنچتے پہنچتے پورے دس مہینے لگ گئے جو دریائے سندھ کی دو شاخوں کا
مقام اتصال تھا۔ سکندر کا یہ سفر بڑا صبر آزما ثابت ہوا۔ کیونکہ دریائے سندھ
تک پہنچتے پہنچتے دریائے بیاس، راوی، چناب اور جہلم اپنے اپنے سنگم
پر آبشار کی صورت میں گر کر گرداب بنا لیتے تھے۔ جن کی وجہ سے کشتیوں
کے الٹ جانے کا خطرہ تھا۔ ان مقامات پر یہ کشتیاں بڑی دقت کے
ساتھ اتاری گئیں۔[1]

اس سفر کے دوران سکندر کو بعض مقامات پر زبردست مزاحمت
کا سامنا کرنا پڑا لیکن سفر پر روانگی سے قبل اس نے اپنے سپہ سالاروں کو
روانہ کر کے ساو بھوتی کی وسیع سلطنت کو زیر کرنے کا حکم دے دیا تھا
جو دریائے جہلم سے دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی تاکہ اس کی فوج
خطرے سے محفوظ رہے اور اس کا رابطہ یورپ میں اپنے فوجی مستقر
کے ساتھ قائم رہ سکے۔ یہ سفر اکتوبر ۳۲۶ ق م قبل مسیح کے اواخر میں شروع
ہوا تھا۔[2]

---

[1] - AN EARLY HISTORY OF INDIA - SMITH.
[2] ABID -

سکندر کی فوج کو سب سے زیادہ خطرہ ملی قوم سے تھا جو دریائے راوی کے دونوں طرف اس کی سرسبز و شاداب وادی میں بود و باش رکھتی تھی اور ایک جنگجو قوم تھی۔ سکندر نے سب سے پہلے سیبوئی اور اگالسی اقوام کے علاقوں پر ہلہ بول دیا تاکہ یہ لوگ ملی قوم کے لوگوں کے ساتھ مل کر مزاحمت نہ کر سکیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ تہ تیغ کر دیئے گئے جو باقی بچے انہوں نے فوراً اطاعت قبول کر لی۔ اس اثناء میں خبر آئی کہ ملی اور ان کے ہمسائے کشودراکا اور کئی دوسری اقوام باہم مل کر سکندر کی فوج کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ سکندر نے ملیوں اور ان کے اتحادیوں پر اس تیزی کے ساتھ اچانک حملہ کیا کہ وہ لوگ اپنے منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ سکندر کا حملہ اس قدر خلاف توقع تھا کہ ملیوں کے اکثر لوگ اس ناگہانی حملہ کے وقت اپنے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ ملی دریائے راوی کی طرف بھاگ نکلے۔ اور ان کے ہمسائے کشودراکا دریائے بیاس کے بالائی حصہ میں رہتے تھے۔ سکندر کی فوج نے ملیوں کا اس تیزی سے تعاقب کیا کہ وہ دریا پار نہ کر سکے اور ان میں سے اکثر لوگ یا تو دریا میں ڈوب مرے اور یا پھر یونانی فوج کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ سکندر نے یہاں ایک قصبہ پر بھی حملہ کر دیا جہاں زیادہ تر برہمن آباد تھے۔ یہ قصبہ غالباً ساہیوال کے کہیں نزدیک واقع تھا۔ اس قصبہ کے برہمن باشندوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن ناکام ہو گئے۔ جب ملیوں پر بہت زیادہ

دباؤ پڑ گیا تو انہوں نے بھاگ کر ایک قلعہ کے اندر پناہ لی۔ یونانیوں نے اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ سکندر اپنے چند محافظوں کے ساتھ شہر پناہ کی دیوار پر چڑھ گیا اور ابھی وہ چڑھا ہی تھا کہ اس کو ایک تیر لگا اور وہ بدحال ہو کر قلعہ کے اندر گر پڑا۔ ملی اس کو ہلاک کرنے والے تھے کہ اس کے زرہ بکتر کی چمک سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے اور خیال کیا کہ شاید یہ کوئی مافوق الفطرت ہستی ہے۔ اس اثناء میں اس کے محافظ بھی اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس کو بچا لیا۔ یونانی قلعہ کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے اور ملیوں کو قرار واقعی سزا دی اور ان کو مکمل طور پر قلع قمع کر دیا۔ لہ

سکندر نے اس کے بعد اماطروئی، ابستانوئی اور اوساڈیوئی اقوام کے علاقوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کی جو غالباً سندھ کے بالائی علاقوں میں بودوباش رکھتی تھیں اور ان کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد شاہ موسی کانوس کی باری آئی جس نے ابھی تک سکندر کے پاس اپنا سفیر اور تحفے تحائف روانہ کرنے سے گریز کیا تھا۔ شاہ موسیکانوس نے پہلے تو سکندر کی اطاعت قبول کر لی اور سکندر نے اس کو اس کی حکومت پر بحال کر دیا۔ لیکن اس نے برہمنوں کے کہنے سننے پر دوبارہ بغاوت کر دی لیکن شکست کھائی اور برہمنوں سمیت اپنے دارالحکومت میں جو ارور یا روہڑی تھا موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان فتوحات کے بعد سکندر نے اپنے ایک منصب دار فلپو کو مفتوحہ مقبوضات

لہ:- AN EARLY HISTORY OF INDIA - SMITH -

کا شریپ مقرر کر کے اسے وہاں چھوڑ دیا۔ [1]

آخر کار سکندر جنوبی سندھ کا رُخ کرتے ہوئے ٹبالہ میں داخل ہو گیا جو دریائے سندھ کے ڈیلٹا میں واقع تھا۔ لیکن ٹبالہ کا حکمران سکندر کی آمد کی خبر سن کر ٹبالہ کے باشندوں سمیت ڈر کے مارے بھاگ نکلا۔ سکندر نے ان لوگوں کے پاس جو شہر چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے اپنے قاصد روانہ کئے اور ان کو یقین دہانی کرائی کہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ تب یہ لوگ واپس چلے آئے اور انہوں نے سکندر کی اطاعت قبول کر لی۔ [2]

سکندر کا معتمد سپہ سالار کریٹرس اسی ٹبالہ کے مقام سے فوج کے ایک حصے کو لے کر جس میں ہاتھیوں کا ایک بڑا بیڑہ بھی شامل تھا۔ اراخوزیا اور درنگیانا کے راستے کرمان کے لیئے روانہ ہوا۔ خیال ہے کہ اس نے اپنے سفر کے لیئے درہ بولان یا درہ مولا کا راستہ اختیار کیا تھا اور اس کا گذر خوریں نامی ایک علاقہ سے بھی ہوا تھا جو غالباً خاران ہی تھا۔ ٹبالہ یا ٹبالین کا محل وقوع غیر معلوم ہے گمان کیا جاتا ہے کہ یہ حیدر آباد یا کوٹڑی کے نزدیک کہیں واقع تھا۔ [3]

سکندر نے کئی دن تک ٹبالہ میں قیام کیا۔ اس نے یہاں دریائے

---

[1] :- AN EARLY HISTORY OF INDIA _ SMITH.

[2] :- ABID

[3] :- ABID

سندھ کی دونوں شاخوں کا جائزہ لیا اور یہ مقام اسے بہت پسند آیا۔ اس
نے بحری بیڑے کے لئے چار مہینہ کی خوراک جمع کرنے کا انتظام کر لیا۔
یہاں قریب ہی ایک جھیل واقع تھی۔ اس نے اس جھیل کے کنارے
ایک بندرگاہ تعمیر کی اور کشتیوں کے لئے ایک لنگر باڑی بھی تیار کر لی اور
بندرگاہ تک آسانی سے رسائی حاصل کرنے کے لئے راستے بنوائے۔ سکندر
کا ارادہ خود ساحل مکران کے ساتھ ساتھ خشکی کے راستے سفر کرنے کا تھا
اور بحری بیڑے کے متعلق پہلے ہی فیصلہ کیا جا چکا تھا کہ وہ اس کے معتمد
سپاہ سالار امیر البحر نیرخس کی سرکردگی میں سمندری راستے سے سفر کرتے
ہوئے خلیج فارس میں جا کر لنگر انداز ہوگا۔ اور سکندر کے ساتھ کرمان میں
رابطہ قائم کرے گا۔ [1]

ساحل مکران کا یہ بری راستہ بڑا دشوار گذار تھا۔ اس راستے پر پانی
کی زبردست کمی تھی۔ اس سے پہلے اس راستے پر اتنی بڑی فوج کے ساتھ
کسی کو سفر کرنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ آسوری دور اقتدار میں جب ممتاز
خاتون سپاہ سالار سیمی رامس جب ہندوستان کی مہم کی ناکامی کے بعد وہاں
سے بھاگ نکلی تو اس نے بھی واپسی کے سفر کے لئے یہی راستہ اختیار
کیا تھا اور اس سفر کے اختتام پر اس کے صرف بیس سپاہی بچ کر منزل
مقصود تک پہنچے تھے۔ اس کے بعد جب ایران کے شہنشاہ کرش بزرگ

---

[1]:- AN EARLY HISTORY OF INDIA- SMITH

نے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے مکران کا یہی راستہ اختیار کیا تو اس کے فقط سات سپاہی زندہ بچ سکے تھے اور اس کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ نیرخس کا بیان ہے کہ سکندر کو اس راستہ کی دشواریوں کا علم تھا اور اس نے جان بوجھ کر یہ راستہ اختیار کر لیا تھا تاکہ سیمی رامس اور کرش بزرگ پر سبقت لے جا سکے۔ لیکن زیادہ تر خیال یہ ہے کہ سکندر نے بحری بیڑے کی ضروریات مثلاً خوراک اور پانی مہیا کرنے کی نیت سے یہ راستہ اختیار کیا تھا۔ [۱]

نیرخس ابھی پٹالہ ہی میں موافق ہواؤں کا منتظر تھا کہ سکندر اکتوبر ۳۲۵ قبل مسیح کے شروع میں اپنے اس تکلیف دہ سفر پر روانہ ہوا۔ اس نے اپنی فوج کے ایک حصہ کو جس کو کہ وہ اپنے ساتھ نہیں لینا چاہتا تھا۔ اپنے ایک فوجی افسر ہفاسچن کے سپرد کر دیا اور باقی ماندہ فوج کو جو زیادہ سوار دستوں پر مشتمل تھی اپنے ساتھ لے کر سمندر کا رخ کر کے دریائے اربیٹیس کی جانب روانہ ہوا جو بلا مبالغہ حب ندی تھی۔ اس نے سمندر کو اپنے بائیں طرف رکھ لیا تاکہ ساحل کے ساتھ ساتھ جس قدر زیادہ ممکن ہو سکے کنوئیں کھدوائے جائیں اور بحری بیڑے کے لئے وافر مقدار میں پینے کے پانی کا انتظام کیا جا سکے۔ اس کا یہ بھی ارادہ تھا کہ اوریتائی کے ہندی قبیلہ پر دھاوا بول دیا جائے جو ایک عرصہ دراز سے

---

[۱] AN EARLY HISTORY OF INDIA – SMITH

آزاد چلا آتا تھا۔ کیونکہ اس قبیلے کے لوگوں نے سکندر کی فوج کے لئے کوئی قابلِ قدر خدمت انجام نہیں دی تھی اور اس کی طرف دوستی اور خیر سگالی کا ہاتھ بڑھانے میں تحمل اور لیس و پیش سے کام لیا تھا۔ دریائے اربیٹس کے مشرقی جانب ایک اور آزاد قبیلہ ارابا تائی آباد چلا آتا تھا اور جب ان لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ سکندر کی فوج ان کی طرف بڑھ رہی ہے تو یہ لوگ ویرانہ اور صحرا کی طرف بھاگ نکلے اور اپنی شمالی پہاڑیوں میں پناہ لی۔ کیونکہ یہ لوگ نہ سکندر کی اطاعت قبول کرنے پر تیار تھے اور نہ اس کی فوج کے ساتھ مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ [1]

سکندر نے دریائے اربیٹس کو عبور کیا جو زیادہ گہرا تھا اور نہ زیادہ چوڑا بلکہ یہ ایک پایاب تنگ ندی کی صورت میں بہتا تھا۔ [2]

وہ رات کے وقت صحرا کے ایک بڑے حصہ کو طے کر کے آبادی کے قرب و جوار میں پہنچ گیا۔ یہاں اس نے توپخانے کو اپنے پیچھے پیچھے منظم صورت میں چلنے کا حکم دیا اور گھوڑ سواروں کو اپنے ساتھ لے کر ان کو کئی دستوں میں تقسیم کر کے میدانی علاقے کے ایک وسیع رقبے میں پھیلا دیا۔ اس طرح اس نے اورتیائی کے علاقے پر اپنا حملہ شروع کر دیا

---

[1] AN EARLY HISTORY OF INDIA - SMITH.

[2] ABID.

ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے مزاحمت کی، موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور بہت سے لوگ زندہ گرفتار کر لیئے گئے۔ اس کے بعد وہ پانی کے ایک جوہڑ کے قریب ٹھہر گیا اور جب ہانا پچین کی سرکردگی میں فوج کا باقی ماندہ حصہ آکر اس سے مل گیا تو اس نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا اور آگے بڑھ کر رمبکیہ کے قصبے میں پہنچ گیا جو اورتیائی کے علاقے کا سب سے بڑا قصبہ تھا۔ وہ اس کے محل وقوع سے بڑا خوش ہوا اور خیال کیا کہ اگر یہاں ایک نوآبادی قائم کی جائے تو یہ ایک خوشحال بستی بن سکتی ہے اس نے اس مقصد کے لیئے ہانا پچین کو پیچھے چھوڑ دیا۔ تاکہ وہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکے۔[1]

اس کے بعد اس نے اپنا سفر اورتیائی اور گدروزیائی کی درمیانی سرحد کی طرف جاری رکھا۔ جس کے بارے میں اس کو اطلاع ملی تھی کہ آگے اس کا راستہ ایک تنگ درے سے ہو کر گزرتا ہے اور اس درے کے اوپر اورتیائی اور گدروزیائی قبیلوں کا ایک ملا جلا لشکر اس کا راستہ روکے بیٹھا ہے۔ درحقیقت وہ لوگ وہاں اسی مقصد کے لیئے جمع ہو گئے تھے لیکن جونہی ان کو خبر ہوئی کہ سکندر کی فوج ان کی طرف بڑھ رہی ہے اور عنقریب پہنچنے والی ہے تو وہ کسی قسم کی مزاحمت اور مقابلہ کیئے بغیر اپنے مورچوں سے نکل کھڑے ہوئے اور درے کو خالی کر کے بھاگ نکلے

---

[1] AN EARLY HISTORY OF INDIA - SMITH.

اس کے بعد اورتیائی کے سرکردہ افراد اس کے پاس چلے آئے اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے ان کو حکم دیا کہ وہ اورتیائی قبیلے کے لوگوں کو جمع کر کے ان کے گھروں کو روانہ کر دیں کیونکہ وہ ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے اس نے ان لوگوں پر اپولوفنیس کو سٹریپ مقرر کر دیا اور اسی کے ساتھ اس نے لیونا ٹڑ کو بھی جو محافظ دستے کا ایک اعلیٰ افسر تھا چھوڑ دیا اور فوجی دستوں کی کمان اسی کے سپرد کر کے اس کو ہدایت کر دی کہ وہ بحری بیڑے کے اس مقام سے گذرنے تک بدستور اورا میں قیام کرے اور شہر میں ایک نوآبادی لبائے اور اورتیائی لوگوں میں نظم ونسق اور امن قائم رکھے تاکہ یہ لوگ سٹریپ کی فرماں برداری اور وفاداری کا دم بھرنے کے لئے آسانی سے تیار ہو سکیں۔ اس کے بعد وہ خود اپنی بھاری فوج کے ساتھ ایک نہایت دشوار گذار راستے پر گدروزیائی کے علاقے کی جانب روانہ ہوا۔ [۵]

اس دشوار گذار راستے کا تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ اس راستے پر زندگی کی ضروریات دستیاب نہیں تھیں اور فوج کے استعمال کے لئے پینے کے پانی کی شدید قلت تھی۔ گرمی کی وجہ سے ان کو رات کے وقت اپنا سفر جاری رکھنا پڑتا تھا۔ وہ سمندر سے بھی خاصے فاصلے پر تھے۔ حالانکہ سکندر کی مرضی تھی

۵۔ AN EARLY HISTORY OF INDIA - SMITH

کہ وہ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ اپنا سفر جاری رکھے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہاں کس قسم کی بندرگاہیں موجود ہیں اور اس طرح بحری بیڑے کی سہولت کے لیے ہر قسم کی ممکن تیاریاں کی جا سکیں جن میں کنوؤں کی کھدائی اور منڈیوں اور بندرگاہوں کی دریافت شامل تھی۔ گدروزیائی کا ساحلی علاقہ بہرکیف بہت زیادہ غیر آباد تھا۔ اس کے باوجود سکندر نے اپنے ایک افسر تھوس کو چند سواروں کے ساتھ سمندر کی جانب روانہ کر دیا۔ تاکہ وہ معلوم کرے کہ آیا سمندر سے نزدیک اس قسم کے مقامات موجود ہیں جہاں پانی دستیاب ہو سکے اور آیا لنگر اندازی کے لیے بندرگاہیں یا کوئی اور سہولت موجود ہے کہ جس سے بحری بیڑہ کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اس شخص نے واپس آ کر اطلاع دی کہ اسے ساحل سمندر پر چند ماہی گیر ملے تھے جو وہیل مچھلیوں کی ہڈیوں سے تیار کی ہوئی جھگیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے پاس جو تھوڑا بہت پینے کا پانی ہے وہ بھی میٹھا نہیں ہے اور ان لوگوں کا گذارہ ہی فقط مچھلی کے گوشت پر ہے۔ اس بنا پر سکندر نے ساحل سمندر کی طرف مڑنے کا خیال ترک کر دیا اور اپنا سفر جاری رکھا۔ [۱]

جب سکندر کا گذر گدروزیا کے ایک ایسے علاقے سے ہوا جہاں غلہ وافر مقدار میں دستیاب تھا تو اس نے اس تمام غلے پر قبضہ کر کے اسے بار برداری کے جانوروں پر لادیا اور ان کے اوپر اپنی ذاتی مہر لگا کر حکم دیا

---

[۱] AN EARLY HISTORY OF INDIA - SMITH -

کہ ان کو سمندر کے کنارے پہنچا دیا جائے لیکن جب وہ سمندر سے نزدیک ایک قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا تو سپاہیوں نے اس مہر کی بھی پروا نہ کی اور محافظوں کے ساتھ مل کر ان سے استفادہ کیا اور ان لوگوں کو بھی کچھ نہ کچھ دے دیا جن کی حالت بھوک کی وجہ سے خراب تھی۔ بلاشبہ وہ اس قدر بدحال ہو گئے تھے کہ ان کو اس بددیانتی کا خمیازہ بعد میں بھگتنے کی بجائے موجودہ خطرے کا زیادہ احساس تھا جس سے ان کو فوری طور پر واسطہ پڑ رہا تھا۔ سکندر نے بھی ان کی یہ حرکت اس ضرورت کے پیش نظر معاف کر دی جس سے یہ لوگ دوچار ہو گئے تھے۔ اس نے اشیائے خوراک کی تلاش میں سارا علاقہ چھان مارا اور معتمد رفقائے کار کے توسط سے وہ تمام خوراک اس فوج کے استعمال کے لئے بھجوا دی جو سمندر کے راستے کشتیوں میں سفر کر رہی تھی۔ اس نے مقامی باشندوں کو حکم دے دیا کہ وہ تمام غلہ جو ضلع میں دستیاب ہے پیس کر کھجور اور بھیڑوں سمیت فوج کے استعمال کے لئے پہنچا دیں اور اس کا ان کو پورا پورا معاوضہ دیا گیا۔ [۱]

اس موقع پر جبکہ سکندر گدروزیا کے اندرونی علاقہ سے ساحل سمندر کی طرف ایک قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا تو رہبر تیز ہوا اور گرد و غبار کی وجہ سے راستہ بھول گئے کیونکہ ریت اڑنے کی وجہ سے راستے کا نشان غائب ہو گیا تھا۔ راستہ معلوم کرنے کی کوئی دوسری صورت نہ تھی۔ یہ رہبر رات کے وقت تاروں کی مدد سے سفر کر کے منزل مقصود کی طرف بڑھنے کا شعور

۱:- AN EARLY HISTORY OF INDIA - SMITH.

نہیں رکھتے تھے۔ سکندر اس صورت حال سے کس قدر گھبرا گیا اور اب اس کے لئے فوجی دستوں کو بائیں جانب ساحل سمندر کی طرف گھمانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ وہ کچھ گھوڑ سواروں کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھا۔ لیکن گھوڑ سواروں کے گھوڑے تھک کر چور ہو گئے تھے اور ان میں آگے بڑھنے کی سکت نہیں تھی۔[۱] سکندر نے ان سب کو چھوڑ دیا اور فقط پانچ گھوڑ سواروں کی معیت میں آگے بڑھا۔ تھوڑی دور سفر کرنے کے بعد وہ ساحل سمندر پر پہنچ گیا۔ یہاں ریت کے نیچے کھدائی کرنے سے صاف شفاف اور میٹھا پانی مل گیا۔ اس کے بعد ساری فوج یہاں پہنچ گئی اور انہوں نے سات دن تک ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ اپنا سفر جاری رکھا اور آخر کار جب رہبروں نے دوبارہ راستہ پالیا تو وہ دوبارہ اندرونی علاقے کی طرف بڑھے۔ سکندر اس کے بعد گدروزیا کے صدر مقام کی طرف روانہ ہوا جو پورا کہلاتا تھا اور یہاں سے روانہ ہونے کے بعد گدروزیا کے صدر مقام پورا تک اپنا سفر مکمل کرنے میں اسے پورے ساٹھ دن لگے۔ تقریباً تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ سکندر کی فوج کو ایشیا بھر میں اپنے سفر کے دوران جتنی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا وہ اس سے کہیں کم تھیں جو اس کو ساحل مکران کے راستے سفر کے دوران پیش آئی تھیں۔[۲]

۱:- AN EARLY HISTORY OF INDIA – SMITH

۲:- ABID.

اس سفر کے دوران گرمی کی شدت اور پانی کی قلت کی وجہ سے فوج کا بڑا حصہ تباہ ہوگیا اور خصوصاً بار برداری کے جانور ایک طرف ریت کی نرمی اور گہرائی اور دوسری طرف گرمی کی تپش سے جو آگ کی طرح جلاتی تھی بڑی تعداد میں ہلاک ہو گئے۔ ان کا گذر ریت کے ایسے ٹیلوں سے ہوا جو نہایت نرم تھے اور ان میں انسانوں اور حیوانوں کی ٹانگیں کچھ اس طرح دھنس جاتی تھیں جس طرح کہ کیچڑ یا برف کے اوپر گذرنے سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پہاڑی ٹیلوں کو عبور کرتے وقت اترائیوں اور چڑھائیوں کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ سامنے آیا جس کی وجہ سے گھوڑے خچر تھک کر چور ہو گئے کیونکہ یہ راستے نہ صرف ناہموار تھے بلکہ ان میں استحکام بھی نہیں تھا۔ منازل کے درمیانی فاصلوں کی طوالت بھی بڑی تکلیف دہ تھی کیونکہ پانی کی متلاشی فوج کو اکثر عام منازل کے مقابلہ میں زیادہ مسافت طے کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ تھا جب وہ تمام رات سفر کر کے اپنی منزل مکمل کر لیتے تھے اور صبح سویرے ان کو پانی مل جاتا تھا تو ان کی ساری تکالیف رفع ہو جاتی تھیں لیکن پانی نہ ملنے کی وجہ سے بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ان کو دن چڑھے بھی اپنا سفر جاری رکھنا پڑتا تھا۔ اس طرح گرمی اور پیاس کے مارے ان کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ ؎

؎:- MC CRINDLIS ANCIENT INDIA AND ITS IN VASION BY ALEXENDER THE GREAT.

فوجی خود بھی باربرداری کے جانوروں کی ہلاکت کا باعث تھے کیونکہ جب بھی ان کی خوراک ختم ہو جاتی تھی تو وہ مل کر ان جانوروں کو ہلاک کر کے ان کا گوشت کھا لیا کرتے تھے اور بہانہ یہ تھا کہ یہ جانور پیاس اور گرمی کی وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں۔ معاملہ کی اصل حقیقت معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ سب لوگ یکساں طور پر مصیبتوں میں گرفتار تھے اور ان جانوروں کو ہلاک کرنے میں سب کا ہاتھ تھا۔ سکندر ان حرکتوں کا نوٹس لینے کی بجائے چشم پوشی کو زیادہ مناسب خیال کرتا تھا۔ اب ان سپاہیوں کو جو بیمار تھے یا تھکاوٹ کی وجہ سے نیند کے غلبہ کے تحت پیچھے رہ گئے تھے ساتھ لینا آسان نہ تھا۔ کیونکہ اپنی حفاظت کی خاطر فوج کو اکٹھا سفر کرنا پڑتا تھا۔ بعض لوگ جن میں سکت تھی نیند سے بیدار ہونے کے بعد فوج سے جا کر مل جایا کرتے تھے لیکن جن لوگوں میں سکت نہ تھی وہ ریگستان میں پڑے رہ جاتے تھے جس طرح کہ سمندر میں کشتیاں غرق ہو جاتی ہیں۔ ویگنوں کو تباہ کرنے کی حرکتیں سفر کے ابتدائی مراحل سے شروع ہو گئی تھیں، کیوں کہ ان کو گھوما پھرا کر آسان راستوں سے کھینچ کر لے جانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جانوروں کی ہلاکت کی وجہ سے ان ویگنوں کا استعمال بھی ایک دشوار مسئلہ تھا۔ اسی وجہ سے بیمار اور تھکے ماندے لوگوں کو اٹھانے کے لئے بھی سواری کی کمی پیدا ہو گئی تھی۔[1]

---

[1] IN VASION OF INDIA BY ALEXENDER MC CRINDLE.

فوج ایک اور حادثہ کا شکار بھی ہو گئی۔ ان علاقوں میں میدانوں کی بجائے بارش اکثر پہاڑوں کے اوپر ہوا کرتی ہے اس موقعہ پر فوج رات کے وقت پانی کی وجہ سے ایک ندی کے کنارے خیمہ زن تھی آدھی رات کو غیر متوقع طور پر ندی میں سیلاب آیا اور خیمہ برداروں کے بیوی بچوں کو بہا لے گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ شاہی سامان اور باربرداری کے جانور بھی بہہ گئے۔ فوج کے سپاہیوں نے بڑی مشکل سے اپنے اسلحہ کا کچھ حصہ اور اپنی جان بچائی۔

سکندر عموماً اپنا کیمپ پانی سے کچھ دور فاصلہ پر لگایا کرتا تھا۔ کیونکہ سپاہی اور جانور پانی پر پل پڑتے تھے اور اس کو نہ صرف گندہ کرنے کا باعث بنتے تھے بلکہ انتہائی پیاس کے باعث بے انتہا پانی پینے کی وجہ سے فوراً ہلاک بھی ہو جایا کرتے تھے۔[لہ]

ایک موقعہ پر فوج ایک ریگستانی علاقے میں سفر کر رہی تھی۔ گرمی سخت تھی اور سورج آسمان پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، سکندر تھکاوٹ کے باوجود فوج کے آگے آگے پیدل چل رہا تھا تاکہ اس کے فوجی یہ خیال نہ کریں کہ وہ ان کی تکالیف میں برابر کا شریک نہیں ہے اس اثناء میں فوج کے چند جوانوں نے تھوڑا پانی پا لیا جو ایک چھوٹے سے چشمہ کے قریب جمع ہو گیا تھا۔ انہوں نے اسے بڑی مشکل سے اکٹھا کر کے بڑی عجلت

لہ INVASION OF INDIA BY ALEXENDER - McCRINDLE

کے ساتھ ایک ہیلمیٹ میں ڈالا اور کچھ اس انداز سے سکندر کے سامنے
پیش کیا کہ گویا وہ اسے ایک نادر اور نایاب تحفہ پیش کر رہے ہوں۔ سکندر
نے پانی لینے کے بعد ان جوانوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر اسے زمین پر گرا
دیا۔ سکندر کی اس جوانمردانہ حرکت سے فوج میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ اس نے زمین پر پانی گرا کر سب کی پیاس بجھا دی ہے
سکندر کی اس غیر متوقع حرکت سے ان کے حوصلے بہت زیادہ بلند ہو گئے
سکندر کی اس حرکت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی طبیعت
میں کس قدر غیر معمولی قوت برداشت تھی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح
ہو جاتا ہے کہ فوج کا حوصلہ بلند رکھنے اور اس کا انتظام اور تنظیم قائم رکھنے
میں اسے کس قدر مہارت اور قوت حاصل تھی۔ [ؔ]

سکندر نے گدروزیا کے دارالحکومت پورہ میں کچھ دن قیام کیا اور
فوج کو بھی یہاں آرام کرنے کا موقعہ ملا۔ یہاں ایریا (ہرات) اور درنگیانا
(زرنج) کے سٹریپ خوراک کی ایک بڑی مقدار ساتھ لا کر اس کے انتظار
میں موجود تھے۔ وہ یہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد کرمان چلا گیا۔ جہاں
اس کا معتمد سپہ سالار کریٹرس اپنی فوج کے ساتھ اس کے ساتھ آ ملا۔ سکندر
نے پورا میں اپنے قیام کے دوران اپولوفنیس کو جس کو اس نے اورا

ؔ:- IN VASION OF INDIA BY ALEXENDER -
MC CRINDLE

میں اوراتائی لوگوں پر سٹریپ مقرر کر کے چھوڑا تھا معزول کر دیا۔ کیونکہ اس نے سکندر کی ہدایات اور احکامات کی پرواہ نہیں کی تھی اور اس کی جگہ طوسس کو سٹریپ مقرر کر دیا لیکن اس کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے سپر ٹینیس کو اس عہدے پر مامور کر دیا۔ اس افسر کو اس سے پہلے کرمان کا سٹریپ نامزد کیا گیا تھا۔ لیکن اب اراخوزیا اور گدروزیا دونوں صوبوں کا انتظام اس کے سپرد ہوا۔ خیال ہے کہ جس طرح موجودہ زمانہ میں مکران اور لسبیلہ کو ملا کر مکران کا نام دیا جاتا ہے اسی طرح اس زمانہ میں گدروزیا اور اوراکو ملا کر گدروزیا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ؎۱

ایڈمرل نیرخس کی داستانِ سفر

امیر البحر نیرخس جس نے رضاکارانہ طور پر بحری بیڑے کو دریائے فرات کے دھانے تک لے جانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ سکندر کی ٹبالہ سے روانگی کے کوئی تین ہفتہ بعد اکتوبر ۳۲۵ء قبل مسیح کے اواخر میں اپنے اس سمندری سفر پر روانہ ہوا اور دریائے سندھ کے دہانے پر پہنچ گیا لیکن ایک آبی دیوار کی وجہ سے کشتیوں کو سمندر میں اتارنے میں دقت پیش آئی اور اسے مجبوراً دریائے سندھ کے دہانے ایک محفوظ بندرگاہ میں پناہ لینی پڑی اور وہ بمشکل اپنے بیڑے کو سمندر میں اتارنے میں کامیاب ہو سکا

؎۱ :- INVASION OF INDIA BY ALEXENDER

MC CRINDLE

اس کے بعد اس نے اپنا بحری سفر مغرب کی طرف جاری رکھا اس سفر کے دوران اس کے عملے کو یونانی فوج سمیت پانی اور خوراک کی کمی کے باعث بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ تقریباً ایک سو پچاس کلومیٹر کے لگ بھگ سفر کرنے کے بعد وہ دریائے اربیئس کے دہانے پر پہنچا جو ارابا تائی آخری ہندی نژاد لوگوں اور اوراتائی قبیلہ کے لوگوں کے علاقوں کے درمیان سرحد کا کام دیتا تھا جو اس دریا کے مغرب میں ایک وسیع علاقے کے اندر بود و باش رکھتے تھے اور اس دریا کے مشرقی جانب ارابا تائی لوگوں کا علاقہ تھا۔ مزید ایک سو پچاس کلومیٹر سفر کرنے کے بعد وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جو کو کالا کہلاتا تھا۔ یہاں بحری بیڑے کی کشتیاں لنگر انداز ہوئیں اور تھکے ماندے یونانی فوجیوں نے کچھ دن یہاں آرام کیا۔ یہاں اس کا رابطہ لیون ناٹو کے ساتھ قائم ہو گیا۔ جس کو سکندر نے اورا میں اوراتائی قبیلہ کے لوگوں میں نظم و نسق قائم کرنے اور ایک نو آبادی بسانے کی غرض سے چھوڑا تھا اور اس کو ہدایت کی گئی تھی کہ بحری بیڑے کے اس مقام سے گزرنے تک وہ یہاں ہی ٹھہرا رہے۔ خبر آئی کہ یونانیوں اور اوریتائی لوگوں کے درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی تھی۔ لیون ناٹو نے ان کو زبردست شکست دے کر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس لڑائی میں اوریتائی قبیلہ کے کوئی آٹھ ہزار پیادے اور تین ہزار سوار شامل ہوئے تھے اگرچہ یونانی فوج کا نقصان بلحاظ تعداد کم تھا لیکن یہ نقصان اہم ضرور تھا کیونکہ یونانیوں کی طرف سے ہلاک ہونے والوں

میں اپولوفینیس بھی شامل تھا۔ جس کو سکندر نے اورتیائی لوگوں کے اوپر
سٹریپ مقرر کیا تھا اور لیوناٹو کو اس کی مدد کے لئے چھوڑ گیا تھا اس
لڑائی میں اورتیائی قبیلہ کی طرف سے چھ ہزار افراد اور اس قبیلہ کے تمام
سرکردہ افراد مارے گئے ؎

کوکالا کے مقام پر کشتیوں کی مرمت کی گئی اور عملہ کے بیمار اور
کمزور افراد کو اتار کر ان کی جگہ لیوناٹو کے فوجیوں سے پُر کر دیا گیا اور اس
کے بعد بحری بیڑے نے اپنا سفر جاری رکھا۔ دریائے ٹڑوس کے دہانے
پر ان کی مڈھ بھیڑ ایک نہایت وحشی اور پسماندہ قوم سے ہوئی جن کے بدن
میلے کچیلے اور جن کے بدن جانوروں کی مانند بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے
جانوروں کے پنجوں کی مانند ان کے ناخن اس قدر لمبے تھے کہ ان سے مچھلی
کی کھال اور نرم لکڑی بڑی آسانی کے ساتھ چھیلی جا سکتی تھی۔ ان کے
کپڑے جانوروں کے چمڑے اور مچھلی کی کھال سے تیار کئے جاتے تھے۔ ان
لوگوں سے ایک معمولی جھڑپ کے بعد بحری بیڑہ یہاں پانچ دن لنگر انداز
ہوا تاکہ کشتیوں کی مرمت کی جا سکے۔ اور چھٹے دن روانہ ہو کر راس ملان
کو پار کر لیا۔ جو اسی زمانہ میں بھی کوہ ملانک کے نام سے موسوم تھا۔ یہی مقام
اورتیائی قبیلہ کی آخری حد تھی اور اس کے بعد گدروزیا کا علاقہ شروع ہوتا
تھا۔ اورتیائی قبیلہ کے لوگ وحشی نہیں تھے۔ ہندیوں کی طرح عمدہ لباس
پہنتے تھے اور اچھی قسم کے ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ لیکن لوہے کے

؎ AN EARLY HISTORY OF INDIA – S

استعمال سے ناواقف تھے۔ ؎۱

دریائے مُردس جس سے مراد غالباً ہنگول تھا کا ایک معادن خشک دریا آراآبی کہلاتا تھا اور یہ دریا بدستور اسی نام سے مشہور ہے اور تیانی لوگوں کی زبان اور ان کے رسم ورواج ہندیوں سے مختلف تھے۔ وہ اپنے مُردوں پر نوحہ کرنے کی بجائے خوشیاں مناتے ناچتے گاتے تھے۔ مُردے کو عمدہ لباس اور زیورات پہنانے کے بعد صحرا میں لے جاکر دفن کئے بغیر درندوں کے رحم وکرم پر چھوڑ آتے تھے۔ اور ان کے عمدہ لباس اور زیورات وغیرہ اتار کر آپس میں بانٹ لیتے تھے اور جانوروں کی قربانیاں دے کر ان کا گوشت مرنے کے ورثا اور لواحقین کو کھلاتے تھے۔ یہ ایک قسم کی ضیافت ہوتی تھی۔ ؎۲

ساحلی علاقہ کے باشندے کلیتاً مچھلی پر گذارہ کرتے تھے۔ یونانیوں نے ان کو اچیتو پہاگی کا نام دیا تھا جس کے معنی ماہی خور کے ہیں۔ یہاں سمندر میں ویل مچھلیاں بڑی تعداد میں ہوتی تھیں جو بحری بیڑہ کی کشتیوں کے لئے خطرہ کا موجب تھیں لیکن مقامی لوگوں کے لئے ان کا تیل اور ہڈیاں بڑی کارآمد تھیں۔ ان لوگوں کے مویشی اور بھیڑ بکریاں مچھلی کھا کر گذارہ کرتی تھیں۔ ؎۳

؎۱:- AN EARLY HISTORY OF INDIA - SMITH.

؎۲ INVASION OF INDIA BY ALEXENDER - MC CRINDLE.

؎۳ ABID

اس سفر کے دوران بحری بیڑہ جن مقامات یا بندرگاہوں پر لنگرانداز ہوا تھا۔ ان میں بجاگیسرہ (اور ماڑہ) کلمہ (کلمت بند) خیدزی (پسنی بندر) ڈومو (ڈومگ بندر) بارنہ (گوادر بندر) درمبوسہ (کوہ ڈرامب) اور کپھا قابل ذکر ہیں۔

یہ بحری بیڑہ ہفت تلار کے جزیرے کے نزدیک سے بھی گذرا تھا۔ جس کا ذکر نیرخس نے نوسالا کے نام سے کیا ہے۔ ایرانی اسے استولا اور ہندو اسے ستادیپ کے نام سے یاد کرتے تھے۔ بلوچ اسے ہپت تلار کا نام دیتے ہیں۔ اس زمانہ میں اس جزیرہ کے متعلق عجیب وغریب توہمات مشہور تھیں۔ ایک روایت یہ تھی کہ جو بھی شخص اس جزیرے کے اندر چلا جائے تو اس کے واپس آنے کی امید باقی نہیں رہتی اور وہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتا ہے۔ یونانی بھی اس پر قدم رکھنے سے ڈرتے تھے۔ نیرخس خود چند لوگوں کے ساتھ اس کے کونے کونے میں گھوم آیا تھا۔ لیکن وہ صحیح وسلامت واپس آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب روائتیں محض افسانہ تھیں جو توہم پرستی کا نتیجہ تھیں۔ [۵]

آخرکار بحری بیڑہ تمام قسم کے خطروں کا مقابلہ کرتے ہوئے بادس کی بندرگاہ میں داخل ہوا۔ جو راس جاسک کے نزدیک خلیج ہرمز میں واقع تھی اور اس طرح یونانیوں کا رابطہ کرمان کے مہذب صوبہ کے ساتھ قائم ہوگیا۔ اس کے بعد یہ لوگ ہرمز کی بستی میں داخل ہو گئے۔ جہاں ہر قسم کی

۵:۔ AN EARLY HISTORY OF INDIA - SMITH -

ضرورت کی اشیاء دستیاب تھیں۔ اس موقعہ پر سکندر کرمان میں موجود تھا اور نیرخس اپنے ایک ساتھی کے ساتھ فوراً اس کے دربار میں حاضر ہوا اور اسے بڑی مشکل سے رسائی حاصل ہوئی۔ اس کی حالت اس قدر خراب تھی کہ سکندر پہلے تو اس کو پہچان نہ سکا اور پھر خیال کیا کہ بحری بیڑہ شاید سمندر کی موجوں کا شکار ہو گیا ہے۔ لیکن نیرخس نے اس کو یقین دلایا کہ بحری بیڑہ صحیح سلامت خلیج فارس میں کھڑا ہے اور اس وقت جبکہ سکندر سوسا میں تھا نیرخس نے بحری بیڑے کو دجلہ میں پہنچا دیا اور اس طرح اس کا بحری سفر مکمل ہو گیا۔

ساحل مکران کی نباتاتی کیفیت

ارسٹوبولوس کا بیان ہے کہ سکندر کی یونانی فوج کا ساحل مکران کے جس بنجر علاقوں سے گذر ہوا تھا۔ وہاں مر کے درخت بڑی تعداد میں پائے جاتے تھے جن کے تنوں اور شاخوں سے ایک قسم کا رس نکلتا تھا۔ اور اس کے قطرے جم کر گوندھ کی صورت اختیار کرتے تھے اور اس علاقے میں یہ درخت رس پیدا کرنے والے تمام درختوں سے زیادہ بڑے تھے۔ فونیقوں نے جو سوداگروں کی حیثیت سے سکندر کی فوج میں شامل تھے یہ رس بھاری مقدار میں جمع کر کے اپنے باربرداری کے جانوروں پر لاد دیا تھا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ ان لوگوں نے مجھڑ کی جڑیں بھی جمع کر لی تھیں جو اس علاقے میں وافر مقدار میں دستیاب تھیں لیکن ان کا ایک بہت بڑا حصہ فوجیوں کے پاؤں تلے کچل گیا تھا جس کی وجہ سے ان کی خوشبو دُور دُور تک پھیل

گئی تھی۔[1]

دوسری قسم کے عجیب وغریب درخت بھی ان بنجر علاقوں میں پائے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک درخت اپنی شاخوں کی بنا پر یورپ کے ان درختوں سے مشابہت رکھتا تھا جو انگریزی زبان میں لارل کہلاتا ہے یہ ایسے ساحلی علاقوں میں بھی سمندر کے عین کنارے پائے جاتے تھے۔ جہاں سمندر کا پانی جوار بھاٹے کے دوران چڑھ آتا تھا۔ اور جب زمین کا یہ حصہ جہاں یہ درخت پائے جاتے تھے پانی سے بھر جایا کرتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ درخت سمندر میں اُگ آئے ہیں لیکن جب پانی ہٹ جاتا تھا تو یہ خشک زمین کے اوپر رہ جاتے تھے۔ بہرکیف ان درختوں سے ایک عجیب سماں پیدا ہوتا تھا۔ یہ زیادہ تر چھوٹے چھوٹے غاروں میں اگ آئے تھے جن کے اندر پانی ہر وقت کھڑا رہتا تھا۔ لیکن سمندر کے کھارے پانی سے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ ان میں سے بعض درختوں کی اونچائی تیس فٹ سے زیادہ تھی۔ ان میں اسی موسم کے دوران پھول لگ جایا کرتے تھے جن کا رنگ سفید بنفشہ سے مشابہت رکھتا تھا اور ان میں بلا کی خوشبو تھی۔ ان کے علاوہ ایک دوسری خاردار جھاڑی کا بھی ذکر ملتا ہے جو خشکی پر پائی جاتی تھی اس کے کانٹے اس قدر سخت اور مضبوط تھے کہ اگر کسی سوار کا لباس ان میں الجھ جاتا تھا تو یہ کانٹے ٹوٹنے کی بجائے سوار

---

[1] MC CRINDLE. ANCEIUT INDIA AND ITS IN VASION BY ALEXENDER THE GREAT.

کو اپنی طرف کھینچ کر اسے گھوڑے سے گرا دیتے تھے اگر کوئی خرگوش بھاگ کر ان خاردار جھاڑیوں میں پھنس جاتا تھا تو یہ کانٹے اس کی کھال میں اس طرح پیوست ہو جاتے تھے کہ خرگوش کے لیے زندہ بچ نکلنا ناممکن تھا۔ یہ ان جھاڑیوں میں اس طرح پھنس جاتے تھے جس طرح کہ مچھلی جال میں پھنس جاتی ہے۔ لیکن ان جھاڑیوں کے کانٹے لوہے کے ساتھ ٹکرا کر ٹوٹ جاتے تھے۔ ان میں سے ایک قسم کا رس بھی باہر نکل آتا تھا جو تیزاب کی طرح کڑوا ہوتا تھا۔ سکندر کے فوجیوں کو سمندر میں اس قسم کے جزیرے بھی نظر آئے تھے جو مد جزر کے دوران جب پانی چڑھ آتا تھا تو غائب ہو جاتے تھے اور جب پانی بیٹھ جاتا تھا تو یہ دوبارہ نمودار ہو جاتے تھے۔

سکندر اعظم نے مقدونیہ پہنچنے سے پیشتر ۳۲۴ سنہ قبل مسیح کے وسط میں بابل کے مقام پر نمونیہ میں مبتلا ہو کر عین عنفوانِ شباب میں وفات پائی اور اس طرح دنیا ایک بہت بڑے فاتح اور فوجی سپہ سالار سے محروم ہو گئی۔

ANCIENT INDIA AND ITS INVASION BY ALEXENDER THE GREAT MC CRINDLE

ساتواں باب

موریا خاندان اور مابعد

سکندر اعظم کی وفات کے بعد اس کے مفتوحہ علاقوں کے مشرقی ممالک کا وارث اس کا مشہور سپاہ سالار سیلوکس نکوتر بن گیا۔ سکندر کی زندگی ہی میں پنجاب کے سٹرپ فلپس کی ہلاکت اور قتل کی اطلاع سکندر کو اس کے سفرِ واپسی کے دوران کرمان ہی میں مل چکی تھی۔ اس کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد ہاتھیوں سمیت تمام یونانی اعلیٰ افسر سندھ اور پنجاب سے نکال باہر کر دیئے گئے۔ ۳۲۱ سنہ قبل مسیح کے لگ بھگ ایوڈیموس کے سوا کوئی یونانی اعلیٰ افسر سندھ اور پنجاب میں باقی نہ رہا۔ اس افسر کو بھی ۳۱۷ سنہ قبل مسیح میں پنجاب سے باہر نکلنا پڑا۔ اس پر طرہ یہ کہ ۳۰۵ سنہ قبل مسیح میں سیوکس نکوتر نے دریائے سندھ کو عبور کر کے سندھ اور پنجاب پر دوبارہ تسلط جمانے کی سعی لاحاصل کی لیکن مگدھا کے نوجوان راجہ چندر گپتا موریا نے اسے میدانِ جنگ میں شکست دی اور سندھ و پنجاب تو درکنار یونانیوں کو آریانا کے بیشتر حصہ سے ہاتھ دھونا پڑا۔ جس میں وادی کابل، گندارا، اراخوزیا اور تقریباً تمام گدروزیا یا اس کا ایک بڑا حصہ شامل تھا۔ سلوکس صرف پانچ سو ہاتھیوں

کے عوض نہایت ذلت آمیز شرائط پر معاہدہ کرکے ان علاقوں سے دست بردار ہوگیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ شام کا گورنر انٹی گونس اس کی بالادستی قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اور وہ اس کے ساتھ اپنا معاملہ نمٹانے کی خاطر یکسوئی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے حریف کو شکست دے کر سکندر کے تمام مشرقی مقبوضات کا حکمرانِ اعلیٰ بن گیا۔ موریا کے ممتاز اور مشہور راجہ اشوکا کی وفات تک جو ۲۲۰ء قبل مسیح واقع ہوئی مذکورہ بالا ممالک موریا خاندان کی وسیع سلطنت کا ایک اہم حصہ تھے شمالی ہندوستان کے علاوہ جنوبی ہندوستان کے بیشتر حصہ پر بھی ان کا تسلط قائم تھا۔ اس خاندان کا مشہور مہاراجہ چندر گپتا بندوسار اور اس کا بیٹا اشوکا منفرد حیثیت کے مالک تھے ان کے زمانے میں تمام ہندوستان میں نیشنلزم اپنے عروج پر تھا۔ اس سے پیشتر اتنی وسیع سلطنت ہندوستان میں کبھی قائم نہیں ہوئی تھی۔[1]

اس خاندان کا بانی مبانی چندر گپتا موریا اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ اس کو ابتدا ہی سے ایک نہایت قابل اور عالم برہمن اتالیق اور مشیر کے طور پر ملا جو مختلف ناموں چانکیہ، کوٹلہ، وشنو بھگت وغیرہ سے عام لوگوں میں روشناس تھا۔ اس برہمن عالم کی تصنیف ارتھ شاستر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاسی اور انتظامی امور کا ایک بڑا فلاسفر تھا۔[2]

چندر گپتا موریا نے اپنی سلطنت کی وسعت کے پیش نظر اپنا دارالحکومت

ف[1] :- EARLY HISTORY OF INDIA - SMITH.

ف[2] :- ABID.

مگدھا سے پاٹلی پترا (پٹنہ) منتقل کیا۔ میگستھنز ۳۰۲ قبل مسیح میں سیلوکس نکوتر کے سفیر کی حیثیت سے چندر گپت موریا کے دربار میں آیا تھا۔ اس نے چندر گپتا موریا کے دربار کی شان و شوکت کی بڑی تعریف کی تھی اور اس کے شاہی محل کو عجوبہ روزگار قرار دیا تھا۔[۱]

میگستھنز لکھتا ہے کہ شاہی محل کی بلند پایہ عمارات باغیچوں، فواروں تالابوں کی رنگا رنگ نہایت خوبصورت مچھلیوں، وسیع پارکوں، قسم قسم کے پھولوں، درختوں، ان کے اندر گھومتے ہوئے ہرنوں، غزالوں، ناچنے والی مورنیوں، دوسرے خوبصورت جانوروں اور پرندوں کو دیکھ کر ان پر ایرانی فردوس کا گمان ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چندر گپتا موریا اور اس کے جانشین تعمیرات فنکاروں، علما اور حکما اور باکمال معماروں کے قدر داں تھے۔ ان کے عہد کی عمارات قلعوں اور ان کی یادگاری لاٹوں میں جو خصوصاً اشوکا کے زمانہ میں تعمیر کی گئی تھیں، ایرانی اثرات پوری طرح مترشح تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سکندر مقدونی کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ایرانی فنکاروں، معماروں اور باکمال لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے ایران کو خیر باد کہہ کر اپنے آپ کو چندر گپتا اور اس کے جانشینوں کے دربار سے وابستہ کر لیا تھا۔ اس زمانہ میں "سکہ" کا رواج بھی ایرانی دنیا تک محدود تھا۔ ہندوستان میں "سکہ" کا رواج بھی صحیح معنوں میں گپتا خاندان کے دور اقتدار

---

[۱]:- EARLY HISTORY OF INDIA - SMITH

میں رائج ہوا تھا جو عموماً ایرانی طرز پر بنائے جاتے تھے۔

موریا خاندان کے راجاؤں نے اصلاحات اراضی اور مالیات کے سلسلے میں جو نظام رائج کیا تھا وہ بھی بنیادی طور پر ایران سے ماخوذ تھا اس کا طرزِ حکومت بھی ایران کی مانند وفاقی تھا۔ بدھ مت اور جین مت کے بانی بدھا اور مہاویرا بھی مگدھا سے تعلق رکھتے تھے جو چھٹی صدی قبل مسیح میں ہو گذرے تھے اور ان دونوں مذاہب نے اس زمانہ کے ہندوستان کے باشندوں کے معاشرہ اور ان کے اخلاق و عادات پر گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ جب اشوکا نے کالنجر کی تسخیر کے دوران بڑے پیمانے پر خونریزی اور قتل و غارت سے متاثر ہو کر بدھ مت قبول کیا تو اس مذہب کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ جس کے اثرات دور دور تک پھیل گئے۔ وادی کابل ولایت قندھار حتیٰ کہ بلوچستان تک اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مجسمہ سازی کے فن میں بھی بڑی ترقی ہوئی جس کے اعلیٰ نمونے شمال مغربی سرحدی صوبہ اور وادئ کابل وغیرہ سے دریافت ہوئے ہیں۔[1]

برصغیر ہند و پاکستان میں بلدیات کا قیام برطانوی دورِ اقتدار سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اس قسم کے شواہد موجود ہیں کہ موریا خاندان کے دورِ حکومت میں جو بڑے بڑے شہر اور قصبات تعمیر ہوئے تھے، ان میں صحت و صفائی، صنعت و حرفت، تجارت اور دوسرے امور سے جن میں

---

[1] EARLY HISTORY OF INDIA – SMITH.

نظم ونسق اور انصاف بھی شامل تھا نمٹنے کے لیے بلدیاتی کونسلیں قائم تھیں اور ان کے اراکین اہل تجارت، اہلِ زراعت اور اہل صنعت وحرفت کے نمائندوں سے نامزد کئے جاتے تھے۔ ان بڑے بڑے شہروں کا نظم ونسق، صحت وصفائی، تجارت اور صنعت وحرفت کی دیکھ بھال محاصل کی وصولی اور خرچ انہی بلدیاتی اداروں کے فرائض میں شامل تھا۔[۱]

بلوچستان میں بھی ہندو کلچر کے اثرات اسی خاندان کے دورِ حکومت میں سرایت کر گئے تھے۔ لسبیلہ میں ہنگلاج کے مقام پر مہادیو کا ستھان مستونگ میں شیوجی کا مندر اور مکران میں شادیپ کا ستھان غالباً اسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اشوکا نے ۲۳۲ قبل مسیح میں وفات پائی اور اس کی وفات کے بعد اس کے جانشین اس کی سلطنت کو برقرار نہ رکھ سکے اور شہنشاہان ایران نے دوبارہ آریانا پر قبضہ کر کے اپنے اقتدار کو دریائے سندھ سے بھی آگے پنجاب اور سندھ تک بڑھا دیا۔[۲]

یونان

سیلوکس نکوتر نے ۳۰۶ قبل مسیح میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا۔ اس اولوالعزم بادشاہ کے عہدِ حکومت میں سیلوکیوں نے مشرقی ایران

---

[۱]: تہذیب وادیٔ سندھ۔ محمد ادریس صدیقی۔

[۲]:- EARLY HISTORY OF INDIA -- SMITH.

میں بہت سی بستیاں بسائیں اور نوآبادیاں قائم کیں۔ ۲۶۱ء قبل مسیح میں اس کی وفات ہو گئی۔ اس کے جانشین اس کی وسیع سلطنت کو قائم نہ رکھ سکے۔ اس کی وفات کے بعد اس کے مقبوضہ ممالک جن میں باختر کا صوبہ زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ ٹوٹ کر کئی خودمختار چھوٹی چھوٹی یونانی ریاستوں میں تقسیم ہو گئے۔ تیسری صدی قبل مسیح کے نصف ثانی میں بلخ سغد اور مرو پر مشتمل علاقوں پر ڈیوڈوٹس کا قبضہ ہو گیا۔ دوسری صدی قبل مسیح کے نصف اول میں ڈیمیٹرس نے پنجاب اور گندارا فتح کر کے کابل ہرات اور اراخوزیا کو اس میں ملا دیا اور ایک وسیع حکومت قائم کی اسی زمانے میں باختر کے متصل صوبے ایکرائیڈس کے ہاتھ لگے۔ ان چھوٹی چھوٹی یونانی ریاستوں کی آپس میں سخت لڑائیاں ہوئیں۔ ان لڑائیوں کے نتیجہ میں منڈار نے جس کا ذکر ملندا کے نام سے بدھ مت کی کتابوں میں ملتا ہے اکثر چھوٹی چھوٹی یونانی ریاستوں کو توڑ کر ایک بڑی یونانی ریاست قائم کر دی لیکن یہ ریاست بھی کچھ زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوئی اور ساکا قبائل کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔ منڈار کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے بدھ مت قبول کر لیا تھا۔[1]

ساکا

اسی اثناء میں وسط ایشیا سے بڑی بڑی ہجرتیں شروع ہوئیں ترکی الاصل ہون چین کے صوبہ کانسو پر حملہ آور ہوئے اور یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ

---

[1] :- ایران بعہد ساسانیاں۔ پروفیسر آرتھر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال

وہاں کے اصل باشندوں کو جو یولے چی اور وسون کہلاتے تھے اپنی جگہ سے حرکت کرنی پڑی۔ ان کا ایک بڑا گروہ دریائے جیحوں کے شمال میں آباد ہوگیا۔ طخاری بھی اسی زمانے میں منظر عام پر آئے۔ اس نقل مکانی کے نتیجہ میں قوم ساکا کے بعض قبائل فرغانہ کی وادیوں سے آگے دھکیل دیئے گئے اور یہ لوگ ہرات سے ہوکر اراخوزیا تک آنکلے جو رخج کہلاتا تھا اور درنگیانا (زرنج) میں بھی پھیل گئے جو انہی ساکاؤں کی مناسبت سے سکستان اور پھر سیستان کہلایا۔ سمتھ کا خیال ہے کہ وہ پہلے ہی سے وہاں سکونت پذیر تھے۔ اراخوزیا کے عین شمال تک ان کی موجودگی ان کے سکوں سے ثابت ہے۔ ساکا قبائل کی یہ ہجرت پہلی صدی قبل مسیح میں عمل میں آئی تھی انہوں نے ان علاقوں پر ایک سو سال تک حکومت کی۔ ساکا بادشاہوں میں ماوس، آزس، ازیلائیسس اور ازس کے نام سکوں سے معلوم کئے گئے ہیں جنہوں نے ۹۰ قبل مسیح اور ۸۰ء کے درمیان ان علاقوں پر حکومت کی تھی۔[۱]

ماوس نے ۹۰ قبل مسیح اور ۲۰ قبل مسیح کے درمیان پنجاب کی طرف پیش قدمی کی۔ اس نے گندھارا میں ٹیکسلا کو اپنا دارالحکومت بنالیا جہاں اس سے پہلے سیلوکی باختریوں کی حکومت قائم تھی۔ اس کی وفات کے بعد

---

[۱]:- ایران بعہد ساسانیاں۔ پروفیسر آرتھر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال

[۲]:- THE PATHAN — SIR OLAF CAROE —

آزس اول بیس برس کی کشمکش کے بعد ۵۸ قبل مسیح میں اس کے مقبوضات کا وارث بنا۔ اس نے ایک طویل عرصہ تک حکومت کی اور ایک خوشحال اور مستحکم سلطنت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس کی وفات کے بعد ان علاقوں پر اس کے بیٹا ازی لائیسس نے اور اس کے بعد ازی لائیسس کے بیٹے آزس ثانی نے حکومت کی۔ ؎

ان ساکا قبائل کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ میدانی علاقوں میں گومل ٹوچی اور پائے دار کے راستوں سے داخل ہو گئے تھے جو ان کے سکوں سے ثابت ہے۔ ان میں سے کچھ قبائل سیستان سے روانہ ہونے کے بعد بلوچستان میں وارد ہوئے اور یہاں سے دریائے سندھ کے بالائی علاقوں سے ہو کر گندارا کی طرف نقل مکانی کی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے بھائی بند پارتھیوں کی طاقت میں اس زمانہ میں زبردست اضافہ ہو رہا تھا اور وہ ان کے ہاتھ سے شکست کھانے کے بعد متذکرہ بالا علاقوں کی جانب نقل مکانی کر کے یہاں سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ دار کے کتبوں کے مطابق ساکاؤں کا اصل وطن امیو دریا کا مغربی علاقہ تھا جہاں سے ان کے کچھ قبائل عظیم ہجرتوں کے دوران اراخوزیا اور درنگیانا تک نکل آئے تھے۔ ان کے مغرب میں پارت کا علاقہ پارتھیوں کا وطن تھا جن کے ہاتھ سے شکست کھانے کے بعد یہ لوگ ایک طرف گومل ٹوچی اور پائے دار اور دوسری طرف بلوچستان کے راستے گندارا اور پنجاب کی طرف

؎:- THE PATHAN _ SIR OLAF CAROE.

ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ [1]

ہیروڈوٹس اور آرین دونوں کا بیان ہے کہ ساکا شہسوار پہنتے تھے ان کے سر پر لمبی سرے سے نوکیلی ٹوپیاں ہوتی تھیں۔ ان کی گردنوں میں ان کا روایتی خنجر اور ان کے کندھوں پر ان کے وطن کے تیر کمان آویزاں رہتے تھے۔ یہ ایک نہایت جنگجو اور اعلیٰ پایہ کی شہسوار قوم تھی۔ میدان جنگ میں وہ دشمن پر اچانک اور بڑی پھرتی کے ساتھ یکبارگی پل پڑتے تھے اور لڑائی کے دوران وحشت طاری کرنے والی جنگی چالوں کا مظاہرہ کر کے دشمن پر خوف و ہراس طاری کرتے تھے۔ ان کے سر کے بال لمبے اور داڑھیاں گھنی ہوتی تھیں۔ ان کے بدن پر بال بکثرت ہوتے تھے۔ ان کا جسم بڑا مضبوط اور گٹھا ہوا اور ان کے خد و خال بڑے خوبصورت ہوتے تھے۔ [2]

پارتھی

پارتھیوں نے ارشک کی سرکردگی میں ایران کے اندر جو حکومت قائم کی تھی وہ شہنشاہ کے نگ بنگ اپنے عروج پر تھی۔ اس زمانے میں اشکانی بادشاہ اپنی سلطنت کو وسعت دے کر دریائے سندھ تک پہنچانا چاہتے تھے جو ہخامنشی شہنشاہوں کے زمانے میں ایران کی آخری حد تھی بلکہ اس سے بھی آگے پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی مشرق کی طرف یہ فوجی نقل و حرکت غالباً سکستان کے راستے سے عمل میں لائی گئی تھی۔ کیونکہ بعض سکوں

---

[1] THE PATHAN - SIR OLAF CAROE.

[2] ABID

سے ظاہر ہے کہ ایک پارتھی بادشاہ گنڈوفار فرنیس نے سنہ ۱۹ء میں وادی کابل پنجاب اور گندارا پر اپنی حکومت قائم کی تھی۔ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ مقامی طور پر ایک خود مختار حکمران تھا اور اس کی وفاداریاں طیسفون کی مرکزی حکومت سے وابستہ تھیں۔ گنڈوفار نے سنہ ۴۸ء میں وفات پائی۔[۱]

کشان

گنڈوفار کی وفات کے بعد تقریباً انہی علاقوں پر نژاد ساکا کے ایک دوسرے خاندان کی حکومت قائم ہو گئی جو کشان کہلاتے تھے۔ اس خاندان نے گنڈوفار کے جانشین کو گندارا کے دارالحکومت ٹیکسلا میں شکست دی اور گنڈوفار کے تمام مقبوضات پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس قبیلہ کے لوگ وسط ایشیا سے نکلنے کے بعد باختر میں داخل ہو گئے اور ایران کی پارتھی حکومت کو کمزور کرنے کا باعث بنے۔ انہوں نے اپنے پہلے حکمران کجولا کدفائیسس کی سرکردگی میں دریائے سیحون کے جنوبی علاقے میں اپنے لشکر کو منظم کیا اور ہر طرف حملے شروع کر دیئے۔ کجولا کدفائیسس نے سب سے پہلے سنہ ۶۰ء میں گنڈوفار کے جانشین سے پہلے کابل اور اس کے بعد گندارا کا علاقہ چھین لیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے جانشین ویمہ کدفائیسس نے ٹیکسلا کا محاصرہ کر کے شمالی ہندوستان پر اپنی بالادستی کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد پنجاب اور سندھ پر حملہ کر کے ان علاقوں کو دریائے سندھ کے دہانے تک فتح کر لیا۔ بعد ازاں اس نے ایران کی اشکانی حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر جو روم کی

۱؎ - THE PATHAN - OLAF CAROE.

حکومت سے برسرپیکار تھی۔ کابل، ہرات اراخوزیا سکستان اور گدوزیا پر قابض ہو گیا۔ ۱۲۵ء کے لگ بھگ یہ وسیع سلطنت اس خاندان کے مشہور بادشاہ کنشکا کے قبضہ و اختیار میں آگئی اس نے اپنی سلطنت کو مزید وسعت دے کر اسے دریائے گنگا تک پھیلا دیا اور متورا کو اپنا دارالحکومت بنا لیا اس کا شمالی دارالحکومت اس کی سلطنت کے مرکز میں پرشاپورا (پشاور) قرار پایا۔ کنشکا بدھ مت کا ایک ممتاز مبلغ تھا۔ اس بادشاہ کے کئی کتبے دریافت ہوئے ہیں۔ کشان یوچی قبیلہ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور ساکا اور پارتھی دونوں کے ساتھ خونی رشتہ رکھتے تھے۔ ان سب بادشاہوں کا طرز حکومت وفاقی تھا۔[۱]

۱:- EARLY HISTORY OF INDIA. SMITH.

آٹھواں باب

ایران کے اشکانی (پارتھی) اور ساسانی خاندان

ایران میں اشکانی سلطنت کا بانی ارشک تھا جس نے سنہ ۲۵۰ قبل مسیح میں پارتھیا (پارت) میں اپنی حکومت قائم کی تھی جو رفتہ رفتہ بمرور زمانہ ایک بڑی سلطنت بن گئی۔ ارشک کا تعلق سورین قبیلہ کے پارتی خاندان سے تھا اور یہ اشکانی یا پارتی شمال میں بحیرہ کیسپین کے کنارے بود و باش رکھتے تھے یہ بڑے طاقتور اور نہایت جنگجو واقع ہوئے تھے اور اعلےٰ پایہ کے شہسوار تھے۔ یہ لوگ پارت میں جو خراساں کا صوبہ تھا اور جس میں مشہد واقع ہے وارد ہوئے اور ارشک کی سرکردگی میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ جس کی وسعت اس کے عروج کے زمانے میں دریائے سندھ سے لے کر دریائے فرات تک پھیلی ہوئی تھی اور طیسفون اس کا دارالحکومت تھا۔ گنڈوفار کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا جس کا ذکر اس سے پہلے گذر چکا ہے جس نے وادی کابل گندارا اور پنجاب پر حکومت کی تھی۔ آخری دور میں اشکانی بادشاہوں کی

طاقت میں امتدادِ زمانہ کی وجہ سے انحطاط پیدا ہوگیا اور ان کی کمزوریوں کی وجہ سے ایران میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ امرا خود غرض ہو گئے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی علیحدہ حکومت قائم کرلی۔ اور اس صورت حال سے ایران کی وہ شان و شوکت خاک میں مل گئی۔ جو اشکانیوں کے پیشرو ہخامنشی شہنشاہوں کے زمانہ میں اسے نصیب ہوئی اور جس کو خود اشکانی بادشاہوں نے ایک بار پھر بحال کر دیا تھا جو پانچ سو سال قائم رہی۔[1]

اردشیر پاپکان وہ پہلا ساسانی بادشاہ تھا جس نے ۲۲۶ء میں سب سے پہلے مقامی بادشاہوں کے ساتھ نبرد آزمائی کی۔ ان میں سے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ شکست دی اور ان کے علاقے اپنی قلمرو میں شامل کر لئے۔ ان بادشاہوں کی خود غرضی کا یہ حال تھا کہ یہ سب کے سب جاہ پرست ایک دوسرے کے خلاف تھے اور آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ یہ لوگ اردشیر کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا کر لڑنے کی سکت اور جرأت بھی نہیں رکھتے تھے اردشیر نے ایک ایک کرکے ان سب کو زیر کرلیا اور اس سے اس کے حوصلے اور زیادہ بلند ہو گئے اور اس کی طاقت میں بھی کئی گنا اضافہ ہوا اس کے بعد وہ سب سے زیادہ طاقتور اشکانی بادشاہ اردوان کی طرف متوجہ ہوا اس کو کئی لڑائیوں میں شکست دی اور ایک وسیع سلطنت کا مالک بن گیا۔[2]

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں آرتھر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال۔

[2] ایضاً

اردشیر نے سب سے پہلے اپنے مقبوضات کے نظم و نسق اور انتظام
کو درست کرنے کی طرف توجہ دی اور اپنی فوج کو نئے سرے سے منظم کیا
ملک کی اقتصادی حالت کو درست کرنے کی خاطر مالیات کے نظام کا
از سر نو جائزہ لیا اور کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کی تاکہ ملک اور حکومت
کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ ان فوری اور اہم فرائض سے سبکدوش ہونے
کے بعد اس نے شاہ کشان کو زیر کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کو کئی لڑائیوں
میں پے در پے شکست دے کر اس سے وہ تمام علاقے واپس لے لئے
جو ہنحامنشی اور اشکانی دور اقتدار میں شہنشاہان ایران کے قبضہ و اختیار میں تھے
ان پے در پے کامیابیوں سے ایران کی قدیم شان و شوکت دوبارہ بحال ہو گئی
اور ایران ایک بار پھر ایشیا کی ایک عظیم طاقت بن گیا اور وہ دوبارہ ان حدود
تک پھیل گیا جو روایتی طور پر ایرانی دنیا کے نام سے مشہور چلا آتا تھا اور جہاں
ایرانی تہذیب کے گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے۔[لے]

ایرانی حکومت کی وسعت

ہنحامنشی دور میں ایرانی سلطنت کا مظہر وہ کتبہ ہے جو داریوش
اول کے زمانہ میں تخت جمشید کے مقام پر نصب کیا گیا تھا۔

"منم داریوش بزرگ شاہ شاہان شاہ کشور ہائے کہ دارائے
ہمہ گونہ نژاد است اور دیر زمان شاہ این زمین بزرگ پسر

لے: ایران بعہد ساسانیاں۔ پروفیسر آرتھر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال۔

وشتاسپ ہنحامنشی پارسی آریائی از نژاد آریا - داریوش بزرگ گوید بخواست اہُرمزدا این است کشورہائے کہ علاوہ از پارس در تصرف داشتم و بر آنان فرمان روائی میکردم بمن باج دادند ہرچہ از طرف من برانہا امر میشد میکردند قانون من درآنجا روا و محفوظ بود"

ماد سوسیانا پارت ہرہیو باختر سغد خوارزم (خیوہ) درنگیانا (زرنج) اراخوزیا (رخج) ثتہ گوش (دستہ گوش) گندارا ہندوستان ورکاسے سکائے، وتیگر خدائے سکائے، ماکائے، بابل، آسور عربستان مصر ارمنستان کاپادوکیا سپاردا، سرزمین یونان تاجدار پوتیا کوشیا مچیا، کارکا، اسکودرا۔

ڈاکٹر شہریار شاطر نے ان ممالک اور اقوام کی یوں تشریح کی ہے :۔ ازین ایالات سوسیانا سوس است درنگیانا (سیستان) اراخوزیا رخج ثتہ گوش وگندارا۔ از ایالات شرقی ایران در ایالات بعد از ہندوستان سرزمین ساکا یا است سکائے ہوم نوش وسکاہائے تیزخود۔ ماکا مکران . سپاردا . سارد است پوتیا سرزمین نجد [illegible] کوشیا حبش . محیط اطلس کارکا کارتاژ اسکودرا مقدونیہ ہمہ ایالات امپراطوری ہنخامنشی است۔

سائیکس کا خیال ہے کہ ہنخامنشی .. میں ایرانی صوبوں میں سب سے اہم صوبہ داش کا تھا .. [illegible] کے [illegible] جہ میں [illegible] یا [illegible] پارت درنگیانا (زرنج) آریا (ہرات) خوارزمہ (خوارزم)، باختر (بلخ) گندارا [illegible]

کی سرزمین ستاگدیہ (پنجاب) سرزمین ماکا جو غالباً کمران تھا۔ مغرب کی طرف اروایا عیلام (سوسیانا) اس کے بعد بابل، چالڈیہ (کلدان) اثورا (اسیریا) عربیہ (بشمول سیریا و فلسطین) مصر (بشمول فونیقیا و قبرص) یونان کے جزائر، سپاردا (لیڈیا) ارمنیا و کاپاڈوکیا کے صوبے تھے۔[1]

مورخ امیاں مارسیلینوس نے جن صوبوں کے نام گنوائے ہیں اور جو بدخشوں سٹریپوں اور بادشاہاں زیر دست کے زیر فرمان تھے وہ یہ ہیں

اسیریا (آسور) خوزستان میڈیا پارس ہرکانیا (گرگان) پارتیا (پارت) کارمان بزرگ (کرمان، مرگیانا (مرو) باختر (بلخ) سوگدانا (سغد) ولایت سکیتھائے ماورائے امیوداں (سیحون) سریکا آریا (ہرات) ولایت پروپانیاد (غوریان) درنگیانا، اراخوزیا (رخج) گدروزیا (جنوبی بلوچستان)[2]

پروفیسر آرتھر کرسٹن سین کے مطابق اردشیر نے جو ممالک فتح کیے تھے وہ یہ ہیں:-

پروپانیاد، کاوا (کابل) اراخوزیا، درنگیانا، گندارا، بلخ، سغد، مرو ارمینیہ خوارزم خراسان، ہرات ترکستان پنجاب، مکران۔

ہرتفلسٹ کی تحقیقات کے مطابق مندرجہ ذیل ممالک بہرام دوم ساسانی

---

[1]:- A HISTORY OF PERSIA - PEREY SYKAS.

[2]:- پروفیسر آرتھر کرسٹن سین۔ ایران بعہد ساسانیاں

کی فتوحات کے بعد اس کی سلطنت میں شامل تھے۔

ہرکیانا (گرگان) تمام خراسان سغد، سیستان مکران توران گندرگے

سندھ کا درمیانی علاقہ اس کے دہانے کے آس پاس کے علاقے کچھ کاٹھیاواڑ

مالوہ اور اس کے پرے کا علاقہ شامل تھا اور فقط گندارا اور کابل شاہان کشان

کے زیر فرمان تھے۔[۱]

ایرانی معاشرہ

اہل ایران کے قدیم معاشرے کی سب سے بڑی خصوصیت نظام

خانوادگی تھا جو چار طبقوں پر مشتمل تھا۔

(۱) نمان (خاندان) ۲۔ ولیس (دہ) ۳۔ زنتو (قبیلہ) ۴۔ دیہو (ولایت)

لوگ اپنے آپ کو آریا کہتے تھے۔ اس سے جغرافیائی نام ایران نکلا۔ نقش

رستم میں داریوش کے کتبے میں اس کا ذکر ذیل طریقہ پر کیا گیا ہے:۔

داریوش پسر وشتاسپ ہخامنشی پارسی آریائی اور اس تمام عبارت

کا مطلب خاندان قبیلہ اور قوم کو ظاہر کرنا ہے جب اہل ایران خانہ بدوش

حالت سے گذر کر دہ نشین ہوگئے تو قبیلہ (زنتو) کا تصور درمیان سے خارج

ہوگیا اور ولیس کی اہمیت بڑھ گئی۔ کیونکہ اجتماعی زندگی کا منبع یہی تھا۔[۲]

ساسانی عہد میں یا اس سے کچھ پہلے معاشرے میں ایک ممتاز طبقہ

---

[۱] :۔ ایران بعہد ساسانیاں۔ پروفیسر آرتھر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال۔

[۲] :۔ ایضاً

ابھر آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی شروع ہی سے ایران میں کوئی سات خاندان ممتاز خیال کئے جاتے تھے۔ ان خاندانوں کے افراد اعلیٰ ترین رتبہ کے مالک تھے۔ ان میں ایک خود بادشاہ کا خاندان تھا اور تین دوسرے خاندان سورین، قارین اور اسپہبد زیادہ مقتدر خیال کئے جاتے تھے اور اشکانی الاصل ہونے کے دعویدار تھے۔ ان کا تعلق ملک کے مختلف علاقوں سے تھا۔ مثلاً سیستان، نہاوند وغیرہ ان خاندانوں کے افراد کو ان کے متعلقہ علاقوں میں جاگیریں ملی ہوئی تھیں تمام فوجی اور انتظامی عہدے انہی کے لئے وقف تھے۔ ان لوگوں کا فرض یہ تھا کہ وہ ضرورت کے وقت حکومت کو سپاہ مہیا کرتے تھے جو کلیتاً ان کاشتکاروں پر مشتمل ہوتی تھی جو ان کی جاگیروں پر کام کرتے تھے۔[۱]

مذہب

ایرانی معاشرے کا سب سے اہم پہلو مذہب کا تھا۔ آریوں کے قدیم مذہب کی بنیاد عناصر اجرام فلکی اور قدرت کی طاقتوں کی پرستش پر رکھی ہوئی تھی، لیکن ان سادہ معبودوں کے ساتھ بمرور زمانہ اور نئے خدا بھی شامل ہو گئے جو اخلاقی قوتوں کے مظہر خیال کئے جاتے تھے جو اہر کہلاتے تھے۔ یہ ان صفات کے مالک تھے جو تہذیب و تمدن کے ساتھ وابستہ تھیں دوسرے وہ دیوتا تھے جو وحشت اور بربریت کے مظہر یا نمائندے تھے۔ خیر و شر کا یہ امتزاج مزدائیت کہلاتا تھا۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں زرتشت

---

[۱] ایران بعہد ساسانیاں۔ پروفیسر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال

ایک اصلاح شدہ مزدائیت کا پیغمبر بن کر بلخ میں نمودار ہوا۔ اس کی تعلیم کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ روز اول سے دو مخالف ارواح میں جنگ جاری ہے ایک روح توانا جو مزدا کی حقیقت اصلی ہے اور دوسری روح شر جو غارت گری اور بیرحمی کا مظہر ہے۔ یہ شیطان کی حقیقت اصلی یا فطرت اصلی کا مظہر ہے ان خیر و شر کے نمائندوں کے درمیان جو جنگ جاری ہے اس کا خاتمہ آخر کار روح خیر کی فتح پر ہوگا۔ لہٰذا انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ تدین و تقویٰ کے ساتھ ساتھ صداقت دین و ترقی تہذیب و اخلاق کے لئے جد و جہد کرے مسائل حیات کی طرفداری اور موت کی طاقتوں کا مقابلہ اس کے فرائض دینی میں داخل ہے۔ پندار نیک گفتار نیک اور کردار نیک اخلاق زرتشتی کے اصول سہ گانہ ہیں اور ان کا صلہ عقبیٰ یعنی دوسرے جہان میں جنت الفردوس ہے جہاں دائمی طور پر اطمینان بخش زندگی کی لذتیں بدرجہ اتم حاصل ہوں گی۔ گناہگاروں کی سزا جائے ناراستی ہے جہاں سزائے الیم ہے۔ زرتشت کا یہی عقیدہ توحید غیر کامل دولت و ملت ایران کا مذہب تھا جو اہل ایران کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی اور اثر انداز تھا۔[۱]

معاشرے میں مزید ارتقا

اوستائے جدید میں سوسائٹی کے تین طبقوں کا ذکر ملتا ہے:-

(۱) آذروان (علمائے مذہب) ۲۔ اذا الیشتر (سپاہی) ۳۔ داستر

---

[۱] ایران بعہد ساسانیاں۔ پروفیسر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال۔

یوتشوئنت (اہل زراعت)۔ یہ تقسیم بڑی پرانی ہے یاسنا میں صرف ایک جگہ سوسائٹی میں ایک چھوٹے طبقے کا ذکر ملتا ہے۔ ہوئیتی یعنی اہل حرفہ۔ غالباً اہل تجارت کا بھی ایک طبقہ تھا لیکن اس کا ذکر نہ اوستا میں ملتا ہے اور نہ یاسنا میں۔ غالباً ان طبقوں کی کوئی منفرد حیثیت نہیں تھی اور ان کا تعلق اہل زراعت ہی کے طبقہ سے تھا۔[۱]

ساسانی عہد میں سوسائٹی کی تقسیم نئے سرے سے ہوئی اور حسب ذیل چار طبقے نمودار ہوئے:۔

(۱) علمائے مذہب (۲) سپاہی (۳) دبیران یعنی عمال حکومت و دانشور (۴) اہل زراعت جس میں اہل حرفہ و اہل تجارت شامل تھے۔[۲] سوسائٹی کی یہ تقسیم یا جماعت بندی سیاسی حالات کے تحت ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ معیشت اور اقتصادی حالات میں بھی تبدیلی واقع ہوئی اور معاشرے میں اور طبقے نمودار ہو گئے۔ چنانچہ حاجی آباد کے کتبہ میں جس کو شاہ پور (ساسانی) نے نشانہ بازی کی ایک تقریب کے سلسلے میں نصب کیا تھا۔ مندرجہ ذیل طبقوں کا ذکر ملتا ہے:۔ شہرداران و اسپہران و آزادگان۔ یہ بھی سوسائٹی کے ممتاز طبقے تھے۔ دولت ساسانی میں طبقہ اول شہرداران میں شاہان ماتحت شامل تھے جو شاہ کے لقب سے پکارے جاتے تھے اور ان کی وجہ سے ایران کا بادشاہ شہنشاہ کہلاتا تھا۔ طبقہ دوئم

۱و۲۔ ایران بعہد ساسانیاں۔ پروفیسر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال

واسپہران یعنی امراء اور اعلیٰ منصبدار شامل تھے۔ جو ایران کے مختلف علاقوں کے سات ممتاز خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ طبقہ سوم وچہارم یعنی دہقان اور آزادگان میں زیادہ تر متوسط طبقہ کے امرا یعنی معززین اور شرفا (المعز والاشراف) شامل تھے۔ جو غالباً زیادہ تر اہلِ زراعت، اہل تجارت اور اہل حرفت سے تعلق رکھتے تھے اور سوسائٹی میں ان کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔[1]

ایران کا نظام حکومت

ایران کی حکومت ابتدا میں ایک محدود رقبے پر قائم ہوئی تھی پارس کا صوبہ ہی اصل ایران خیال کیا جاتا تھا بمرور زمانہ ایران کے بادشاہوں نے اپنی حکومت میں وسعت پیدا کرلی۔ اور وہ ایک وسیع علاقے پر پھیل گئی اور کئی ممالک اس کے زیرنگیں آ گئے۔ اسی وجہ سے ایران میں وحدانی نظام کی بجائے وفاقی حکومت مقبول ہو گئی۔[2]

یہ نظام حکومت مقامی موروثی حکمرانوں، باجگذار ریاستوں شاہان زیردست اور صوبجاتی گورنروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ملک کی چاروں سرحدات پر ملک کی سلامتی اور استحکام کے پیشِ نظر شاہان ماتحت کی نگرانی میں حکومتیں قائم تھیں جو حکام چارگانہ کے نام سے شہرت رکھتی تھیں۔ شاہان زیردست

---

[1] :۔ ایران بعہد ساسانیاں۔ پروفیسر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال

[2] :۔ ایضاً

زیادہ تر شہزادے یا شہنشاہ کے عزیز و اقارب ہی ہوا کرتے تھے جو حکام چہار گانہ کے حکمران ہوتے تھے۔ ایران کے نظامِ حکومت میں مرکزیت بدرجہ اتم پائی جاتی تھی اور تمام قسم کے امور جن میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی امور شامل تھے۔ سب کے لیئے علیحدہ علیحدہ نگران افسر مقرر تھے۔ مثلاً اہلِ زراعت و اہلِ حرفہ کے کام کی نگرانی کے لیے جو افسر مقرر تھا وہ واستریوشان کہلاتا تھا اسی طرح مذہبی رسوم، اخلاقی تربیت عدل و انصاف، قانون اور نظم و نسق وغیرہ کے لیئے جدا جدا محکمے قائم تھے۔[1]

مرکزی حکومت کا نظم و نسق وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور اس کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ حکومت کی ساری مشینری اس کی مرضی پر چلتی تھی۔ وہ ملک کی تمام صوبائی حکومتوں، شاہان زیر دست، با جگذار ریاستوں، حتیٰ کہ فوجی معاملات میں بھی دخل دینے کا اہل تھا۔ صوبوں کے گورنر شہنشاہ کی طرف سے مقرر کیئے جاتے تھے۔ داخلی امور کے علاوہ خارجی امور میں بھی وزیر اعظم کو بڑے اختیارات حاصل تھے۔ بیرونی ممالک کے ساتھ گفتگو اسی کی وساطت سے ہوتی تھی۔[2]

صوبے اور ریاستیں ضلعوں اور ضلعے حلقوں میں تقسیم کیئے جاتے تھے۔ ضلع کا افسرِ اعلیٰ پاذگوپان یا استاندار کہلاتا تھا۔ شہری حلقے شہریگ

---

[1] ۔ ایران بعہد ساسانیاں۔ پروفیسر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال۔

[2] ۔ ایضاً

اور دیہی حلقے دیہگ کہلاتے تھے۔ عموماً حلقوں کے افسر موروثی تھے جو کسانوں سے مقرر کئے جاتے تھے اور کذخذا کہلاتے تھے۔

ایران کے نظامِ حکومت کے تحت ملک کی سیاسی اور اقتصادی پالیسیوں پر زیادہ تر امراہی اثر انداز ہوتے تھے۔ فوجی امور میں بھی ان کی رائے کو وقعت حاصل تھی۔ لیکن دبیروں کا طبقہ بھی اہم تھا اور تمام تکنیکی مسائل میں انہی کے مشوروں کو بڑا وزن دیا جاتا تھا۔[۱]

ایران کے نظامِ حکومت کو خوش اسلوبی سے چلانے کا دارومدار خود شہنشاہ کی ذات پر موقوف تھا۔ اگر شہنشاہ قابل اور بیدار مغز ہوتا تو وہ امرا کو قابو میں رکھ سکتا تھا۔ ورنہ اس طبقہ کے لوگ عموماً رجعت پسند ہوتے تھے اور بادشاہ کو تخت سے اتارنے کی سازش تک کر سکتے تھے ایرانی دورِ حکومت میں کئی امرا اس قسم کے جرائم میں قتل کئے گئے اور امرا نے بھی کئی بادشاہوں کو تخت سے اتروا کر قتل کروا دیا تھا۔[۲]

ایرانی نظامِ حکومت میں مذہب کو بھی بڑا دخل حاصل تھا اور کسی بھی بادشاہ کے لئے تخت حاصل کرنے کے لئے اہل مذہب اور علمائے دین کی حمایت حاصل کرنا ضروری تھا۔ یہ لوگ اپنے قول و فعل میں آزاد ہوتے تھے۔ مذہبی رسوم ادا کرنا انہی کے فرائض میں داخل تھا۔ وہ عام

---

[۱] :- ایران بعہد ساسانیاں۔ پروفیسر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال۔

[۲] :- ایضاً

لوگوں کی زندگی پر پیدائش سے موت تک حاوی رہتے تھے۔ نذرانوں، زکوٰۃ اور صدقات کی صورت میں ان کو بڑی آمدنی ہوتی تھی۔ آتشکدوں کا انتظام انہی کے ذمہ تھا۔ مذہب زرتشت کی رو سے پانچ قسم کی آگ کا ذکر اوستا میں ملتا ہے۔ ان میں آتش خانہ، آتش دہ زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ ہر شہر، استانوں کے صدر مقام اور صوبوں کے صدر مقامات میں بھی آتشکدے ہوتے تھے اور ان میں ہر وقت آگ روشن رہتی تھی۔ ان مختلف نوعیت کے آتشکدوں میں تمام طبقوں عمال حکومت اور حکام اعلیٰ سمیت کی مذہبی رسومات کی ادائیگی کے سلسلے میں رہنمائی کے لئے جو افسر مقرر تھے وہ آذربد، آذرگشنسپ اور ماہ آذرگشنسپ کہلاتے تھے۔[۱]

ایران کا عدالتی نظام کلیتاً اس زمانہ میں مذہبی تھا اور تمام ملک میں زرتشتی شریعت کا نفاذ تھا۔ تمام فوجداری اور دیوانی مقدمات زرتشتی شریعت کے مطابق فیصلہ پاتے تھے اور سزائیں انہی مذہبی قوانین کے تحت دی جاتی تھیں جو معمولی سزاؤں سے لے کر خطرناک جرائم میں موت تک ہو سکتی تھی۔ ان شرعی عدالتوں پر کلیتاً علما فائز تھے اور دادور کہلاتے تھے۔[۲]

۱؎ :۔ ایران بعہد ساسانیاں۔ پروفیسر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال۔

۲؎ :۔ ایضاً۔

ایران میں اراضی کاشتکاروں کی استعداد کے مطابق تقسیم کی گئی تھی۔ ان کاشتکاروں کی حیثیت موروثی تھی۔ مالیہ کل پیداوار کے تیسرے حصے سے لے کر چھٹے حصے تک مقرر تھا۔ لگان کی شرح زمین کی زرخیزی پر موقوف تھی۔ مالیہ وصول کرنے والا افسر واستریوشان سالار کہلاتا تھا اور مستوفی اس افسر کے ماتحت ہوتا تھا۔ اہلِ حرفہ کے لئے ضروری تھا کہ مصنوعات معیار کے مطابق تیار کریں اور ان کی پوری نگرانی کی جاتی تھی۔[1]

کسانوں کا ایک اور طبقہ بھی تھا جو جاگیرداروں کے کھیتوں پر غلام کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس کو جبراً فوجی خدمت بھی دینی پڑتی تھی۔ امرا اور جاگیردار انہی کسانوں سے لشکر تیار کر کے شہنشاہانِ ایران کی امداد پر جایا کرتے تھے اور میدانِ جنگ میں ان کے دشمنوں کے خلاف لڑتے تھے۔ مالیہ عموماً جنس اور نقد کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا۔[2]

مرکزی حکومت کو مختلف صوبوں سے جو آمدنی ہوتی تھی ان میں سب سے کم مالیہ اس صوبے کا تھا جو بوتیان کہلاتا ہے۔ اس صوبے کا مالیہ فقط پتدی کے ایک سو ستر معیاری سکوں پر مشتمل تھا جو سالانہ وصول کئے جاتے تھے۔ اس کے برعکس دوسری طرف بابل سے ایران کی مرکزی حکومت کو سالانہ ایک ہزار [illegible] ہمعصر [illegible] ستر سونے کے معیاری سکے بطور مالیہ وصول ہوتے تھے۔[3]

---

[1] ایران بعہد ساسانیاں۔ پروفیسر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال

[2] ایضاً [3] ایضاً

ایرانی نظام حکومت میں بلوچستان کی حیثیت

ایرانی نظام حکومت میں گدروزیا جو ایران اور بلوچستان کے موجودہ بلوچی علاقوں پر مشتمل تھا، ایک گورنری صوبے کی حیثیت رکھتا تھا۔ ادرا اور گدروزیا دونوں مل کر گدروزیا کے نام سے موسوم تھے۔ جیسا کہ موجودہ زمانہ میں مکران اور سبید کو ملا کر مکران کا نام دیا جاتا ہے۔ گمان ہے کہ خاران اور جھالاوان کے علاقے بھی اس صوبے میں شامل تھے۔ شمالی بلوچستان اراخوزیا (رخج) کے صوبے کا جنوبی حصہ تھا جسے عرب الرخاج کا نام دیتے تھے۔ لبست اس صوبے کا صدر مقام تھا۔ جو دریائے ہلمند اور دریائے ارغنداب کے سنگم یا مقام اتصال پر واقع تھا۔

گدروزیا کا صدر مقام پورہ تھا جو لبعد میں فہرج کے نام سے موسوم ہوا اور بلوچ اسے "پہرہ" کے نام سے پکارتے تھے۔[۱] اس قدیم بستی کے کھنڈرات اب بھی بمپور کے نزدیک غیبی اور کلاگان کے درمیان واقع ہیں۔ غزنویوں اور غوریوں کے دورِ اقتدار تک فہرج ہی مکران کا صدر مقام تھا۔ سلطان مسعود کے دورِ حکومت میں عیسیٰ بن معاون والی مکران اور سلطان مسعود کی غزنوی فوج کے درمیان اسی فہرج ہی کے قرب و جوار میں لڑائی ہوئی تھی۔

ادرا کا صدر مقام رمبکیہ تھا جس کے محل وقوع کے بارے میں

۱۔ یہ اب یہ قدیم بستی ایران شہر کہلاتی ہے۔

شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ ممتاز ماہر علم الآثار شائن کا خیال ہے کہ یہ قدیم قصبہ بیلہ ہی تھا۔ آرین نے اس سلسلے میں واضح طور پر لکھا ہے کہ سکندر نے اپنی فوج کی ضروریات مثلاً غلہ، چاول، کھجور اور شراب تک رمبکیہ کے قرب و جوار سے حاصل کی تھیں۔ پیری پلس آف اری تھراکن سمی میں جو سکندر سے چار سو سال بعد میں لکھا گیا تھا۔ رمبکیہ کا ذکر ملتا ہے جہاں اوراکا پارتھی بادشاہ قیام کرتا تھا۔ پیری پلس کے مطابق اوریہ کی چھوٹی سی بندرگاہ رمبکیہ سے سات دن کے فاصلے پر ایک دریا کے دھانے پر واقع تھی۔ جہاں بڑی بڑی کشتیاں آسانی سے داخل ہو سکتی تھیں۔ ٹیٹ کا خیال ہے کہ اس قسم کی پیداوار ساحل سمندر سے نزدیک فقط کیچ ہی میں پائی جاتی ہے اور اس قسم کی پیداوار مشرق کی طرف کسی علاقے میں دستیاب نہیں ہے اس کا خیال ہے کہ پیری پلس میں اوریہ کی جس بندرگاہ کا ذکر ملتا ہے وہ کلمت بندر ہی ہو سکتی ہے جو کیچ سے سات دن کے فاصلے پر واقع ہے۔[1]

آرین واضح طور پر لکھتا ہے کہ سکندر ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کا خواہشمند تھا تاکہ وہ بحری بیڑہ کی ضروریات پوری کر سکے لیکن وہ ساحل سمندر سے بہت دور نکل گیا تھا۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ رمبکیہ سے آگے اپنا سفر جاری رکھنے کے دوران اسے تبلایا گیا تھا کہ آگے ایک درہ

---

[1]:- MEMOIR ON THE COUNTRY AND FAMILY OF THE KHANS OF KALAT - G.P. TATE.

آنے والا ہے جہاں اورتیائی اور گدروزیائی کا مشترکہ لشکر مورچے سنبھال کر اس کا منتظر ہے۔ گمان غالب ہے کہ یہ درہ جھاہو لک تھا جو ساحل سمندر سے دور لسبیلہ اور مکران کی مین سرحد پر واقع ہے۔ آرین کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سکندر جب ندی کو عبور کرنے کے بعد شمال مغرب کا رُخ اختیار کر کے جھاہو جا پہنچا تھا اور جھاہو لک سے آگے بڑھنے کے بعد وہ دوبارہ سمندر کا رُخ کر کے سمتھ کے قول کے مطابق اس راستے پر ہو لیا تھا جو آگے جا کر پسنی بندر کے شمال سے گذرتا ہے اور برطانوی دورِ اقتدار میں جس کے ساتھ ساتھ ٹیلی گراف کے کھمبے لگے ہوئے تھے[1] آرین کے بیان کی روشنی میں گمان کیا جا سکتا ہے کہ رمبکیہ کا قصبہ جھاہو کے علاقے میں واقع تھا۔ جس کے شمالی حصے میں زرخیز اراضیات کے وسیع رقبے اور کھجور کے نخلستان پائے جاتے ہیں اور جہاں ان اراضیات کو سیراب کرنے کے لئے پانی بھی وافر مقدار میں دستیاب ہے اور مشرق کی طرف ساحل سمندر سے نسبتاً نزدیک جھاہو ہی وہ واحد علاقہ ہے جہاں گندم اور جو کے علاوہ شالی کی کاشت بھی ہوتی ہے۔ جھاہو لک کے مغربی جانب اس علاقہ کی زمین اس قدر نرم اور کچی ہے کہ اس سے گذرتے وقت باربرداری اور سواری کے جانوروں اور خصوصاً گھوڑوں کی ٹانگیں زمین میں دھنس جاتی ہیں اور لبااوقات تیز ہوا چلنے کی وجہ سے اس قدر مٹی اڑتی ہے کہ راستے کا نشان تک غائب ہو جاتا ہے۔ جس کا تجربہ سکندر کی

---

[1] ۔ EARLY HISTORY OF INDIA — SMITH.

یونانی فوج کو بھی ہوا تھا۔ جھاؤ اور ماڑہ کی بندرگاہ سے بھی سات دن کے فاصلے پر واقع ہے۔

آرین کا بیان ہے کہ سکندر اعظم نے اپولونائس کو اورامیں اور تیائی لوگوں کے اوپر سٹریپ مقرر کر کے چھوڑا تھا۔ لیکن پورہ پہنچنے کے بعد اس کو معزول کر کے اس کی بجائے سبرتیئس کو آراخوزیا اور گدروزیا کے دونوں صوبوں کا سٹریپ مقرر کیا تھا جو ایک دوسرے سے متصل واقع تھے۔ غالباً ایرانی دور اقتدار میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جاتا تھا کہ کبھی دونوں متصل صوبوں کے لئے علیحدہ علیحدہ اور کبھی دونوں صوبوں کے لئے ایک ہی سٹریپ مقرر کیا جاتا تھا جو بست میں قیام کر کے دونوں صوبوں کا انتظام چلاتا تھا۔[سمتھ]

آرین کے اس بیان پر کہ سکندر نے اوریتائی کے ہندی قبیلہ کے خلاف اس بنا پر لشکرکشی کا فیصلہ کیا تھا کہ یہ قبیلہ ایک عرصہ دراز سے آزاد چلا آتا تھا اور اس قبیلہ کے لوگوں نے سکندر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے میں پس و پیش سے کام لیا تھا۔ سر الیگزنڈر کنگھم نے بڑے تعجب کا اظہار کیا ہے۔ کیونکہ سکندر کے حملے کے وقت اور اس سے پیشتر ان قبیلوں کی وفاداریاں صدیوں تک ایران سے وابستہ رہی تھیں۔ لیکن سمتھ کا خیال ہے کہ بلوچستان برصغیر سے زیادہ قریب واقع ہوا ہے اور اس کی تاریخ بھی کبھی کبھار ہندوستان ہی سے وابستہ رہی ہے۔ اور اگر یونانی ان کو ہندی نژاد قبیلے خیال کرتے تھے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے ان

سمتھ: EARLY HISTORY OF INDIA — SMITH.

قبیلوں کے ایک عرصہ دراز سے آزاد چلے آنے کا بھی مطلب یہی ہے کہ یہ علاقہ ایران کے مرکز سے اس قدر دور واقع تھا کہ اس پر ایران کی مرکزی حکومت کا تسلط بھی برائے نام تھا۔*

بلوچستان میں ایرانی دور اقتدار سے منسلق کئی قدیم بستیوں کے آثار ٹیلوں کی صورت میں موجود ہیں جن میں سب سے اہم تپہ سام پور اور تپہ سفید بلندی کے ٹیلے ہیں جو وادی مستونگ کے عین وسط میں ایک دوسرے سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ علم الآثار کے ممتاز عالم مسٹر بارگرلوز نے ۱۹۲۵ء میں تپہ سام پور پر باقیاتی تفتیش کی تھی۔ وہ لکھتا ہے:- "ہمارے مشاہدات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک قدیم بستی ہے جو کئی قدرتی ٹیلوں اور ان کے دامن میں بسائی گئی تھی اور یہ بستی قلات کی موجودہ میری سے بڑی مشابہت رکھتی ہے۔ یہ بستی ایک عرصہ دراز تک مسلسل آباد چلی آتی تھی۔ اس کے باشندوں کا معاشرہ وابستہ شدہ۔ دوران کا گھریلو اثاثہ فقط چند ہی اشیاء اور اسباب پر مشتمل تھا جن میں کوئی خصوصیت نہیں پائی گئی لیکن وہ کھیتا [illegible] تھے اس وادی کے موجودہ باشندوں کے مقابلہ میں ان کا معاشرہ کلچر اور طرز معاشرت زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ یہ بستی عیسوی سن کے شروع ہونے سے بہت پہلے بسائی گئی تھی اور عیسوی سن کے شروع ہونے کے بعد بھی یہ بستی ایک عرصہ دراز تک آباد تھی۔ یہ بستی عربوں کے حملوں سے بہت پہلے ترک کر دی گئی تھی اور اس کے بعد اس کے دوبارہ آباد ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ کوئٹہ کے نزدیک کے بعض ٹیلے جن میں کچلاک اور

---

*: EARLY HISTORY OF INDIA — SMITH.

سرانان کے ٹیلے بھی شامل ہیں اور اسی طرح اسی وادی میں تپہ سفید بلندی کے ٹیلہ کے علاوہ بھی کے نزدیک لونی کا ٹیلہ سب کے سب اس ایک ہی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تپہ سام پور سے چاندی کا ایک بڑا پیالہ بھی دریافت ہوا تھا جس کا پیندا اتلا تھا۔ اس قسم کے اتلے پیندے والے برتن ایران میں پارتھی عہد میں بنائے اور استعمال کئے جاتے تھے۔ ؁

بلوچستان میں کاریزوں کا رواج ایرانی دور میں شروع ہوا تھا۔ بعد میں عربوں نے انہیں مزید ترقی دی۔ مکران میں خسروی اور کاؤسی نامی کاریزیں اس کے صدر مقام تربت میں ایرانی دور اقتدار میں احداث کی گئی تھیں۔ جھالاوان۔ مکران اور خاران کے علاوہ سراوان کے بعض علاقوں میں گبربندوں کی صورت میں جو زرعی آثار ملتے ہیں۔ ان کا تعلق بھی ایرانی دور اقتدار سے ہے اس زمانہ میں بلوچستان کے باشندوں کا انحصار جو ساکا ہی تھے پرورش حیوانات اور زراعت پر تھا۔ ان بندات کی تعمیر کا مقصد جن میں بڑے بڑے وزنی پتھر استعمال کئے گئے تھے یہ تھا کہ بارش کا پانی ندی نالوں میں بہہ کر ضائع ہو جانے کی بجائے ان بندوں سے ٹکرا ٹکرا کر آہستہ آہستہ وادی میں پھیل جائے تاکہ گھاس وافر مقدار میں اُگ سکے اور جانوروں کے لئے بھی پانی کے ذخیرے ہر جگہ موجود ہوں اور وادیوں کی سنگلاخ زمین کے اوپر چکنی مٹی کی تہہ جم سکے جو کاشتکاری کے لئے بڑا ضروری ہے ان لوگوں کو زراعت سے بھی گہری

ؐ:- MEMOERS ON THE EXCAVATIONS AT (SIR DUMB) NAL - HARGREAVES.

دلچسپی تھی۔ خضدار کے شمال میں خیرو جوئی نامی ایک پانی کا چشمہ ہے اس زمانہ میں اس علاقے کے باشندوں نے اس کا پانی چٹان کاٹ کر نالی کی صورت میں بہت دور سے جا کر زرخیز اراضیات کے ایک وسیع اور ہموار رقبے کو اس سے سیراب کیا تھا۔ اس قسم کی ایک نالی کے آثار خاران میں کوہ سیاہاں کے دامن میں بھی پائے گئے ہیں۔ وادی مستونگ میں تپہ سفید بلیدنی کے دامن میں ایک پانی کا بڑا چشمہ ہے۔ اس زمانہ کے لوگوں نے پختہ مٹی کے پائپوں کے ذریعہ اس چشمہ کے پانی کو بہت دور سے جا کر زرخیز اراضیات کے وسیع رقبوں کو سیراب کیا تھا۔

بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ مکران میں بھی ایرانی دور اقتدار میں اس قسم کے جاگیردار تھے کہ جن کی جاگیروں کے کھیتوں پر کسان غلاموں کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور یہ کسان جنگی قیدی ہی تھے جو لڑائیوں میں گرفتار ہو کر غلام بنا لیئے گئے تھے مکران کے درزادے غالباً انہی کسانوں کی اولاد ہیں اور ان کا پیشہ اب بھی زراعت ہے اور یہ دہقان کار کہہ کر پکارے جاتے ہیں۔

ایرانی معاشرے میں کسانوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور ان کے اختیارات ان کے مقامی موروثی کدخداؤں میں مرکوز تھے۔ مکران کے معاشرے میں اب بھی ان کدخداؤں کو بڑی اہمیت حاصل ہے جو کہودہ کہلاتے ہیں اور یہ اسی قدیم ایرانی معاشرے کے بچے کھچے آثار ہیں۔

نواں باب

سفید ہون

سفید ہون کا اصل وطن منگولیا تھا۔ ابتدا میں یہ سفید ہون وہاں آوار قوم کے ماتحت زندگی بسر کرتے تھے ان کی معیشت کا دارومدار گلہ بانی پر تھا۔ یہ گڈریئے بھیڑ بکریوں کے بڑے بڑے ریوڑ اور دوسرے مویشی رکھتے تھے۔ آوار حکمران ان لوگوں سے چراگاہوں کے عوض ٹیکس اور مالیہ لیتے تھے ان کے حکمرانوں نے مالیہ اور ٹیکسوں میں غیر معمولی اضافہ کر کے ان کو تنگ کرنا شروع کر دیا اور ان کی وصولی میں سختی برتنے لگے۔ آخر کار جب ٹیکسوں اور مظالم کا سلسلہ ناقابل برداشت ہوگیا تو ان لوگوں کیلئے ہجرت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ یہ لوگ اپنے حکمرانوں کے مظالم سخت گیری اور ٹیکسوں سے نجات حاصل کرنے کی خاطر اپنے اصلی وطن منگولیا کو خیرباد کہہ کر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اور بلخ کے علاقے میں وارد ہوئے جو اس زمانہ میں باختر کہلاتا تھا۔ ان کی تعداد دس لاکھ خاندانوں پر مشتمل تھی۔ اس زمانہ میں باختر کے اندر کداریوں کی حکومت قائم تھی جو چھوٹے کشان کہلاتے تھے۔ [۱]

۱۔ THE PATHAN – SIR OLAF CAROE

۳۶۰ء میں انہوں نے کداریوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ان کی جگہ باختر میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ کداری گندارا کی طرف زبردستی دھکیل دیئے گئے۔ یہاں گندارا میں انہوں نے ساسانی شاہ زبردست کشان شاہ کی وفات کے بعد جو ۳۶۵ء میں واقع ہوئی اپنی حکومت قائم کر لی۔ کشان اور کداری دونوں اور ساسانی ایرانی نژاد قومیں تھیں۔ اور تینوں آپس میں خونی رشتہ رکھتی تھیں۔ [۵]

سفید ہون کی اصلیت کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے جس کی کئی ٹھوس وجوہات ہیں۔ اصل ہون کی طرح سفید ہون بھی منگولیا کے رہنے والے تھے۔ دونوں کا اصل وطن بھی زنگاریہ تھا جو منگولیا میں واقع تھا۔ دونوں کی عادات و اطوار میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ لیکن اصلی ہون اور سفید ہون میں بنیادی فرق یہ تھی کہ سفید ہون منگولی زبان نہیں بول سکتے تھے۔ اصلی ہون کے برعکس ان کے خدوخال متناسب تھے۔ اس بنا پر بعض مورخین کا خیال ہے کہ سفید ہون ایرانی نژاد تھے یا پھر ممکن ہے کہ ان کے خون میں ایرانی خون کی آمیزش ہو۔ البتہ ان کی قبائلی یا فوجی تنظیم اصل ہون کی مانند تھی جس کی بنیاد ہزار کے عدد پر رکھی ہوئی تھی اور یہ منگ کہلاتے تھے۔ منگ منگولی زبان میں ہزار کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ گویا ہزار افراد کے اوپر ایک سردار ہوتا تھا۔

باختر میں جب ان کو کامیابی ہوئی اور انہوں نے اپنے پاؤں خوب

۵۔ THE PATHAN - SIR OLAF CAROE.

جماعتے نرائی کے بعد ان کے حملے ہر طرف شروع ہوئے مشرق میں انہوں نے شمالی ہندوستان پر ہلہ بول دینے کے بعد اپنا رخ مغرب کی طرف موڑ دیا اور ایران میں ساسانی حکومت کے خاتمہ کے درپے ہو گئے سن ۴۲۷ء میں ان کی مڈھ بھیڑ ایران کے نامور بادشاہ بہرام گور پنجم کے ساتھ ہوئی۔ بہرام کے ہاتھ سے انہوں نے سخت نقصان اٹھایا اور ان کا زور ٹوٹ گیا۔ بہرام کے ساتھ انہوں نے مجبور ہو کر دوستانہ تعلقات استوار کر لیے۔[۱]

بہرام گور کے پوتے فیروز کی تخت نشینی کے وقت فیروز اور اس کے بھائی ہرمز کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہرمز بھی تخت کا دعویدار تھا۔ اس اثناء میں سفید ہون نے بھی کچھ اپنی طاقت مستحکم کر لی تھی۔ فیروز غالباً اپنے بھائی کے مقابلے میں کچھ کمزور تھا۔ اس نے ان سفید ہون سے امداد طلب کی لیکن بعد میں ایران میں ان کی مداخلت اس قدر بڑھ گئی کہ فیروز بھی اُن پر سخت تنگ آ گیا۔ فیروز کا ان کے ساتھ اختلاف پیدا ہو گیا اور نوبت لڑائی تک آ گئی۔ انہوں نے فیروز کو پے در پے کئی لڑائیوں میں شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ فیروز نے ۴۸۴ء میں وفات پائی۔ چھٹی صدی عیسوی تک ایران ان کا باجگزار تھا۔ اسی زمانے میں یہ لوگ بلوچستان میں بھی بڑی تعداد میں داخل ہوئے لیکن ایران مزید ان کے دست برد سے بچ گیا کیونکہ اس زمانے میں یہ لوگ ہندوستان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔[۲]

---

۱. THE PATHAN - SIR OLAF CAROE

۲:- ABID

اسی اثناء میں ایران میں خسرو اول نوشیروان جو تاریخ میں نوشیروان
عادل کے نام سے مشہور ہے۔ برسر اقتدار آیا۔ اسی زمانے میں سفید ہون اور
ترکستان کے ترکوں کے درمیان اختلافات رونما ہوئے۔ اور ان اختلافات
نے شدید صورت اختیار کر لی۔ ادھر ایران کے شہنشاہ انوشیروان نے جو ایک
قابل اور بیدار مغز بادشاہ تھا اپنے تعلقات ترکستان کی حکومت کے ساتھ
استوار کر لئے۔ یہ خسرو اول انوشیروان کی حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ ایرانیوں اور
ترکوں نے مل کر ۵۶۶ء میں سفید ہون کو جو ابتالی بھی کہلاتے تھے۔ سغدیانا
(سمر قند) میں شکست دی اور باختر سے ان کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اس
فتح کے بعد ایرانیوں نے اپنے کھوئے ہوئے وقار کے ساتھ ساتھ اپنے
کھوئے ہوئے مقبوضات بھی دوبارہ حاصل کر لیے۔[1]

سفید ہون بلوچستان میں پانچویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں داخل
ہو گئے تھے لیکن ایرانی حکومت کے ہاتھوں شکست کھانے کے باوجود ان
کا زور بلوچستان میں ٹوٹ نہ سکا۔ یہ بلوچستان کے کوہستانی خطے میں دور دور تک
پھیل گئے اور انہوں نے زیادہ تر جھالاوان کو اپنا مرکز بنا لیا۔ انہی سفید ہون کی
مناسبت سے یہ علاقہ عرب دور اقتدار میں توران کے نام سے موسوم تھا۔

اس بات پر تمام مورخین متفق ہیں کہ سفید ہون کے ساتھ جٹ اور
گجر بھی شامل تھے۔ ان کا باہمی خونی رشتہ غیر واضح ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ
یہ لوگ کہاں اور کس علاقے میں ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے تھے۔ اکثر

ملہ:- THE PATHA - SIR OLAF CARDE.

مورخین جٹ کا نسلی رشتہ کلاسیکی مصنفین کی اس قوم کے ساتھ ملاتے ہیں جو مشرقی ایران کے جٹہ نامی علاقے میں مسہ جٹائے MASSA JATAE کے نام سے سکونت رکھتی تھی جو باختر میں واقع تھا۔ غالباً گجر بھی اسی علاقے میں بود و باش رکھتے تھے۔ گمان ہے کہ سفید ہون کی بلخ میں شکست کے بعد یہ لوگ بھی ان کے ساتھ مل کر مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں ایران اور بلوچستان میں داخل ہوئے تھے۔ سیستان میں یہ لوگ گاودار کہلاتے ہیں۔ بلوچستان میں یہ گدّے کے نام سے موسوم ہیں۔[۵]

بہرکیف اس معاملے کی حقیقت کچھ بھی ہو جب سفید ہون بلوچستان میں داخل ہوئے تو یہ لوگ تین طبقوں پر مشتمل تھے۔ سب سے اونچا طبقہ سفید ہون کا تھا جو منگ کہلاتے تھے۔ یہ زبردست جنگی صلاحیت کے مالک تھے اور بڑے بہادر اور دلیر واقع ہوئے تھے۔ دوسرا طبقہ جٹ قبیلوں پر مشتمل تھا جو زراعت اور مویشیوں کی پرورش سے دلچسپی رکھتا تھا۔ تیسرے طبقہ میں نقیب شامل تھے جو خیمہ برداروں کی حیثیت سے متذکرہ بالا طبقوں کے ساتھ آئے تھے۔ یہ ان کا خدمتگار طبقہ تھا۔

بلوچستان پر عربوں کے حملوں کے وقت ان کی ایک کثیر تعداد لسبیلہ مکران، جھالاوان، خاران اور کچھی میں پھیلی ہوئی تھی۔ غالباً یہ لوگ علاقائی سرداروں کے تحت زندگی بسر کرتے تھے۔ بارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں غز ترکمانوں کے دباؤ کے تحت جب بلوچ قبائل کثیر تعداد میں کرمان سے نقل مکانی

۵۔ SEISTAN – G.P. TATE

کر کے بلوچستان میں پھیل گئے تو اس کے بعد بمرور زمانہ یہاں کے معاشرے میں تبدیلی آئی اور ان تینوں طبقوں کا باہمی رشتہ کٹ گیا اور پندرہویں صدی تک ان کا باہمی رشتہ ختم ہو چکا تھا۔ سولہویں صدی میں ایک طرف براہوئی قبائل اور دوسری طرف یہاں کی جٹ آبادی کے درمیان ایک طویل خشک سالی قحط اور بارش کی قلت کے نتیجہ میں جس کی وجہ سے چراگاہوں کی وسعت میں تنگی پیدا ہوئی، تھی ان چراگاہوں کے اوپر کئی لڑائیاں ہوئیں اور ان لڑائیوں میں یہاں کی جٹ آبادی شکست سے دوچار ہوئی۔ ان کا ایک حصہ سندھ کی طرف منتقل ہو گیا اور جو لوگ بلوچستان میں باقی رہ گئے ان کا ایک بڑا حصہ بلوچ اور براہوئی قبائل میں مدغم ہو گیا۔ اب بھی ان کی ایک بڑی تعداد لسبیلہ اور کچھی میں بود و باش رکھتی ہے۔ خیال ہے کہ جب جٹ اور سفید ہون قبائل بلوچستان میں داخل ہو گئے تھے تو ان کا سابقہ جنوبی بلوچستان کے ان قبائل سے پڑا تھا، جو ساکا اصلیت کے حامل تھے۔ یہ ساکا قبائل یا تو جٹ قبیلوں میں بمرور زمانہ مدغم ہو گئے اور جو باقی بچے تھے وہ بعد میں بلوچ آبادی میں گھل مل گئے اور بلوچی زبان اختیار کر لی۔ بلوچستان میں سفید ہون کا بہترین نمائندہ مینگل قبیلہ ہے جو اب ایک ممتاز براہوئی قبیلہ خیال کیا جاتا ہے۔ موجودہ وقت میں گجر کلیتاً بلوچستان کے ضلع کچھی میں پائے جاتے ہیں۔ راجپوتوں کے بارے میں بھی مورخین کا عام خیال یہ ہے کہ وہ بھی انہی سفید ہون کی اولاد ہیں۔

دسواں باب

ہندو شاہی

ایرانی معاشرے میں انحطاط اور ایرانی نظام حکومت میں زوال ہی وہ سب سے بڑے اسباب تھے۔ جن کی وجہ سے ایرانی حکومت کا عرب بادیہ نشینوں کے ہاتھ سے خاتمہ ہوا۔ اس انحطاط کے اثرات عربوں کے حملہ سے پیشتر ایران میں نمودار ہو چکے تھے انہوں نے بلوچستان کے سیاسی افق پر بھی اپنے دور رس اثرات کا سایہ ڈال دیا تھا۔

بہرام گور پنجم کی وفات کے بعد سندھ کے راجپوت حکمران راجہ سیہرس اکبر نے پہلے ارمن بیلہ اور اس کے بعد مکران پر حملہ کر کے بلوچستان کے وسطی اور جنوبی علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔[۱] اس میں کچھی کا علاقہ سبی سمیت شامل تھا جو بودھیہ[۲] کہلاتا تھا۔ اس موخر الذکر علاقہ کے جٹ باشندے بدھ مت کے پیروکار تھے اور یہی مذہب سندھ کے شاہی خاندان اور اس کے باشندوں کا تھا۔

---

[۱] THE PATHAN _ SIR OLAF CAROE.

[۲] ایلیٹ نے اسے نودھیہ لکھا ہے

حقیقت یہ ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت سندھ میں ایک وسیع سلطنت قائم تھی جو شمال میں کشمیر تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں پنجاب کا ایک بڑا حصہ شامل تھا۔ شمال مشرق میں اس کی سرحدیں ریاست قنوج سے ملتی تھیں۔ مغرب میں مکران یا کیچ مکران کردان (کزدار) کیکان یا کیکانان کا وسیع خطہ اس میں شامل تھا۔ شمال مغرب میں اس وسیع مملکت کی سرحدیں سجستان کی حد تک اس وسیع علاقے کی حدود کو چھوتی ہوئی کوہ سیاہ یا مہترسلیمان کے دامن کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں جو بلوکس (ولایت۔ قندہار) کے نام سے موسوم تھا۔ جنوب مشرق میں وہ اضلاع بھی اس کا حصہ تھے جو بندرات دلیول، دیلو اور سورت کے اردگرد ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ اس عظیم مملکت کی بنیاد راجہ سیہرس بن دیواجی نے رکھی جو ایک نہایت طاقتور حکمران تھا۔ الور کا عظیم شہر اس کا دارالسلطنت تھا جو دریائے اکرہ کے قریب واقع تھا۔ یہ سلطنت چار بڑے صوبوں میں تقسیم تھی اور ہر ایک صوبے کا انتظام ایک گورنر کے ہاتھ میں تھا۔ ان صوبوں میں سیوستان کا صوبہ بھی تھا جو سندھ کے وسط میں واقع ہونے کے ساتھ ساتھ رجھان اور اس کے آگے مکران کے کہسار کے دامن تک پھیلا ہوا تھا۔ جنوب میں وہ علاقہ بھی اس صوبے میں شامل تھا جہاں ٹھٹھہ کا پُرعظمت شہر بعد میں آباد ہو گیا تھا اور برہمن آباد بھی اس صوبے کے عظیم شہروں میں سے تھا۔ سندھی مورخین کے بیان کے مطابق اسی ایک خاندان کے چار حکمرانوں نے اس وسیع مملکت پر حکومت کی تھی۔ راجہ

سیہرس اکبر کے بعد اس کا بیٹا راجہ ساہسی تخت نشین ہوا۔ اس کی وفات کے بعد رائے سیہرس ثانی حکمران بن گیا اور اس کے بعد اس کے بیٹے رائے ساہسی نے عنان حکومت سنبھالی ؎

بہرام گور پنجم کا پوتا فیروز جب ایران میں برسر اقتدار آیا تو اس نے کچھ عرصہ کے بعد ایک فوجی مہم بھیج کر وسطی اور جنوبی بلوچستان کے ان علاقوں کو دوبارہ ایران میں شامل کر لیا۔ سندھی مورخین کے مطابق بادشاہ فیروز نے کیچ مکران پر حملہ کر دیا تھا جب رائے سیہرس ثانی کو اس کا علم ہوا اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ حملہ آور ان علاقوں کو لوٹ کر اور اس کے باشندوں کو گرفتار کر کے واپس چلے گئے ہیں تو اس نے ایک تحکمانہ خط بادشاہ فیروز کے پاس روانہ کیا جو خود بھی لڑائی کے لئے تیاری کر رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں دونوں فریق کے درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی جو صبح سے دوپہر تک جاری رہی۔ رائے سیہرس نے شکست کھا کر میدان جنگ سے بھاگنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک تیر اس کی گردن میں لگا اور وہ زمین پر گر گیا۔ حملہ آوروں نے سندھیوں کا جملہ اسباب لوٹ لیا۔ سندھیوں سے جو لوگ بچے انہوں نے الور کی راہ لی اور راجہ کے بیٹے رائے ساہسی ثانی کو اس کے باپ کی جگہ تخت پر بٹھا دیا۔ ؎ لیکن ایرانی مورخین اور عرب وقائع نگاروں کی تحریریں اس سے کچھ مختلف ہیں۔ گردیزی نے اپنی تاریخ میں جو حوالے دیئے ہیں ان سے

؎ NOTES ON AFGHANISTAN AND BALUCHISTAN

RAVERTY ؎ ABID

ظاہر ہوتا ہے کہ ان واقعات سے دو صدیاں پیشتر مکران کا علاقہ ایران
میں شامل تھا۔ جبکہ شیرماہ ملک ہند نے اپنی بیٹی ساسانی خاندان کے چودھویں
شہنشاہ بہرام گور کے نکاح میں دے دی۔ تو وہ ہند چلا گیا اور بھیس بدل
کر شیرماہ کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔ اور راجہ نے اس کی بیوی کو سندھ
و مکران کا علاقہ جہیز میں دے دیا۔ بہرام گور نے سنہ ۴۲۰ء سے سنہ ۴۳۱ء تک
ایران پر حکومت کی تھی۔ [1]

راجہ ساہسی ثانی کے دورِ حکومت میں سندھ کے اندر سماجی اور سیاسی
تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ بدھ مت روبہ زوال تھا اور ہندو مت کو عروج حاصل
ہو رہا تھا اور دوبارہ اس کا احیاء شروع ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں ایک برہمن
چاچ بن سیلائج نے ایک شخص حاجب رام کے توسط سے راجہ ساہسی کے
وزیر بدھمن کا قرب حاصل کر لیا۔ اس کے بعد راجہ کے دربار میں اپنی قابلیت
اور علم کا سکہ بٹھا کر راجہ تک رسائی حاصل کر لی اور تھوڑے عرصہ میں اس کا
منظورِ نظر بن گیا۔ راجہ کی بیوی سوہن دیوی اس پر فریفتہ ہو گئی۔ کچھ عرصے کے بعد
جب راجہ بیمار ہو گیا تو وہ اس کی بیوی کے ساتھ ساز باز کر کے اپنے آپ
کو راجہ کی وفات کے بعد اس کے تاج و تخت کا وارث بنا دیا اور راجہ کی
رعایا نے بلا چوں و چرا اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اس نے تمام ملک کا دورہ
کر کے اپنی طاقت مستحکم کر لی اور تمام ملک پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی
اس کے بعد اس کو ان علاقوں کا خیال آیا جو راجہ سیہرس ثانی کی ایرانیوں

---

[1] NOTES ON AFGHANISTA AND BALUCHISTAN - RAVERTY.

کے ہاتھ سے شکست کے بعد ایرانیوں کے قبضہ و اختیار میں چلے گئے تھے[۱]۔

اِدھر ایران میں بھی اس زمانہ میں تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔ نظامِ حکومت اور معاشرے میں انحطاط کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ خسرو ثانی کے زمانے میں اگرچہ ایران کو عارضی کامیابی حاصل ہوئی اور وہ دمشق اور یروشلم پر قبضہ کرنے کے بعد انکارہ سے ہوتے ہوئے باسفورس تک جا پہنچا جو روم کے بازنطینی علاقے کے بالمقابل واقع تھا۔ رومیوں نے ہرکل کی سرکردگی میں جوابی کارروائیاں کیں اور وہ ایشیائے کوچک اور ارمینیہ پر قبضہ کرنے کے بعد ایران کے دروازے پر دستک دینے لگے۔ خسرو ثانی ۶۲۸ء میں اپنے بیٹے کے ہاتھ سے قتل ہوا جو ایک بازنطینی شہزادی کے بطن سے تھا۔ اس سے ہر طرف افراتفری اور انتشار پھیل گیا۔ ایرانی حکومت کی بنیادیں ہل گئیں۔ فوج قابو سے باہر ہو گئی۔ ایرانی گورنروں نے ہر جگہ اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ کئی ایرانی شہزادے ملک کے گوشہ گوشے سے نکالے گئے اور تخت نشینی کے بعد قتل کر دیئے گئے ان میں ایک بدقسمت شہزادی (عارض ماہ؛ اور اس کی بہن توران دخت بھی) تھی[۲]۔

ان دو ایرانی شہزادیوں میں سے ایک کے دورِ حکومت میں ایران کی اس سیاسی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر سندھ کے ہندو راجہ چاچ بن سیلائج نے حملہ کر کے وسطی اور جنوبی بلوچستان کو دوبارہ اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس

---

[۱]:- CHACH NAMA.

[۲]:- ایران بعہد ساسانیان۔ پروفیسر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال

سلسلے میں چاچ نامہ کے مصنف کا بیان ہے کہ جب چاچ اپنی مہمات سے فارغ ہوگیا تو کرمان کی سرحد کی حد بندی کا معاملہ اس کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس نے کہا کہ یہ علاقے بلاد ہند کے بادشاہوں کے زیر فرمان تھے اور ان کی سرحد کا تعین بڑا ضروری ہے۔ چاچ نامہ کے مطابق اس زمانہ میں جبکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کو چار سال گذر رہے تھے کہ ایران کا بادشاہ کسریٰ (خسرو) ابن ہرمز ہلاک ہوگیا اور ایرانی ممالک میں انتشار پھیل گیا۔ جس کے نتیجے میں عنانِ سلطنت ایک عورت کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ جب چاچ کو اس کا علم ہوگیا تو اس نے بڑی تندہی کے ساتھ بلاد مکران کی طرف جانے کا ارادہ کیا اور ارما بیل کی طرف روانہ ہوا۔ اس علاقے میں سمنی نام کا ایک شخص اس کے استقبال کو آیا جو بدھ مت کا پیروکار تھا۔ یہ شخص ہند کے بادشاہ سیہرس کے گماشتوں کے اہل خاندان میں سے تھا اور راجہ نے خصوصیت کے ساتھ اس کو یہاں کا فرمانروا مقرر کیا تھا۔ لیکن پھر تداول زمانہ کی وجہ سے وہ راجہ کا مخالف بن کر خدمت سے دست کش ہوا۔ لیکن بعد میں دونوں کے درمیان عہد و پیمان ہوگیا اور ان کی دوستی

ف ۱۔ خسرو ثانی ۶۲۸ء میں ہلاک ہوگیا تھا۔ چینی سیاح ہون سیانگ ۶۲۹ء میں چین سے نکلا اور ۶۳۰ء سے لے کر ۶۴۳ء تک ہندوستان میں سفر کرتا رہا وہ اسی سال دسمبر میں دریائے سندھ عبور کر کے سندھ میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے سفرنامہ میں رائے چاچ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس نے لکھا ہے کہ سندھ کا حکمران ایک شودرا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۶۴۳ء تک رائے چاچ سندھ میں برسر اقتدار نہیں آیا تھا اس لحاظ سے چاچ نامہ کی دی ہوئی تاریخ درست نہیں ہے

مستحکم ہوگئی تو وہ وہاں سے مکران کی جانب روانہ ہوا۔ مکران کے عقب میں ایک پہاڑ کو عبور کر کے ایک دوسرے علاقے میں پہنچا۔ یہاں ایک قلعہ تھا جو کنز بیود (پنجگور) کے نام سے موسوم تھا۔ اس نے اس قلعہ کو مرمت کرنے کے احکام جاری کر دیئے اور اس کے علاوہ اس نے ہندو دستور کے مطابق یہاں صبح دوپہر اور شام کو پانچ سازوں کی نوبت بجانے کا بھی انتظام کر لیا۔ اس کے بعد وہ مزید اپنا سفر جاری رکھ کر کرمان کی سرحد پر پہنچ گیا۔ اس نے یہاں چیدے لگوائے اور اسی مقام کو مکران اور کرمان کی درمیانی سرحد قرار دیا اس جگہ پہلے سے کھجور کے جھنڈ موجود تھے۔ اس نے کھجور کے اور زیادہ پودے لگوا کر اس کو مزید گنجان بنا دیا اور اعلان کیا کہ راجہ سیہرس اکبر کے زمانہ میں یہی حد تھی اور وہی حد آج میرے عہد میں بھی ہے اس کے بعد اس نے وہاں سے ارمابیل کی طرف کوچ کیا اور دوبارہ مڑ کر دریائے پورالی کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے توران کے علاقے میں داخل ہوگیا اور لڑائی کی غرض سے کوئی شخص اس کے مقابلے پر نہیں آیا۔[1]

اس کے بعد وہ بلاد کندابیل میں وارد ہوا اور وہاں سے آگے بڑھ کر دریائے سیوی کے کنارے فرد کش ہوا اور قلعہ کے اندر جانے کا ارادہ کیا لیکن لوگوں نے بھاگ کر اپنے آپ کو قلعہ میں بند کر لیا۔ چاچ نے بدستور وہاں اپنا قیام جاری رکھا۔ اس سے لوگ تنگ ہو گئے۔ اس نے اپنا مالیہ

---

[1] بر چاچ نامہ۔

ایک سو کوہستانی گھوڑے اور ایک لاکھ درہم سالانہ مقرر کر کے ایک سال کا خراج پیشگی وصول کر لیا۔ اس کے بعد مختلف قسم کی انتظامی ہدایات نافذ کر کے واپس اپنے دارالحکومت الور چلا آیا اور قیام کیا۔ اس کی یہاں وفات ہو گئی۔ اس نے کل چالیس سال حکومت کی۔

شہزادی عارض ماہ کی تخت سے دست برداری کے بعد اس انتشار اور افراتفری کے موقع پر ایرانیوں نے ایک اور شہزادے کو استخر کی تاریکیوں سے ڈھونڈ نکالا جو ۶۳۲ء میں یزدگرد سوئم کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اگرچہ وہ بڑا قابل شخص تھا۔ لیکن ایرانی معاشرے میں انحطاط اور زوال کے گھن کچھ اس حد تک لگ گئے تھے کہ اب اسے بچانا اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس وقت اس کا سپہ سالار رستم نامی ایک ایرانی امیر تھا جو غیر معمولی قابلیت کا مالک تھا لیکن اس کے باوجود ایرانی فوج نے ۶۳۶ء میں عربوں کے ہاتھ سے شکست کھائی۔[ل]

اسی انتشار اور افراتفری کے دوران جو ایران میں عربوں کے حملہ سے چار سال پیشتر شروع ہوا تھا۔ کابل کے شاہ زیر دست جو غالباً ایک راجپوت تھا، اپنی فوجوں کو حرکت دے کر اراخوزیا کے ایرانی صوبے پر قبضہ کر لیا اور اس کے صدر مقام بُست میں اپنی طرف سے ملک سعد کو گورنر بنا کر بٹھا دیا۔ اس طرح شمالی بلوچستان کا علاقہ بھی جو اراخوزیا

لہ :۔ ایران بعہد ساسانیاں۔ پروفیسر کرسٹن سین۔ ترجمہ ڈاکٹر محمد اقبال

(رخج) میں شامل تھا۔ ہند و اقتدار کے تحت آ گیا اور عربوں کے حملہ ایران کے بعد بھی ایک عرصہ دراز تک ان کے زیر فرمان رہا۔[1]

---

[1] ے۔ دی پٹھان۔ سر اولوف کیرو۔

گیارھواں باب

عرب دورِ اقتدار

عربوں نے سیستان پر ۲۳ھ ہجری (۶۴۴ء) میں حملہ کر کے اس علاقے کو اس کے شہروں اور قصبوں سمیت حدود ہند تک فتح کر لیا اور اس کے ساتھ ہی ولایت قندہار کے ایرانی صوبے پر بھی ان کا تسلط قائم ہو گیا جو اس زمانہ میں رُخج یا الرخاج کے نام سے موسوم تھا۔ اور جس کو بیلوس کا نام بھی دیا جاتا تھا لیکن زرنج جو سجستان کا دارالحکومت تھا ایک عرصہ تک فتح نہ ہو سکا کیونکہ اس کے استحکامات بڑے مستحکم تھے لیکن آخر کار بعد میں حملہ آوروں کے حوالے کیا گیا اور وہ عرب سپہ سالار عمرو بن العاس التیمی تھا جس نے شاہ نیمروز کی فوج کو شکست دے کر اس شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔[۱]

اس کے بعد عبد اللہ بن عبد اللہ السلولی نے جس نے ۲۳ھ ہجری میں کرمان کو تاخت و تاراج کیا تھا۔ امیر معاویہ کے عہدِ خلافت میں حکم بن عمرو السلاولی کے زیر قیادت مکران پر حملہ کرنے کی غرض سے ایک بڑا لشکر روانہ کیا جو کرمان اور عمان سے لے کر سندھ تک ایک وسیع خطہ میں پھیلا ہوا تھا اور

---

[۱] SEISTAN – G.P. TATE

جہاں بہت سی بستیاں بھی تھیں جن میں قیقن اور خواش کے قصبات بھی شامل تھے۔ یہ تمام مکران سے متصل واقع ہوئے تھے۔ مکران اور عمان کے درمیان سمندر حائل تھا۔ اس فوج کے ساتھ شہاب المحارب بن شہاب بھی گیا تھا اور لعبد میں سہیل بن عادی بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔[1]

مکران کا حاکم ملک سعد تھا جس نے سندھ کے راجہ سے امداد طلب کی کیونکہ اس زمانے میں مکران سندھ میں شامل تھا۔ سندھ و ہند کی زبان میں ژندپیل وہاں کے حکمران کا لقب تھا جیسا کہ عجم کا بادشاہ کسریٰ روم کا بادشاہ قیصر اور چین کا بادشاہ خاقان کے لقب سے ملقب ہوتا تھا۔ سندھ کے راجہ کو جب اس حملے کا حال معلوم ہوا تو اس نے ایک بڑی فوج جمع کر لی۔ اس فوج میں ہاتھی بھی شامل تھے اور وہ بہ نفس نفیس ملک سعد ژندپیل، کی امداد پر مکران چلا آیا۔[2]

عبداللہ بن عبداللہ کو جب کرمان میں ان تیاریوں کا علم ہو گیا تو وہ اپنا ایک نائب کرمان میں چھوڑ کر چند فوجی دستوں کے ساتھ فوراً عرب فوج کی امداد پر روانہ ہو گیا۔ جب وہ مکران میں داخل ہوا تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ عرب فوج ہند فوج سے ایک بڑے فاصلہ پر خیمہ زن تھی اور ملک سعد نے اور زیادہ فوج جمع کرنے کی غرض سے اپنے قاصد روانہ کئے تھے

---

[1] NOTES ON AFGHANISTAN AND BALUCHISTAN. RAVERTY -

[2] ABID.

تاکہ سندھ کے گوشے گوشے سے امداد حاصل کرے۔ اس کے نتیجہ میں
ہندو فوج کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے اس تاخیر سے برہم
ہو کر عرب سپہ سالاروں سے کہا کہ دشمن کی فوج سے اس قدر زیادہ فاصلے
پر خیمہ زن ہو کر جنگ میں تاخیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ دشمن
کو جان بوجھ کر یہ موقع فراہم کر رہے ہو کہ وہ ساری دنیا کو تمہارے خلاف
جنگ کے لئے جمع کرے۔ اس کے بعد اس نے عمرو اور شہاب کی فوجوں
کے ساتھ مل کر رات کو اچانک دشمن کی فوج پر شبخون مارا۔ اس لڑائی میں
زنبیل خود مارا گیا اور اس کی فوج کو مکمل شکست ہو گئی وہ سر پر پاؤں رکھ
کر بھاگنے لگے اور عربوں نے ان کا تعاقب کیا اور وہ رات کے اندھیرے
میں ان کو قتل کرتے رہے۔ عربوں کو اس لڑائی میں بہت سا مال غنیمت ہاتھ
آیا جس میں سے بہت سے ہاتھی شامل تھے اور بہت سے لوگ قیدی بنا
لئے گئے اور مکران کا سارا علاقہ ان فاتحین کے قبضہ و اختیار میں آگیا۔ یہ
واقعہ ۲۳ھ ہجری کے اواخر میں غالباً[1] اکتوبر ۶۴۴ء میں پیش آیا۔ لیکن
چاچ نامہ کے مصنف کا بیان اس سے مختلف ہے۔

اس کا بیان ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ
کے عہدِ خلافت میں ۱۵ھ ہجری میں ہند و سندھ کے علاقہ پر پہلا حملہ ہوا
اس نے عثمان بن ابی العاص الثقفی کو بحرین روانہ کیا اور وہ وہاں سے فوج

ف ۱ ۔ NOTES ON AFGHANITAN & BALUCHISTAN – RAVERTY REFERING TO YAFAI.

سے کرمان کی طرف روانہ ہوا اور فوج کو کشتیوں میں بٹھا کر سمندر کے راستے آگے چل پڑا اور مغیرہ بن ابی العاص کو ان کا سپہ سالار مقرر کر کے بحرین بھیج دیا تاکہ وہ بحرین سے دیبل کی طرف کوچ کرے۔ اس زمانہ میں چچ بن سیلائج سندھ کا حکمران تھا۔ چچ نے سامہ بن دیواجی کو وہاں کا حکمران مقرر کیا تھا۔ اہل دیبل تجارت پیشہ لوگ تھے۔ جب عرب فوج دیبل میں داخل ہوگئی تو سامہ بن دیواجی قلعہ سے باہر آگیا اور دونوں فوجوں کے درمیان لڑائی شروع ہوگئی لیکن عرب فوج نے سندھی فوج کے ہاتھ سے شکست کھائی۔ عربوں کو اس لڑائی میں زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ ان کے بیشمار آدمی میدان جنگ میں کام آئے اور مغیرہ بھی اس لڑائی میں لڑتے لڑتے شہید ہوگیا۔

چاچ نامہ کے مصنف کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ عراق کا گورنر تھا تو اس کے ساتھ ربیع بن زیاد حارثی کو کرمان اور مکران کا حاکم بنا دیا گیا۔ دارالحکومت سے ابو موسیٰ کو ہدایت کی گئی کہ وہ ولایت ہند و عراق اور کرمان کے حالات لکھ کر بتلا دے۔ چونکہ مغیرہ کی شہادت کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ ہند و سندھ کے اوپر ایک نہایت جابر اور طاقتور رائے حکومت کرتا ہے جو بڑا کینہ پرور بھی ہے۔ ابو موسیٰ نے ان حالات سے امیر المومنین کو آگاہ کر دیا۔ انہوں نے ہند کی طرف فوج کشی سے منع کر دیا۔[1]

---

[1] چاچ نامہ۔

طبری کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مکران پر پہلا حملہ حکم بن عمرو التغلبی کی قیادت میں ہوا۔ حکم ایک بڑی فوج لے کر مکران کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں پہنچنے کے بعد شہاب بن المحارب بن شہاب بھی اس کے ساتھ جا کر ملا۔ اسی طرح سہیل بن عدی اور عبداللہ بن عتبان بھی اس کی امداد پر پہنچ گیا۔ یہ لوگ ایک نہر یا دریا کے کنارے فروکش ہو کر خیمہ زن ہوئے اور اہل مکران بھی لڑائی کی نیت سے آگے بڑھ کر ندی کی دوسری طرف جمع ہو گئے اور لڑائی کی تیاریاں کرنے لگے۔ ان کا سرکردہ مکران کا حاکم راسل تھا۔ وہ عربوں کے مقابلے پر نکل آیا اور اسی نہر یا دریا کے کنارے گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ اس موقعہ پر اہل مکران کی امداد پر تازہ دم فوج بدستور آ رہی تھی۔ اس تازہ دم فوج کے پہنچنے تک عرب ان سے لڑتے رہے اور ان میں سے بہت سے لوگوں کو تہ تیغ کیا۔ یہ ایک خونریز اور سخت لڑائی تھی۔ عربوں نے نہر کے کنارے تک ملک راسل کی فوج کا تعاقب کیا اور دشمن کے سپاہیوں کو بے دریغ قتل کیا۔ آخر کار ملک راسل کی فوج نے مکمل شکست کھائی، عربوں نے بہت دنوں تک مکران میں قیام کیا اور ان کو بڑی مقدار میں مال غنیمت ہاتھ آیا جس میں ہاتھی شامل تھے۔

حکم نے امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فتح کی اطلاع دے دی اور صحار العبدی کے ذریعہ مال غنیمت کا خمس ان کی خدمت میں روانہ کیا، اور ہاتھیوں

لے :۔ تاریخ طبری

کے بارے میں دریافت کیا کہ ان کو کیا کیا جائے؟ کیونکہ ان کا نہ گوشت کھایا جا سکتا تھا اور نہ ان کو لگام ڈال کر سواری کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا اور پھر یہ اتنی خوراک کھاتے تھے کہ ان کے اخراجات آسانی سے پورے نہیں کئے جا سکتے تھے اور ان سے سندھ پر بھی حملہ کرنے کی اجازت طلب کر لی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اس زمانہ میں جو بھی جاتا تھا وہ اس سے مکران کے حالات دریافت کرتے تھے انہوں نے صحار سے بھی مکران کے حالات دریافت کئے۔ اس نے جواب دیا، یا امیر المومنین اس کی ہموار زمین پہاڑ سے بدتر ہے۔ وہاں پانی کی قلت ہے۔ اس کے میوے بدمزہ اور کڑوے ہیں۔ وہاں نیکی کم اور برائی زیادہ ہے اگر زیادہ فوج رکھی جائے تو اس کے بھوک سے ہلاک ہو جانے کا خطرہ ہے اور کم فوج رکھی جائے تو دشمن کے ہاتھ سے اس کے قتل ہو جانے کا امکان ہے اور اس سے آگے کا علاقہ اور زیادہ خراب ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی گفتگو سن کر دریافت کیا کہ کیا شاعری کر رہے ہو۔ اس نے برجستہ جواب دیا کہ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم کے پاس ہدایت بھیجی کہ ہاتھیوں کو قرب و جوار کے حکمرانوں پر فروخت کیا جائے۔ اس نے حکم کو سندھ پر فوج کشی سے منع کیا اور کہا کہ اگر پوری قوت اور استقامت حاصل کرنے سے پہلے سندھ پر فوج کشی کر کے مسلمانوں کو جانی و مالی نقصان پہنچاؤں تو اس کے لئے مجھے خداوند تعالیٰ کے آگے جواب دینا ہو گا۔

چاچ نامہ کے مصنف کا بیان ہے کہ امیر المومنین حضرت عثمان بن

عفان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں عبداللہ بن عامر نے خلیفہ کے حکم سے حکم بن جبلہ کو ہند وسندھ کے حالات معلوم کرنے پر مامور کیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے تمام حالات بلاکم وکاست بیان کئے اور بڑی شرح وبسط کے ساتھ وہاں کے باشندوں کے قواعد جنگ فوج کشی کے طریقوں اور باشندوں کی صلاحیتوں کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ عبداللہ نے اس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ جب وہ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مستعدی سے شرطِ خدمت بجالایا۔ امیر المومنین نے اس سے ہند وسندھ کے حالات دریافت کئے۔ اس نے بیان کیا کہ اس کا پانی کڑوا ہے۔ اس کا میوہ بدمزہ اور مقاتل ہے۔ اس کی زمین سنگلاخ اور باشندے ناقابلِ اعتبار ہیں۔ اگر فوج کم رکھی جائے تو دشمن کے ہاتھ سے اس کی ہلاکت کا خطرہ ہے اگر زیادہ فوج رکھی جائے تو خوراک کی کمی کے باعث اس کے بھوک سے ہلاک ہونے کا امکان ہے۔ امیر المومنین نے دریافت کیا، وہاں کے باشندے عہدوپیمان میں کیسے ہیں وفادار ہیں یا غدار ہیں۔ حکم نے جواب دیا کہ خائن اور غدار ہیں۔ اس کے بعد اس نے عبداللہ بن عامر کو ہند وسندھ کی طرف فوج کشی کرنے سے منع کیا اور کوئی بھی نہ گیا۔

چاچ نامہ کے مصنف کا بیان ہے کہ ۳۸ھ ہجری (۶۵۹ء) میں جب حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ خلیفہ بنے تو اس زمانے میں اہلِ شہر کے درمیان نااتفاقی پیدا ہوگئی اور مسلمان ایک دوسرے کی مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوئے عامر بن الحارث بن عبدالقیس سے روایت ہے کہ جب قرب وجوار کے

لوگ مخالف ہو گئے تو امیر المومنین نے ثاغر بن دعو کی قیادت میں ایک فوج مرتب کر کے ہند پر فوج کشی کا حکم دے دیا اور کئی فوجی اکابر و اعیان اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ انہوں نے فہرج اور کوہ پایہ کے راستے اپنا سفر جاری رکھا۔ ۳۸ھ ہجری کے اواخر میں جن جن اضلاع سے ان کا گذر ہوا ان کو وہاں فتح و ظفر اور کامیابی حاصل ہو گئی اور بہت سا مال غنیمت ان کے ہاتھ لگا۔ آخر کار وہ کیکانان کے علاقے میں وارد ہوئے۔ اس طائفہ کے لوگ لڑائی پر آمادہ تھے۔ بلاذری کا بیان ہے کہ حارث بن مرہ ایک دلیر اور بہادر شخص تھا۔ اسلحہ سے لیس ایک ہزار سپاہی اس کے ہمراہ تھے اور تین بہادر اور قوی الجثہ غلام بھی اس کے ساتھ تھے۔ ان میں سے ایک کو اس نے اپنا محافظ مقرر کیا تھا اور باقی دو اپنے اپنے فوجی دستوں کے اوپر سرلشکر تھے۔ ان میں سے ہر ایک پانچ سو افراد کے اوپر سپہ سالار تھا۔ جب وہ مکران میں تھے تو ان کی آمد کی خبر کیکانان پہنچ گئی تھی۔ اہل کوہ پایہ اور کیکانان جمع ہو کر ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ۴۲ھ ہجری (۶۶۳ء) میں جب عرب کیکانان پہنچے تو اس علاقے کے لوگ جو پہلے سے تیار بیٹھے تھے لڑائی پر آمادہ ہو گئے اور جنگ شروع ہو گئی۔ تقریباً بیس ہزار پیادہ کیکانی اکٹھے ہو گئے تھے۔ عرب فوج کا ان سے مقابلہ ہوا۔ جب کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تو وہ لوگ آگے بڑھے اور لڑائی میں مشغول ہو گئے۔ جب عرب غزا سے واپس ہوئے تو وہ لوگ کیکانان کے درے میں داخل ہو گئے اور راہ فرار اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ عرب لشکر نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور اطراف

کے پہاڑوں سے بھی نعرۂ تکبیر کی گونج بلند ہوئی. کیکان کے کفاروں نے جب یہ
آوازیں سنی تو ان کے دلوں پر ایک قسم کی ہیبت طاری ہو گئی اور وہ بہت
زیادہ خوف زدہ ہو گئے ان میں سے بہت سے لوگوں نے آگے بڑھ کر
اسلام قبول کر لیا اور دوسروں نے شکست کھا کر راہ فرار اختیار کر لی. اب
بھی اسی موسم میں ان پہاڑوں سے تکبیر کی آواز بلند ہوتی ہے. ابھی یہ لوگ
فتح سے ہمکنار ہوئے تھے کہ ان کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت
کی اطلاع ملی وہ وہاں سے واپس لوٹے اور جب مکران میں پہنچے تو ان کو
معلوم ہوا کہ معاویہ بن ابو سفیان کی خلافت کا اعلان ہو چکا ہے. حضرت
علی کرم اللہ وجہہ کو ایک خارجی ابو ملجم نے سنہ ۴۰ھ ہجری (سنہ ۶۶۱ء) میں
جمعہ کے دن شہید کیا تھا.

امیر معاویہ بن ابو سفیان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے
بعد سنہ ۴۱ھ ہجری میں خلافت کے عہدہ جلیلہ پر مامور ہو گیا. اس نے اپنے
دور خلافت میں عبداللہ بن سوار العبدی کی قیادت میں چار ہزار سواروں پر
مشتمل ایک فوج ولایت سندھ کی طرف روانہ کی. چاچ نامہ کے مصنف کے
بیان کے مطابق امیر معاویہ نے اس ولایت کا انتظام ان کے سپرد کرتے
ہوئے فرمایا کہ بلاد سندھ میں ایک بلند پہاڑ ہے جو کیکان کے نام سے موسوم
ہے. وہاں کے گھوڑے بڑے تن آور، جسیم بلند و بالا اور خوبصورت ہوتے
ہیں. تم سے پہلے بھی وہاں سے مال غنیمت ہاتھ آتا رہا ہے. وہاں کے باشندے
بڑے غدار اور ناقابل اعتبار ہیں. ان کو اپنے پہاڑ کی دشوار گذاری پر بڑا فخر

اور ناز ہے جہاں وہ پناہ لیتے ہیں۔ اس نے عمر بن عبداللہ بن عمر کو اردبیل
فتح کرنے کی مہم پر بھیجا اور عبداللہ بن عامر کو بصرہ کے لئے نامزد کیا تاکہ قیس
بن ہاشم السلمی کے پاس جائے اور اس سے مل کر اردبیل (دبیل) پر حملہ کرے
اور اس مہم کے لئے چار ہزار افراد اپنے ساتھ لے۔ روایت ہے
کہ جب امیر معاویہ نے عبداللہ بن سوار کو چار ہزار سواروں کی سرکردگی میں
روانہ کیا تو اس کے لشکر میں آگ جلانے کی اجازت نہ تھی اور وہ دہی
کھاتے تھے جو ابن سوار ان کو مہیا کرتا تھا۔ ایک رات اس کی لشکرگاہ میں
آگ کی روشنی نظر آئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک عورت حاملہ تھی
اور اس کے ہاں بچہ پیدا ہوگیا ہے جس کی وجہ سے آگ جلانے کی ضرورت
پڑی۔ عبداللہ نے اس کو آگ جلانے کی اجازت دے دی۔ عورت خوش
ہو کر دعائیں دینے لگی اور تین دن تک فوج کو کھانا کھلاتی رہی۔ جب وہ
لوگ کیکانان کے بلاد میں داخل ہوگئے تو ان پر دشمن نے حملہ کیا۔ عرب
لشکر نے ان کو شکست دے دی اور بہت سامان غنیمت ان کے ہاتھ آیا۔
کیکانی اس کے بعد پھر جمع ہوگئے اور تمام دروں کی ناکہ بندی کر دی۔ اس
موقع پر ایک سخت لڑائی ہوئی۔ عبداللہ بن سوار نے اپنے لشکر کے درمیان
کھڑے ہو کر آواز دی کہ اے مہاجر اور انصار کے فرزندو! کافروں سے
منہ مت موڑنا کہیں تمہارے ایمان میں خلل واقع نہ ہوجائے۔ اسلام کا
لشکر اس کے علم کے گرد جمع ہوگیا۔ بنی عبدالقیس کا ایک آدمی مجمع سے باہر
نکل آیا اور لڑائی کی خواہش ظاہر کی۔ دشمن کا ایک سرکردہ اس کے مقابلے

پر آیا۔ یاسر بن سوار بھی اس کے ساتھ اس لڑائی میں شامل ہو گیا۔ دونوں نے ایک ساتھ حملہ کر کے دشمن کے سرکردہ کو زمین پر گرا دیا۔ کیکانان کا لشکر ان پر بیک وقت حملہ آور ہوا اسلام کے لشکر کو شکست ہو گئی۔ تمام کوہستان مردہ سپاہیوں کی لاشوں سے ڈھک گیا۔ مسلمان واپس ہوئے اور مکران چلے آئے قیتبہ السہیلی سے روایت ہے کہ وہ بھی اس دن اس لشکر میں موجود تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ ابن سوار کا مقابلہ ایک جوان سے ہوا دشمنوں سے اَن گنت لوگ مارے گئے۔ ابن سوار بھی اس جنگ میں مارا گیا میں نے کیکانی کشتہ گان کی لاشوں کی تلاشی لی۔ مجھے ایک سو انگشتری مہریں مل گئیں۔ امیر معاویہ نے عبداللہ کی شہادت کے بعد سنان بن سلمہ کو مکران کی امارت پر فائز کر دیا اور زیاد کو تاکید کر دی کہ وہ ایسے شخص کو عامل مقرر کرے جو سفر ہند کے قابل ہو۔ سنان نے دو سال تک مکران میں قیام کیا۔ اس کے بعد کسی وجہ سے امیر معاویہ نے اس کو معزول کر دیا اور اس کی بجائے راشد بن عمرو کو ولایت سندھ کا عامل مقرر کر دیا۔ یہ ایک بڑا با ہمت شریف اور لائق شخص تھا۔ امیر معاویہ نے اس کی روانگی سے قبل اس کو اپنے پاس بلایا۔ اس کو اپنے پاس بٹھا کر دیر تک اس سے مشورہ کیا۔ اس کے بعد اکابرین عرب سے مخاطب ہو کر کہا کہ راشد ایک شریف آدمی ہے اس کی اطاعت سے روگردانی نہیں کرنی چاہیئے اس کی فرماں برداری میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور جنگ کے وقت اس کی مدد کرو اور اسے تنہا مت چھوڑو۔ راشد جب مکران میں وارد ہوا تو عرب اکابرین اور عمائدین کو ساتھ لے کر

سنان کے پاس چلا گیا اور اسے بڑا قوی اور قابل شخص پایا اس نے کہا خدا کی قسم سنان ایک بڑا آدمی ہے۔ وہ بہتری اور فوج کشی کے قابل ہے اور ایک بہادر آدمی ہے۔ دونوں بڑی دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے رہے راشد نے اس سے وہاں کے مقامی حالات دریافت کیئے تاکہ امیر معاویہ کو ان حالات سے آگاہ کر سکے۔ اس کے بعد اس نے سنان سے سندھ کے حالات دریافت کیئے اور سندھ پر فوج کشی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جب راشد بن عمرو سندھ کے علاقے کی طرف روانہ ہوا تو کوہ پایہ کا مالیہ وصول کر کے کیکان کی طرف چلا گیا اور مالیہ وصول کرنا شروع کر دیا اور مالیہ کی وصولی کے سلسلے میں اس نے لڑائیاں کیں۔ اس نے یہاں کے حالات سے پوری آگاہی حاصل کر لی اور پورے ایک سال تک اس نے اس علاقے میں قیام کیا۔ ایک سال کے بعد جب وہ مالیہ وصول کر کے سیستان کے راستے واپس جا رہا تھا کہ کوہ منذر اور بہرج (فہرج) کے نزدیک اس علاقے کے کوئی پچاس ہزار افراد جمع ہو گئے اور لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔ دونوں فریقوں کے درمیان صبح سے عصر کی نماز تک گھمسان کی لڑائی ہوئی اور اس لڑائی میں راشد نے جام شہادت نوش کر لیا۔ دوسری روایت ہے کہ مکران میں میدوں نے بغاوت کی اور راشد ان کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا جب راشد بن عمرو نے شہادت پائی تو زیاد نے دوبارہ سنان بن سلمہ کو عامل مقرر کر دیا۔ یہ شخص جناب رسول اللہ کے عہد مبارک میں پیدا ہوا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے باپ کو اس کے نیک طالع ہونے کی

بشارت دی تھی۔ انہوں نے ہی اس کا نام سنان تجویز فرمایا تھا۔ سنان جب دوبارہ عامل مقرر ہوا تو اس نے اپنا لشکر منظم کر کے مکران کی طرف کوچ کیا اور یہاں پہنچنے کے بعد اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ جناب رسول اللہ نے اس سے خواب میں کہا کہ تیرا باپ تیری مردانگی پر فخر کرتا تھا۔ آج تیری آزمائش ہے اور بہت سے ممالک تیرے زیر فرمان آئیں گے۔ ان کی اصلاح کرنا۔ سنان کے دورِ حکومت میں مکران میں میدوں نے بغاوت کی۔ اس نے اس بغاوت کو کچل دیا۔ اس کے بعد وہ کیکانان کی طرف گیا اور وہاں سے بوقان پر فوج کشی کر کے اسے فتح کیا ہر موضع سے جب اس کا گذر ہوتا تھا۔ تو وہ نیک روایات قائم کرتا تھا آخر کار جب وہ بودھیہ کے علاقہ میں پہنچ گیا۔ تو اس کے خلاف وہاں کے جٹ باشندوں نے بغاوت کی اور وہ اس بغاوت کے دوران جٹوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوگیا۔ ایک دوسری روایت ہے کہ خضدار میں بغاوت ہوئی اور وہ خضدار میں جو توران کا صدر مقام تھا باغیوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا۔ [1]

چاچ نامہ کے مصنف کا بیان ہے کہ امیر معاویہ نے ۶۱ سنہ ہجری (۶۸۰ء) میں منذر بن جارود کو مقبوضات ولایت سندھ کا والی مقرر کر دیا۔ جب وہ امارت کا لباس پہن کر روانہ ہوا تو اس کے کپڑے اوپر

---

[1] :۔ چاچ نامہ

ایک لکڑی میں پھنس کر پھٹ گئے۔ اس پر عبداللہ بن زیاد بڑا غمگین ہوا اور کہا کہ یہ منذر کے لئے نیک فال نہیں ہے۔ وہ اس سفر سے واپس نہیں آئے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب وہ روانہ ہو کر دشمن کی ولایت میں پہنچا تو دریائے پورالی کے قریب بیمار ہو کر فوت ہو گیا۔ لیکن بلاذری کا بیان ہے کہ اس نے بوقان اور کیکان پر حملے کئے جس کے دوران مسلمان غالب آئے اور بہت سا مال غنیمت ان کے ہاتھ لگا۔ اس نے ان علاقوں میں چھوٹے چھوٹے فوجی دستے پھیلا دیئے جنہوں نے ہر جگہ کامیابی حاصل کر لی۔ اس اثنا میں خضدار کے جبٹ باشندوں نے بغاوت کی۔ جب منذر کو اس بغاوت کا علم ہو گیا تو اس نے خضدار پر فوج کشی کر کے اس بغاوت کو فرو کر دیا اور خضدار ہی میں اس کی وفات ہو گئی۔ اس کے بعد اس کی جگہ اس کا بیٹا حکم بن منذر ولایت ہند و سندھ کا والی مقرر ہوا۔ یہ ایک بڑا بہادر شخص تھا۔ وہ بیک وقت کرمان اور مکران کا والی تھا۔[1]

امیر معاویہ کے دورِ خلافت ہی میں مہلب بن ابی سغرا نے مکران میں ایک فوجی مہم کی رہنمائی کی اور جب وہ کیکانان کے قرب وجوار میں تھا تو اس کی مڈھ بھیڑ اٹھارہ ترک شہسواروں سے ہوئی جن کے گھوڑوں کی دمیں کٹی ہوئی تھیں۔ وہ مہلب بن ابی سغرا کے لشکر کے خلاف بڑی بہادری سے لڑے اور لڑائی کے دوران سب کے سب مارے گئے

---

[1] چچ نامہ

مہلب ان کی بہادری سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنے گھوڑوں کی دمیں بھی کٹوا دیں۔

عبدالملک بن مروان کے عہدِ خلافت میں حجاج بن یوسف عراق اور ہند و سندھ کا گورنر تھا۔ اس نے سعید بن اسلم کلابی کو مکران کے اوپر عامل مقرر کر دیا۔ چاچ نامہ کے مصنف کے بیان کے مطابق سعید مکران میں وارد ہونے کے بعد ایک شخص سفہوی بن لام الحمامی سے جو حال ہی میں اندر سے یہاں آیا تھا خواہش ظاہر کی کہ وہ انتظامی معاملات میں اس کے ساتھ تعاون کرے لیکن اس شخص نے انکار کیا اور تلخ لہجے میں کہا کہ میں تیرے ماتحت کام کرنا اپنے لئے باعث شرم خیال کرتا ہوں۔ اس جواب ناثواب پر سعید بڑا برہم ہوا۔ اس نے سفہوی کو قتل کر کے اس کے چمڑے میں بھس بھر دیا اور اس کا سر کاٹ کر حجاج کے پاس پہنچا دیا۔ سعید نے مکران میں اپنے قیام کے دوران لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور ہر ایک کے ساتھ نیکی اور خوش اخلاقی سے پیش آیا۔ اس نے مالیہ کی وصولی کے لئے اپنے معتمد آدمی مقرر کئے اور بہت سارا مال جمع کیا۔ آخر کار جب وہ مالیہ اور خراج اکٹھا کر کے واپس جا رہا تھا کہ فہرج کے نزدیک علافیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

چاچ نامہ کے مطابق قتیبہ بن اشعث سے روایت ہے کہ کلیب بن خلف المغنی، عبداللہ بن عبدالرحیم علافی محمد بن معاویہ علافی نے باہم مشورہ کیا کہ سفہوی اہل عمان میں سے تھا جو ہمارے وطن سے متصل واقع

ہے اور سعید کو کیا حق پہنچتا تھا کہ ہمارے ہمسایہ کو قتل کرے۔ چنانچہ انہوں نے فہرج کے نزدیک اس کا راستہ روک کر اس کو سفہوی کے قصاص میں قتل کردیا۔ حجاج نے سعید کے ہمراہیوں سے ان کے امیر کے متعلق پوچھا تو وہ منکر ہوئے آخر کار بعد میں جب ان کے کچھ ہمراہی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تو انہوں نے مندکرہ بالا علافیوں کے نام بتادیئے کہ انہوں نے غلبہ کر کے سعید کو دھوکا اور فریب سے قتل کر دیا ہے۔ اس کے بعد حجاج نے سعید کے قتل کے بدلے میں بنی کلاب کے ایک شخص کو حکم دے کر سلمان علافی کو قتل کرادیا اور اس کا سر کاٹ کر سعید کے اہل خاندان کے پاس بھجوا دیا تاکہ ان کی تسلی وتشفی ہوجائے۔

چاچ نامہ کے مطابق حجاج نے اس کے بعد مجاعہ بن مغیرہ کو مکران کا عامل مقرر کر دیا اور اسے ہدایت کر دی کہ سعید کے قتل کے جرم میں علافیوں کو قرار واقعی سزا دے جنہوں نے مکران میں مستقل سکونت اختیار کی ہوئی تھی۔ علافیوں نے جب مجاعہ کی آمد کی خبر سنی تو وہ سندھ کی طرف بھاگ نکلے اور سندھ کے حکمران راجہ داہر کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔ مجاعہ نے مکران میں ایک سال گذارا اور مکران ہی میں اس کی وفات ہوگئی۔ ۸۵ھ ہجری میں ولایت ہند وسندھ اور کندابیل حجاج کے زیر انتظام آ گئے تھے۔

چاچ نامہ کے مطابق ولید بن عبدالملک ۸۶ھ ہجری میں خلافت کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوگیا۔ حجاج بن یوسف نے محمد بن ہارون کو مکران

کا والی مقرر کر دیا۔ یہ ایک بڑا قابل شخص تھا۔ اس نے مکران میں رفاع عام کے بہت سے کام کئے اور زراعت کو ترقی دینے کے لئے کاریزیں بنوائیں۔ حجاج نے اس کو حکم دیا کہ جو بھی علافی ہاتھ آئے سعید کے قتل کے عوض میں اس کو قتل کیا جائے۔ محمد ہارون کو نامی ایک علافی ہاتھ آیا اور اس نے اس کو قتل کر کے اس کا سر حجاج کے پاس بھیج دیا اور حجاج کو لکھا کہ اگر میری زندگی نے وفا کی تو میں ایک بھی علافی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ محمد بن ہارون عام لوگوں میں بڑا مقبول تھا اس نے پانچ سال تک مکران پر حکومت کی۔ وہ اپنی مقبولیت کی وجہ سے محمد بن ہارون النومری المکرانی کے نام سے مشہور تھا۔ محمد ہارون کی امارت سے پہلے بلال بن احواز مکران کا حاکم تھا اس نے کندابیل پر حملہ کر کے مہلب بن سفرا کے بیٹوں بدرک، مفضل، مالک نیاد اور معاویہ کو قتل کر دیا تھا۔

چاچ نامہ کے بیان کے مطابق ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں حجاج بدستور ہند و سندھ کا مختار کل تھا۔ اس زمانہ میں سراندیپ کے بادشاہ نے بہت سے تحفے تحائف جن میں زر و جواہر، نوادر اشیاد اور بہترین کپڑوں کے علاوہ، خوبصورت کنیزیں اور چاق و چوبند حبشی غلام بھی شامل تھے کشتیوں کے ذریعے خلیفہ وقت کے لئے روانہ کئے۔ ان قیمتی اشیاء اور تحفہ و تحائف کے علاوہ کئی مسلمان عورتیں خانہ کعبہ میں فریضہ حج کے مناسک ادا کرنے اور دارالخلافہ کی زیارت کرنے کی نیت سے ان کشتیوں

میں سفر کر رہی تھیں۔ بد قسمتی سے سمندر میں طوفان آیا اور یہ کشتیاں دریائے قارون کے دہانے سے واپس مڑ کر دیبل کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوئیں قزاقوں کی ایک جماعت جو انگارہ قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کشتیوں کا مال اسباب لوٹ کر لے گئی اور سواریوں کو عورتوں سمیت غلام اور کنیز بنا لیا۔ حجاج بن یوسف کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے راجہ داہر کو مکران کے والی محمد بن ہارون کے توسط سے ایک خط لکھا اور بڑے زور دار طریقے سے مطالبہ کیا کہ لوٹے ہوئے مال و اسباب کے علاوہ مسلمان عورتوں اور مردوں کو رہا کر کے واگذار کیا جائے اور اس کے ساتھ یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ قزاقوں کی اس حرکت پر حجاج بڑا برہم تھا۔ راجہ داہر نے اس مطالبہ کو پورا کرنے سے معذوری ظاہر کی اور جواب دیا کہ ان قزاقوں کی گرفتاری اس کے بس سے باہر ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ایک ایسے سرکش قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جن کے دست برد سے اس کا اپنا علاقہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ حجاج کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ مجرموں کو اس کے حوالے کیا جائے۔ راجہ داہر کے اس جواب سے حجاج کی تسلی نہ ہوئی اور یہ واقعہ سندھ پر عربوں کے حملہ کا باعث بنا۔

چاچ نامہ کے مطابق خلیفہ ولید بن عبدالمالک کی اجازت سے حجاج بن یوسف نے بدیل کو ایک جمعیت کے ساتھ سندھ پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا لیکن داہر کے بیٹے جیسیہ نے اسے شکست دی اور وہ

میدانِ جنگ میں شہید ہو گیا۔ اس کے بعد حجاج نے ۹۲ سنہ ہجری میں اپنے چچا زاد بھائی اور داماد محمد بن قاسم کو جس کی عمر فقط سترہ سال کی تھی ایک بھاری جمیعت کے ساتھ جو ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس تھی اور جس میں سوار دستوں کے علاوہ بیشمار بار برداری کے جانور بھی تھے سندھ کی طرف روانہ کیا اس کے علاوہ حجاج نے بہت سی کشتیوں میں اسلحہ اور اشیائے خوراک لادکر انہیں سمندر کے راستے دیبل کی طرف روانہ کر دیا۔ محمد بن قاسم کا لشکر شیراز سے ہو کر مکران میں داخل ہوا جہاں محمد بن ہارون والی مکران نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ انہوں نے اس کے بعد ارمن بیلہ سے ہو کر سندھ کے ساحلی علاقہ کا رُخ کیا جہاں وہ کشتیاں بھی آ پہنچیں جن پر بہت سا اسلحہ اور خوراک لدی ہوئی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر دیبل کی بندرگاہ کا محاصرہ کر لیا اور اس کے باشندے محصور ہو گئے لیکن دیبل کا قلعہ منجنیقوں کی تاب نہ لا سکا۔ اور اس کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے اور وہ کسی بڑی مزاحمت کے بغیر سر کر لیا گیا۔ اس مہم کے دوران محمد بن ہارون بھی عرب لشکر کے ساتھ ہو گیا تھا لیکن وہ بیمار تھا اور عرب لشکر کے دیول پہنچنے سے پیشتر ارمن بیلہ ہی میں اس کی وفات ہو گئی۔

اس کے بعد عرب فوج نے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ کے اندرونی علاقوں کا رخ کیا لیکن راجہ داہر کی فوج کی جانب سے کوئی بڑی مزاحمت نہ ہوئی اور یہاں کے تمام قلعے جن میں نیرون، بھمن آباد، بھاٹیہ ارور، اسکلندہ سکہ و ملتان۔ نودھیہ کے قصبات اور قنوج وغیرہ ایک ایک

کر کے فتح ہوئے۔ سندھ کے راجہ داہر نے رمضان المبارک ۹۳ھ ہجری (۷۱۲ء) میں اپنے دار السلطنت ارور کے عظیم الشان شہر کے نزدیک عربوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھائی اور میدان جنگ میں کام آیا اس کے بعد اس کی ساری سلطنت پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔

راجہ داہر کی سلطنت ایک مضبوط مملکت تھی۔ وہ عربوں کے خلاف میدان جنگ میں جو فوج لے آیا تھا۔ اس کی تعداد بیس ہزار افراد کے لگ بھگ تھی اور اس میں سینکڑوں ہاتھی شامل تھے لیکن اس کی شکست اور عربوں کی کامیابی کی کئی وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ عرب فوج اسلحہ سے لیس تھی۔ جس میں ان گنت منجنیق شامل تھے۔ انہوں نے اس مہم کے لئے پوری تیاریاں کی تھیں اور حجاج نے بعد میں دو ہزار گھوڑے ان کی امداد کے لیئے روانہ کئے تھے۔ لیکن سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ اس زمانہ میں ہندو مت کا احیاء ہو چکا تھا۔ لیکن سندھ کے باشندوں کی ایک بڑی اکثریت بدھ مت کی پیروکار تھی جس کی بنیاد عدم تشدد پر رکھی ہوئی تھی اس مذہب کی رو سے انسان تو انسان، جانور کا خون بہانا بھی بڑا پاپ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ برہمن اور ان کے پیروکار کھشتری جن میں خود شاہی خاندان کے افراد شامل تھے، مذہب کے معاملے میں کٹر واقع ہوئے تھے ان سب کا سلوک بدھ مت کے پیروکاروں کے ساتھ معاندانہ تھا اور ان میں رواداری کا فقدان تھا۔ اس بنا پر سندھ کے حکمرانوں کو ان کی رعایا کی حمایت حاصل نہ تھی۔ جس کے بغیر دشمن کے خلاف لڑائیوں میں کامیابی

حاصل کرنا مشکل تھا اور راجہ داہر کو عربوں کے سامنے شکست کھانی پڑی۔[1]

اس قسم کے آثار و شواہد موجود ہیں کہ جب عرب مکران اور جھالاوان کے علاقے میں داخل ہوئے تو ان کا سابقہ یہاں کے باشندوں سے پڑا تھا جو ترک، جٹ اور مید تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے جھالاوان کو توران کا نام دیا جہاں ترکوں کا زور تھا اور یہ ترک بلا مبالغہ سفید ہون ہی تھے جن کی بہادری اور دلیری سے عرب بہت متاثر ہوئے تھے۔ بلوچستان کے قدیم باشندے جن کا ذکر یونانی مورخین نے اوریتائی اور گدروزیائی کے نام سے کیا تھا کا استحصال غالباً انہی سفید ہون اور جٹ قبائل کے ہاتھ سے ہوا تھا۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ یا تو جٹ آبادی میں مدغم ہو گئے یا پھر سندھ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔

بلوچستان میں ساکاؤں کا بہترین نمائندہ ساجدی قبیلہ ہے جو عرب دورِ اقتدار میں سیگتھائی سے بدل کر ساجدی ہو گیا تھا۔

عربوں کو جنوبی بلوچستان کا علاقہ فتح کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں بڑی قربانیاں دینی پڑیں۔ ان کے کئی فوجی سردار اور والی و عامل میدانِ جنگ میں کام آئے یا پھر بغاوتوں کا شکار ہو گئے ایک عرصہ دراز تک عربوں کو یہاں نظم و نسق قائم کرنے میں بہت کم کامیابی ہوئی تاآنکہ سندھ مکمل طور پر فتح ہونے کے بعد منصورہ ان کے مشرقی

---

[1] :۔ چاچ نامہ۔

مقبوضات کا صدر مقام بن گیا۔ چنانچہ عرب واقعہ نگاروں کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ عباسی خلیفہ المنصور کی خلافت کے دوران ۱۴۲ھ ہجری میں کنداییل میں جو بودھیہ کا صدر مقام تھا۔ بغاوت ہوئی جس کا سرغنہ ایک عرب تھا اور حشم بن عمرو نے جو سندھ کا گورنر تھا اس بغاوت کو فرو کر دیا۔ اسی طرح المعتصم باللہ کے عہد خلافت میں ۲۲۲ھ ہجری میں خضدار میں بغاوت ہوئی اور عامر بن موسیٰ نے جو سندھ کا گورنر تھا۔ کیکان کے جٹ باشندوں کو تہ تیغ کیا اور بغاوت فرو ہو گئی۔ اسی زمانہ میں کنداییل میں دوبارہ بغاوت ہوئی اور بڑی مشکل سے فرو کر دی گئی۔ یہی عامر تھے جن کے دور حکومت میں یہاں عربوں نے ایک بستی کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام البیضہ رکھا۔ جس کے معنی روشنی کے ہیں۔ یہ بستی خضدار کے نزدیک واقع تھی۔[۱]

عربوں کو جنوبی بلوچستان میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن شمالی بلوچستان کا معاملہ اس سے بھی کٹھن ثابت ہوا۔ اس زمانہ میں یہ علاقہ ایران کے صوبہ رخج کا حصہ تھا اور اس صوبے میں افغانستان کے جنوبی علاقے شامل تھے۔ یہی رخج کا صوبہ تھا جو بعد میں ولایت قندھار کے نام سے موسوم ہوا۔ زمانہ قدیم سے اس کا صدر مقام بست چلا آتا تھا جس کے کھنڈرات بھی دریائے ہلمند کے کنارے دریائے ارغنداب اور ہلمند کے سنگم پر موجود ہیں۔ ایران پر عرب حملوں کے زمانہ میں اس صوبے کا گورنر ملک سعد ژندپیل تھا اس نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی خاطر کابل کے

---

[۱] THE PATHAN - SIR OLAF CAROE.

ہند و حکمران کابل شاہ کی حمایت حاصل کر لی اور عربوں کے مقابلے پر ڈٹا رہا۔[1]

۶۵۰ء میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دورِ خلافت میں عبداللہ بن عمرو دشت لوط سے ہو کر خراسان میں داخل ہوا اور نیشا پور کو اپنا فوجی مستقر قرار دے کر ہرات، بلخ اور مرو پر کامیاب حملے کیے۔ اسی زمانہ میں ربیع بن زیاد نے سیستان پر فوج کشی کی اور رخج کو فتح کرنے کے بعد لبست کو اپنے فوجی مستقر یا چھاؤنی بنا دیا۔ امیر معاویہ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ربیع کی بجائے عبدالرحمٰن بن سمورہ ان مقبوضہ علاقوں کا گورنر بن گیا اور لبست ہی کو اپنا مرکز قرار دیا۔ اس نے زمینداور کو بھی فتح کر کے اس کو عرب مقبوضات میں شامل کر لیا۔ پہلے ربیع اور اس کے بعد ابن سمورہ نے جو اس کا جانشین بنا نہ صرف رخج پر اپنا تسلط قائم رکھا بلکہ کابل اور زابل پر کامیاب حملے کر کے ۴۳ھ ہجری (۶۶۳ء) میں ان علاقوں کو فتح کیا جو اس وقت کابل اور غزنی قلات غلزئی اور مکر کہلاتے ہیں۔

۴۶ھ ہجری (۶۶۷ء) میں ژندپیل اور کابل شاہ دونوں نے بغاوت کر دی۔ کابل اور زابل کے علاوہ رخج بھی عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور ملک سعد ژندپیل نے لبست پر قبضہ کر لیا۔ ابن زیاد نے اس کے خلاف دوبارہ فوج کشی کی اور دونوں فریق کے درمیان ایک زبردست لڑائی کے باوجود فقط ایک معاہدہ ہو سکا جس کی شرائط کے تحت ژندپیل

---

[1] THE PATHAN – SIR OLAF CAROE.

محض خراج دینے پر راضی ہوگیا۔ ایک مستند روایت کے مطابق عباد بن زیاد نے چاغی پر فوج کشی کی اور اس کے بعد توران اور قندھار تک جا نکلا۔ لیکن عرب تذکرہ نویسوں کی تحریروں سے یہ واضح نہیں ہے کہ توران اور قندھار سے مراد جھالاوان اور کندابیل ہے یا گندارا اور ترکستان، کیونکہ اس زمانہ میں قندہار کی موجودہ بستی کا وجود نہیں تھا۔ اس کی بجائے بست ہی جنوبی افغانستان اور شمالی بلوچستان پر مشتمل ایرانی صوبہ رخج کا صدر مقام تھا۔[1]

۶۸۵ء میں جب عبدالمالک بن مروان خلافت کے عہدے پر فائز تھا۔ ملک سعد ژندپیل نے دوبارہ سر اٹھایا۔ عربوں کے خلاف بغاوت کی اور خراج دینا بند کر دیا۔ وہ اس قدر طاقتور تھا کہ اس نے عرب سپہ سالار کو زرنج کے قلعہ میں مقید کر دیا۔ اس موقع پر فریقین میں جو لڑائی ہوئی اس میں ملک سعد ژندپیل خود مارا گیا اور اس کا بیٹا جو اسی ژندپیل کے لقب سے ملقب تھا اس کا جانشین بن گیا لیکن یہ ژندپیل ثانی اپنے باپ سے بھی زیادہ خطرناک اور دلیر ثابت ہوا۔ اس نے سیستان کے عرب گورنر کو لڑائی میں شکست دی جس کی وجہ سے خلیفہ عبدالمالک ناراض ہوگیا اور اس کو اس عہدے سے برطرف کر دیا۔

۷۹ ہجری (۶۹۸ء) میں عبیداللہ نے کابل پر چڑھائی کی لیکن کابل شاہ کے ہاتھ سے شکست کھائی اور شہید ہوگیا۔ دوسرے سال عبدالرحمن

لہ ۱۔ THE PATHAN - SIR OLAF CAROE.

بن محمد نے ژند پیل کے خلاف جو ملک سعد کا بیٹا تھا کچھ کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن اپنے گورنر حجاج کے ساتھ اس کا جھگڑا ہو گیا۔ اس نے بغاوت کر دی اور ژند پیل کے ہاں پناہ لی۔ حجاج کی خواہش پر ژند پیل نے اس کو قتل کر دیا۔ اگرچہ حجاج نے ژند پیل کو اپنے قابو میں رکھنے میں کسی قدر کامیابی حاصل کر لی۔ لیکن خلیفہ عبدالملک کی وفات کے بعد بنی امیہ کے اقتدار میں زوال کے آثار نمایاں ہوئے اور عربوں کا تسلط فقط بدنج تک محدود ہو گیا۔ بالآخر بنی عباس کے خلفا نے جن میں مامون الرشید زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ مشرقی ایران کے علاقوں پر تسلط قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس کے باوجود ژند پیل کے خاندان کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا اور صفراویوں کے عہد حکومت میں جا کر مشرقی ایران کے علاقے صحیح معنوں میں فتح ہوئے۔ [ٹ]

اس صورتِ حال کا یہ نتیجہ نکلا کہ بلوچستان کے اکثر علاقوں میں نہ شریعت کا پوری طرح نفاذ ہوا اور نہ اسلامی نکتہ نگاہ سے بڑے پیمانے پر کسی قسم کی اصلاحات نافذ ہو سکیں۔ یہاں زرعی پیداوار پر عشر کی بجائے ایرانیوں کا پرانا نظام مالگذاری بدستور قائم رہا۔ البتہ تمام بلوچستان میں مکران ہی وہ واحد علاقہ تھا جہاں بمرور زمانہ اسلامی معاشرہ قائم ہو سکا اور شریعت کے پوری طرح نفاذ کے ساتھ ساتھ زرعی پیداوار پر بھی عشر وصول کیا جانے لگا۔

ٹ:- THE PATHAN — SIR OLAF CAROE

آج بھی مکران میں اسلامی معاشرے کی چھاپ یہاں کی سوسائٹی اور مجلسی زندگی میں نمایاں ہے۔ اس علاقے میں میراث، حق مہر اور جہیز وغیرہ کے معاملات میں اس قسم کے دستور کی پابندی کی جاتی ہے جو عین شریعت کے مطابق ہے۔ یہاں کی سوسائٹی میں عورت کو جو مقام حاصل ہے اس کی مثال بلوچستان کے کسی دوسرے حصہ میں نہیں ملتی ہے۔ مکران میں عام دستور یہ ہے کہ عورت کو اس کا پورا حصہ اس کے باپ کی میراث میں ملتا ہے اور اس کا خاوند اپنے حصہ کی پوری جائداد حق مہر میں اس کے نام کر دیتا ہے۔ اس صورتِ حال کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ عورت اپنے خاوند کی محتاج نہیں رہتی ہے۔ بلکہ اس کا مرد اس بات پر مجبور ہے کہ عورت کی خوشنودی حاصل کرے۔

اس قسم کے آثار و شواہد دریافت ہوئے ہیں کہ بلوچستان میں آریوں کے مسلمہ حملوں سے پیشتر قحط اور خشک سالی کا ایک طویل دور شروع ہو گیا تھا کہ جس کا زور ایک طویل عرصہ تک نہ ٹوٹ سکا۔ اس طویل قحط اور خشک سالی نے زندگی کی اقتصادی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ جس کے نتیجہ میں یہاں کی گنجان آبادی میں زبردست کمی واقع ہوگئی۔ اکثر بڑی بڑی بستیاں اجڑ گئیں اور صدیوں تک ان کے دوبارہ آباد ہونے کی نوبت نہیں آئی اور یہاں کی ترقی یافتہ تانبہ اور کانسی کے عہد کی تہذیب یکا یک زوال سے دوچار ہوگئی۔ ایرانی دورِ اقتدار میں اگرچہ بلوچستان کے اندر ایک منظم حکومت قائم ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود یہاں کے اقتصادی وسائل پوری طرح بحال نہ

ہو سکے اور نہ یہاں کاریزوں کا کوئی ایسا جال بچھایا جا سکا کہ اس سے
یہاں کی آبادی میں اضافہ ہو سکتا۔ لیکن عربوں کے دور حکومت میں ظہور
اسلام کے بعد یہاں ایسے لوگ وارد ہوئے جو آبی وسائل کو ترقی دینے
کے فن میں بڑی مہارت رکھتے تھے جن کی کوششوں سے یہاں زراعت
کے معاملہ میں خاطر خواہ ترقی ہوئی اور آبادی میں بھی دوبارہ اضافہ ہو گیا
قدیم بستیوں کے نزدیک دوبارہ نئی بستیوں کی بنیاد پڑی اور رفتہ رفتہ
ان کی وسعت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ مکران کی اکثر کاریزوں کے متعلق روایات
مشہور ہیں کہ ان کی احداثی عربوں کے ہاتھ سے عمل میں آئی تھی۔ گمان ہے
کہ عربوں کے دورِ اقتدار میں بلوچستان کے گوشے گوشے میں نئی نئی کاریزیں
احداث کی گئیں۔ زراعت کو دوبارہ ترقی دی گئی اور ایک بار پھر زرخیز
اراضیات کے وسیع خطے زیر کاشت لائے گئے۔

سیاسی اور دینی انتشار

خلفائے راشدین، بنی امیہ اور بنی عباس کے دور خلافت میں
عربوں کے اندر زبردست دینی اور سیاسی انتشار پیدا ہو گیا تھا اور یہ انتشار
اس زمانے میں پیدا ہوا جبکہ عربوں نے عرب کی سرزمین سے باہر نکل کر
عجم کے وسیع ممالک پر اپنا اقتدار قائم کیا۔ غالباً اس زمانہ میں عربوں کی
پرانی عصبیت ایک دوسرے رنگ میں ابھر آئی تھی۔ خلیفہ ثالث حضرت
عثمان رضی اللہ عنہ پر اقربا پروری کا الزام لگایا گیا اور فتنہ پردازوں نے حق
و انصاف کے نام پر ان کو شہید کر دیا۔ اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہٗ

کو اس خونِ ناحق میں ملوث کر کے اندرونی خلفشار کی فضا پیدا کر دی گئی اور نوبت خانہ جنگی تک آئی اور بعد میں وہ بھی شہید کر دیئے گئے۔ اس کے بعد یزید کے ظلم و ستم کی وجہ سے کافی لوگ ہجرت کر کے ایران سے ہوتے ہوئے بلوچستان پہنچ گئے۔ عرب عراق اور خلیج فارس کے زبیریوں اور دمشق کے خلفائے بنی امیہ کے درمیان ایک زبردست کشمکش ہوئی۔ ادھر خوارج نے بھی سر اٹھایا اور خلفائے بنی امیہ کے ساتھ ساتھ زبیریوں کے خلاف بھی اپنی مہم تیز کر دی۔ ان سب نے ایک دوسرے کے خلاف لڑنا شروع کر دیا۔ ہر شخص دوسرے سے برسرِ پیکار تھا اور سب لوگ ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے تھے۔ خارجیوں اور زبیریوں نے اپنے اپنے علیحدہ خلفا بنی امیہ کے خلفا کے مقابلے میں کھڑے کیے۔ یہ لوگ کبھی ایک دوسرے کے خلاف لڑتے تھے اور کبھی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ اس کے نتیجہ میں اسلامی اقتدار کو وسعت دینے میں رکاوٹ پیدا ہو گئی اور مفتوحہ علاقوں کا نظم و نسق بھی درہم برہم ہو گیا "تا آنکہ خلیفہ عبدالملک خلافت کے عہدے پر فائز ہو گیا اور اس کے عہدِ حکومت میں حالات کسی قدر سدھر گئے لیکن یزید کے عہدِ حکومت میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ کربلا کے میدان میں اس کے حکم سے پیش آیا۔ اس واقعہ کے بعد یزید کے حکم سے اہل بیت اور طرفداران حق و انصاف پر جو ستم روا رکھے گئے اس کے نتیجے میں عراق سے مشرقی ایران اور کرمان کی طرف حضرت امام حسین کے طرفداروں کی ہجرت شروع ہوئی اور اس سانحہ عظیم کے اثرات ایک عرصہ دراز تک باقی رہے جن کی وجہ سے خلفاء بنی امیہ کو زبردست مشکلات

کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مہاجر زیادہ تر کوفیوں پر مشتمل تھے جنہوں نے حضرت امام حسین کو یزید کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب دی تھی۔ اور واقعہ کربلا کے وقت ان کے ساتھ غداری کی اور ان کی اعانت کرنے سے گریز کیا تھا۔ اب اس واقعہ کے تین سال بعد یہ لوگ کثیر تعداد میں کربلا کے میدان میں جمع ہو گئے اور وہاں سے دمشق کا رُخ کیا۔ اس وقت یزید فوت ہو چکا تھا اور خلافت کی باگ ڈور مروان بن حکم کے ہاتھ میں تھی۔ مروان نے بیس ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج تیار کر کے ان کے مقابلے پر روانہ کی اور لڑائی کے دوران کوفیوں کو شکست ہو گئی اور وہ منتشر ہو گئے اس کے بعد المختار اور ابراہیم بن الاشتر نے مل کر خاندان بنی امیہ کے اقتدار کے خلاف مسلح جدوجہد جاری رکھی لیکن انہوں نے بھی کوفہ کے نزدیک شکست کھائی ان متواتر شکستوں کے بعد جب کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تو بہت سے کوفی عرب جن میں کچھ شامی عرب بھی تھے اپنی جان بچانے کی خاطر عراق سے بھاگ نکلے اور زیادہ تر کرمان کا رخ کیا جو اس زمانہ میں خوارج کا گڑھ تھا۔ اسی طرح بنی ابو علی بھی نجد سے ہجرت اختیار کر کے عمان میں ان کے ساتھ شامل ہو کر کرمان میں وارد ہوئے۔ یہ نجدی حضرت علی کرم اللہ وجہٗ اور امیر معاویہ کی کشمکش کے دوران حضرت علی کے طرفدار بن گئے تھے۔ بنی آزاد کا قبیلہ بھی ان سے چند سال پیشتر کرمان اور سرحد کے درمیان انہی حالات کی بنا پر اپنے اصلی وطن سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہو گیا تھا۔[۱]

۱:- THE PATHAN - SIR OLAF CAROE

خارجی تحریک کی ابتدا حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے زمانہ میں ہوئی۔ یہ لوگ شروع میں ان کے طرفدار تھے لیکن بعد میں ان کے خلاف ہو گئے اور حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے انہی کے ہاتھ سے جام شہادت نوش کیا۔ یہ لوگ ایک سچے امیر کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے اور حضرت علی کو اپنے درمیان پاکر بھی ان کی بلند پایہ شخصیت کو پا نہ سکے۔ بعینہٖ ایسا ہی جیسا کہ کچھ لوگ اندھیرے میں بھٹک کر چراغ کی تلاش میں سرگرداں پھرتے ہوں اور جب انہیں چراغ مل جائے تو وہ اس کی روشنی سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ بصیرت کی یہی کمی تھی کہ جس کی وجہ سے افتراق کے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔[۱]

خارجی تحریک کی بنیاد قرآنی اساسیات پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ سنت اور فقہ پر اعتماد نہیں رکھتے تھے۔ اسی لیے سنی اور شیعہ دونوں فرقوں کے خلاف تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے بہت سے دوسرے اصول بھی وضع کیے جن میں خلافت و امارت کا معیار ذاتی اوصافِ حمیدہ اور ذاتی قابلیت کو قرار دیا اور اپنے اصولوں میں لاحکم الا اللہ کا نعرہ بھی شامل کر لیا۔ وہ پہاڑوں اور صحراؤں میں گروہ در گروہ رہتے تھے اور اپنا خلیفہ خود مقرر کرتے تھے۔ انہوں نے خلفائے بنی عباس کے دورِ اقتدار میں کئی بار سرکاری فوجوں کے خلاف جنگ کر کے ان کو شکست دی۔ ان خارجیوں کی طاقت کا یہ حال تھا کہ بنی عباس کے خلفا کے عرب گورنروں نے مشرقی ایران میں فقط فوج کے بل بوتے پر امن و امان قائم کیا ہوا تھا اور فوجی طاقت کے مظاہرے کے

---

[۱] THE PATHAN — SIR OLAF CAROE.

بغیر نظم ونسق کا قیام ان علاقوں میں ان کے لیئے ایک مشکل امر بن گیا تھا۔[۱]

سیستان میں اس تحریک نے ایک قومی تحریک کی صورت میں مقبولیت حاصل کر لی تھی اور مالیہ کی وصولی میں رکاوٹ پیدا کر کے عرب اقتدار کو کمزور کرنے میں یہ تحریک ایک بہت بڑا ذریعہ بن گئی اور حکومت کے خلاف خارجیوں کی سرگرمیوں کو عام لوگ ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔[۲]

خارجیوں نے سیستان سے کر مکران تک ساحلی علاقوں پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ ان کی معاندانہ سرگرمیوں سے حالات اس قدر نازک صورت اختیار کر گئے کہ سنہ ۱۸۰ ہجری میں خارجیوں کے امیر حمزہ نے خلفائے بنی امیہ کی فوج کو صرف چھاؤنیوں میں مقیم رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔[۳]

امیر حمزہ نے مالیہ کی عام معافی کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ مالیہ وصول کرنے والے بہت سے افسروں اور کارندوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ان واقعات سے بغداد کو مالیہ ادا کرنے کا دستور ختم ہو گیا۔ ان واقعات کے بعد خلیفہ ہارون الرشید نے حمزہ کو ایک خط لکھا جس میں اس کو ان کارروائیوں پر ملامت کی گئی تھی۔ امیر حمزہ نے اگرچہ اس خط کا جواب نرم لہجہ میں دیا لیکن اپنے موقف کی تائید میں لاحکم الا اللہ کا جملہ بھی درج کر دیا۔[۴]

خارجیوں کی سرگرمیاں دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ تاریخ حدود عالم کے علاوہ تاریخ سیستان مطبوعہ تہران ۱۹۳۰ء سے ثابت ہے کہ حمزہ نے گردیز کا قصبہ بھی بسایا تھا جو افغانی علاقوں کی وادی زرمات میں واقع ہے

۱، ۲، ۳، ۴ :- THE PATHAN _ SIR OLAF CAROE

اسی زمانہ میں اس کے باشندے خارجی تھے. اس سے ظاہر ہے کہ حمزہ کا اقتدار دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔[1]

دوسری صدی ہجری میں خارجی سرگرمیوں کی وجہ سے انتظام حکومت اس حد تک کمزور ہو گیا تھا کہ اب خلفائے بغداد کے لیے مشرقی ایران کے علاقوں میں کوئی جاذبیت باقی نہ رہی تھی اور یہ علاقے دارالخلافہ کے لیے بیرونی چوکیوں یا چھاؤنیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے۔ زُنبیل کا خاندان بست سے مشرق کی طرف تمام علاقوں پر بدستور قابض تھا۔ وہ اور کابل شاہ کبھی کبھار خراج ضرور دیتے تھے لیکن عملی طور پر ان کی حیثیت آزاد اور خودمختار حکمرانوں کی تھی۔[2]

---

[1]:- THE PATHAN - SIR OLAF CAROE

[2]:- ABID.

بارھواں باب

صفراوی خاندان

۲۴۷ سنہ ہجری (۸۶۱ء) میں امیر یعقوب بن لیث سیستان کی امارت پر فائز ہوا اور خلیفہ وقت موفق باللہ نے امیر سیستان کی حیثیت سے اس کو تسلیم کر لیا۔ یہ ایک غریب ایرانی نژاد خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ایران میں ساسانی خاندان کے اقتدار کے خاتمہ کے بعد یہ پہلا ایرانی تھا جو ایران میں برسر اقتدار آیا اسی زمانہ میں ماوراء النہر کے علاقہ میں ایک اور خاندان بھی برسر اقتدار تھا جو ایرانی النسل تھا اور یہ سامانی شہزادے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اختتام پر عرب فاتحین کا وہ طوفان تھم چکا تھا۔ جس کا مظاہرہ اس سے پہلے کیا جاتا تھا۔ بحیثیت فاتح اب وہ آگے بڑھنے کی طاقت اور صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ خلفائے عباسیہ کے آخری دور میں فتوحات حاصل کرنا تو کجا، مفتوحہ علاقوں کو قابو میں رکھنا بھی عربوں کے لئے مشکل ہو گیا تھا۔ اسی لئے سیاسی اقتدار اب ایسے ہاتھوں میں منتقل ہونا شروع ہو گیا۔ جو ایرانی نژاد تھے۔ یہی لوگ ایران اور اس کے مشرقی ممالک میں نظم و نسق قائم رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ خلیفہ وقت کی بالادستی برائے نام رہ گئی تھی۔

امیر یعقوب بن لیث سیستان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ ابتداء میں اس کا تعلق مسگری کے پیشہ سے تھا۔ اس کے بعد وہ لوٹ مار کرنے والے ڈاکوؤں اور قزاقوں کے گروہ میں شامل ہوگیا۔ اس دوران اس کی سپاہیانہ صلاحیت اجاگر ہوئی۔ اس نے اس پیشے کو ترک کرکے صالح بن النصر امیر سیستان کے ہاں ملازمت اختیار کرلی۔ جو خارجیوں کے خلاف کئی مہمات میں حصہ لینے کی وجہ سے خلفائے عباسیہ کی نظروں میں بڑا مقبول ہوگیا تھا۔ اس ملازمت کے دوران امیر یعقوب کے جوہر بھی خوب آشکارا ہوگئے۔ وہ ترقی کرکے امیر سیستان النصر کی فوجوں کا سپاہ سالار بن گیا۔ النصر کی وفات کے بعد اس کا بھائی امیر یعقوب کے حق میں سیستان کی امارت سے دست بردار ہوگیا۔ اس نے چھ سال تک النصر کی فوج میں زبردست خدمات سرانجام دیں اور خصوصاً خارجیوں کے خلاف اس کے کارناموں کی وجہ سے اس کو خلفائے عباسیہ کی تائید حاصل ہوگئی۔[1]

اپنے دور حکومت میں امیر یعقوب نے سیستان کے صدر مقام زرنج سے سب سے پہلے خارجیوں کے خلاف اپنی مہمات کا آغاز کیا اور خارجیوں کو شکست دے کر ان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اس سے اس کے حوصلے بڑھ گئے۔ اب اس نے اپنی توجہ حاکم الرخاج (ارخج) اور کابل شاہ کی طرف مبذول کرکے ان کے خلاف فوج کشی کی اور ان کی طاقت کا خاتمہ کر دیا اور ان کے بہت سے علاقے اپنے قبضہ میں کر لئے۔ غزنی کے قصبہ کی بنیاد اسی

---

[1] SEISTAN — G.P. TATE.

نے رکھی ۔ ۲۵۶ھ ہجری (۸۷۰ء) میں اس نے کابل پر قبضہ کر لیا اور خلیفہ کے پاس بغداد میں بہت سا مالِ غنیمت بطور تحفہ بھیج دیا۔ ان تحائف میں ایک بیش قیمت بت بھی تھا۔ جو اس نے بامیان کے ایک بڑے بت خانہ سے حاصل کیا تھا۔[۱]

۲۵۹ھ ہجری (۸۷۲ء) میں اس نے کوہ ہندوکش کو عبور کر کے ماوراالنہر کے علاقوں کی طرف ایک زبردست فوجی مہم بھیج کر بلخ پر قبضہ کر لیا۔ وہاں سے واپسی پر اس نے نیشاپور میں خاندان طاہری کا خاتمہ کر دیا۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایرانی حکمران نے ایران کے تمام مشرقی ممالک پر اسلام کا پرچم لہرانے میں پوری طرح کامیابی حاصل کر لی۔[۲] اور اسلام کا وہ مشن پورا کر دیا جس کی ابتدا عربوں نے کی تھی۔ لیکن اندرونی خلفشار کی وجہ سے وہ اس مشن کو مکمل کرنے سے قاصر ہو گئے تھے۔ اس نے پندرہ سال کے قلیل عرصہ میں عراق سے لے کر سندھ تک کے تمام ممالک پر اسلامی تسلط قائم کر دیا اور اسلام کو ایران کے مشرقی ممالک میں اسی کے زمانہ میں فروغ حاصل ہو گیا۔ امیر یعقوب نے ۲۶۶ھ ہجری (۸۷۹ء) میں وفات پائی۔[۳]

امیر یعقوب کی وفات کے بعد اس کا بھائی عمرو بن لیث سیستان کی امارت پر فائز ہو گیا۔ وہ کچھ زیادہ قابلیت کا مالک نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ کابل کے علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ سندھ الرخاج اور مکران و توران (جھالاوان)

ف۱:- SEISTAN _ G. P. TATE

ف۲:- ABID.

ف۳:- ABID.

پر اس کا تسلط برائے نام تھا اور یہ بھی وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ڈھیلا پڑتا گیا۔ فقط سیستان اور فارس کے علاقے اس کے قبضے میں تھے۔ اس کے عہد میں کوئی قابلِ قدر واقعہ پیش نہیں آیا۔ سوائے اس کے کہ امیر خراسان رافع بن ہرثمہ کے ساتھ اس کی لڑائیاں ہوئیں اور ایک موقعہ پر وہ عمرو لیث کے ہاتھ سے مارا گیا۔ عمرو لیث نے اس کا سر بارگاہِ خلافت میں بھیج دیا۔ لیکن اس کے باوجود خلیفہ المعتضد باللہ اس سے ناخوش رہتا تھا۔ خود خلیفہ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اس کو سیستان کی امارت سے ہٹا سکتا۔ البتہ خلیفہ ماوراالنہر کے حکمران اسمٰعیل سامانی اور عمرو لیث کو ایک دوسرے کے خلاف اکسانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ خلیفہ کی اس چال کے اسباب عمرو لیث نے خود فراہم کئے کہ بلخ پر اپنا حق جتاتا تھا کہ یہ بھی امیر یعقوب کے مقبوضات میں شامل تھا۔ [۱]

ادھر خلیفہ کی حالت یہ تھی کہ وہ بظاہر عمرو لیث کا قبضہ و اختیار فارس سیستان، خراسان، اصفہان، کرمان، زرنج، مکران اور سندھ پر تسلیم کرتا تھا۔ اس نے اس موقع پر عمرو بن لیث کے پاس ایک امتیازی پرچم بھی بھیج دیا اور وہ اس پرچم کو زرنج کے قلعہ پر تین دن تک لہراتا رہا تاکہ ارد گرد کے لوگوں میں اس کی امتیازی شان کا مظاہرہ ہو سکے اور ان کو یہ بھی معلوم ہو کہ اسے خلیفہ بغداد کے ہاں کتنی مقبولیت حاصل ہے۔ [۲]

۱:- SEISTAN - G.P. TATE.

۲:- ABID

اس پرچم کی وجہ سے اس کا گھمنڈ اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس نے ۲۸۷ھ ہجری (۹۰۰ء) میں کوہ ہندوکش کے شمالی علاقوں پر چڑھائی کی جو سامانی خاندان کے حکمرانوں کے زیر فرمان تھے۔ اسماعیل سامانی نے اس موقعہ پر اس کو بلخ میں زبردست شکست دی اور اس کو گرفتار کر کے پابجولاں خلیفہ کے پاس بغداد بھیجدیا۔ خلیفہ نے اس کو قید خانہ میں رکھا اور قید خانہ ہی میں اس کی وفات ہوگئی۔

سیستان کے علاوہ صفاری خاندان کے دوسرے مقبوضات پر بھی جن میں رخج فارس خراسان، کرمان، مکران اور سندھ وغیرہ شامل تھے۔ سامانیوں کا قبضہ ہوگیا۔ ان کے مملوک غزنی کو صدر مقام بنا کر یہیں سے ان ممالک پر حکومت کرنے لگے جو عمرو لیث کی شکست کے بعد سامانیوں کے زیر اقتدار آ گئے تھے۔[۱] ۳۹۵ھ ہجری (۱۰۰۴ء) میں سامانی خاندان کا آخری حکمران ابوابراہیم ترکمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوا اور اس کے قتل کے ساتھ اس خاندان کا بھی خاتمہ ہوگیا۔[۲]

دسویں صدی کے تذکرہ نویسوں نے اپنی تحریروں میں مکران اور توران (جھالاوان) کا بھی ذکر کیا ہے۔ ابن حوقل (۹۴۳ء) کی روایت ہے کہ اس کے زمانہ میں مکران کا والی معادن تھا جو ایک عرب خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی زمانہ میں خضدار کا حاکم معین بن احمد تھا جو کبرکانان (کیکانان) میں سکونت رکھتا تھا۔ ابن حوقل کے مطابق خضدار ایک بڑا شہر تھا جس کے اردگرد کئی

ف ۱۔ SEISTAN - G.P. TATE

ف ۲۔ ABID

بستیاں واقع تھیں۔ خضدار میں انگور، انار اور کھجور بکثرت پیدا ہوتی تھیں۔ کبر کانان میں زندگی کی ضروریات بہت سستی تھیں۔ وہاں انگور اور انار کے علاوہ دوسرے میوہ جات بھی بکثرت دستیاب تھے لیکن کھجور نہیں پیدا ہوتی تھی۔ ابنِ حوقل کے مطابق توران کا سب سے بڑا شہر خضدار تھا اور خطبہ فقط خلیفہ کے نام کا پڑھا جاتا تھا۔ المقدسی (۳۷۵ھ ہجری) کی روایت ہے کہ اس کے زمانہ میں خضدار کا حاکم ابوالقاسم البصری تھا۔ جو ایک عرب خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ قودھیہ کا علاقہ بھی اس کے زیر فرمان تھا جس کا صدر مقام کندابیل تھا۔

۹۳۲ء میں علی بن بواویہ دیلمی کو جو ایک ایرانی ماہی گیر خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ طبرستان کے حکمران مرداویج بن زیار کی جانب سے کراج کا گورنر مقرر کیا گیا جو ہمدان کے صوبے کا ایک ضلع تھا۔ اس نے اپنے بھائی احمد کی مدد سے اپنی طاقت جنوب کی طرف فارس تک بڑھا کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اسی موقع پر اس کے بھائی احمد نے سرجان فتح کرنے کے بعد کرمان پر چڑھائی کی جو ان دنوں محمد بن الیاس عرف ابو علی نامی ایک ڈاکو کے قبضہ میں تھا۔ اس شخص نے اہل بواویہ کے لئے بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ وہ محصور ہونے کے بعد دن کے وقت لڑائی جاری رکھتا تھا اور رات کے وقت اپنے قاصد احمد کے پاس بھیج کر صلح کی پیش کش کیا کرتا تھا۔ آخر کار احمد نے اس شرط پر اس سے صلح کر لی کہ وہ دیلمیوں کو باقاعدہ خراج دیا کرے گا۔ ابو علی نے یہ شرط قبول کر لی۔ اور اہلِ بواویہ کا باجگذار بن گیا۔ ۹۳۴ء میں کرمان کے معاملات سے فارغ ہونے کے بعد احمد فارس میں جا کر اپنے بھائی علی سے ملا اور

دونوں نے مل کر فارس پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے کرمان پر بھی اپنی بالادستی قائم کر لی اور مکران پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔[1]

اس زمانہ میں عراق پر بھی ان کا اقتدار قائم تھا۔ اور خلیفہ بغداد ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا اور عملی طور پر آلِ بویہ کی مرضی ہی سے خلافت کے امور سرانجام پاتے تھے۔[2]

---

[1] :- تاریخ ایران۔ قزوینی

[2] :- ایضاً

تیرھواں باب

سلاطین غزنی

۹۰۰ء میں جب عمرو بن لیث کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تو اس کے مقبوضات سامانی خاندان کے حکمرانوں کے قبضہ و اختیار میں چلے گئے جن کا اپنا دارالخلافہ بلخ میں تھا۔ انہوں نے ان مقبوضات کے لئے جو صفاری خاندان کے خاتمہ کے بعد حاصل ہوئے تھے غزنی کو صدر مقام بنایا جس کی بنیاد امیر یعقوب صفاری نے رکھی تھی اور ان کے مملوک ہی غزنی میں قیام کرکے ان مقبوضات کے نظم ونسق اور انتظام کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ یہ مملوک جنگی قیدی تھے جن کو کھلی منڈیوں میں خریدا گیا تھا۔ بلحاظ نسل وہ ترک تھے سامانیوں نے ان کی فوجی اور انتظامی قابلیت کے پیشِ نظر ان کو آزاد کرکے فوجی اور انتظامی خدمات سرانجام دینے کے لئے اپنے صوبجات کے صدر مقامات پر متعین کر رکھا تھا۔[1]

۹۵۰ء کے بعد سامانی حکمرانوں کی جانب سے صوبہ غزنی اور اس کی متعلقہ ولایات پر ترک مملوک بطور والی مقرر تھے۔ یہاں الپتگین بلکتگین

---

[1] - THE PATHAN - SIR OLAF CAROE.

اور پیرائے یکے بعد دیگرے گورنر مقرر ہوئے۔ ان میں پیرائے بڑی کمزور شخصیت کا مالک تھا۔ اس سے کئی غلطیاں سرزد ہوئیں جن کی وجہ سے غزنی اور اس سے متعلقہ دوسری ولایات کے نظم و نسق پر برا اثر پڑا۔ اس زمانے میں سبکتگین نے جو الپتگین کا غلام اور اس کا داماد تھا بڑی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اس نے سیاسی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کر کے اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ اسی وجہ سے اس کو سامانی حکمرانوں کی تائید بھی حاصل ہو گئی۔ وہ پیرائے کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر غزنی کا والی بن گیا۔ اگرچہ یہ تقرری قاعدہ کے مطابق نہ تھی۔ لیکن ماوراالنہر کے سامانی خاندان کا اقتدار بھی زوال پذیر تھا۔ ان کیلئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں تھا کہ وہ سبکتگین کی خود ساختہ تقرری پر مہر تصدیق ثبت کر دیں۔[1]

سبکتگین بلا کی فوجی اور انتظامی قابلیت کا مالک تھا۔ اس کی فوج افغان تاجک اور غلزئیوں پر مشتمل تھی۔ اس نے چن چن کر سپاہی اور فوجی منصبدار رکھے ہوئے تھے۔ اس نے سب سے پہلے وادی کابل اور اس کے مشرقی علاقوں وادی پشاور کے راجپوت حکمرانوں کے خلاف اقدام کر کے ان علاقوں سے ان کو باہر نکالنے کی کوشش کی اور راجہ راجیہ پال کو جو تاریخ میں غلطی سے راجہ جے پال کے نام سے مشہور ہے۔ لغمان اور ننگر ہار کے مقامات پر شکست دی۔ ان لڑائیوں میں بہت زیادہ مال غنیمت۔ فوجی ہتھیار اور سینکڑوں ہاتھی اس کے ہاتھ لگے۔ ان فتوحات سے اس کی فوجی طاقت اور زیادہ بڑھ گئی اور

ف ۱- THE PATHAN - SIR OLAF CAROE.

اس کا حوصلہ بھی بہت بڑھ گیا۔[1]

۹۷۷ء میں سبکتگین بست پر قبضہ کرنے کے بعد جس میں بیلوس یا الرخاج کا تمام علاقہ شامل تھا۔ خضدار پر حملہ آور ہوا اور خضدار کے مسلمان حکمران کو جو عرصے سے خود مختار چلا آتا تھا خراج دینے پر مجبور کر دیا۔ سبکتگین نے ۹۹۷ء میں وفات پائی۔[2]

سبکتگین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل غزنی کے تخت پر بیٹھا لیکن وہ بڑی کمزور شخصیت کا مالک تھا۔ دو سال بعد اس کے چھوٹے بھائی محمود نے اس کو معزول کر کے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ وہ سبکتگین سے بھی زیادہ قابل ثابت ہوا۔ اس نے نہ صرف وادی کابل اور وادی پشاور سے راجپوتوں کے بچے کھچے اقتدار کا خاتمہ کر دیا بلکہ شمالی ہندوستان پر بھی کئی حملے کیے اور وہاں بھی راجپوت حکمرانوں کو شکست فاش دی۔ اس کو ہندوستان سے مال غنیمت سونا چاندی اور جواہرات وغیرہ کی صورت میں بہت زیادہ مقدار میں ہاتھ آیا اور غزنی میں دولت کے انبار لگ گئے اس کے بعد اس نے مغرب میں ایران، شمال میں بلخ و بخارا، مشرق میں پنجاب، وادی پشاور اور سندھ پر کئی حملے کیے۔ ان حملوں کے دوران وہ بہت کچھ مال غنیمت اور دولت جمع کر کے غزنی لوٹ آیا۔ ان فوجی کارروائیوں کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے ۹۹۹ء اور ۱۰۲۶ء کے درمیان شمالی

---

[1] THE PATHAN- SIR OLAF CAROE.

[2] NOTES ON AFGHANISTAN AND BALUCHISTAN - RAVERTY

ہندوستان پر سترہ دفعہ فوج کشی کی اور ہر بار کامیابی نے اس کے پاؤں چومے[1]
بیہقی اور جامع التواریخ دونوں کا بیان ہے کہ سلطان محمود نے ایلک
خان اور ترکوں کے ساتھ اپنے معاملات نمٹانے کے بعد خضدار پر فوج کشی کرنے
کا فیصلہ کیا جس کے حاکم نے سلطان محمود کی اطاعت سے منہ موڑ کر خراج دینا
بند کر دیا تھا اس نے اگرچہ ہرات جانے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن غزنی سے روانہ
ہو کر وہ سیدھا بست پہنچا اور وہاں سے بڑی تیزی کے ساتھ رات دن سفر
کرتے ہوئے اچانک خضدار میں نمودار ہوا۔ خضدار کے والی کو اس اچانک
حملے کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ وہ گھبرا گیا اس نے فوراً اطاعت قبول کر لی
اور پانچ لاکھ درہم خراج کے بقایا کے طور پر بھی ادا کر دیئے اور محمود کو پندرہ
ہاتھی بھی پیش کش کے طور پر دیئے۔ سلطان نے اس کو ماتحت حاکم کی حیثیت
سے اس کے عہدے پر برقرار رکھا۔[2]

۹۹۹ء میں محمود نے نیشاپور پر حملہ بول دیا اور کسی مزاحمت کے
بغیر اس پر قابض ہو گیا اور سامانیوں کا مملوک باق توزون وہاں سے بھاگ
نکلا۔ اس کے بعد اس نے سامانیوں کے آخری شہزادے کو میدان جنگ میں
شکست دے کر بلخ پر قبضہ کر لیا۔ اس فتح کے بعد محمود اور ایلک خان کے درمیان
اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی جو کاراخانی ترکمانوں کا قائد تھا اور جس نے سامانیوں
کے زوال کے بعد ماوراالنہر کے علاقوں پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ محمود کاراخانی

---

[1] THE PATHAN - SIR OLAF CAROE

[2] RAVERTY - NOTES ON AFGHANISTAN AND BALUCHISTAN.

ترکمانوں کو شکست دے کر بلخ اور بخارا پر قابض ہو گیا۔[1]

سیستان میں سامانیوں کے ہاتھ سے اگرچہ صفراوی خاندان کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ لیکن امیر ابوالحسن سامانی نے لیث کے پڑپوتے احمد بن محمد کو سیستان کی امارت پر فائز کر دیا تھا۔ احمد کے بعد اس کا بیٹا خلف سیستان کے صوبے کا امیر بنا۔ ۱۰۰۰ء میں اس نے اپنی حکومت کو وسعت دینے کی کوشش کی جس کی وجہ سے محمود کے ساتھ اس کی ٹکر ہو گئی اور محمود نے طاق کے قلعہ میں اس کو محصور کر لیا۔ اس نے محمود کی اطاعت قبول کر لی ۱۰۱۳ء میں خلف اپنے بیٹے کے حق میں سیستان کی امارت سے دست بردار ہو گیا۔ لیکن جلد ہی پشیمان ہوا اور سیستان کی عنانِ حکومت دوبارہ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا جس کی وجہ سے اہلِ سیستان اور خصوصیت کے ساتھ اس کے اپنے عزیز و اقربا اس کے خلاف ہو گئے اس موقعہ پر محمود نے سیستان پر چڑھائی کی اور خلف نے دوبارہ اپنے آپ کو طاق کے قلعہ میں محصور کر لیا۔ ایک طویل محاصرہ کے بعد اس نے اپنے آپ کو محمود کے حوالے کر دیا۔ جب وہ محمود کے سامنے پیش ہوا تو وہ سلطان کہہ کر اس سے مخاطب ہوا۔ اس خطاب سے محمود اس قدر خوش ہوا کہ اس نے خلف کی جان بخشی کر دی۔ اسی خطاب کی وجہ سے اس نے سلطان محمود غزنوی کے نام سے شہرت پائی۔[2]

ھ [1]۔ RAVERTY - NOTES ON AFGHANITAN AND BALUCHISTAN.

ھ [2]۔ SEISTAN - G.P. TATE.

۱۰۲۱ء میں مکران کا والی معادن فوت ہو گیا۔ اس کے دونوں بیٹوں عیسیٰ اور ابو عسکر کے درمیان اپنے باپ کی وراثت پر جھگڑا پیدا ہو گیا۔ اہل زراعت اور جنگی صلاحیت رکھنے والے طبقے عیسیٰ کے حق میں تھے۔ ابو عسکر سیستان چلا گیا جہاں سلطان محمود کے مفادات کے نگران اعلیٰ خواجہ ابو نصیر خافی نے اس کو اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ اس موقعہ پر سلطان محمود سومنات کی مہم میں مصروف تھا۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ غزنی پہنچا تو اس نے ابو عسکر کو سیستان سے بلا کر اپنے دربار میں رکھا۔ اس سے عیسیٰ بن معادن کو بڑی تشویش لاحق ہوئی۔ اس نے ایک وفد مکران کے قاضی کی قیادت میں سلطان کے دربار میں غزنی بھیجا۔ اس وفد میں اہلِ زراعت کے نمائندوں کے علاوہ کئی روسا مذہبی زعما اور دوسرے شرفا شامل تھے۔ اس نے سلطان کی خدمت میں ایک عرضداشت بھی بھیجی اور اس میں لکھا کہ میں اپنے باپ کا قانونی اور شرعی وارث ہوں۔ اگر میرا بھائی غدار اور میرا دشمن نہ ہوتا تو میں اس کو کسی صورت میں اپنے باپ کی وراثت سے محروم نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر سلطان مجھ کو مکران کا والی تسلیم کر لے تو میں اتنا خراج دینے کے لئے تیار ہوں جتنا کہ سلطان مناسب خیال کر کے مقرر کرے۔ سلطان نے اس کی درخواست منظور کر لی اور اس کو مکران کا والی تسلیم کر لیا اور مکران کا وفد جو ہر طبقہ کے معززین پر مشتمل تھا کامیابی کے ساتھ واپس مکران لوٹ گیا۔ ابو عسکر بدستور غزنی میں ٹھہرا رہا۔[۱]

---

[۱] :- SEISTAN_ G.P.TATE.

محمود کی زندگی کے آخری ایام میں اس کی سلطنت بہت وسیع ہو گئی تھی مغرب میں ایران کا علاقہ عراق کی حدود تک اس کے قبضہ و اختیار میں تھا۔ مشرق میں سیستان، پنجاب، ملتان، بلوچستان، سندھ، ولایت رخج، کابل غزنی اور وادی پشاور اس کے تسلط میں تھے۔ شمال میں بلخ دکنارا کا علاقہ اس کے زیر فرمان تھا اور جنوب میں مکران کے ساحل تک اس کا ہی پرچم لہراتا تھا۔ [1]

سلطان محمود کو دولت جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ غزنی میں اسی دولت کے بل بوتے پر اس نے بیشمار عمارتیں تعمیر کیں اور ان خوبصورت عمارات مسجدوں، بازاروں اور کاروباری دکانوں کی وجہ سے غزنی کی رونق میں چار چاند لگ گئے اور وہ عروس البلاد بن گیا۔ سلطان محمود نے ۱۰۳۰ء میں وفات پائی۔

سلطان محمود کے دربار کی شان و شوکت کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اس کے دربار میں علما فضلا، حکما اور شعرا کا ہر وقت جمگھٹا رہتا تھا۔ وہ خود علوم و فنون کا دلدادہ اور علما و فضلا کا بڑا قدردان تھا اور ان کی سرپرستی کیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے بہت سے ہنرمند اور باکمال لوگ اس کے دربار سے وابستہ رہتے تھے ان میں ابوالقاسم فردوسی زیادہ شہرت کا مالک بنا اس نے شاہنامہ کی منظوم رزمیہ داستان سلطان ہی کی خواہش پر لکھی۔ فردوسی کو تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔ [1]

---

[1] THE PATHAN - SIR OZAF CAROE

وہ عرب کے مقابلے میں عجم کے لوگوں کی صلاحیتوں، ان کی درخشندہ روایات قدیم بادشاہوں کی شان و شوکت اور عجمیوں کی جنگجویانہ صلاحیتوں کا قائل تھا وہ شہنشاہان ایران کے کارناموں کو اجاگر کر کے ثابت کرنا چاہتا تھا کہ تہذیب و تمدن، سیاست اور علوم و فنون کے معاملے میں عجم کے لوگ عرب پر فوقیت رکھتے تھے۔ یزدگرد کی زبانی اپنے اشعار میں اس نے عربوں کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس سے اس کے جذبہ قوم پرستی کی ایک جھلک نمایاں ہے

ز شیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائے رسید ست کار
کہ تخت کیان را کند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

اس پر طرہ یہ کہ اس نے اپنی یہ منظوم داستان ٹھیٹھ فارسی میں لکھی اور عربی کا ایک لفظ بھی استعمال نہ کیا۔ اس قسم کے خیالات کی وجہ سے دربار کے بعض مذہبی لوگوں نے اس پہ غیر مسلموں کی تعریف و توصیف کا الزام لگایا اور اس سے محمود کو بدظن کر دیا۔ سلطان نے اس سے یہ منظوم داستان لکھنے کے لئے جو صلہ دینے کا وعدہ کیا تھا اس سے پھر گیا اور فردوسی نے ناراض ہو کر جو ہجو قلمبند کی اس سے سلطان محمود کی شہرت کو بڑا دھچکا لگا۔ سلطان کو اس وقت پشیمانی ہوئی جبکہ فردوسی دم توڑ چکا تھا۔

اگر شاہ را شاہ بودے پدر

نہادے مرا تاج زریں بسر

اگر مادرے شاہ بانو بودے

مرا سیم وزر تابہ زانو بودے

سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان مسعود اس کے تاج وتخت کا وارث بنا۔ سلطان محمود نے ۳۴ سال تک حکومت کی لیکن اس کے جانشین اس کی مملکت کو دس سال تک بھی قائم نہ رکھ سکے۔ سلطان مسعود نے ہندوستان کے مقبوضات پر اپنا تسلط قائم رکھا لیکن اس میں وہ فوجی اور انتظامی صلاحیت مفقود تھی۔ جو اس کے باپ کے حصے میں آئی تھی۔ اس کمزوری کے نتیجے میں ہر طرف بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور افراتفری پھیلنے لگی۔ مسعود کا اکثر وقت ان بغاوتوں کو فرو کرنے میں گذرا۔[لہ]

تاریخ بیہقی کے مطابق یہ باغیانہ سرگرمیاں اس وقت شروع ہوئیں جب سلطان مسعود ایک مہم پر رے کی طرف گیا ہوا تھا۔ عیسیٰ بن معاون والی مکران ان ماتحت حکمرانوں اور گورنروں میں سے ایک تھا جو باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ سلطان مسعود نے اس کو ہٹا کر اس کے بھائی ابو عسکر کو مکران کا والی مقرر کرنے کا فیصلہ کیا لیکن بعض ضروری امور درپیش آنے کی وجہ سے یہ معاملہ التوا میں پڑ گیا۔[ئہ]

آخر کار اس مقصد کے لئے ایک فوجی مہم مکران کی طرف روانہ کی

لہ:- SEISTAN _ G.P. TATE.

ئہ:- RAVERTY _ NOTES ON AFGHANISTAN AND BALUCHISTAN

گئی اور ایک بڑا لشکر ان کی امداد کے لیے خضدار بھیجا گیا تاکہ اگر مکران میں بڑے پیمانے پر بغاوت پھیل جائے تو اس بغاوت پر آسانی کے ساتھ قابو پایا جا سکے۔ جب عیسیٰ کو اس فوجی نقل و حرکت کا علم ہو تو اس نے بھی لڑائی کی تیاری شروع کر دی اور ہر طرف سے لشکر جمع کرنے شروع کر دیئے۔ غالباً اس زمانہ میں خاران بھی اہل معاون کے زیر فرمان تھا۔ عیسیٰ نے کیچیوں اور خارانکے ریکیوں اور دوسرے مکرانیوں پر مشتمل بیس ہزار نفوس پر مشتمل ایک جمعیت اکٹھی کر لی اور اس کے علاوہ اس نے چھ ہزار سواروں پر مشتمل ایک لشکر بھی تیار کر لیا تاکہ پوری قوت کے ساتھ غزنوی فوج کا مقابلہ کیا جا سکے۔ لڑائی شروع ہونے سے پہلے غزنوی فوج کے جمعدار نے دو ہزار سوار نزدیک ہی کھجوروں کے جھنڈ میں چھپا کر مکرانیوں کی گھات میں بٹھا دیئے۔ عیسیٰ اپنے لشکر کو لے کر غزنوی فوج پر بلہ بول دینے کے خیال سے آگے بڑھا۔ وہ خود ہاتھی پر سوار تھا اور دس دوسرے ہاتھی اس کے پیچھے جھوم جھوم کر آگے بڑھنے لگے جن کو لڑائی کی خوب تربیت دی گئی تھی۔ لڑائی کے دوران مکرانیوں کا پلہ بھاری رہا اور قریب تھا کہ غزنوی فوج شکست کھا جائے۔ مکرانی لشکر کو کامیابی ہونے لگی تھی کہ جمعدار نے بڑی ہمت سے کام لے کر اپنے منتشر فوجیوں کو دوبارہ اکٹھا کر لیا۔ اسی دوران گھات میں بیٹھے ہوئے سوار بھی کھجوروں کے جھنڈ سے باہر نکل آئے اور مکرانیوں پر پل پڑے۔ مکرانی لشکر کو شکست ہو گئی عیسیٰ کو ایک پہاڑی درّے کے اندر گھیر کر گرفتار کیا گیا۔ اس کے بعد اسے

قتل کر کے غزنوی فوجی اس کا سر کاٹ کر اپنے ساتھ غزنی لے گئے۔ انہوں نے سینکڑوں دوسرے لوگوں کو بھی جو لڑائی میں شامل تھے گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ غزنوی فوجیوں نے دس دن تک شہر اور اس کے مضافات کو لوٹا اور وہ بہت سا مال غنیمت اور مویشی جمع کر کے اپنے ساتھ لے گئے انہوں نے ابو عسکر کو مکران کا والی مقرر کر دیا جو اس کے بعد اپنی وفات تک مکران کا والی رہا۔[۱]

۱۰۴۰ء میں سلطان مسعود کو قتل کیا گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سلطان مودود غزنی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس کے عہد حکومت میں خضدار کے مسلمان والی نے دوبارہ خراج دینا بند کر دیا۔ سلطان نے اپنے حاجب کی قیادت میں چند فوجی دستے خضدار کی طرف روانہ کئے انہوں نے والی خضدار کو دوبارہ خراج دینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد سلطان نے اپنی توجہ سندھ کی طرف مبذول کی اور امیر ابو الحسن نے چند فوجی دستوں کے ساتھ ٹھٹھہ اور بھاٹہ پر چڑھائی کی اور یہاں کے گورنر کو جو خود مختار بن بیٹھا تھا اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ سلطان مودود نے ۱۰۴۹ء میں وفات پائی۔[۲]

سلطان مودود کی وفات کے بعد اس کا چچا عبدالرشید دو سال کے لئے غزنی کے تخت پر بیٹھا۔ یہ ایک شریف النفس اور خوش اخلاق حکمران

۱۔ BEISTAN. G. P. TATE.

۲۔ RAVERTY_NOTES ON AFGHANISTAN & BALUCHISTAN.

تھا. لیکن اس میں حکومت کرنے کی صلاحیت نہ تھی اسی زمانے میں سلجوق ترکمان شمال اور مغرب کی طرف سے غزنویوں کی قلمرو میں داخل ہو گئے انہوں نے سب سے پہلے ۱۰۵۰ء میں اپنے قدم مرو میں جما لئے اس کے بعد الپ ارسلان نے طخارستان کی طرف سے غزنی پر چڑھائی کی. اس کا باپ داؤد بیگ اور اس کے چچا بیغو نے سیتان سے بُسْت پر فوج کشی کی. سلطان عبدالرشید نے اپنے مملوک طغرل کو جو ایک قابل سپہ سالار تھا اس کے مقابلے پر بھیجا. وہ ان سلجوق قبائیلوں کی جنگی چالوں سے خوب واقف تھا اس نے الپ ارسلان کو پیچھے دھکیل دیا اور اس کے بعد مڑ کر داؤد اور بیغو کو سیستان کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا. لڑائی سے واپسی پر اس نے عبدالرشید کو قتل کر دیا اور خود غزنی کے تخت پر بیٹھ گیا. اس نے تمام غزنوی شہزادوں کو ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تاکہ تخت کا کوئی دعویدار باقی نہ رہے لیکن اس کو چالیس دن سے زیادہ حکومت کرنے کا موقعہ نہ ملا. الپ ارسلان نے غزنی پر قبضہ کر لیا. ۱۰۶۳ء میں سلجوق ایران میں داخل ہو گئے اور انہوں نے خراسان فارس اور کرمان پر قبضہ کر لیا.[۱]

پہلا سلجوق حکمران طغرل بیگ لاولد فوت ہو گیا. الپ ارسلان جو اس کا بھتیجا تھا اس کا جانشین بنا. اس نے ۱۰۶۳ء سے لے کر ۱۰۷۲ء تک

---

۱. RAVERTY - NOTES ON AFGHANISTAN & BALUCHISTAN

سلجوق مقبوضات پر حکومت کی۔ الپ ارسلان کے قتل کے بعد ملک شاہ سلجوق مقبوضات کا وارث بنا۔ نظام الملک طوسی اس کا وزیر تھا۔ جو ایک بڑا عالم اور فاضل شخص ہونے کے علاوہ عمر خیام اور حسن بن صباح کا ہم مکتب رہ چکا تھا۔ اس نے سیاست مدن پر کتاب لکھ کر شہرت دوام حاصل کرلی۔[1]

غزنی کے حکمران سلجوق بادشاہوں کے باجگذار بن گئے۔ بہرام شاہ آخری غزنوی حکمران تھا جس نے ایک سلجوق شہزادی سے نکاح کرلیا اور انہی کی حمایت سے تخت کے دوسرے دعویداروں کو شکست دے کر غزنی کا حکمران بن گیا۔[2]

سلجوق حکمرانوں میں امام الدین قرا ارسلان ملک خورد ۱۰۴۱ء میں کرمان کا حکمران بنا جو طغرل بیگ کے بھائی چاکر بیگ کا بڑا بیٹا تھا۔ اس نے کرمان سے اہل بوآدیہ کے اقتدار کا خاتمہ کرنے کے بعد فارس پر بھی قبضہ کرلیا۔ لیکن طغرل بیگ کے بیٹا ملک شاہ نے اس سے فارس کا صوبہ دوبارہ چھین لیا وہ کرمان پر بھی قابض ہونا چاہتا تھا لیکن اس نے کرمان کی حکومت اپنے چچا زاد بھائی سلطان شاہ کے سپرد کردی۔ ارسلان شاہ کرمان کا آخری حکمران تھا۔ اس سلجوق خاندان نے مکران پر بھی اپنی بالادستی قائم کی ہوئی تھی۔ جس کے عہد حکومت میں یہ علاقے بڑے خوش حال تھے۔[3]

---

[1] طبقات ناصری

[2] ایضاً

[3] تاریخ ایران قزوینی

رفتہ رفتہ سلجوق خاندان کے بادشاہ بھی زوال سے دوچار ہوئے۔ غز ترکمانوں نے آخری سلجوق حکمران سلطان سنجر کو شکست دے کر اس کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اس سے غور کے تاجک شہزادوں کے لئے زمین ہموار ہو گئی اور انہوں نے حملہ کر کے غز ترکمانوں کو جو غزنی کے ارد گرد آباد ہو گئے تھے نکال باہر کیا اور غزنی پر قابض ہو گئے۔ ❖

چودھواں باب
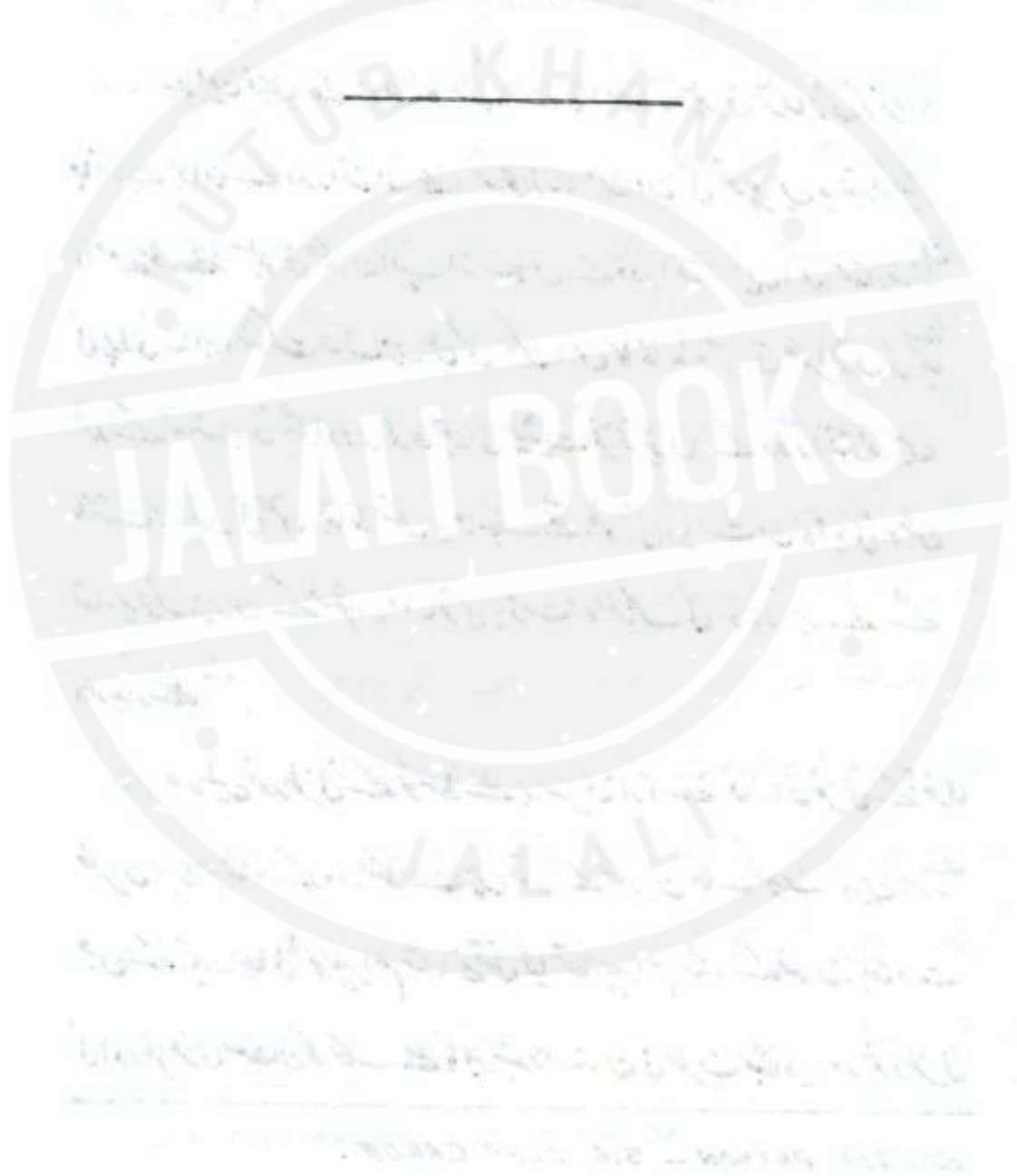
سلاطین غور

سلاطین غزنی کے زوال کا سب سے بڑا سبب سلجوق ترکمانوں کو گردانا جاتا ہے جو ان کے دور اقتدار کے آخری زمانہ میں ان کی قلمرو میں بہ تعداد کثیر داخل ہو گئے۔ سلجوق حکمران الپ ارسلان کے دور اقتدار میں اس ممتاز خاندان کی پرانی شان و شوکت خاک میں مل گئی لیکن اس کا فائدہ سلجوق حکمرانوں کی بجائے غور کے شنسابانی شہزادوں کو ملا جن کی حیثیت غزنویوں کے دور اقتدار میں ماتحت حکمرانوں کی تھی۔ بلحاظ نسل یہ تاجک تھے۔ غور کی ریاست ان کا آبائی وطن تھا۔ یہ لوگ ایران کے مشہور افسانوی بادشاہ ضحاک کی اولاد ہونے کے دعویدار تھے۔ [۱]

سلاطین غور غزنی کے توسط سے برسر اقتدار آئے۔ خاندان غزنی کے آخری حکمران بہرام شاہ کے دور حکومت میں غور کے حکمران ملک سیف الدین سوری نے جس کے ایک بھائی کو بہرام شاہ نے قتل کیا تھا۔ بہرام شاہ کے خلاف بغاوت کی اور غزنوی سلطان کو ملک سے باہر ہندوستان کی طرف بھگا دیا اور خود غزنی

---

[۱] THE PATHAN – SIR OLAF CAROE.

پر قابض ہو گیا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد بہرام شاہ خفیہ طور پر واپس غزنی چلا آیا اور رات کے وقت غزنی پر حملہ کر کے اس پر قابض ہو گیا اور ملک سیف الدین سور کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔[۱]

ملک سیف الدین کے بھائی ملک علاؤالدین کو اپنے بھائی کے قتل کا بڑا رنج ہوا۔ اس نے بہرام شاہ سے انتقام لینے کا پختہ عزم کر لیا۔ اس نے غور کے تاجکوں سے ایک فوج تیار کر کے بہرام شاہ کو غزنی کی گلی کوچوں میں عبرتناک شکست دی اور اپنے انتقام کی آگ کو بجھانے کی خاطر اس نے غزنی کو لوٹا اور پھر قتل عام کا حکم دے کر اس عظیم الشان شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اس کے بعد سارے شہر کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ روایت مشہور ہے کہ سات دن تک شب و روز آگ جلتی رہی اور سات ہزار نفوس بلا امتیاز تہ تیغ کر دیئے گئے یا آگ میں جل گئے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اہالیان غزنی نے خفیہ طور پر بہرام شاہ کو غزنی پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی تھی۔ اس نے سلاطین کی قبریں بھی کھود کر ان کی ہڈیاں جلا دیں اور صرف سلطان محمود کی قبر کو اس بے عزتی سے مستثنیٰ رکھا۔ ملک علاؤالدین نے صرف اسی پر قناعت نہ کی بلکہ اس نے سلطنت غزنی کے دوسرے بڑے شہر بست پر بھی حملہ کر کے اس کی تمام عمارتیں مسمار کر دیں۔ اور ان کو جلا کر خاک کا ڈھیر کر دیا۔ اس آتش زنی میں ہزاروں جانیں اور ہزاروں قلمی دستاویزات، قلمی نسخے اور کتابیں تلف ہو گئیں۔ اسی بنا پر ملک علاؤالدین تاریخ میں جہانسوز کے لقب سے مشہور ہے۔ غالباً اسی بربادی کے بعد بست

---

۱ - THE PATHAN - OLAF CAROE.

کی اہمیت ختم ہوگئی اور قندہار نے رفتہ رفتہ اہمیت حاصل کر لی۔[۵۱]

ایک سال کے اندر اندر ملک علاؤالدین کو اپنے کئے کی سزا مل گئی۔ وہ اتنا مغرور ہو گیا تھا کہ اس نے سلطان سنجر سلجوق کو خراج دینا بند کر دیا۔ سلطان سنجر نے اس کے خلاف فوج کشی کی۔ ہرات کے نزدیک سلجوق ترکمانوں اور تاجکوں میں سخت لڑائی ہوئی۔ ملک علاؤالدین شکست کھا کر گرفتار ہوا اور کافی عرصہ قید میں رکھا گیا۔[۵۲]

ابھی اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ غز ترکمانوں اور سلجوق حکمران کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا جو سلجوق ترکمانوں کے ساتھ خونی رشتہ رکھتے تھے اور انہی کی طرح شمال میں ماوراالنہر کے علاقوں سے سلجوق سلطنت میں بہ تعداد کثیر داخل ہو گئے تھے۔ سلطان سنجران غز ترکمانوں سے سالانہ بیس ہزار بھیڑ بکریاں ان چراگاہوں کے عوض بطور مالیہ وصول کیا کرتا تھا۔ جو اس کی قلمرو میں واقع تھیں۔ سلطان سنجر نے اس مالیہ میں اضافہ کر دیا لیکن غز ترکمان اس اضافی ٹیکس کو قبول کرنے میں ذرا حیل وحجت سے کام لیتے تھے۔ سلطان سنجر نے اپنا دبدبہ دکھانے اور ان کو مرعوب کرنے کی خاطر ان کے خلاف فوجی نقل وحرکت شروع کر دی۔ یہ لوگ بھی اپنی حفاظت کی خاطر مزاحمت پر تل گئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ سلطان سنجر کی فوج نے خلاف توقع ان غز ترکمان گڈریوں کے ہاتھ سے شکست کھائی۔ اور اس کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ غز ترکمان

۵۱۔ THE PATHAN – OLAF CAROE

۵۲۔ ABID.

س کے بعد غزنی پر قبضہ کر کے اس کے اردگرد آباد ہو گئے۔ انہوں نے خراسان کے صوبے کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ عورتوں اور بچوں سمیت کوئی دو لاکھ کے قریب انسان ان کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ یہ لوگ مرو بلخ زمینداوڑ اور سرخس میں بھی داخل ہو گئے اور بست کے اردگرد کے علاقوں کے علاوہ گرم سیر میں پھیل گئے اور ہرات پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا انہوں نے نیشاپور کو بھی روند ڈالا۔ یہ لوگ غزنی کے علاقے میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے اور شاہان سلجوق پر ان کی فتح سے غور کے تاجک شہزادوں کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔[1]

خوارزم کے حکمرانوں نے خراسان کو ان کے دست برد سے بچانے کے لئے خطائی کے خان سے امداد حاصل کر لی اور ۱۱۷۲ء میں ملک دینار کو جو غز ترکمانوں کا سردار تھا اور جس نے سرخس کے قلعہ پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ اس کے قبیلوں سمیت کرمان میں دھکیل دیا۔ غز قبیلوں کی یہ ہجرت اس قدر شدید تھی کہ اس کے نتیجے میں ایک اور آبادی کو جو کرمان میں بود و باش رکھتی تھی اور بلوچ کے نام سے موسوم تھی۔ کرمان سے ہجرت کر کے جیرفت کے جنوبی علاقوں اور ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ مکرانات میں آباد ہونا پڑا۔ جہاں اس سے پہلے کوفج قبیلے بھی سکونت پذیر تھے۔ بمرور زمانہ دونوں آبادیاں مل کر کوچ و بلوچ کے نام سے موسوم ہو گئیں۔[2]

ملک دینار کی حیثیت ۱۱۸۱ء تک کرمان میں مستحکم ہو گئی۔ ۱۱۸۵ء میں کرمان پر غز ترکمانوں نے پوری طرح غلبہ حاصل کر لیا۔ ۱۱۸۶-۹۸ء میں کرمان و

لہ ۱- THE PATHAN - SIR OLAF CAROE

۲ہ ۱- SEISTAN - G.P. TATE.

مکران کا آخری سلجوق حکمران فوت ہوگیا۔ اسی سال امام الدین ملک دینار نے کرمان میں اپنی حکومت قائم کرلی اور مکران کا کچھ حصہ اس میں شامل کرلیا۔ اس خاندان نے کافی عرصہ کرمان و مکران پر حکومت کی۔ ۱۲۰۰ء میں اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد غز ترکمانوں کا طوفان تھم گیا اور وہ رفتہ رفتہ صفحہ ہستی سے معدوم ہوگئے۔ بلوچستان کی بلوچ براہوی آبادی میں ایک مضبوط غز عنصر کی موجودگی خارج از امکان نہیں ہے۔

اس اثناء میں ملک سیف الدین کے بیٹوں غیاث الدین اور معز الدین کا ستارۂ اقبال تیزی سے چمکنے لگا۔ یہ دونوں بھائی محمد بن سام کے نام سے موسوم تھے۔ معز الدین کو شہاب الدین کے نام سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں اس نے محمد غوری کے نام سے شہرت پائی۔

۱۱۷۳ء میں دونوں بھائیوں نے مل کر غز ترکمانوں کو شکست دی اور غزنی پر قبضہ کرلیا۔ غیاث الدین نے غزنی کا علاقہ معز الدین کے سپرد کر دیا اور خود غور کا حکمران بن کر فیروز کوہ کو اپنا دارالسلطنت بنالیا۔ محمد شہاب الدین نے غز ترکمانوں کے ایک دوسرے گروہ سنکران کو شکست دی اور اپنی طاقت کو مستحکم کرلیا۔ اس نے غزنی کو اپنا فوجی مستقر قرار دے کر ہندوستان پر پے در پے حملے کئے اور ہندوستان میں ایک اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ ۱۱۷۶ء میں اس نے دریائے سندھ کو عبور کرکے اوچ پر قبضہ کرلیا۔ جو ملتان کے قریب واقع ہے۔ ۱۱۸۲ء میں اس نے جنوبی سندھ پر فوج کشی کی اور ساحل سمندر تک کا علاقہ فتح کرلیا۔ غزنی فتح ہونے کی وجہ سے جنوبی افغانستان اور بلوچستان

کے علاقے مکران اور جھالاوان سمیت خود بخود اس کے زیر فرمان آ گئے۔ ان کامیابیوں سے اس کے حوصلے بڑھ گئے۔ واپس غزنی آنے پر اس نے اب کی بار شمالی ہندوستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں اور دلّی کو اپنی آخری منزل قرار دیا۔ یہ شہر شمالی ہندوستان میں ہندو اقتدار کا گڑھ تھا۔ ۱۱۸۶ء میں اس نے لاہور پر چڑھائی کی اور اسے فتح کر کے پنجاب پر اپنی بالا دستی قائم کی ۱۱۹۰ء میں اس نے دلّی کا رُخ کیا۔ لیکن یہ حملہ کامیاب ثابت نہ ہوا۔ دلّی کا راجپوت حکمران رائے پتھورا جو پرتھوی راج کے لقب سے ملقب تھا، کرنال کے نزدیک ترائن کے میدان میں اس کے مقابلے کے لئے پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ اس نے اس لڑائی کے لئے خوب تیاریاں کی ہوئی تھیں اور وہ ہاتھیوں کا ایک زبردست بیڑا اور لاتعداد گھوڑ سوار دستے میدانِ جنگ میں لایا تھا۔[1]

شہاب الدین کی فوج تاجکوں اور افغانوں پر مشتمل تھی۔ جن کو میدان میں لڑائی کرنے کا چنداں تجربہ نہ تھا۔ راجپوتوں نے ان کے خلاف ترائن کے کھلے اور ہموار میدان میں اپنی بہادری کا خوب مظاہرہ کیا اور جان توڑ کر لڑے اس لڑائی میں شہاب الدین خود زخمی ہو گیا اور ایک افغان فوجی کی بروقت مداخلت ہی سے وہ میدانِ جنگ سے زندہ بچ کر نکل سکا۔ اس کی فوج نے راجپوتوں کے مقابلہ میں شکست کھائی۔ محمد غوری نے ایک سال تک دوبارہ تیاریاں کیں۔ ۱۱۹۱ء میں وہ دوبارہ شمالی ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس دفعہ بھی راجپوت حکمرانوں نے ترائن کے کھلے میدان میں افغانوں اور تاجکوں کا

---

[1] THE PATHAN - SIR OLAF CAROE

مقابلہ کیا۔ دونوں طرف سے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا گیا اور اس بے جگری سے لڑے کہ جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی اور آن کی آن میں دونوں طرف سے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ پرتھوی راج کی فوج نے بالآخر شکست کھائی اور اس شکست سے ہندوستان میں راجپوتوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔[1]

دلّی فتح ہونے سے شہاب الدین کا غرور بڑھ گیا تھا۔ اس کے دل میں خوارزم فتح کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ یہ ایک فحش غلطی تھی۔ خوارزم میں اس زمانے میں سلطان محمد شاہ اور اس کے بیٹے ملک جلال الدین کی حکومت تھی ان کا خاندان سلجوق حکمرانوں کے زمانے سے اس علاقے کا حکمران چلا آتا تھا جو خیوا سے نزدیک دریائے جیحوں کے نشیبی علاقوں پر مشتمل تھا۔ دونوں باپ بیٹے زبردست قابلیت کے مالک تھے۔ یہ علاقہ اگرچہ بڑا سرسبز و شاداب تھا لیکن چاروں طرف سے صحراؤں اور دریائے ارال سے گھرا ہوا تھا جہاں گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں سخت سردی پڑتی تھی۔ محمد غوری کا یہ حملہ بری طرح ناکام ثابت ہوا۔ اس شکست سے افراتفری پھیل گئی۔ اسے اس ناکامی کے بعد پنجاب کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ ہر طرف بغاوت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اس ناکامی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ خود بھی پنجاب میں ایک معمولی آدمی کے ہاتھ سے مارا گیا جو محافظوں سے آنکھ بچا کر خیمہ میں داخل ہوگیا

---

[1]:- THE PATHAN - SIR OLAF CAROE

تھا۔ یہ واقعہ ۱۲۰۶ء میں پیش آیا۔[۱]

محمد شہاب الدین غوری کی کوئی اولاد نہ تھی۔ دلی میں اس کے ہندوستانی مقبوضات کا وارث اس کا ترک مملوک قطب الدین ایبک بنا جو ہندوستان میں خاندان غلامان کا بانی تھا۔ دلی کا قطب مینار اس کی یادگار ہے۔ ملتان، اوچھ اور سندھ کے مقبوضات اس کے ایک دوسرے غلام ناصرالدین قباچہ کے زیر فرمان آ گئے جو دلی کے ماتحت تھا۔ غزنی میں اس کا ایک اور غلام تاج الدین یلدوز اس کے تاج و تخت کا وارث بنا اور وہ تمام ممالک جن کا تعلق غزنی سے تھا اس کے دائرہ اختیار میں آ گئے۔ قطب الدین اور ناصرالدین دونوں تاج الدین یلدوز کے داماد تھے۔ قطب الدین ۱۲۱۰ء میں دلی میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر پڑا اور فوت ہو گیا۔ اس کی جگہ سلطان شمس الدین التمش دلی کے تخت پر بیٹھا جو سلطان قطب الدین کا غلام اور اس کا داماد تھا۔ قطب الدین کی وفات کے بعد ناصرالدین قباچہ نے بھی سلطان کا لقب اختیار کر لیا۔[۱]

تاج الدین یلدوز نے غزنی سے پنجاب پر کئی بار فوج کشی کی لیکن سلطان شمس الدین التمش کے ہاتھوں شکست کھائی۔ ۱۲۱۵ء میں سلطان محمد شاہ خوارزم نے تاج الدین یلدوز کو غزنی سے نکال باہر کر دیا اور یلدوز پنجاب پر قابض ہو گیا۔ لیکن سلطان شمس الدین التمش کے ہاتھ سے شکست کھائی اور گرفتار ہو کر اس کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔[۲]

---

[۱] RAVERTY_NOTES ON AFGHANISTAN AND BALUCHISTAN

[۲] ABID.

۱۲۲۷ء میں سلطان شمس الدین التمش نے سندھ پر فوج کشی کی اور دلی سے کوچ کر کے اوچھ چلا آیا جہاں سلطان ناصرالدین قباچہ فروکش تھا۔ سلطان ناصرالدین قباچہ نے اس کے خوف سے بھاگ کر بھکر کے قلعہ میں پناہ لی۔ سلطان التمش نے ملتان پر حملہ کیا اور اس پر قابض ہوگیا۔ اس نے اپنے وزیر محمد جنیدی کو ناصرالدین کے تعاقب میں روانہ کیا۔ جب ناصرالدین قباچہ کو اس کی آمد کی خبر ہوئی تو اس نے تمام قیمتی اشیاء اور زر وجواہرات اکٹھا کر کے ایک کشتی میں ڈال دیئے اور اپنے تمام اہل وعیال اور لواحقین سمیت کشتی میں دریائے سندھ کے راستے بھاگ نکلنے کی کوشش کی لیکن بدقسمتی سے کشتی زیادہ بوجھ برداشت نہ کر سکی اور دریا میں غرق ہوگئی۔ ناصرالدین قباچہ اپنے اہل وعیال اور لواحقین سمیت دریا میں ڈوب کر مرگیا۔ سلطان کے وزیر نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور تمام سندھ کو ساحل سمندر تک فتح کر لیا۔ تاج المنصور کا بیان ہے کہ مکران اور خضدار تک سلطان شمس الدین التمش کا اقتدار تسلیم کیا جاتا تھا۔[۱]

سلطان محمد شاہ خوارزم نے ۱۲۱۵ء میں جب تاج الدین یلدوز کو غزنی سے نکال باہر کر دیا تو غزنی کی حکومت اپنے ہونہار بیٹے ملک جلال الدین منگبارنی کے حوالے کر دی لیکن اسے غزنی پر پانچ سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ اور شاہ خیوا کی حکومت کا چنگیز خان کے منگول شہسواروں کے ہاتھ سے خاتمہ ہوگیا۔[۲]

۱۔ RAVERTY - NOTES ON AFGHANISTAN AND BALUCHISTAN.

۲۔ ABID.

پندرھواں باب

چنگیز خان منگول

التسز کے خاندان کا آخری تاجدار علاؤالدین محمد تیرھویں صدی کے اوائل میں خوارزم کے تخت پر جلوہ افروز ہوا. محمد غوری کی شکست کے بعد وہ ایک وسیع سلطنت کا مالک بنا. کچھ عرصہ کے لئے اس کی سلطنت اتنی زیادہ وسیع ہوگئی جتنی سلجوقیوں کی سلطنت ان کے عروج کے زمانے میں تھی. یہ ایک طرف کوہ یورال سے لے کر خلیج فارس تک اور دوسری طرف دریائے سندھ سے لے کر دریائے فرات تک پھیلی ہوئی تھی. فارس اور خوزستان کے سوا تمام ایران اس میں شامل تھا۔[1]

خوارزم کی سلطنت میں استحکام کے عناصر اس کی پیشرو حکومتوں غزنویوں غوریوں اور سلجوق کی نسبت زیادہ قوی تھے اگر حالات معمول پر رہتے تو امید تھی کہ یہ سلطنت مزید ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکتی تھی کئی امور میں سے وہ واقعہ جو فوری طور پر اس کے خاتمہ کا باعث بنا ایک غیر متوقع عظیم آفت تھی جس نے دنیا کی شکل وصورت یکسر بدل دی۔ اس عظیم حادثے

[1] BROWN LITERARY HISTORY OF PERSIA

کہ جس کی توقع اس کے معرض وقوع ہونے تک کسی کو نہ تھی ایسی قوتیں
حرکت میں آگئیں کہ جن کے اثرات بڑے دور رس ثابت ہوئے اور ان
قوتوں کی وجہ سے نسل انسانی پر مصائب و آلام کے وہ پہاڑ ٹوٹے جن کی
مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ یہ المیہ منگول حملہ تھا۔ اس حملے کے فوری
اسباب خود محمد نے فراہم کئے۔[۵۱]

چنگیز خان ۱۲۰۶ء میں منگولیا میں برسر اقتدار آیا۔ اس کے بعد اس
نے چین کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے پیکنگ پر قبضہ کر لیا۔ انہی ایام میں
اس کا بیٹا جوجی اس کی مملکت کی مغربی سرحد کی حفاظت پر مامور تھا اس دوران
خوارزم کے محافظ دستوں اور جوجی کے فوجیوں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں لیکن
ان جھڑپوں کو کوئی اہمیت نہ دی گئی اور دونوں مملکتوں کے درمیان سفرا کے
تبادلے عمل میں آئے لیکن سلطان محمد ایک طرف اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار
خیال کرتا تھا اور دوسری طرف چین فتح کرنے کا خبط اس کے سر میں سمایا ہوا
تھا۔ وہ ان منگولوں کو بڑی نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا جو اس
کی مملکت میں مداخلت کر رہے تھے۔ خلیفہ بغداد بھی اس سے ناخوش تھا۔
بظاہر چنگیز خان کے تعلقات شروع میں شاہ خوارزم کے ساتھ خوشگوار
تھے اس نے محمد کے دربار میں اپنے ایلچی بھی بھیجے جنہوں نے محمد کو چنگیز خان
کی طرف سے بیش قیمت تحفے اور تحائف بھی پیش کئے اس موقع پر اس
نے شاہ خیوا کو ایک دوستانہ خط بھی لکھا اور توقع ظاہر کی کہ دونوں ایک

۵۱۔ BROWN – LITERARY HISTORY OF PERSIA –

دوسرے کے ساتھ امن اور آشتی سے رہیں گے اور دونوں مملکتوں کے درمیان تجارتی کاروانوں کی آمد و رفت جاری رہے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی لکھا کہ وہ محمد کو اپنا عزیز ترین بیٹا خیال کرتا ہے۔

شاہ خیوا نے ان سفراء میں سے ایک سے جو خیوا کا باشندہ تھا چنگیز خان کی فوجی طاقت کے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں اور اس کے بعد ان کو خندہ پیشانی سے رخصت کیا لیکن اس کے ساتھ اس نے چنگیز خان کے خط سے یہ تاثر بھی لیا کہ اس کے بین السطور میں منگول بالادستی کا اشارہ موجود ہے کیونکہ باپ اور بیٹے کا رتبہ مساوی نہیں ہو سکتا تھا۔ سلطان محمد اپنے آپ کو ایک حقیقی بادشاہ خیال کرتا تھا۔ وہ اس غیر مساویانہ حیثیت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔[۱]

اس کے تھوڑے عرصہ بعد چنگیز خان نے خیوا کے تین تاجروں کا سارا مال و اسباب خرید لیا اور ان کے ساتھ اپنے تین نمائندے بھی خوارزم کی طرف روانہ کر دیئے تاکہ یہ لوگ اپنے مویشیوں کی کھالوں کے عوض اس قسم کی اشیائے ضرورت خرید لیں جو خوارزم کی پیداوار تھیں۔ جب یہ تجارتی کاروان اترار کے سرحدی قصبہ میں پہنچا تو اترار کے گورنر نے ان کا مال و اسباب حاصل کرنے کی خاطر اس کاروان کے اراکین کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا اور اس کی اطلاع شاہ خیوا کو دے دی اور الزام لگایا کہ یہ لوگ جاسوسی کی نیت سے آئے تھے۔ گمان ہے کہ معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ محمد نے نیک نیتی کو بالائے طاق رکھ کر اور نتائج سے

---

[۱] A HISTORY OF PERSIA. SYKES

بے پرواہ ہوکر ان تاجروں کو قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اترار کے گورنر نے بھی اس حکم کی فوری تعمیل کی اس۔ اثناء میں چنگیز خان کو خلیفہ بغداد کی طرف سے مکتوبات بھی ملے تھے اور وہ جیسا کہ اس کے رویہ سے معلوم ہوتا تھا بہانے کی تلاش میں تھا۔ سلطان محمد کی اس ناعاقبت اندیشانہ حرکت سے یہ بہانہ خود بخود فراہم ہو گیا۔ چنگیز خان نے ان تاجروں کے قتل کی اطلاع پاتے ہی فوراً اپنا ایک ایلچی شاہ خیوا کے دربار میں بھیج کر مطالبہ کیا کہ اترار کے گورنر کا بازو اس کے حوالے کیا جائے تاکہ اس کو منگول انتقام کا نشانہ بنایا جا سکے۔ ورنہ لڑائی ناگزیر ہو گی۔ محمد کے دل میں اپنی گذشتہ کامیابیوں کی وجہ سے اس قدر گھمنڈ پیدا ہو گیا تھا کہ اس نے چنگیز خان کے بھیجے ہوئے ایلچی کو بھی فوری طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔[۱]

حقیقت یہ ہے کہ تباہی اور بربادی کا یہ طوفان ان واقعات سے ایک سال پیشتر حرکت میں آ چکا تھا۔ ۱۲۱۹ء میں منگولوں کو چنگیز خان کی طرف سے سردریا کے کنارے جمع ہونے کا حکم ملا۔ محمد چار لاکھ نفوس پر مشتمل ایک بھاری فوج میدانِ جنگ میں لے آیا تھا تاکہ وہ کوئی فیصلہ کن جنگ لڑ سکے لیکن جوجی نے اسے اُش اور سنگر کے درمیان عبرتناک شکست دے کر ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دیا۔ اس شکست سے محمد کے دل و دماغ پر ایسی ہیبت طاری ہو گئی کہ اس نے پہل کرنے کا کام منگولوں پر چھوڑ دیا اور ایک دفاعی جنگ پر قناعت کر کے اپنی فوج کو اپنی مملکت کے مختلف شہروں کی چھاؤنیوں میں اس امید پر تقسیم کر کے پھیلا دیا کہ منگول ہر جگہ لوٹ مار کرنے کے بعد اپنا مالِ غنیمت لے کر اپنے اپنے گھروں کو

---

[۱] A HISTORY OF PERSIA - SYKES.

لوٹ جائیں گے اس سے منگولوں کا کام اور زیادہ آسان ہو گیا اور چنگیز خان
کو موقعہ مل گیا کہ وہ کسی بڑی مزاحمت کے خوف سے بے پرواہ ہو کر جہاں چاہے
اپنی فوج کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر کے روانہ کرے۔ اترار کے محاصرے کا کام
اس کے دونوں بیٹوں چغتائی اور اوگتائی کے سپرد ہوا۔ جوجی نے محمد کو شکست
دینے کے بعد شمال میں خوجند کے صوبے کی طرف اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔
اور فقط پانچ ہزار افراد پر مشتمل ایک مختصر لشکر الگ کر کے اسے دریا کے بالائی علاقہ
سے خوجند کی طرف روانہ کر دیا۔ [۱]

چنگیز خان اپنے چھوٹے بیٹے طولی کی معیت میں اپنی فوج کے بڑے
حصے کو لے کر بخارا کی طرف چل پڑا تاکہ اگر محمد اپنے تاج و تخت کو بچانے کی
خاطر لڑائی لڑنے کا فیصلہ کرے تو اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اترار کے محاصرے
میں چار مہینے لگ گئے۔ گورنر نے اس امید پر منگولوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ
شاید محمد کی طرف سے کوئی مدد آن پہنچے لیکن اس کی یہ امید بر نہ آئی اور آخر
کار شہر پر منگولوں کا قبضہ ہو گیا اس کے باوجود گورنر نے مزید ایک مہینہ تک
منگولوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن بزدل محمد کی طرف سے اس کے
لئے کوئی مدد نہیں آئی اور اب شکست قبول کرنے کے سوا اس کے لئے کوئی
چارہ کار باقی نہ رہا اور منگولوں نے اسے زندہ گرفتار کر کے چنگیز خان کے حکم سے
تاجروں کے قتل کے بدلے میں اس کی آنکھوں اور کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ
ڈال دیا اس کے بعد جوجی نے سگنک اور خوجند پر قبضہ کر لیا۔ [۲]

---

[۱] [۲] A HISTORY OF PERSIA - SYKES.

محمد کی سپاہ نے جس کی تعداد بیس ہزار افراد کے لگ بھگ تھی بخارا کا دفاع کیا۔ لیکن اس کی قوت بکھر گئی اور وہ محاصرے کے دوران ایک دن اچانک قلعہ سے باہر نکل کر منگولوں پر پل پڑے اور ان کی صفوں کو دھکیلتے ہوئے بھاگ نکلنے کی کوشش کی۔ منگولوں کو پہلے تو ان کی اس حرکت پر بڑا تعجب ہوا۔ لیکن انہوں نے فوراً ہی اپنی صفوں کو دوبارہ درست کر کے فراریوں کا پیچھا کیا اور دریائے سیحون کے کنارے جا کر ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد بخارا کے باشندوں نے اطاعت قبول کر لی۔ چنگیز خان گھوڑے پر سوار بخارا کی شاہی مسجد میں داخل ہوا جہاں منگولوں نے اپنی فتح کی خوشی میں خوشیاں منائیں۔ بخارا کی ساری آبادی کو اکٹھا کر کے متمول لوگوں سے ان کی دولت چھین لی گئی۔ اس کے بعد شہر کی عالیشان عمارات کو مسمار کر کے اور جلا کر خاک کا ڈھیر کر دیا گیا۔ منگولوں نے بخارا کے باشندوں کو جمع کر کے ان کو آپس میں بانٹ لیا۔ تاکہ ان کو فوجی کارروائیوں کے دوران قلعوں کو منہدم کرنے والی جماعتوں کے لئے پردہ کے طور پر استعمال کر سکیں یا پھر ان سے قلعوں میں شگاف ڈال کر راستہ بنوانے اور خندقیں بھروانے کا کام لیا جا سکے اشد ضرورت کے وقت مٹی کی بجائے اس قسم کے لوگوں کے جسم ہی سے خندقیں بھروائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ عورتوں کو لونڈی بنانا ان کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ لے

اس کے بعد چنگیز خان زرافشاں کی سرسبز اور شاداب وادی سے ہو

لے:- A HISTORY OF PERSIA- SYKES.

کر ثمرقند کی طرف روانہ ہوا جس کی مدافعت کے لیے چالیس ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج متعین تھی لیکن کسی بڑی مزاحمت کے بغیر یہ شہر فتح ہو گیا۔ قلعہ کے ترک سپاہیوں نے اس امید پر ہتھیار ڈال دیئے کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے گا۔ لیکن ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ شہر کی آبادی میں سے تیس ہزار کاریگروں کو منگولوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ اتنے ہی لوگ فوجی کارروائیوں کے لئے الگ کر دیئے گئے۔ پچاس ہزار افراد نے فدیہ دے کر اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ لیکن ان میں سے اکثر لوگ فوجی کارروائیوں کے لئے دوبارہ گرفتار کئے گئے۔؎

جب جنگلوں کا سیلاب اُمنڈ آیا تو محمد اس وقت ثمرقند میں مقیم تھا اور وہ اس وقت تک یہاں مقیم رہا جب تک کہ یہ شہر محفوظ تھا لیکن جب اپنے ہی دارالحکومت میں اس کے محصور ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تو وہ غزنی میں پناہ لینے کی نیت سے بخارا کی طرف بھاگ نکلا اور وہاں سے غزنی کی بجائے نیشاپور میں جا کر دم لیا۔ اس موقعہ پر اس کے نامور بیٹے ملک جلال الدین نے ہر چند زور دیا کہ اسے کم از کم دریائے سیحون کے دفاعی خط کی حفاظت اور مدافعت کرنے کی اجازت دی جائے لیکن محمد نہ خود لڑنے کے لئے تیار تھا اور نہ اپنی فوج کی کمان اپنے بیٹے کے حوالے کرنے پر راضی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے ہر طرف دشمن ہی دشمن نظر آ رہے تھے۔ جو مختلف سمتوں سے اس کی قلمرو میں داخل ہو کر آگے بڑھ رہے تھے جب محمد کو اطلاع

؎:- A HISTORY OF PERSIA - SYKES

ملی کہ منگولوں نے سیحون پار کر لیا ہے تو وہ نیشاپور سے اس راستے پر بھاگ نکلا جس راستے پر شہنشاہ ایران داریوش سوئم سکندر اعظم کے آگے آگے بھاگ نکلا تھا۔ لیکن فرق صرف یہ تھا کہ ان دونوں کی سمت ایک دوسرے سے مختلف تھی۔[۱]

چنگیز خان نے ثمرقند سے دس دس ہزار افراد پر مشتمل دو لشکر سلطان محمد کے تعاقب میں بھیج کر حکم دیا کہ فوراً اس کا کھوج لگایا جائے۔ جیبے کا لشکر نیشاپور سے ہو کر کمپن اسفرائین اور دامغان کو تاخت و تاراج کرتا ہوا سبوطے کے لشکر کے ساتھ رے میں جا کر ملا اور رے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔[۲]

۱۲۲۰ء میں محمد قزوین پہنچا جہاں اس نے ایک آخری معرکہ لڑنے کی تیاریاں شروع کر دیں لیکن اس کو خبر مل گئی کہ رے پر دشمن کا قبضہ ہو گیا ہے جو قزوین سے ایک سو میل سے بھی کم فاصلہ پر واقع تھا۔ محمد کی طرح اس کی فوج کے اوسان بھی خطا ہو گئے اور وہ فوراً منتشر ہو گئی۔ محمد اپنی جان بچا کر مازندان میں داخل ہوا اور بحیرہ خزر کے ایک جزیرے میں پناہ لی۔ یہاں اگرچہ وہ محفوظ تھا لیکن اس پر نزاع کا عالم طاری ہو گیا اور اس نے تھوڑے ہی دنوں میں دم توڑ دیا۔ اس نے اپنے پیچھے بدنامی کا ایسا دھبہ چھوڑا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔[۳]

۱:- A HISTORY OF PERSIA _ SYKES.

۲:- ABID.

۳:- ABID.

محمد کی وفات کے بعد ملک جلال الدین اپنے دو بھائیوں کے ساتھ سمندر کے راستے جزیرہ نما منگش لک سے ہوکر خوارزم کے دارالحکومت میں پہنچا جہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا لیکن اس کے خلاف ایک سازش کا انکشاف ہوا اور وہ راتوں رات تین سو سواروں کے ساتھ سولہ دنوں میں صحرا عبور کر کے نسا پہنچا جو استرآباد کے جنوب میں واقع تھا۔ اس شہر میں اس کی مڈھ بھیڑ منگولوں کے ایک لشکر سے ہوئی جو پہلے ہی سے اس شہر پر قابض تھا۔ اس نے ان منگولوں کو شکست دے کر زبردست نقصان پہنچایا۔ اس کے بعد یہاں سے کوچ کر کے نیشاپور پہنچا۔ اس کے دونوں بھائیوں نے جب سنا کہ غور گنج میں منگولوں کی ایک بھاری جمعیت اکٹھی ہو رہی ہے تو وہ بھی نیشاپور کی طرف نکل کھڑے ہوئے لیکن تین دن کے بعد منگولوں کے نرغے میں پھنس گئے اور قتل کر دیئے گئے۔[۱]

چنگیز خان نے دوسری اہم کارروائی یہ کی کہ اس نے منگولوں کی ایک بڑی فوج جوجی چغتائی اور اوگتائی کی زیر سرکردگی خوارزم کے دارالحکومت پر چڑھائی کے لئے روانہ کر دی جب منگول شہر کے دروازوں کے قریب پہنچے تو شہر کے محافظین نے جن کو بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ گھات میں بٹھا دیا گیا تھا ان پر حملہ کر کے نہ صرف ان کا پیچھا کیا بلکہ ان کو زبردست نقصان بھی پہنچایا۔ جب منگول فوج کا بڑا حصہ غور گنج کے سامنے آن پہنچا تو انہوں نے ان بیچارے مظلوم تاجک لوگوں کو بیگار میں پکڑ کر ان سے خندقیں زبردستی

۱۔ A HISTORY OF PERSIA.

بھر والیں جو دوسرے شہروں سے بھاگ کر یہاں پناہ لینے آئے تھے اس کے بعد اسی جگہ انہوں نے تولچانے کو ترتیب دیا۔ لیکن چغتائی اور اوگتائی کے درمیان رنجش پیدا ہونے کی وجہ سے فوجی کارروائی معطل ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد چنگیز خان نے فوج کی اعلیٰ کمان اوگتائی کے سپرد کر دی جس نے فوراً قلعہ پر ایک زبردست حملہ کرنے کا حکم دے دیا اور یہ حملہ کامیاب ثابت ہوا۔ اگرچہ شہر کے باشندوں نے بڑی بہادری سے مزاحمت کی اور چھ مہینے تک منگولوں کے مقابلے پر ڈٹے رہے لیکن آخر کار ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ فاتحین نے شہر کی ساری آبادی کو جمع کر کے ان سے کاریگروں کو الگ کر دیا؛ وہ باقی لوگ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے انہوں نے عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا۔[۱]

ملک جلال الدین نسا میں منگولوں کی طاقتور فوج کو شکست دینے کے بعد نیشا پور پہنچا تھا۔ یہاں سے وہ دو دن کے قیام کے بعد غزنی کی طرف روانہ ہوا اس کی روانگی کے ایک گھنٹہ بعد منگول بھی موقعہ پر آدھمکے اور اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے ملک جلال الدین کو ابھی زوزان پہنچے ایک ہی دن ہوا تھا کہ منگول بھی قریب آ گئے اور شہر کے باشندوں نے ملک جلال الدین پر شہر کے دروازے بند کر دیئے اور وہ اپنا سفر جاری رکھ کر صحیح سلامت غزنی جا پہنچا۔[۲]

غزنی میں اگرچہ لاقانونیت کا دور دورہ تھا۔ لیکن فوراً ہی اس کے جھنڈے

۱۔ A HISTORY OF PERSIA. SYKES.

۲۔ ABID.

نے بہت سے لوگ جمع ہو گئے اس نے ۱۲۲۱ء کے موسم سرما میں بامیان کی طرف کوچ کیا۔ یہاں اس کی مڈھ بھیڑ منگولوں کے ایک بڑے لشکر سے ہوئی اور ایک ہزار منگول پروان کے میدان میں اس کے ہاتھ سے مارے گئے لیکن شکی قتوک تیس ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج فوراً ہی اس کے مقابلے چلے آیا جس کو چنگیز خان۔ نے فوجی کارروائیوں کو تحفظ دینے کے لئے متعین کر رکھا تھا۔ چنگیز خان کے اس قسم کے انتظامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف جنگی چالوں سے پوری طرح واقفیت رکھتا تھا۔ بلکہ وہ ہر ایک موقعہ کا فوجی حکمت عملی کے نکتہ نگاہ سے مطالعہ بھی کیا کرتا تھا۔[۱]

پہلے دن تو لڑائی کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ لیکن دوسرے دن منگولوں کو مکمل شکست ہو گئی اور ایرانیوں نے ان کی پیدل فوج پر حملہ بول کر ان کو میدان جنگ سے نکال باہر کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان گنت فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن بدقسمتی سے ملک جلال الدین کی فوج میں مال غنیمت کی تقسیم پر ناراضگی پیدا ہو گئی اور اس کی فوج کا غوری حصہ اس سے الگ ہو گیا۔ اس موقعہ پر جب ملک جلال الدین کو خبر ملی کہ چنگیز خان غزنی کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس نے محسوس کیا کہ اب کوہ ہندوکش کے دفاعی خط کو قائم رکھنا مشکل ہے اور اسے مجبوراً سندھ کی سرحد کی طرف پسپا ہونا پڑا۔[۲]

---

[۱] A HISTORY OF PERSIA - SYKES.

[۲] ABID.

منگول فاتح نے اپنے ایک پوتے کے قتل کا انتقام لینے کی خاطر بامیان پر حملہ کر کے صفحۂ ہستی سے اس کا نام ونشان تک مٹا دیا اور مقتول شہزادے کی یادگار کے طور پر اسے لُوٹنے کی بھی اجازت نہ دی بلکہ قربانی کے طور پر اسے یونہی ویران چھوڑ دیا۔ اس کے بعد اس نے غزنی کی طرف کوچ کیا۔ جہاں سے ملک جلال الدین دو ہفتہ پیشتر سندھ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ اس نے اپنا سفر بڑی تیزی کے ساتھ جاری رکھا اور رات دن ایک کرتے ہوئے اسے سندھ کی سرحد پر جا لیا۔ جہاں وہ اپنے کچھ فوجی دستوں کے لئے انتظار کر رہا تھا۔ ملک جلال الدین کی مرضی اب کی بار لڑائی لڑنے کی نہ تھی اور وہ دریائے سندھ کو عبور کر کے اسے اپنی قلیل فوج اور منگول فوج کے درمیان رکھنا چاہتا تھا لیکن اس کی رفتار سست تھی اور چنگیز خان کی فوج نے عین دریا کے کنارے اسے جا لیا۔ [1]

اس موقعہ پر جب ملک جلال الدین کے لئے کوئی چارہ کار نہ رہا تو اس نے شیر کی طرح جھپٹ کر باغیوں کے دائرے کو توڑنے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس کے بعد وہ ایک تازہ دم گھوڑے پر سوار ہوا اور منگولوں پر ایک زبردست حملہ کر کے ان کو پیچھے دھکیل دیا اور اس کے بعد نہایت چابکدستی کے ساتھ اپنے گھوڑے کی باگیں موڑ کر اسے اونچے ساحل سے دریائے سندھ میں ڈال دیا اور منگولوں کی دیکھا دیکھی تیرتا ہوا دریا کے دوسرے کنارے پر جا کر دم لیا۔ منگول اس کی اس حرکت سے بڑے محظوظ ہوئے۔ چنگیز خان نے اس

---

[1]:- A HISTORY OF PERSIA - SYKES.

موقعہ پر فراخدلی کا مظاہرہ کر کے اس کی طرف تیر چھوڑنے سے منع کیا اور اسے
شجاعت کے پیکر کے طور پر اپنے بیٹوں کے سامنے پیش کیا۔

اس کے بعد چنگیز خان نے چند سوار دستے اس کی تلاش میں سندھ کی
طرف روانہ کیئے لیکن وہ لوگ اس کا کھوج نہ لگا سکے۔ انہوں نے ملتان پر
قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن گرمی سے تنگ آکر اپنا ارادہ بدل دیا اور قرب وجوار
کے علاقوں میں لوٹ مار کرنے کے بعد مالِ غنیمت ساتھ لے کر چنگیز خان کی
فوج سے جا ملے جو تاتاریا کی طرف کوچ کر رہی تھی۔[طہ]

ملک جلال الدین دلّی جانے کا خواہشمند تھا۔ لیکن سلطان شمس الدین
التمش نے اس کو دلّی آنے کی اجازت نہ دی۔ وہ تین سال تک سندھ میں ٹھہرا
رہا اور سلطان ناصر الدین قباچہ کو کئی لڑائیوں میں شکستیں دیں۔ ۱۲۲۳ء میں وہ
مکران کے راستے دوبارہ اصفہان چلا آیا۔

سلطان محمد شاہ نے اس زمانہ میں جبکہ منگول خراسان میں داخل ہو گئے
تھے۔ ملک بہرام شاہ والی سیستان کو جو اس کا باجگذار تھا اپنی مدد پر بلایا تھا
سیستان کی فوج جب ترمز کے قلعہ میں داخل ہو گئی تو
اس کی اطلاع چنگیز خان کو ملی۔ اس نے فوراً قلعہ کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ
کر لیا اور سیستانی ایک ایک کر کے قتل کر دیئے گئے۔ اس نے اس موقعہ پر
ملک بہرام شاہ کے دونوں بیٹوں ملک نصرت اور ملک کمال الدین کو بھی قتل کر
دیا جو اپنے باپ کی وراثت اور اس کی جانشینی پر ایک دوسرے کے خلاف

[طہ] :: A HISTORY OF PERSIA - SYKES.

برسرپیکار تھے ؎۱

۱۲۲۱ء میں منگولوں کا لشکر ہرات کے ارد گرد جمع ہو گیا. طغرل خان اور اس کے فوجی منصبداروں نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور ایک ہفتہ تک شہر کے ارد گرد سخت لڑائی ہوئی اس کے بعد طغرل خان اور اس کے دوسرے منصبداروں نے خندق کے کنارے آکر اعلان کر دیا کہ اگر شہر کے لوگ ہتھیار ڈال دیں تو ان کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی جائے گی اور ان سے فقط اتنا مالیہ اور خراج وصول کیا جائے گا. جتنا کہ وہ ملک جلال الدین کو دیا کرتے تھے انہوں نے اس شرط کی پابندی کرنے کی قسم اٹھائی. شہر کے دروازے کھول دیئے گئے. لوگوں نے باقاعدہ طور پر اطاعت قبول کر لی. ملک جلال الدین کے سارے طرفداروں کی تعداد بارہ ہزار افراد کے لگ بھگ تھی قتل کر دیئے گئے لیکن عام آبادی میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا. ملک ابوبکر مرحکی شہر کا گورنر مقرر ہوا اور طولی خان کا ایک منصب دار منگو خان چنگیز خان کے مفادات کا نگران بنا. نیشاپور نے بھی انہی شرائط پر اطاعت قبول کر لی. اور فاتحین نے بھی ان شرائط کی پوری پابندی کی لیکن ملک جلال الدین کو پروان کی لڑائی میں فتح حاصل ہونے کے بعد منگولوں کے خلاف ہر طرف بغاوت کے آثار نمودار ہونے لگے. ہرات کے باشندوں نے ان باغیانہ سرگرمیوں میں دل کھول کر حصہ لیا، انہوں نے ملک ابوبکر کو پکڑ کر چار سو میں اور منگو خان کو قلعہ کے باہر قتل کر دیا ؎۲

؎۱ SEISTAN — G.P. TATE.

؎۲ ABID.

الجکدائی نوئین چنگیز خان کے حکم سے ۱۲۲۱ء میں ہرات میں آدھمکا اور ہرات رود پر خیمہ زن ہوا۔ وہ غزنی سے باغیوں کو سزا دینے کے لئے آیا ہوا تھا لیکن ہرات کے باشندوں نے جو محصور ہو گئے تھے خوب تیاریاں کی ہوئی تھیں اور چھ سات مہینے گزر جانے کے باوجود منگولوں کو کوئی کامیابی نہ ہوئی آخر مجبور ہو کر منگولوں نے جولائی ۱۲۲۲ء میں ہرات کے قلعہ پر زبردست حملے کرنے شروع کر دیئے۔ ان حملوں میں ان کو کچھ کامیابی ضرور ہوئی لیکن ان کے پانچ ہزار آدمی ان حملوں کے دوران مارے گئے اور ان کے چار سو نامور فوجی قلعہ کی دیوار گرنے سے اس کے ملبے میں دب کر مر گئے اس کے بعد منگولوں نے قلعہ پر ایک زبردست دھاوا بولا اور خاک کی برجی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے وہ یہاں ہی سے شہر میں داخل ہو گئے اور انہوں نے قتلِ عام کا بازار گرم کر دیا۔ اس قتل و غارت میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ الجکدائی خان نے ایک ہفتہ شہر میں قیام کر کے اسے مسمار کر دیا اور اس کی عالیشان عمارتیں گرا دیں اس کے بعد وہ نارتو کے قلعہ پر قبضہ کرنے کے خیال سے روانہ ہوا لیکن رود آب سے دو ہزار سواروں کو واپس لوٹا دیا تاکہ قتلِ عام کے دوران جو لوگ بچ گئے تھے ان کا کام بھی تمام کر دیا جائے اس قتلِ عام میں مزید تین ہزار بیگناہ لوگ مارے گئے اور صرف سولہ آدمی بچ نکلے جنہوں نے قریب کی پہاڑیوں میں اپنے آپ کو چھپا لیا تھا۔ اس کے بعد بچ نکلنے والوں کی تعداد چالیس ہو گئی ان لوگوں نے شہر کی اس جامع مسجد میں جا کر پناہ لی جس کو شہاب الدین غوری نے تعمیر کیا تھا اور اس کے قریب

اس کا مزار بھی تھا۔ [۱]

ملک جلال الدین کے حامیوں میں سے دس ہزار کانکونی جوانوں نے قراچہ، طوغان اور سیقور کی سرکردگی میں نیشاپور اور طوس کے درمیان پہاڑیوں کو اپنا مرکز بنا کر منگولوں کے خلاف چھاپہ مار جنگوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ خر معنون منگول نے خوارزم سے ایک بڑی فوج ان کا قلع قمع کرنے کے لیے روانہ کر دی۔ ان کانکونیوں اور منگولوں میں متعدد بار سخت لڑائیاں ہوئیں اور ہر بار کانکونیوں نے شکست کھائی لیکن منگولوں کی طرف سے کوئی دو ہزار آدمی ان کے ہاتھ سے مارے گئے۔ طوغان نے کوہستان کا رخ کیا۔ قراچہ سیستان کی طرف بھاگ نکلا۔ سیقور کا اس کے بعد کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ کانکونی ہرات کی طرف بھاگ نکلے اور چار ہزار منگول سواروں نے ان کا پیچھا کیا۔ کانکونیوں نے مجبور ہو کر جامع مسجد شہاب الدین میں پناہ لی۔ منگولوں نے وہاں بھی ان کو نہ چھوڑا اور وہ سب کے سب قتل کر دیے گئے۔ ہرات اس قدر تباہ ہو گیا کہ پناہ گیروں نے پندرہ سال تک پہاڑوں کے غاروں میں زندگی بسر کی۔ [۲]

ہرات کو تہ و بالا کرنے کے بعد منگولوں نے کالیون، نارتو، نیشاپور اور شادینک پر قبضہ کر کے ان کو بھی مسمار کر دیا۔ منگولوں کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں کے دوران کالیون اور نارتو کے باشندوں نے ایک دوسرے کے

---

[۱]:- SEISTAN - G. P. TATE

[۲]:- ABID.

ساتھ اتحاد استوار کر لیا تھا اور یہاں ہی سے کچھ لوگوں نے تاجروں کے بھیس میں مختلف دروازوں سے ہرات میں داخل ہو کر ہرات کے باشندوں کو بغاوت پر اکسایا تھا۔[۱]

اس اثنا میں ملک جلال الدین سندھ سے واپس لوٹ آیا اور آتے ہی اس نے فارس سے ایک لشکر جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ اس کا ایک عزیز نیگین جو سلطان محمد کا چچازاد بھائی تھا۔ سیستان اور فراہ میں اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس کی سرگرمیاں بھی چنگیز خان کے مفادات کے خلاف تھیں۔ ان واقعات کی بنا پر منگول دوبارہ سیستان پر حملہ آور ہوئے یہاں سے ان کا ایک بڑا گروہ ۱۲۲۴ء کے موسم گرما میں مکران میں داخل ہوا اور مکران کے علاقے کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے یہ لوگ پنجگور تک جا نکلے اور انہوں نے گرمیوں کا موسم پنجگور ہی میں گزارا۔ اس زمانہ میں پنجگور کا حاکم سالار خان تھا جس نے ان کی ضروریات کو پوری کرنے میں بڑی مستعدی سے کام لیا ان لوگوں کے پاس بہت سے قیدی بھی تھے جن سے وہ لوگ خدمت گذاری کا کام لیتے تھے اور یہ لوگ ان کے لئے شالی بھی صاف کیا کرتے تھے۔ پنجگور میں ان کے قیام کے دوران وبا پھوٹ پڑی اور ان میں سے بہت سے لوگ وبائی امراض سے مر گئے۔ پنجگور سے رخصت ہوتے وقت انہوں نے ان سب قیدیوں کو قتل کر دیا۔ جن کو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔[۲]

---

[۱] SEISTAN - G.P. TATE

[۲] MEMOIRS ON THE COUNTRY AND FAMILY OF THE KHANS OF KALAT - G.P. TATE

ملک جلال الدین جب تک زندہ تھا اس نے منگولوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن منگولوں نے سیتگین کے خلاف فوجی کارروائی کر کے اسے ہلاک کر دیا۔

سلطان محمد شاہ نے کرمان کی حکومت ملک قوام الدین زوزانی کے سپرد کر دی تھی۔ اس نے ۱۲۱۲ء میں بام اور جیرفت کو فتح کیا۔ اس کے بعد گواشیر کے قلعہ پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ ملک شجاع الدین اس کا نائب تھا۔ ملک شجاع الدین ابوالقاسم نے مکران پر فوج کشی کر کے کیچ اور ترمز پر قبضہ کر لیا شاہ خیوا نے ملک قوام الدین زوزانی کی وفات کے بعد کرمان کی حکومت اپنے بیٹے غیاث الدین آق سلطان کے سپرد کر دی۔ ملک شجاع الدین اس کا نائب تھا اور اس نے اس کو گواشیر کے قلعہ کا کوتوال مقرر کر دیا۔[1]

اس کے باپ پیر شاہ کی وفات کے بعد جب غیاث الدین کرمان چلا آیا تو شجاع الدین نے اس کو گواشیر کے قلعہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی اور وہ مجبور ہو کر واپس عراق چلا گیا جہاں براق حاجب بھی اس کے پاس چلا آیا۔ وہ پہلے اس کے باپ سلطان محمد کا حاجب تھا اور وہ غیاث الدین کا امیر بننے کا خواہشمند تھا۔ براق اور اس کا بھائی حامد بُر قرا خطائی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔[2]

براق حاجب غیاث الدین کے وزیر سے ناراض ہو کر اس کی اجازت سے کرمان کے راستے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ جب اپنے اہل خاندان

---

[1] قزوینی۔

[2] ایضاً۔

اور بوا حنین کے ساتھ گواشیر اور کامیدی پہنچا تو ملک شجاع الدین نے بلا وجہ اس پر حملہ کر دیا لیکن شکست کھائی اور مارا گیا۔ اس کے بیٹے نے بھی شکست کھائی اور گواشیر کے قلعہ میں محصور ہو کر اپنے اوپر قلعہ کے دروازے بند کر لئے۔ لہ

اسی اثنا میں ملک جلال الدین سندھ اور مکران سے ہو کر کرمان پہنچا۔ مکران میں اسکے قیام کے دوران وبا پھوٹ پڑی تھی اور اس کے بہت سے سپاہی وبائی مرض سے ہلاک ہو گئے۔ براق حاجب نے اس کا استقبال کیا اور اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دی۔ ملک جلال الدین ہی نے شجاع الدین کے محصور بیٹے کو قلعہ سے باہر نکال کر اسے براق کے چنگل سے چھڑایا۔ براق حاجب نے ملک جلال الدین پر اپنے رویہ سے ظاہر کر دیا کہ وہ آسانی کے ساتھ کرمان کی حکومت چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے اور اس موقعہ پر ملک جلال الدین نے بھی حالات کو ناساز گار دیکھ کر اسے کرمان کی حکومت سے نکال باہر کرنا مناسب خیال نہ کیا اس کے بعد جب غیاث الدین اپنے اہل و عیال سمیت کرمان چلا آیا۔ تو براق حاجب کا رویہ بدل گیا تھا اور وہ اس کے ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھ کر اس سے شفقت آمیز سلوک کیا کرتا تھا۔ آخر اس نے شہزادے کو ورغلا کر اس کی والدہ سے نکاح کر لیا۔ ایک موقعہ پر وہ شہزادے کو ایک مکان میں لے جا کر قتل کرنا چاہتا تھا کہ شہزادے کے شور و غل پر اس کی والدہ دوڑتی ہوئی آئی اور اس کو بچانے کے لئے واویلا شروع کر دیا لیکن براق حاجب نے ان دونوں کی

لہ ۔ قزوینی

گردن میں رسی کا پھندا ڈال کر ان کو قتل کر دیا۔ [۵]

براق حاجب کو کرمان پر قبضہ جمانے کے دوران بہت سامان و اسباب ہاتھ آیا تھا۔ اسی بنا پر خلیفہ نے اس کی حیثیت بطور والی کرمان تسلیم کرتے ہوئے اس کو قتلغ سلطان کے لقب سے بھی نوازا اور وہ غیاث الدین کے قتل کے بعد کرمان کا والی بن گیا۔ اس نے منگولوں کی بالادستی تسلیم کر کے ان کو خراج دینا منظور کر لیا۔ [۶]

اگست ۱۲۲۷ء میں چنگیز خان فوت ہو گیا۔ منگولوں کا وہ طوفان ختم گیا جس کی لپیٹ میں تقریباً تمام ایران آ گیا تھا۔ [۷]

فروری ۱۲۲۹ء میں اوگتائی خان چنگیز خان کا جانشین بنا۔ یہ چنگیز خان کا چھوٹا بیٹا تھا اور وہ اپنے ذاتی کردار اور قتل و غارت سے نفرت کی بنا پر اپنے بڑے بھائی چغتائی خان سے مختلف طبیعت کا مالک واقع ہوا تھا۔ اس نے ۱۲۳۵ء میں ان تمام شہروں کو دوبارہ تعمیر کر کے آباد کرنے کا حکم دے دیا۔ جو اس کے باپ کی زندگی میں تباہ و برباد کئے جا چکے تھے اس نے ان تمام کاریگروں کو جنہوں نے ہرات اور دوسرے بڑے بڑے شہروں سے بھاگ کر سیستان اور فراہ وغیرہ میں پناہ لی ہوئی تھی دوبارہ بلا کر اپنے شہروں میں آباد کر دیا اس نے امیر عزالدین کو جو اہل حرفہ اور خصوصاً اعلیٰ درجہ کے پارچہ بافی کے کاریگروں

۵۔ قزوینی

۶۔ ایضاً

۷۔ سیستان۔ جی پی ٹیٹ

کا سرکردہ تھا اور جس نے ہرات کی تباہی کے بعد ایک ہزار خاندانوں کے ساتھ پیش بیغ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ دوبارہ ہرات میں آکر سکونت اختیار کرنے کا حکم دیا اور اس کے لئے تمام قسم کی سہولتیں مہیا کر دیں۔ اس نے زراعت کی طرف بھی توجہ دی اور تقریباً تمام بڑے بڑے شہروں اور علاقوں میں آبپاشی کے نظام کو دوبارہ بحال کر دیا۔ ہرات کی نہریں ۱۲۳۶ء میں مقامی آبادی میں تقسیم کی گئیں۔ سیکور، جوئے ملان انجیل اور بعض دوسری نہریں جو منہدم ہو گئی تھیں از سر نو احداث کی گئیں یا پھر ان کی مرمت عمل میں آئی۔ انجیل کے نہری نظام کی طرف خصوصیت سے توجہ دی گئی اور اس کو دوبارہ احداث یا مرمت کر کے بحال کر دیا گیا۔ زرعی پیداوار میں اضافہ اور صنعت و حرفت کے میدان میں بھی رفتہ رفتہ ترقی ہوئی۔ غرضیکہ عام لوگوں کے اعتماد کو بحال کرنے کے سلسلے میں وہ سب کچھ کیا جو ان دنوں ممکن تھا۔ اسی طرح الخان کی نہریں بھی از سر نو جاری ہو گئیں اور ہر جگہ زراعت و صنعت و حرفت کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ تجارت میں بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی۔[1]

منگولوں نے ہرات پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد کالیون کی ایک اہم شخصیت ملک مجد الدین کو ہرات کا گورنر مقرر کر دیا اس نے منگول منصبدار کاریوغ کی مدد سے نظام آبپاشی کو درست کرنے کے لئے بہت سے اقدامات کئے اور ہرات کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔[2]

---

[1] SEISTAN – G.P. TATE.

[2] ABID.

۱۲۳۵ء میں براق حاجب والی کرمان نے وفات پائی اس نے اسی سال اپنے بیٹے رکن الدین کو اوگتائی کے دربار میں بھیجا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بھتیجے قطب الدین نے کرمان کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ جب رکن الدین واپس آکر کرمان پہنچا تو قطب الدین نے کرمان کی حکومت اس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اس اثناء میں منگو خان منگول ماوراءالنہر میں چنگیز خان کے تخت پر بیٹھا تھا اور رکن الدین کے لئے حالات بدل چکے تھے۔ رکن الدین نے اپنی شکایات منگو خان کے دربار میں پہنچا دیں اور اس نے دونوں کو اپنے دربار میں بلایا اور دونوں کی باتیں سننے کے بعد رکن الدین کو اس کے چچا زاد بھائی قطب الدین کے حوالے کر دیا اور قطب الدین نے اس کو قتل کر دیا۔ قطب الدین نے ایک طویل عرصہ تک منگولوں کے باجگذار کی حیثیت سے کرمان پر حکومت کی اور ۱۲۵۷ء میں وفات پائی۔[۱]

۱۲۴۶ء میں منگولوں نے ایک سازش کے تحت ملک مجد الدین کو قتل کر دیا اور ۱۲۴۷ء میں اس کا بیٹا ملک شمس الدین باطو خان منگول کی مرضی سے ہرات کا گورنر مقرر ہوا۔ ۱۲۵۰ء میں شمس الدین لاچی کے ایما پر ملک شمس الدین کو اس کے ایک قابل اعتماد ملازم نے زہر دے کر ہلاک کر دیا شمس الدین لاچی جو نائب گورنر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتا تھا انتقام کے خوف سے بھاگ نکلا اور ملک کا انتظام عملی طور پر اہل کرت کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا۔[۱]

۱۔ SEISTAN – G.P. TATE

سولھواں باب

اہلِ کرت

اس زمانہ میں جب کہ چنگیز خان کے منگول خراسان کے صوبے کو تاخت و تاراج کر رہے تھے ملک رکن الدین کرت خیسار کے قلعہ میں محصور ہو گیا لیکن خیسار کا قلعہ منگولوں کے ہاتھوں فتح نہ ہو سکا۔ آخر کار منگولوں نے تنگ آکر ملک رکن الدین سے صلح کر لی اور اس کو غور کا حکمران تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے اسی بنا پر ملک رکن الدین کے ورثا غور کی حکومت پر اپنا حق جتاتے تھے ملک رکن الدین، ملک تاج الدین عثمان کا بیٹا اور عز الدین عمر مراغانی کا بھائی تھا جو سلطان غیاث الدین غوری کا وزیر اعلیٰ رہ چکا تھا۔ عز الدین نے اپنے دورِ وزارت میں اپنے تمام عزیزوں کو کسی نہ کسی صوبے کا حاکم مقرر کر دیا تھا خیسار کا قلعہ اس نے ملک تاج الدین کے حوالہ کیا۔ اس کی وفات کے بعد اس قلعہ پر اس کے بیٹے شمس الدین کا قبضہ ہو گیا۔[۱]

تاریخ وصاف کے مطابق ملک شمس الدین کرت اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کا مورثِ اعلیٰ اسی ضلع میں سلطان محمود غزنوی کی فوج کا

ل: - SEISTAN – G.P TATE

سپہ سالار رہ چکا تھا۔ اور اس کے دربار میں بڑا رسوخ رکھتا تھا۔ وہ خود شہاب الدین غوری کی برادری سے تعلق رکھتا تھا۔ ۱۲۴۶ء میں وہ سالی نوئین کے ساتھ ہندوستان چلا گیا۔ اس کے بعد وہ سالی نوئین کو چھوڑ کر خراسان میں طاہر بہادر کے پاس چلا آیا اور اس کی وفات تک جو ۱۲۴۶ء میں واقع ہوئی اسی کے پاس مقیم رہا۔ اس کے بعد اس نے منگو خان کے دربار سے اپنے آپ کو وابستہ کر دیا جو ان دنوں چنگیز خان کے تخت پر ماوراء النہر میں جلوہ افروز تھا۔[۱]

منگو خان نے ہرات کی حکومت ملک شمس الدین کے حوالے کر دی۔ اور وہ تمام ایالات جو ہرات سے وابستہ تھے۔ مثلاً جام کنارا کوہ سوبہ۔ فیروزکوہ، غرجستان، مرغاب، مارو چک اور فاریاب کا علاقہ دریائے سیحون تک اس کے اختیار میں دے دیئے۔ اس کے علاوہ اسفرار، فراہ، سیستان وہ علاقہ جس کا صدر مقام بست تھا جو شمالی بلوچستان اور جنوبی افغانستان پر مشتمل تھا۔ تاکیاں، کابل، تیرا کا علاقہ دریائے سندھ تک اس کے دائرہ اختیار میں آ گئے۔ ملک شمس الدین نے ۵۵-۱۲۵۴ء میں ہرات پہنچ کر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔[۲]

اس زمانہ میں ملک میران شاہ مستونگ کا حاکم تھا اس کا بھائی ملک تاج الدین اس کا مخالف بن گیا۔ وہ یہاں سے بھاگ کر ہرات چلا گیا اور ملک شمس الدین کے دربار میں رسائی حاصل کر لی۔ اس نے اپنے بھائی کے خلاف

---

[۱] :- SEISTAN- G.P.TATE

[۲] :- ABID.

شکایات پیش کر کے اس کو مستونگ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ ملک شمس الدین نے ۱۲۵۰ء میں ایک بڑے لشکر کے ساتھ مستونگ پر حملہ کر کے مستونگ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور اہالیانِ مستونگ کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ ملک میران شاہ مستونگ سے تیری چلا گیا اور قلعہ کوشنگ میں پناہ لی۔[۱]

ملک شمس الدین نے مستونگ کا قلعہ ملک تاج الدین کے حوالے کر کے اس کو اس کے بھائی کی جگہ مستونگ کا حاکم مقرر کر دیا اور خود کوشنگ کے قلعہ پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا۔ پورے تین مہینے تک ملک میران شاہ کوشنگ کے قلعہ میں محصور رہا۔ اس کے دونوں بھائی بہرام شاہ اور شہنشاہ اس کے ساتھ تھے۔ آخر کار ملک میران شاہ قلعہ سے باہر نکل آیا اور ملک شمس الدین کی فوج سے خنڈ کے کھلے میدان میں نبرد آزما ہوا۔ اس نے ملک شمس الدین کے ہاتھ سے شکست کھائی وہ خود سیستان کی طرف بھاگ نکلا اور کچھ عرصہ بعد ملک شمس الدین کے ہاتھ سے قتل ہوا۔[۲]

دوسرے سال اہالیان تیری جو مستونگ کے شمال میں اس سے آٹھ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ بغاوت پر آمادہ ہو گئے اور ملک تاج الدین کا حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ ملک تاج الدین نے دوبارہ ہرات سے امداد طلب کی۔ ملک شمس الدین نے دوبارہ تیری پر حملہ کر کے تیری کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اہالیانِ تیری کے سرکردہ ملک عالم آرا نے اس کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور اپنے

---

[۱] تاریخ ہرات۔ عبدالرزاق زبیر۔

[۲] ایضاً۔

پچاس کے قریب ساتھیوں کے ساتھ میدان جنگ میں کام آیا اور جو لوگ گرفتار ہوئے وہ بھی قتل کر دیئے گئے اس کے علاوہ تین سو کے قریب سرکردہ افراد کی گردنوں میں رسی ڈال کر ان کو تیری کی گلی کوچوں میں گھسیٹا گیا اور کئی سرکردہ لوگوں کی ناک اور کان کاٹ کر ان کے چہرے مسخ کر دیئے گئے۔ اس کے بعد شمس الدین دوبارہ ہرات چلا گیا۔[۱]

اس نے ۵۹-۱۲۵۸ء میں بکر کا قلعہ بھی فتح کر لیا جو افغانی علاقہ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس قلعہ میں قلعہ کے کوتوال نے کئی خروار غلہ جمع کر لیا تھا اس پر بھی اس نے قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ اس مہم کے دوران اس نے دس ہزار دینار نقد اور بہترین عربی گھوڑے اور دیگر قیمتی اشیاء و نوادرات بطور تاوانِ جنگ حاصل کیے۔ اس کے بعد زمیندارڈ کے علاقے میں داخل ہو گیا اور یہاں اس نے ملک میران شاہ کو قتل کر دیا جس نے مستونگ سے بھاگ کر یہاں پناہ لی تھی۔[۲]

۱۲۶۲ء میں جبکہ ملک شمس الدین ہرات میں تھا۔ قندھار کا نقودری حاکم بغاوت پر آمادہ ہوا اور منگولوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہا۔ اباقا خان منگول نے اس کی سرکوبی کے لئے ملک شمس الدین سے امداد طلب کر لی اور اس مقصد کے لئے اپنے بھائی طبسیں کو ہرات روانہ کر دیا۔ ملک شمس الدین اور طبسیں نے مل کر نقودریوں کا مقابلہ کر کے ان کو شکست دی۔ نقودری رہنما نے وہاں سے بھاگ کر مستونگ میں ملک تاج الدین حاکم مستونگ کے ہاں پناہ لی۔

---

[۱] :۔ تاریخ ہرات۔ عبدالرزاق زبیر۔

[۲] :۔ سیستان۔ جی۔ پی ٹیٹ

طبیس کی مرضی کے مطابق ملک شمس الدین، اختیار الدین، طلوک پہلوان اور محمد ناہی کو اپنے ساتھ لے کر مستونگ پہنچا۔ ملک تاج الدین اس کا مقابلہ کرنے کے خیال سے شہر سے باہر نکل آیا تھا۔ ہرمز۔ تاتاری بھی اس موقعہ پر ملک تاج الدین کی امداد کے لیے قلعہ ہرمز سے باہر آگیا تھا۔ اس موقعہ پر ملک شمس الدین اور تاج الدین حاکم مستونگ کے درمیان جو معمولی سی لڑائی ڈیڈ ہنگ آباد کے قریب کھلے میدان میں ہوئی اس میں تاج الدین اور ہرمز کے کوئی بیس آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد ملک شمس الدین دوبارہ ہرات چلا گیا۔[۱]

۱۲۶۳ء میں ملک شمس الدین سیستان میں تھا کہ اس کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں۔ شہزادہ بالو نے اپنے بھتیجے بلغا کو حکم دیا کہ وہ ملک شمس الدین کو سیستان سے گرفتار کر کے لائے۔ بلغا نے اپنی طرف سے قطوگہ نوئین کو اس کام پر مامور کر دیا۔ قطوگہ نے والی سیستان ملک علی مسعود کے ذریعے اس کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ لیکن ملک شمس الدین کو اس سازش کا پہلے ہی سے علم ہو گیا تھا۔ جب ملک علی مسعود سیستان میں اس کے پاس پہنچا تو ملک شمس الدین نے اس کو پکڑ کر قتل کر دیا اور خود سیحون پار جا کر الغان کے دربار میں پناہ لی اور اس کو ان سازشوں کا حال بتلا دیا۔ الغان کو اس کی وفاداری پر بھروسہ تھا۔ اس نے ملک شمس الدین کو دوبارہ ہرات کی حکومت پر فائز کر دیا۔[۲]

---

[۱] :۔ تاریخ ہرات ۔ عبدالرزاق زبیر۔

[۲] :۔ سیستان ۔ جی پی ٹیٹ۔

۶۷۔ ۶۶-۱۲۶۵ء میں ملک شمس الدین عراق میں اباقاخان کے دربار میں حاضر ہوا اور وہاں اس کے حریف براقاخان کے خلاف چند لڑائیوں میں حصہ لیا اور اس کے بعد دوبارہ ہرات چلا آیا۔[1]

۶۸۔ ۱۲۶۷ء میں وہ الخان کے دربار میں حاضر ہوا جو ماوراالنہر میں چنگیز خان کے تخت پر متمکن تھا۔ ان دنوں ملک شمس الدین کی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اور ایک وسیع ملک پر اس کا اقتدار قائم ہو گیا تھا۔ اس موقعہ پر الخان نے اس کو اپنے دربار میں موجود رہنے کا حکم دے دیا اور اس کے بھائی اور بیٹے رکن الدین کو دربند باقور روانہ کر دیا۔[2]

۶۸۔ ۱۲۷۷ء میں اباقاخان کے حکم سے اس کو زہر پلا کر ہلاک کر دیا گیا۔ اباقاخان کو اس سے اس قدر خوف پیدا ہو گیا تھا کہ جب اس کو اس کی ہلاکت کی اطلاع مل گئی تو اس نے اس خبر کی تصدیق کے لئے عراق سے اپنا ایک خاص قاصد روانہ کر دیا۔ اس خبر کے درست ثابت ہونے پر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔[3]

۷۹۔ ۱۲۷۸ء ہی میں اباقاخان نے ہرات کا دورہ کیا اور اس موقعہ پر شہر کی حالت دیکھ کر اس نے محسوس کیا کہ روز بروز ابتری اور بدانتظامی پھیلتی جا رہی ہے اور اس نے یہ بھی خیال کیا کہ تاجکوں کے بغیر منگول اس

---

[1]۔ SEISTAN- G.P.TATE.

[2]۔ ABID.

[3]۔ ABID.

کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام نہیں دے سکتے ہیں۔ اس نے ملک رکن الدین کو اس کے باپ کی جگہ ہرات کی حکومت پر فائز کر دیا اور ان تمام علاقوں کا انتظام اس کے سپرد کر دیا جو اس سے پیشتر اس کے باپ کے زیر فرمان تھے اس کو شمس الدین کے لقب سے بھی نوازا اور اس بنا پر وہ تاریخ میں ملک شمس الدین اصغر کے نام سے مشہور ہوا۔[1]

۱۲۸۱ء میں قندہار کے حاکم نے ملک رکن الدین کی اطاعت سے روگردانی کی اور خود مختار بن بیٹھا۔ اس نے قندھار پر حملہ کر کے اس علاقے کو دس دن تک تاخت و تاراج کیا اور ولایت قندہار پر اس کا پوری طرح قبضہ ہو گیا۔[2]

اس زمانے میں انتظام حکومت کو خوش اسلوبی سے چلانا ایک دشوار مسئلہ بن گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں الخان ہی چنگیز کے مقبوضات کا مختار کل تھا۔ الخان کی حکومت کے تحت منگول شہزادے منگولوں کی ٹولیوں کو اپنے ساتھ لے کر شمالی مشرقی اور جنوبی صوبوں میں دور دور تک جاتے تھے۔ ان کا مقصد لوگوں سے زبردستی مالیہ خراج اور جرمانہ وصول کرنا تھا۔ یہ لوگ جہاں کہیں جاتے تھے تو اہلِ زراعت اہلِ حرفہ اور تاجروں سے مالیہ اور ٹیکسوں کے نام پر دولت حاصل کرتے تھے۔ قاعدہ اور قانون سے ان کو غرض نہیں تھی اور وہ حاکمان صوبجات کی پرواہ نہیں کرتے تھے بلکہ

ط [1]:- SEISTAN – G.P.TATE.

ط [2]:- ABID.

ان کے کام میں بیجا مداخلت کر کے انتظام حکومت کو درہم برہم کرنے کا باعث تھے۔ یہ معمولی شہزادے پورے شاہی اختیارات استعمال کرتے تھے ان کے جاری کردہ احکامات کو شاہی خاندان کے افراد میں سے صرف الخان ہی مسترد اور منسوخ کر سکتا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر ۱۲۸۲ء میں ملک فخرالدین نے اپنے بیٹے ملک علاؤالدین کے حق میں ہرات کی حکومت سے دست بردار ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔[1]

ملک علاؤالدین کو بھی ان ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا جن حالات سے ملک رکن الدین کو سابقہ پڑا تھا اور وہ بڑی مشکلات میں پھنس گیا۔ ایک طرف رعایا تھی جن سے وہ مالیہ وصول کرتا تھا اور جن کی حفاظت اس کے فرائض منصبی میں داخل تھا۔ دوسری طرف منگول شہزادے تھے جن سے رعایا کی جان اور مال محفوظ نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہرات کے لوگوں نے نقل مکانی شروع کر دی اور دوسرے صوبوں اور علاقوں کی طرف بھاگ نکلے۔ ہرات کا شہر شرفا سے خالی ہو گیا۔[2]

ان دنوں اباچی نقودری نے بھی ہرات پر حملہ کر دیا اور رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اس نے ہرات اور اس کے دوسرے اضلاع کو لوٹا۔ لوگوں کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا اور ان کے خاندانوں کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آیا۔ ان حالات میں ملک علاؤالدین کے لئے حکومت کا کاروبار چلانا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ آگے چل کر اس نے بھی ہرات کی حکومت سے

[illegible] SEISTAN- G.P.TATE.

دست بردار ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔[ثلے]

[۱۲۹۱] سنہ میں آخر کار غزن خان نے ملک حسام الدین بستر داری، ملک جلال الدین فراہی اور ملک نصر الدین سیستانی کے نام فرامین جاری کر کے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ان لوگوں کو جو ہرات چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ دوبارہ ہرات میں آکر سکونت اختیار کرنے کی ترغیب دیں اور ان کو یقین دلایا جائے کہ ان کی دوبارہ آبادکاری اور تحفظ کے لئے ہر ممکن انتظامات کئے جائیں گے۔ الخان نے بھی اس قسم کی تعدیوں اور مظالم کے تدارک کے لئے امیر نیروز کی سرکردگی میں پانچ سو گھوڑ سواروں کا ایک دستہ بھی ہرات روانہ کر دیا تاکہ ہرات کے صوبے کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کیا جا سکے اور نظم و نسق کو دوبارہ بحال کیا جا سکے۔ اس نے مالیہ اور ٹیکسوں کی معافی کا بھی اعلان کر دیا۔ ان انتظامات کے نتیجہ میں ان تمام لوگوں نے ہرات میں آکر سکونت اختیار کر لی جو اس سے پہلے دوسرے علاقوں میں نقل مکانی کر کے چلے گئے تھے۔ اس سے ہرات میں دوبارہ چہل پہل شروع ہوئی اور اس کے بازاروں کی رونق بڑھ گئی۔[ثلہ]

ملک شمس الدین نے اپنے بیٹے ملک فخر الدین کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا تھا۔ امیر نیروز نے اس کو رہا کر کے اس کی تربیت کی اور اس سے الخان کے مخالفوں کے خلاف کام لیا۔ اس زمانہ میں جبکہ نیلگین عراق میں

ثلے :- SEISTAN - G.P. TATE.

ثلہ :- ABID.

تھا۔ امیر نمیروز نے اس کے بھائی جلال الدین کو پکڑ کر غرجستان کے قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ عراق سے واپسی پر جب نیگیین کو اپنے بھائی کا حشر معلوم ہوا تو وہ غرجستان کے قلعہ پر حملہ کر کے اس پر قابض ہو گیا اور اس کے بعد اس نے اپنے بھائی کو رہا کر دیا۔ امیر نمیروز نے ملک فخرالدین کو اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کر دیا۔ ملک فخرالدین نے اس کو اطاعت قبول کرنے پر آمادہ کیا اور ساتھ ہی یقین دلایا کہ وہ اس کی خطا معاف کرانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔[۱]

اس زمانہ میں جبکہ ہرات تباہ ہو رہا تھا۔ فراہ کا حکمران اس افراتفری اور بدانتظامی سے فائدہ اٹھا کر خود مختار بن بیٹھا تھا۔ اس موقعہ پر شہزادہ دوآنے جو برقہ کا بیٹا تھا۔ دس ہزار منگولوں کے ساتھ خراسان میں داخل ہو کر ملک فخرالدین کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے انکار کر دیا اور امیر نمیروز کے ساتھ غزن خان کے دربار میں عراق چلا گیا۔ الخان اس سے بہت خوش ہوا اور ہرات کی حکومت اس کے سپرد کر دی۔ اس نے سب سے پہلے فراہ کے والی کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ بدقسمتی سے غزن خان کسی بات پر امیر نمیروز سے ناراض ہو گیا اور امیر موصوف نے اس کے ڈر سے بھاگ کر ہرات میں ملک فخرالدین کے ہاں پناہ لی۔ امیر قتلغ سات ہزار منگول سپاہیوں کے ساتھ اس کے تعاقب میں ہرات چلا آیا۔ امیر قتلغ اور اسکے سپاہیوں نے سات دن تک ہرات کے شہر کو لوٹا اور آس پاس کے اضلاع کو تاخت و تاراج کیا اور ملک فخرالدین سے مطالبہ کیا کہ امیر نمیروز کا بازو ان کے حوالے کیا جائے تاکہ اس سے انتقام لیا جائے۔ ملک فخرالدین نے مجبور ہو کر امیر نمیروز کا

---

[۱] SEISTAN – G. P. TATE.

بازو ان کے حوالے کر دیا اور ۱۲۹۶ء میں انہوں نے اسے قتل کر دیا۔[1]

۱۲۹۶ء میں ملک فخر الدین کی رضامندی سے امیر نقودر نے تین ہزار نقودریوں کو ساتھ لے کر ہرات میں سکونت اختیار کر لی یہ لوگ بڑے سرکش قسم کے انسان تھے۔ لوٹ مار اور ڈاکہ زنی ان کا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔ اگرچہ ان کو اچھی آمدنی بھی ہوتی تھی۔ لیکن اپنی عادت سے مجبور ہو کر انہوں نے آس پاس کے علاقوں میں سیستان تک لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ غزن خان نے اپنے بھائی خدا بندہ کو ان کی سرکوبی پر مامور کیا۔ ملک فخر الدین کو اس کارروائی سے اتفاق نہیں تھا اس نے مخالفت کی اور خدا بندہ نے ناراض ہو کر ہرات پر حملہ کر دیا۔ ملک فخر الدین ہرات سے نکل کر قلعہ امان کوہ میں محصور ہو گیا۔ منگولوں نے چار دن تک اس کا محاصرہ کیا اور پانچویں دن دونوں فریق کے درمیان لڑائی ہوئی ملک فخر الدین کا پلہ بھاری رہا۔ اس کے ہاتھ سے منگولوں کے دو ہزار آدمی قتل اور اتنے ہی زخمی ہوئے۔ ملک فخر الدین منگولوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچانے کے بعد راتوں رات ہرات چلا گیا جب منگولوں نے اس کا پیچھا کیا تو وہ غور کی طرف فرار ہو گیا۔ خدا بندہ نے ہرات کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن یہ محاصرہ بیسود ثابت ہوا کیونکہ ملک فخر الدین ہرات میں موجود نہیں تھا۔ اٹھارہ دن کے بعد جب منگولوں نے ہرات کا محاصرہ اٹھایا تو اس نے دوبارہ ہرات پہنچ کر شہر کے استحکامات درست کیے۔ ۱۳۰۱ء تک یہ کام مکمل ہو گیا۔[2]

---

[1] SEISTAN – G.P. TATE

[2] ABID.

۱۳۰۲ء میں اس نے سبزوار پر حملہ کر دیا تاکہ وہ ملک حسام الدین اور اس کے بھائی ملک رکن الدین کو قرار واقعی سزا دے سکے جو اس کی اطاعت سے روگردان ہو چکے تھے۔ حسام الدین فوت ہوگیا اور رکن الدین رباط کے قلعہ میں محصور ہوگیا اور یہ محاصرہ مجبوراً اٹھا لیا گیا۔ اس کے بعد ملک فخر الدین نے دو بار سبزوار پر چڑھائی کی۔ پہلی بار اس کا حملہ ناکام ہوا۔ دوسری بار اس کا بھائی اس کی امداد پر آ گیا اور دونوں نے ایک خونریز جنگ کے بعد جو ایک ہفتہ تک جاری رہی، سبزوار فتح کر لیا۔ ملک رکن الدین بھاگ نکلا البتہ اس کا بیٹا عز الدین گرفتار ہوا اور ملک رکن الدین نے اس کو قید کر دیا۔ ملک شمس الدین اصغر نے جو ملک رکن الدین کا باپ تھا، ۱۳۰۵ء میں گوشہ نشینی میں وفات پائی۔

۱۳۰۴ء میں غزن خان کی جگہ خدا بندہ نے اقتدار اعلیٰ کے اختیارات سنبھالے اور اجیتو سلطان کے لقب سے حکومت کرنے لگا۔ ۱۳۰۶ء میں ملک فخر الدین اور خدا بندہ کے درمیان پرانی دشمنی دوبارہ شروع ہو گئی۔ اجیتو سلطان نے اپنے بھائی دانشمند بندہ کو اس کی گرفتاری کے کام پر مامور کر دیا۔ ملک فخر الدین نے امان کوہ کے قلعہ میں پناہ لی۔ اس کا بیٹا ملک جمال الدین محمد سام ہرات کی فوجی چھاؤنی میں ٹھہرا۔ منگولوں اور جمال دین کے درمیان جھڑپیں شروع ہوئیں۔ دانشمند بندہ منگولوں کے چند دستوں کے ساتھ فوجی مستقر کے ایک کونے میں گھس گیا۔ ملک جمال الدین نے آگے بڑھ کر ان سب کو قتل کر دیا۔[1]

اس موقعہ پر فراہ کا حکمران ملک نیتگین بھی منگولوں کی امداد پر آیا ہوا تھا

---

[1] :- SEISTAN - G.P.TATE.

جب اس کو منگولوں کا حشر معلوم ہوا تو وہ سر پہ پاؤں رکھ کر سیستان کی طرف بھاگ نکلا۔[1]

۱۳۰۰ء میں دانشمند بندہ کے بیٹے بوجاؤ نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ ہرات پر حملہ کیا اور اس کے بعد شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ملک فخرالدین نے وفات پائی اور ملک جلال الدین نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے اور امیر بوجاؤ نے اس کو اپنے باپ کے قصاص میں قتل کر دیا۔[2]

جنوری ۱۳۰۷ء میں ملک فخرالدین کی وفات کے بعد اس کا بھائی ملک غیاث الدین ہرات کا حکمران بن گیا۔ اس نے غور اور اسفرار کا دورہ کیا۔ منگولوں نے جلد ہی اس کے خلاف سازشیں شروع کر دی۔ ۱۳۱۱ء میں اجیتو سلطان نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ چار سال اس کے پاس ٹھہرا رہا۔ ۱۳۱۵ء میں اجیتو سلطان نے ہرات کی حکومت پر اس کو دوبارہ بحال کر دیا۔[3]

۱۳۱۶ء میں شہزادہ یسور نے خراسان کو تاخت و تاراج کیا جو چنگیزی منگولوں کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ملک غیاث الدین نے پورے سال اس کا مقابلہ کیا۔ ۱۳۱۶ء میں اجیتو سلطان نے وفات پائی اور اس کی بجائے ابو سعید سلطان اقتدار اعلیٰ کے منصب پر فائز ہو گیا۔ ملک غیاث الدین کو ابو سعید سلطان کی تائید حاصل ہو گئی لیکن شہزادہ یسور نے علاقے میں لوٹ مار بدستور جاری رکھی۔ سبزوار، فراہ اور سیستان کے صوبے ہرات کے ماتحت تھے لیکن

ف ۱- SEISTAN – G.P.TATE.

ف ۲- ABID

ف ۳ – ABID

ان صوبوں کے باجگذار حکمرانوں نے ہرات کے ساتھ اپنا تعلق ختم کرکے اپنے آپ کو شہزادہ یسور کے ساتھ وابستہ کر دیا اور ملک غیاث الدین کی اطاعت سے منہ موڑ لیا۔ ملک قطب الدین اسفرازی نے اکل کے قلعہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ ملک نیتگین بھی فراہ سے ایک لشکر منظم کرکے اس کی امداد کو آیا لیکن امیر علی خطائی نے جو ملک غیاث الدین کی جانب سے اس علاقے کا حاکم تھا۔ ان کے ساتھ مقابلہ کرکے ان کو اسفرار کے قلعہ میں محصور کر لیا۔ ملک غیاث الدین بھی اس موقعہ پر اسفرار چلا آیا۔ شکران کے میدان میں دونوں فریق کے درمیان سخت لڑائی ہوئی اس لڑائی میں نیتگین کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ نکلا۔ قطب الدین اور اس کے بیٹے نے بھی شکست کھائی ان کو گرفتار کرکے ہرات پہنچا دیا گیا اور وہاں ان کو خوب زدوکوب کیا گیا۔[۱]

ملک غیاث الدین نے اسی سال دیار بکر کو فتح کیا۔ ۱۳۲۰ء میں اس نے اپنے طاقتور حریف شہزادہ یسور کو گرفتار کرکے قتل کر دیا۔ اس کے بعد نیتگین کو بھی دوبارہ شکست دے کر قرار واقعی سزا دی اس کو ان لڑائیوں میں بہت سامال غنیمت ہاتھ آیا۔ اس نے ۱۳۲۹ء میں وفات پائی۔ جامع مسجد شہاب الدین کی مرمت اس کا بڑا کارنامہ خیال کیا جاتا ہے جس کو منگولوں کے ابتدائی حملوں کے دوران سخت نقصان پہنچا تھا۔[۲]

ملک غیاث الدین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ملک شمس الدین ثانی اس کا جانشین بنا۔ لیکن جلد فوت ہو گیا۔ اس کے بعد ہرات کی حکومت پر ملک حفیظ

۱۔ ۲۔ BEISTAN — G. P. TATE.

کو فائز کیا گیا لیکن اس سے بھی کام نہ چل سکا۔ آخر کار ملک غیاث الدین کا سب سے چھوٹا بیٹا معزالدین ہرات کا حکمران بنا۔ اسی اثنا میں ۱۳۳۵ء میں ابو سعید سلطان فوت ہوگیا جو چنگیز خان کے خاندان کا آخری طاقتور اور بلند مرتبہ شہزادہ تھا۔ اس کی وفات کے بعد چنگیز خان کے تخت پر بیٹھنے کے لئے ایسا کوئی شہزادہ باقی نہیں رہا جو اس عہدہ جلیلہ کے اہل ہو۔ اس کی وفات کے بعد ہر طرف بغاوت کے آثار نمودار ہوئے اور افراتفری پھیل گئی۔ اس کی جانشینی پر مغلوں میں خانہ جنگی کا آغاز ہوگیا اور ملک میں بدامنی اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔ لیکن اس نازک دور میں ملک معزالدین نے اپنے آپ کو ایک بڑا لائق، باہمت، دلیر، حوصلہ مند اور منصف مزاج حکمران ثابت کر دیا۔ اس کی حکومت اس افراتفری اور ظلم و ستم کے زمانہ میں مظلوموں اور کمزوروں کی پناہ گاہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی موجودگی میں زورآوروں کو کمزوروں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ملک معزالدین نے ان نامساعد حالات میں اپنی طاقت کو اور زیادہ مستحکم کر لیا۔ اس نے سب سے پہلے بادغیس کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور اس کے بعد بلخ، سیبار خان اور اندخود پر چڑھائی کی۔ اس نے آرلات اور آب درد کے قبائل کے خلاف فوج کشی کر کے ان کو تہ تیغ کر دیا۔ اس موقعہ پر اس کے ہاتھ سے اتنے آدمی قتل ہوئے کہ اس نے ان مقتولوں کے سروں سے دو مینار کھڑے کر دیئے۔ چونکہ سیحون پار کے علاقوں میں خانہ جنگی پھیل گئی تھی اس لئے اس کو اپنی طاقت مضبوط کرنے کا اور زیادہ موقعہ ملا اور وہ ایک آزاد اور

ماخذ:۔ SEISTAN - G.P.TATE.

خود مختار حکمران کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا۔ اس نے ہرات کے استحکامات کو اور زیادہ مضبوط کر کے اس شہر کو ناقابلِ تسخیر بنا دیا۔ ۱۳۰۵ء میں اس نے سیستان کے کیانی حکمرانوں کے خلاف فوج کشی کی لیکن نوبت لڑائی تک نہ آئی۔ شیخ علاؤ الدین کے مریدوں نے فریقین کے درمیان صلح کرا دی۔ سیستان کے حکمران ملک قطب الدین نے جو شاہ رُخ کا بیٹا تھا اور اپنے چچا ملک نصرت کی جگہ سیستان کا حکمران بن گیا تھا۔ ملک معز الدین کی بالادستی تسلیم کر لی اور اس کو خراج دینا منظور کر لیا اس معاملہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ چنگیزی منگولوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اہلِ کرت خاندان کے حکمرانوں نے اپنی حاکمانہ حیثیت برقرار رکھی اور وہ منگول جنہیں اس خاندان پر بالادستی حاصل تھی زوال سے دوچار ہو گئے۔[۱]

ملک معز الدین کی قلمرو میں بادغیس کا علاقہ بھی شامل تھا۔ جہاں کے باشندے زیادہ تر ترک قبیلوں پر مشتمل تھے۔ ان دنوں ماوراء النہر کے علاقوں میں ایک چنگیزی منگول قبیلہ لورث کا سردار امیر عزیز برسراقتدار تھا۔ ترک قبیلوں کے بعض صاحب رسوخ افراد نے امیر عزیز سے ملک معز الدین کی زیادتیوں کی شکایت کی۔ اس نے ۱۳۵۲ء میں کاشغر اور اندخود کے درمیان ترک قبیلوں کو بلخ کے مقام پر جمع ہونے کا حکم دے دیا۔ ملک معز الدین کو بھی امیر عزیز کی اس کارروائی کا علم ہو گیا۔ اس نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ہرات کے شمال میں خندقیں کھدوائیں اور ایک بڑا لشکر بھی منظم کیا جس میں چار ہزار گھوڑ سوار اور بارہ ہزار پیدل سپاہی تھے جب

۱۔ SEISTAN - G.P TATE.

ترکوں کا لشکر ہرات میں پہنچا تو ملک معزالدین کو اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ اطاعت قبول کرنے پر راضی ہوگیا۔[1]

اس کی اس قسم کی بعض حرکتوں سے غوری بھی اس سے ناراض تھے انہوں نے اس کو ہرات کی حکومت سے علیحدہ کرکے اس کے بھائی ملک ابوبکر کو ہرات کا حکمران بنادیا۔ معزالدین سیمون پار کے علاقوں کی طرف بھاگ نکلا اور وہاں سے امداد حاصل کرکے دوبارہ ہرات پر قابض ہوگیا۔ ۱۳۵۵ء میں کوہستان کے حکمران سلیتش اور امیر محمد خواجہ کے ساتھ اس کی ان بن ہوگئی ان ترک سرداروں کے حامیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن یہ دونوں سردار معزالدین کے ہاتھ سے لڑائی میں مارے گئے اور ان کو مکمل شکست ہوگئی۔[2]

ملک معزالدین نے اب محسوس کرلیا کہ اس کی عمر اب زیادہ دیر وفا نہیں کرے گی۔ وہ ہرات کی حکومت سے اپنے بیٹے غیاث الدین پیر علی کے حق میں دست بردار ہوگیا۔ غور کے امراء نے غیاث الدین پیر علی کو ہرات کا حکمران بنادیا۔ ملک معزالدین نے سرخس کا علاقہ اپنے چھوٹے بیٹے ملک محمد امیر خورد کو عطا کیا۔ اس نے ۱۳۷۱ء میں وفات پائی۔[3]

---

[1] SEISTAN- G.P TATE.

[2] ABID.

[3] ABID.

ستر ھواں باب

تیمور لنگ اور آلِ تیمور

تیمور لنگ ۱۳۳۶ء میں ماوراالنہر کے ایک گاؤں کش کے مقام پر پیدا ہوا۔ اسی سال چنگیز خان کے خاندان کا آخری حکمران اعلیٰ ابو سعید سلطان فوت ہوا۔ ابو سعید سلطان کی وفات سے منگول مقبوضات اور خصوصاً سیحون پار کے علاقوں میں جو سیاسی اور فوجی خلا پیدا ہو گیا تھا۔ تیمور نے ہوش سنبھالتے ہی اسے پر کر دیا۔ اس نے تھوڑے عرصہ کے اندر اپنے آپ کو ایشیا کا سب سے بڑا فاتح ثابت کر دیا۔ اس کی قابلِ قدر فتوحات سیاسی بصیرت اور فوجی حکمت عملی کی وجہ سے منگولوں کے وقار میں بڑا اضافہ ہوا اور ایشیا میں ان کی بالادستی از سرِ نو قائم ہو گئی۔[۱]

اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں وہ زیادہ تر اس سیاسی کشمکش میں مصروف تھا جو سیاسی اقتدار کی دوڑ میں سیحوں پار کے علاقوں میں واقع ہو رہی تھی اپنی زندگی کے انہی ایام میں اس کا سابقہ ہرات کے اہلِ کرت تاجک شہزادوں اور سیستان کے تاجک الاصل کیانی ملکوں کے ساتھ پڑا۔ انہی

۱۔ SEISTAN – G.P. TATE.

ایام ہی میں اس کو بلوچستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کا موقعہ ملا اور اس کی ٹانگ میں جو مستقل عیب پیدا ہوا وہ بھی یہاں کے ایک باشندے کی تیر اندازی کا کرشمہ تھا جو بلوچستان کی سرحد کے نزدیک سیستان میں ایک معرکہ کے دوران پیش آیا[1]

اس کی زندگی میں ایک اہم موڑ آنے سے تھوڑا عرصہ پہلے وہ دریائے سیحون کے جنوبی علاقوں میں داخل ہونے پر مجبور ہوا۔ اس موقعہ پر اس کا بڑا اتحادی امیر حسین اس کے ہمراہ تھا جو چنگیز خان کی نسل سے تھا۔ اس نے قندھار کی سمت میں باختر زمین اور قرمز کا رخ کیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کسی موزوں وقت پر قندھار پر قبضہ کر کے اسے اپنا صدر مقام قرار دے۔ اس وقت اس کی عمر انتیس سال کی تھی۔ ۱۳۶۳ء کے دوران سیستان میں وہاں کے کیانی حکمران ملک جلال الدین کے خلاف بغاوت کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ کیانی ملک نے اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے کے لیے تیمور سے امداد طلب کر لی۔ تیمور کے لئے یہ ایک زرین موقعہ تھا۔ اس نے فوراً ایک ہزار منگول شاہسواروں پر مشتمل ایک لشکر ترتیب دیا اور اپنے اتحادی امیر حسین کی معیت میں اپنے دوست ملک جلال الدین کی امداد پر سیستان پہنچا۔ کیانی ملک تیمور کی آمد سے بڑا خوش ہوا اور اس نے تیمور کے لشکر کی خوب آؤ بھگت کی۔ تیمور نے اس موقعہ پر ایک ہی وار میں سات قلعوں میں سے تین قلعوں کو فتح کر لیا جو ملک جلال الدین کے مخالفین کے قبضے میں تھے اور باقی چار قلعوں پر قبضہ کرنے ہی

لے ۱۔ SEISTAN – G.P.TATE.

والا تھا کہ سیستانیوں کی آنکھیں کھل گئیں جو ایک دوسرے کے خلاف برسرِپیکار تھے انہوں نے فوراً اطاعت قبول کر لی اور ملک جلال الدین کے ارد گرد جمع ہو گئے اور اس کو احساس دلایا کہ اگر باقی چار قلعے بھی فتح ہو گئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سارے ملک پر تیمور کا قبضہ ہو جائے گا۔[۱]

ملک جلال الدین محمود اپنے اتحادی امیر تیمور اور امیر حسین کو اطلاع دیئے بغیر فوراً اپنے علاقے میں واپس ہوا۔ وہاں گھوڑ سواروں اور پیدل سپاہیوں پر مشتمل ایک بڑا لشکر جمع کر کے امیر تیمور اور امیر حسین کے منگول لشکر پر چڑھائی کی۔ یہ دونوں امیر اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ سیستانیوں نے ابتدا میں منگولوں کو پیچھے دھکیل دیا اور منگول شکست کھانے ہی والے تھے کہ تیمور صورتحال کی نزاکت کو بھانپ کر اپنے نجی محافظ دستے کے ساتھ سیستانیوں پر پل پڑا اور ان کی صفوں کو چیرتے ہوئے آگے نکل گیا۔ اس کشمکش کے دوران تیمور کے بدن پر دو زخم آئے۔ ایک زخم اس کے ہاتھ پر اور دوسرا زخم اس کی ٹانگ پر آیا۔ اس دوسرے زخم کا اثر جو اس کی ٹانگ پر لگا، عمر بھر رہا اور وہ لنگڑا ہو گیا۔ اس کا افسوس بھی اس کو عمر بھر رہا اور وہ اسی بنا پر تاریخ میں تیمور لنگ کے نام سے مشہور ہوا۔[۲]

اس زمانہ میں قندھار اور سیستان کے درمیانی علاقوں میں نکودری قبیلے ہر جگہ پائے جاتے تھے اور وہ چراگاہوں کی تلاش میں ادھر ادھر گھومتے

حہ ۱- SEISTAN. G. P. TATE.

حہ ۲- ABID.

پھرتے تھے۔ ان کی معیشت کا دارو مدار مویشیوں اور خصوصاً بھیڑ بکریوں کی پرورش پر تھا۔ وہ زیادہ تر دریائے ہلمند کے بالائی علاقوں میں دور دور تک اپنے خیمے لگا کر اپنے مویشیوں کی پرورش میں مشغول رہتے تھے ان کی نقل و حرکت خاران کے علاوہ مکران تک جاری رہتی تھی۔ ارد گرد کے علاقوں میں چھاپے مار کر لوٹ مار کرنا ان کا اہم مشغلہ تھا۔ یہ نقودری قبیلے وسط ایشیا سے چنگیزی مغلوں کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے تھے۔ ابھی تک انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ وہ ایک فطرت پرستانہ مذہب کے پیروکار تھے۔ وہ اپنے مردوں کی سالم لاش کو انتڑیاں نکال کر اور ان کے پیٹ میں جو بھر کے، کپڑوں، ہتھیاروں اور زیورات سمیت گنبد تعمیر کر کے اس میں رکھا کرتے تھے۔ ان کا سب سے اہم مرکز خاران تھا۔ آج بھی اس قسم کے بیشمار گنبد خاران میں تقریباً ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ یہ مذہبی معتقدات اور طریقہ تدفین ان کے آبا و اجداد اپنے ساتھ سٹیپ کے میدانوں سے لائے تھے۔ ان نقودری قبیلوں میں سے ایک قبیلے نے اسلام قبول کرنے کے بعد خاران کے علاوہ مکران کے بعض علاقوں میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور اپنے ایک سردار امیر نوشیروان نقودری کے نام کی مناسبت سے نوشیروانی کہلایا جو آج ایک اہم بلوچ قبیلہ خیال کیا جاتا ہے۔[لے]

اس زمانہ میں ان کے اکثر جوان سیستان کے کیانی ملکوں کی فوج میں بھرتی ہو کر فوجی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ اسی قبیلے کا ایک اہم فرد

لے :۔ SEISTAN - G.P.TATE

ملک محمد کتو (ماما قطلو) تھا جو سیستان کی لڑائی میں جو امیر تیمور اور امیر حسین کے لشکر اور کیانی شہزادہ ملک جلال الدین کے درمیان ہوئی تیر چلا کر امیر تیمور کو زخمی کر دیا اور اس زخم کی وجہ سے امیر تیمور ہمیشہ کے لئے لنگڑا ہو گیا اس معاملہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس لڑائی سے فارغ ہونے کے بعد امیر تیمور نے اپنی نقودریوں کے خیموں میں کچھ دن قیام کر کے آرام کیا اور اپنی نقودریوں نے اس کی تیمارداری کر کے اس کے زخموں کی مرہم پٹی بھی کی اور اس کے مکمل شفا پانے تک مہمان نوازی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اگرچہ اس کے زخم ٹھیک ہو گئے لیکن وہ لنگڑا ہو گیا۔ اس عیب کی وجہ سے نقودریوں کے خلاف اس کے دل میں ایسی کدورت پیدا ہو گئی جو عمر بھر دور نہ ہو سکی۔[1]

امیر تیمور کے تعلقات اس کی زندگی کے ابتدائی ایام میں ملک معز الدین کرت کے ساتھ جو بدستور ہرات کا حکمران تھا بڑے خوشگوار تھے جب وہ ماوراالنہر کا علاقہ فتح کرنے کے خیال سے سیحوں پار کرنے والا تھا تو وہ اپنے اہل و عیال اسی تاجک حکمران کے پاس چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ لیکن بعد میں جب ملک غیاث الدین نے اپنے باپ کی وفات کے بعد عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور ہرات کے استحکامات میں اضافہ کیا تو امیر تیمور اس سے ناراض ہو گیا۔ درحقیقت اس کی طاقت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ امیر تیمور اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا آخر کار وہ موقعہ بھی آیا جب امیر تیمور نے اس کے خلاف فوج کشی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنی فوج کو جیحوں پار کے علاقوں سے حرکت کرنے کا حکم دیدیا

۱۔ SEISTAN — G.P. TATE.

اور ۱۳۸۶ء میں ایک بہت بڑے لشکر کی رہنمائی کرتے ہوئے وہ جیحوں پار کر کے آگے بڑھا۔[1]

اس موقعہ پر ملک غیاث الدین نیشاپور میں سرداریوں کے ساتھ برسرپیکار تھا۔ اس کے بھائی ملک محمد نے اس کے سامنے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ امیر تیمور فوراً جام اور کوہ سوہہ میں داخل ہو گیا تاکہ ان علاقوں کے جنگجو دوگ تاجک حکمران کی امداد پر نہ پہنچ سکیں۔ سب سے پہلے اس نے فشنگ کی چوکی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہرات پر چڑھائی کی۔ دروازہ انصار جو بیرونی استحکامات کا سب سے اہم راستہ تھا۔ منگول حملہ آوروں کے پے در پے حملوں کا نشانہ بن گیا۔ لیکن دو دن کے بعد امیر تیمور کے سپاہی ایک دوسرے چھوٹے استحکام کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ راستہ کشک مراغانی کے نزدیک واقع تھا اسی راستے سے دریائے انجیل استحکامات کے اندر داخل ہوتا تھا جو کسی نامعلوم وجہ سے غیر محفوظ چھوڑ دیا گیا تھا۔ ملک محمد بڑی بہادری سے اس دروازے پر جو دریائے انجیل کے پل پر واقع تھا دشمن کا مقابلہ کر رہا تھا۔ وہ اپنے بیرونی استحکامات میں دشمن کے غیر متوقع داخل ہونے پر بڑا حیران ہوا اور اسے قلعہ کے اندر اس کے اندرونی استحکامات میں داخل ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ امیر تیمور نے فوراً اطاعت قبول کرنے والوں کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کی وجہ سے مزید مقابلے کی گنجائش باقی نہ رہی۔ ملک محمد نے بادل ناخواستہ بامر مجبوری ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے

---

[1] SEISTAN — G.P. TATE

دن اختیار الدین کے قلعے سے باہر نکل کر اس نے باغ زاغان میں باقاعدہ طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ اس مقام کو امیر تیمور نے اپنا صدر مقام بنا لیا تھا۔

ہرات کی بیرونی دیواریں گرا دی گئیں۔ شہریوں سے ایک بڑی رقم تاوانِ جنگ کے طور پر وصول کر لی گئی۔ امیر تیمور نے ہرات کے حکمرانوں کے خزانے اپنی تحویل میں لے لئے۔ مولانا نظام الدین کو حکم دیا گیا کہ وہ دو سو خاندانوں کے ساتھ ہرات چھوڑ کر شہر سبز چلا جائے اور اس حکم کی فوری تعمیل کرائی گئی۔[1]

۱۳۸۲ء میں امیر تیمور نے ترشیز اور قلات غلزئی پر قبضہ کر لیا۔ اسی دوران میں اس نے ملک غیاث الدین کے حامیوں کو گرفتار کر کے ثمرقند بھیج دیا۔ وہ ملک معزالدین کے چھوٹے بیٹے ملک محمد کے ساتھ مہربانی سے پیش آیا اور غور کی حکومت اس کے سپرد کر دی۔

۱۳۸۳ء میں ہرات میں اچانک انقلاب برپا ہو گیا۔ اس انقلاب کا سرکردہ غور کا ایک البیلا نوجوان ملک سید اسپہید تھا جو غوری باچا کہلاتا تھا۔ ملک غیاث الدین نے دس سال پیشتر اس نوجوان کو گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا تھا۔ لیکن امیر تیمور نے ہرات پر قبضہ کرنے کے بعد اس کو رہا کر دیا۔[2]

ملک محمد نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ جو تاجکوں پر مشتمل تھا اور جس

ل:- SEISTAN - G. P. TATE

لے:- ABID.

میں زیادہ تر بیوقوف قسم کے سرکش نوجوان تھے ہرات پر چڑھائی کی ادھر غوری باجا بھی اسس کی مدد کو بیٹھا ہوا تھا۔ ان دونوں نے مل کر امیر تیمور کے فوجیوں کو اختیارالدین کے قلعہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا اور خود کئی گروہوں میں تقسیم ہو کر شہر میں داخل ہو گئے اور ایک اودھم مچا دیا۔ قلعہ اختیارالدین کے دروازوں میں آگ لگادی اس مصیبت سے بچنے کی خاطر کئی منگول سپاہی قلعہ کی دیوار پھاند کر نیچے اتر گئے لیکن ان لوگوں نے ان کا راستہ روک کر ان کو قتل کر دیا۔ ؎

شہزادہ میران شاہ اس وقت پنج دہ کے مقام پر موجود تھا۔ اس نے باغیوں کی سرکوبی کے لئے امیر حاجی سیف الدین اور آق بوغا کو منگول دستوں کے ساتھ ہرات روانہ کر دیا۔ اس کے بعد ان کو سزا دینے کے لئے خود ہرات میں آدھمکا۔ خیابان کی گلی کوچوں میں منگول اور غوریوں کے درمیان دست بدست لڑائی کا بازار گرم ہو گیا۔ غوری شکست کھا کر شہر کے اندر پسپا ہو گئے اور رات کے اندھیرے میں بھاگ کر ہرات کے مضافات میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ منگول سپاہیوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا کیا اور دوسرے دن ان سب کو ملک سپہ اسپہبدیت قتل کر کے ان کے سروں کا مینار کھڑا کیا۔ جب امیر تیمور کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اس نے ملک غیاث الدین پیر علی، ملک محمد امیر غوری اور غورانیوں کے سردار علی بیگ کو جس نے قلات غلزی کے قلعہ کے محاصرہ کے دوران امیر تیمور کی فوج کے ساتھ مقابلہ کر کے شکست کھائی تھی قتل کرنے کا

؎ SEISTAN - G.P.TATE.

حکم دے دیا۔ اس طرح غوری پاجا کی احمقانہ حرکت سے ایک ممتاز خاندان کا خاتمہ ہو گیا [۱]

۱۳۸۳ء کے اوائل میں امیر تیمور جیٹہ کے معاملات میں مصروف تھا۔ ۱۳۸۴ء کے اوائل میں اس نے مازندران کے معاملات کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور جونہی وہ مرغ آب پہنچا تو اس کو معلوم ہوا کہ شیخ داؤد جس کو سبزوار کی حکومت سپرد کی گئی تھی باغیانہ سرگرمیوں میں مصروف ہے اور تابان بہادر کو فرسکان کے مقام پر قتل کر دیا ہے جو سبزوار میں تیمور کے مفادات کا نگران اعلےٰ تھا۔ اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخ داؤد نے بھاگ کر بدرآباد کے قلعہ میں پناہ لی ہوئی ہے تاکہ تابان بہادر کے قتل کی ذمہ داری سے بچ سکے۔ اس کو یہ اطلاع بھی ملی کہ نقودری قبائل نے بھی اودھم مچا رکھا ہے اور سیستان باغیانہ سرگرمیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے [۲]

امیر تیمور نے مازندران پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور اپنی توجہ خراسان کی طرف مبذول کی۔ اس نے ایک ہی حملہ میں بدرآباد کے قلعہ پر قبضہ کر کے اس کے چھ ہزار محافظین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد فراہ کی جانب متوجہ ہوا۔ ملک جلال الدین نے فوراً اطاعت قبول کر لی۔ اب اس نے فراہ سے سیستان کا رُخ کیا اور راستہ میں آک اور زرہ کے قلعوں کو فتح کر کے زاہدان میں جا کر دم لیا۔ منگول لشکر بھی آق تیمور کی سرکردگی میں آس پاس کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرتا ہوا زاہدان میں اس سے جا ملا۔ ان لوگوں کو آس پاس کے

---

۱ :- SEISTAN – G.P. TATE

۲ :- ABID.

علاقوں سے بہت سامال غنیمت ہاتھ آیا۔[1]

امیر تیمور حملہ کے خیال سے زاہدان کے قلعہ کا جائزہ لے رہا تھا کہ سیتان کے کیانی شہزادہ ملک قطب الدین نے اپنے علاقے کے دو سرداروں ملک تاج الدین اور ملک شاہ شاہان کو اس کے پاس بھیج کر اطاعت قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور خراج دینے کا بھی وعدہ کیا۔ لیکن سیتانیوں کا ایک ہجوم آپے سے باہر ہوگیا اور اس بڑے ہجوم نے امیر تیمور کی فوج پر حملہ کر دیا۔[2]

امیر تیمور نے دو ہزار مسلح سپاہیوں کو بوقت ضرورت عمل پیرا ہونے کے لئے تمام لوگوں کی نظر سے اوجھل خفیہ طور پر تیار کھڑے رہنے کا پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ یہ سپاہی اشارہ پاتے ہی سیتانی لشکر پر پل پڑے۔ بڑی گھمسان کی جنگ ہوئی۔ آن کی آن میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ سیتانی فوج زیادہ تر پیدل سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس نے امیر تیمور کے گھوڑ سوار دستوں کی تاب نہ لاکر شکست کھائی اور ہجوم کی صورت میں پسپا ہوکر قلعہ کے اندر جاکر پناہ لی اور قلعہ کے دروازے بند کر دیئے۔[3]

پہلی رات تو یونہی بسر ہوئی۔ دوسری رات سیتانیوں کا لشکر چپکے سے آدھی رات کو قلعہ سے باہر نکل آیا اور منگولوں پر شب خون مارا۔ اس حملے سے منگول پسپا ہوکر خندقوں سے باہر نکل آئے اور خیمہ گاہ میں جا گھسے۔ اس

---

[1] :- SEISTAN - G.P.TATE

[2] :- ABID.

[3] :- ABID.

کے بعد انہوں نے بھی لڑائی شروع کر دی اور منگولوں کی ساری فوج اکٹھی ہو گئی۔ انہوں نے سیتانیوں پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ سیتانی بڑی تعداد میں مارے گئے۔ صبح ہوتے ہی منگولوں نے امیرزادہ علی اور آق تیمور بہادر کی سرکردگی میں دھاوا بول دیا۔ قلعہ کے دروازے پر سیتانیوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ امیرزادہ علی نے حملہ کر کے ان کو پیچھے دھکیل دیا اور قلعہ کے اندر جا گھسا۔ ان منگولوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ اور سیتانی فوراً ان پر پل پڑے۔

امیرزادہ علی نے بڑی بہادری جرأت ہمت اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہت سے سیتانیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ لیکن اس کے اپنے سپاہیوں نے بھی سیتانیوں کے ہاتھ سے بڑا نقصان اٹھایا۔ ان میں ایسا کوئی سپاہی نہیں تھا جو دست بدست کی لڑائی میں زخمی نہ ہوا ہو۔ اس اثنا میں آق تیمور بہادر بھی قلعہ کے اندر گھس کر امیرزادہ علی کی امداد پر پہنچ گیا اور دشمن کو پیچھے دھکیل کر ان کے درمیان سے امیرزادہ علی کو زندہ و سلامت نکال کر باہر لے آیا۔ امیر تیمور ان دونوں کی بہادری سے بہت خوش ہوا اور ان کو بروقت انعام و اکرام سے نوازا۔ ادھر ملک قطب الدین نے بھی کوئی چارہ نہ دیکھا اور اطاعت قبول کرنے کے لئے اپنے پرچم سرنگوں کر لئے اور سفید پرچم لہرایا۔ ابھی ملک قطب الدین اور امیر تیمور کے درمیان صلح کی بات چیت ہو رہی تھی کہ تیس ہزار سیتانی قلعہ سے باہر نکل آئے اور تیمور پر حملہ کر دیا۔ تیمور کو مجبوراً پسپا ہو کر اپنی فوج کی طرف جانا پڑا۔ اس کے پیچھے جو تیر چھوڑے گئے ان میں سے ایک تیر اس کے گھوڑے کو لگا اور اسے زخمی کر دیا۔

امیر تیمور نے ملک قطب الدین کی گرفتاری کا حکم دے دیا اور از سر نو لڑائی شروع ہوگئی۔ امیر تیمور نے زاہدان کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ سیستانی سپاہی سب کے سب قتل کر دیئے گئے اور شہر میں قتلِ عام شروع ہوگیا۔ خون کی ندیاں بہا دی گئیں۔ قلعہ کی دیواریں مسمار کر کے زاہدان کو جلا کر خاک کا ڈھیر کر دیا گیا۔ اس حملے میں تیمور کو کیانی شہزادوں کے خزانے اور زر و جواہرات کے علاوہ بہت سے باختری اونٹ اور عربی گھوڑے ہاتھ آئے۔ ملک قطب الدین کو قیدی بنا کر سمر قند منتقل کیا گیا اور اس کے خاندان میں سے ملک شاہ شاہان کو تیمور نے سیستان کا حکمران مقرر کر دیا۔ اس شہزادے نے ایک عرصہ دراز تک منگولوں کے ماتحت رہ کر سیستان پر حکومت کی۔[۱]

اس موقعہ پر امیر تیمور ایک اور شکار کی تلاش میں دریائے ہلمند کے کنارے کنارے قلعہ بست کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے بند ہلمند کو بھی توڑ دیا۔ قلعہ تگ ہا کے مقام پر اس کو اطلاع ملی کہ نقودری جو وادی ہلمند میں خیمہ زن تھے اپنے خیمے اٹھا کر کیچ مکران کی طرف جا رہے ہیں۔ امیر زادہ میران شاہ کی سرکردگی میں منگولوں کا ایک لشکر ان کے تعاقب میں روانہ ہوا اور بڑی تیزی سے سفر کرتے ہوئے خاران کے علاقے میں ان کو جا لیا۔ شہزادے نے بہ آواز بلند ان کو اطاعت قبول کرنے کی دعوت دی لیکن ان نقودریوں کا خمیر اس قسم کا نہیں تھا کہ وہ ہتھیار ڈال دیتے۔ چنانچہ اپنے قاعدہ کے مطابق وہ لڑائی پر آمادہ ہوگئے لیکن شکست کھائی اور ان کے سردار کا سر کاٹ کر تیمور کو پیش کیا گیا۔[۲]

۱۔ SEISTAN - G.P.TATE.
۲۔ ABID

اسی دوران تیمور کی ملاقات ملک تمہ کتو (ماما قطلو) سے ہوئی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے تیمور کو سیستان کی جنگ میں زخمی کر کے لنگڑا کر دیا تھا اور جس کا امیر تیمور کو بڑا رنج تھا۔ اسی سردار نے اطاعت قبول کرتے ہوئے امیر تیمور کو تحفے تحائف بھی پیش کر دیئے تاکہ اس کے دل میں جو کدورت پیدا ہو گئی ہے وہ دور ہو جائے لیکن امیر تیمور کے دل میں جو کینہ اس کے خلاف پیدا ہو گیا تھا وہ دور نہ ہوا اور اس سردار کا رویہ بدستور مشتبہ تصور کیا جانے لگا جونہی کہ نقودری سردار امیر تیمور کے دربار سے اٹھ کر رخصت ہونے لگا۔ امیر تیمور کے اشارے پر منگولوں نے اس پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی اور زخمی ہو کر اس نے دم توڑ دیا۔[1]

۱۳۸۳ء کے اواخر میں قندھار امیر تیمور کے حوالے کیا گیا جو اہل کرت کے مقبوضات میں شامل تھا۔ اس کے فوراً بعد قلات بر لوک، کندز، بقلان، غزنی اور کابل وزابل تمام متعلقہ علاقوں سمیت ایک ایک کر کے سر کر لئے گئے امیر تیمور نے اپنے بڑے بیٹے مرزا میراں شاہ کو قندھار کی حکومت پر فائز کر دیا اور متذکرہ بالا تمام علاقے اس کے زیر فرمان آ گئے۔ شمالی بلوچستان کے علاقے ژوب، بورالائی، خشک، شال، مستونگ، قلات، نیچارہ، خضدار تک ولایت قندھار میں شامل تھے۔ بدقسمتی سے مرزا میراں شاہ کی وفات ہو گئی امیر تیمور نے ولایت قندھار کی حکومت متذکرہ بالا ولایات سمیت اپنے پوتے مرزا پیر محمد کے سپرد کر دی۔ لیکن امیر تیمور کے آخری ایام ۱۴۰۶ء میں اس

ف ۱- SEISTAN – G. P. TATE

شہزادے نے بھی وفات پائی۔[۵۰]

آل مظفر ابو سعید سلطان کے دورِ حکومت میں ۱۳۱۳ء میں فارس میں برسرِ اقتدار آئے۔ اس خاندان کا بانی شرف الدین مظفر تھا۔ اس کا بیٹا مبارز الدین ابو سعید سلطان کے حکم سے یزد اور فارس کا گورنر بنا۔ اس نے شیروانی خاندان کے حکمرانوں کو جو قراقطائی خاندان کے زوال کے بعد کرمان میں برسرِ اقتدار آئے تھے نکال باہر کر کے ۱۳۴۰ء میں کرمان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ۱۳۵۳ء میں اس نے ابو اسحاق رنجو سے نبرد آزما ہو کر کئی لڑائیوں میں اسے شکست دی اور فارس پر اس کا مستقل قبضہ ہو گیا۔ تین سال کے بعد اس نے اصفہان پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد حالات کو سازگار پاکر تبریز پر بھی قابض ہو گیا۔ لیکن جب اس کی شہرت عروج پر تھی تو اس کے بیٹے نے سازش کر کے اس کو اندھا کر دیا اور یہ خاندان بری طرح خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔ اس خاندان میں شاہ شجاع اس قدر طاقتور تھا کہ اس نے تبریز پر قبضہ کرنے کے بعد بغداد پر بھی اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ وہ حافظ شیرازی کا سرپرست تھا۔

شاہ شجاع کے بعد اس کا بیٹا زین العابدین فارس کا حکمران بنا۔ اس نے اپنے باپ کے رویہ کے برخلاف امیر تیمور کی اطاعت سے روگردانی کی اور اس کے ایلچی کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔[۵۱]

امیر تیمور نے اصفہان پر فوج کشی کی جو آلِ مظفر کے مقبوضات میں

---

۵۰ ۔ SISTAN - G.P. TATE.

۵۱ ۔ A HISTORY OF PERSIA - SYKEN

شامل تھا۔ اصفہان کے باشندوں نے اطاعت قبول کر لی۔ لیکن اصفہان کے شہریوں میں سے ایک ہجوم نے تین ہزار منگولوں پر حملہ کر کے ان کو قتل کر دیا جو شہر میں اپنے قیام کے دوران ڈھول بجا کر خوشیاں منا رہے تھے۔ امیر تیمور نے اس گستاخی کا بڑا سخت بدلہ لیا اور قتلِ عام کے دوران ستر ہزار آدمیوں کو قتل کر کے ان کے سروں سے مینار کھڑے کیے۔[۱]

۹۴-۱۳۹۳ء میں امیر تیمور نے شیراز پر چڑھائی کی۔ اس موقعہ پر اس کا بیٹا شاہ رخ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس زمانہ میں خاندان اہلِ مظفر میں سے شاہ منصور فارس کا حکمران تھا۔ وہ خود تیمور کے مقابلے پر آیا اور اپنے گھوڑے کو اچانک ایڑی لگا کر امیر تیمور کی ذات پر حملہ کر کے اس کو گھائل کرنے کی کوشش کی لیکن امیر تیمور اس کے ہاتھ سے بال بال بچ گیا۔ امیر تیمور کے بیٹے شاہ رخ نے آگے بڑھ کر ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد امیر تیمور نے اس خاندان کے تمام اراکین کو ایک ایک کر کے قتل کر دیا اور اہلِ مظفر خاندان کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔[۲]

کرمان کا صوبہ مکران سمیت اہلِ مظفر خاندان کے مقبوضات میں شامل تھا۔ اس خاندان کے خاتمہ کے بعد امیر تیمور نے کرمان کے صوبے کی حکومت امیر ادوگی کے سپرد کر دی جو منگولوں کے برلاس قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا جس کا سردار خود امیر تیمور تھا۔ اس سے مکران کے زیادہ تر علاقے امیر ادوگی کے

لے ۱۔ A HISTORY OF PESIA – SYKES.

لے ۲۔ ABID.

زیر فرمان آ گئے۔ اس کی حیثیت منگولوں کے ماتحت ایک باجگزار حکمران کی تھی۔ [1]

امیر تیمور ۱۳۹۸ء میں پنجاب کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد دلی پر حملہ آور ہوا اور سلطان محمود شاہ تغلق کو میدان جنگ میں شکست دے کر دلی پر قابض ہو گیا۔ اس کے بیٹے مرزا پیر محمد نے ملتان اور اوچھ پر حملہ کر کے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ امیر تیمور پندرہ دن تک دلی میں ٹھہرا رہا اور عام لوگوں کا قتل عام کر کے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس فتح کی وجہ سے اس کو بے اندازہ مال غنیمت ہاتھ آیا۔ [2]

۱۴۰۵ء میں امیر تیمور نے وفات پائی۔ اس کی وفات کے وقت اس کے ورثا کی تعداد چھتیس تھی۔ ان لوگوں کے درمیان اس کی وراثت پر زبردست رسہ کشی شروع ہو گئی۔ اس موقعہ پر تیموری شہزادوں کے درمیان کشمکش کی یہ حالت تھی کہ بیک وقت تین شہزادے امیر تیمور کے تخت کے دعویدار تھے۔

ان تینوں شہزادوں کی اپنی اپنی علیحدہ فوج تھی اور ہر ایک نے مالیہ خراج اور جرمانہ وصول کرنے کے لئے اپنا اپنا علیحدہ عملہ رکھا ہوا تھا اور یہ لوگ باری باری امیر تیمور کے مختلف مقبوضات میں جا کر رعایا سے زبردستی مالیہ وصول کیا کرتے تھے۔ ان کی ان کارروائیوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے

لے:- A HISTORY OF PERSIA. SYKES.

گے:- RAVERTY- NOTES ON AFGHANISTAN AND BALUCHISTAN.

کہ ان منگول شہزادوں کے ہاتھ سے رعایا پر کیا گذری ہوگی۔ آخر کار اقتدار کی اس جنگ میں دو سال کی کشمکش کے بعد سنہ ۱۴۰۷ء میں اس کا واحد بیٹا مرزا شاہ رخ کامیاب ہوگیا۔ اس نے ہرات کو اپنا دارالحکومت بنایا اور یہیں سے امیر تیمور کی وسیع سلطنت پر حکومت کرنے لگا۔ [۱]

سنہ ۱۴۱۵ء میں مرزا شاہ رخ نے ولایت قندھار کی حکومت قید وبہادر کے سپرد کردی جو مرزا پیر محمد کا بیٹا تھا۔ شمالی بلوچستان کے اکثر علاقے قلات پنجبارہ اور اس سے بھی آگے خضدار تک اس شہزادے کے دائرہ اختیار میں آگئے۔ قید وبہادر کی بدانتظامی سے ولایت قندہار کا نظم ونسق درہم برہم ہوگیا۔ سنہ ۱۴۱۶ء میں صوبہ قندہار کے دو مختلف علاقوں کے ماتحت حاکموں سیفل قندہاری کے بیٹے اور ملک محمد کے درمیان جھگڑے نے فساد کی صورت اختیار کرلی۔ بعض افغان قبائیوں نے جو صوبہ کی مین سرحد پر بودوباش رکھتے تھے اور دریائے سندھ کے کنارے   کے بعض دوسرے لوگوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر گرم سیر کے علاقے میں ڈاکے ڈالنے شروع کردیئے اور وہاں کے لوگوں پر مصائب وآلام کے پہاڑ توڑے۔ سنہ ۱۴۱۹ء میں قید وبہادر نے خود بھی بغاوت کردی۔ اور شاہ رخ نے اس کو گرفتار کرکے ہرات میں اختیارالدین کے قلعہ میں قید کردیا۔ [۲]

مرزا شاہ رخ نے اس کے بعد ولایت قندہار غزنی کابل اور سندھ وہند

۱۔ RAVERTY -

۲۔ RAVERTY .

کے صوبوں کی حکومت پہلے اپنے بڑے فرزند بائے سنکر بہادر کے سپرد کر دی اور کچھ عرصہ کے بعد اس کوہشاکران ولایات کا اختیار اپنے ایک دوسرے بیٹے سیورغ تمش کے حوالے کر دیا۔ ۱۴۲۶ء میں اس شہزادے نے وفات پائی اس کے پسماندگان مرزا مسعود اور مرزا کراچہ خورد سال تھے۔ ان میں سے سیورغ تمش کا بڑا بیٹا مرزا مسعود ان ولایات کا حکمران بنا۔ اس شہزادے کی بدانتظامی سے عام لوگ بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ آخر کار ۱۴۴۷ء میں مرزا شاہ رخ نے مرزا مسعود کو قندہار کی حکومت سے علٰحدہ کر دیا۔ [1]

۱۳۷۸ء میں سیاہ میش خاندان کے قرا یوسف نے جس کے قبیلہ کاراکون یولو کے پرچم پر کالی بھیڑ کی تصویر ہوتی تھی۔ آذربائیجان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس کی بہن شاد گوہر مرزا شاہ رخ کی بیوی تھی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا قرا اسکندر اس کا جانشین بنا۔ اس کے بھائی جہان شاہ نے جو ایک کامیاب سپہ سالار تھا۔ شمال میں جارجیا اور جنوب میں فارس کرمان اور مکران فتح کر لئے اور اس کے بعد خراسان پر قابض ہو گیا۔ ہرات میں اس کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی لیکن وہ جلد ہی سفید میش خاندان کے ۔وزون حسن کے ہاتھ سے قتل ہوا جس کے قبیلے کاراکویون لو کے پرچم پر سفید بھیڑ کی تصویر ہوتی تھی۔ [2]

مرزا شاہ رخ نے قرا یوسف کو متواتر تین لڑائیوں میں شکست دی اور

ف ۱ - RAVERTY.

ف ۲ - SYKES.

اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے قرا اسکندر کو جو آذر بائیجان کا حکمران تھا خراج دینے پر مجبور کیا۔ قرا اسکندر ۳۸-۱۴۳۷ء میں ایک لڑائی کے دوران مارا گیا۔ اس کے قتل کے بعد اس کے بیٹے الوند نے کرمان اور مکران پر اپنی بالادستی قائم کر لی۔ لیکن ایک سال سے زیادہ وہ ان علاقوں کو اپنے تصرف میں نہ رکھ سکا۔[1]

۱۴۳۱ء میں مرزا شاہ رخ نے کرمان پر فوج کشی کی۔ اس موقعہ پر اس کی ملاقات سلطان اویس سے ہوئی جو برلاس قبیلہ کے ایرادوگی کا بیٹا تھا اور جو اپنے باپ کی وفات کے بعد مرکزی حکومت سے منہ موڑ کر خود مختار بن بیٹھا تھا اور جس نے مرکزی حکومت کو خراج دینا بند کر دیا تھا میرزا شاہ رخ کا ارادہ تھا کہ وہ اس باغی کی کھال کھینچ کر اس میں بھس بھر دے۔ لیکن آخر کار اسے معاف کر دیا اور وہ خراج دینے پر مجبور ہو گیا۔[2]

مرزا شاہ رخ کے دورِ حکومت میں فراہ اور سیستان میں باغیانہ سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ اس نے ان علاقوں کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے مقامی حکمرانوں کو اطاعت گزاری پر مجبور کر دیا۔ اور اس کے بعد کسی کو اس کی زندگی میں سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔[3]

اسی زمانہ میں ابدالیوں کی ایک شاخ ترین قبیلہ کے لوگ اپنے اصلی

---

[1] SYKES.

[2] RAVERTY.

[3] G. P. TATE

وطن کاسی غز کو خیرباد کہہ کر صوبہ قندھار کے جنوبی علاقہ میں خشک کے مقام پر آباد ہو گئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ جہاں وہ اب بھی بود و باش رکھتے ہیں۔[1]

سلطان شاہ رُخ کا دورِ حکومت اہم واقعات سے خالی ہے اس کا زمانہ منگول دورِ اقتدار کا پرامن ترین عہد تھا۔ اس نے سنہ ۱۴۴۷ء میں وفات پائی۔[2]

مرزا شاہ رخ کی وفات سے پہلے ہی اس کے واحد زندہ بیٹے نے ماوراءالنہر کے علاقے میں اپنی طاقت مستحکم کر لی تھی، اسے کوئی مخالفت درپیش نہیں آئی لیکن اس کی وفات کے بعد دریائے سیحون کے جنوبی علاقوں میں امیر تیمور نے جو وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ سلطان شاہ رُخ کے چھ متوفی بیٹوں کے ورثا اور پسماندگان کے درمیان ان ممالک کے اقتدار پر رسہ کشی شروع ہو گئی۔ آخر کار اس کا پوتا بابر مرزا بن بالیسغر (بایسونغ) نے ان سب پر فوقیت حاصل کر لی۔ اور ہرات کو اپنا دارالحکومت قرار دے کر یہاں سے اپنی طاقت مستحکم کر لی اور وہ منگولوں کی وسیع سلطنت پر حکومت کرنے لگا۔[3]

مرزا شاہ رخ کے ورثا کے درمیان کشمکش کے دوران اکثر علاقوں کے لوگ اور خصوصاً ماتحت حکمران مرکزی حکومت سے روگردان ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں بادغیس میں الغ بیگ اور اس کے بیٹے عبداللطیف کی سرگرمیوں نے

---

[1] RAVERTY.

[2] G. P. TATE.

[3] SEISTAN - G. P. TATE.

خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ سیستان میں ملک معزالدین خود مختار ہونے کی فکر میں تھا اور فقط موقعہ کا منتظر تھا۔ لیکن بابر مرزا کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ان کے منصوبے کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے۔ [1]

ان دنوں امیر خلیل ہندوکہ اس کی طبیعت پر حاوی تھا۔ اور وہ اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ بابر مرزا شمالی علاقوں میں نظم و نسق درست کرنے کے بعد سیستان کی طرف متوجہ ہوا اور ملک معزالدین کو اطاعت گزاری پر مجبور کر دیا۔ ان کارروائیوں میں امیر خلیل ہندوکہ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس وجہ سے اس نے بابر مرزا کے دربار میں بڑا اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔ بابر مرزا نے بہت سے ممالک جن میں قندھار، کابل، سیستان، فارس، کرمان و مکران شامل تھے اس کے اختیار میں دے دیئے حتیٰ کہ سندھ و ہند کی سرحدوں پر بھی اس کا حکم مانا جاتا تھا اور وہ بابر مرزا کی طرف سے ایک خود مختار حکمران کی مانند حکومت کرنے لگا۔ یہ بڑا بد دماغ اور بد دیانت شخص تھا۔ اس نے سب سے زیادہ سیستان کے علاقے کو اپنی چیرہ دستیوں اور ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اس کے ظلم و ستم اور لوٹ مار سے فراہ اور سبزوار خصوصیت کے ساتھ تباہ ہو گئے اور سارا ملک ویران ہو گیا۔ اس لوٹ مار میں اس کے رشتہ دار اور منصبدار بھی اس کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ بابر مرزا نے ۱۴۵۷ء میں وفات پائی اور اس کی وفات کے بعد اس کا خورد سال بیٹا اس کا جانشین بنا اور امیر شیخ حاجی اس کا اتالیق مقرر ہوا۔ اس خورد سال شہزادے کی وجہ سے

لہ :- SEISTAN. G.P. TATE

ملک کا نظم و نسق اور انتظام اور زیادہ خراب ہو گیا۔[1]

۱۴۶۰ء میں سلطان ابو سعید بہادر خان نے جو شاہ رخ مرزا کا پوتا تھا سیحوں پار کے علاقوں سے اپنی توجہ خراسان کی طرف مبذول کی۔ اس نے خراسان کے علاوہ عراق عجم اور مازندران میں بھی اپنی طاقت مستحکم کر لی۔ اس نے ملک نظام الدین یحییٰ کو سیستان کا حکمران مقرر کر کے اسے امیر خلیل ہندوکہ کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دے دیا جس نے سیستان اور اس سے متصل علاقوں میں دست ظلم دراز کر کے ہر طرف تباہی پھیلائی تھی۔ اور خلق خدا کو پریشان کر دیا تھا۔ اس نے اس امیر کی گرفتاری کے لئے کچھ فوجی دستے بھی سیستان کی طرف روانہ کئے تاکہ اس کو جلدی کیفر کردار تک پہنچایا جا سکے۔ لیکن مازندران میں سلطان سعید کو کچھ اس قسم کے واقعات درپیش آئے کہ امیر خلیل ہندوکہ کا معاملہ التوا میں پڑ گیا۔[2]

امیر خلیل ہندوکہ کو جب معلوم ہوا کہ سلطان ابو سعید بہادر خان ہرات میں موجود نہیں ہے تو اس نے ایک لشکر لے کر ہرات پر چڑھائی کی۔ جب اس کی آمد کی خبر مضافات ہرات میں پھیلی تو لوگ اپنی تیار فصلوں کو چھوڑ کر اس کے ڈر سے شہر ہرات کی طرف بھاگ نکلے۔ اس کے پاس زیادہ فوج نہیں تھی اور وہ شہر کا محاصرہ نہیں کر سکتا تھا۔ ادھر سلطان ابو سعید مازندران کی مہم سے فارغ ہو کر واپس ہرات لوٹ رہا تھا۔ کہ راستہ ہی میں جام کے مقام پر اس کو امیر

---

[1] SEISTAN - G.P. TATE.

[2] ABID.

خلیل ہندوکہ کی ان حرکتوں کا علم ہوگیا جب امیر خلیل ہندوکہ کو سلطان ابوسعید کی آمد کی خبر ملی تو وہ بھی سیستان کی طرف بھاگ نکلا. سلطان کے فوجی دستوں نے بھی اس کا پیچھا کیا اور اس کو پکڑنے کے لئے سیتان کی طرف روانہ ہوئے اس نے فوری طور پر معافی مانگ لی اور اپنی گذشتہ حرکتوں پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے اطاعت قبول کر لی۔ [1]

سلطان ابوسعید بہادر نے اس کو بلخ کی سرحدوں سے متصل علاقوں کا سرحد دار بنا دیا تاکہ اس سے سرحدوں کی حفاظت اور ان علاقوں میں نظم و نسق قائم رکھنے کا کام لیا جا سکے۔ اس طرح سیتان کے باشندوں کو اس کی لوٹ مار اور ظلم و ستم سے نجات حاصل ہو گئی۔ [2]

سلطان ابوسعید بہادر خان نے امیر تیمور کی وسیع سلطنت میں اپنی طاقت کو مستحکم کرنے کے بعد ۶۹-۸۶۸ھ میں کابل اور غزنی کی ولایات متعلقہ علاقوں سمیت ہندوستان کی سرحدوں تک اپنے بیٹے مرزا الغ بیگ کے سپرد کر دیا کچھ عرصہ سے اس کا ایک دوسرا بیٹا سلطان مراد ولایت قندھار اور گرم سیر کے انتظام حکومت کی نگرانی پر مامور تھا. جب عراق کا علاقہ سلطان ابوسعید کی قلمرو میں شامل کر لیا گیا تو مرزا سلطان مراد اپنے باپ کے حکم سے کرمان کی طرف چل پڑا۔ [3]

---

[1] SEISTAN - G. P. TATE.

[2] ABID.

[3] RAVERTY - NOTIS ON AFGHANITAN AND BALUCHISTAN.

فروری ۱۴۶۹ء میں سلطان ابو سعید بہادر خان کاراباغ کے نزدیک ایک فوجی مہم کے دوران ترکمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اس المیہ کی خبر سلطان مراد کو راستہ ہی میں ملی۔ وہ واپس لوٹ کر گرم سیر جانا چاہتا تھا۔ لیکن سفر کے دوران راستہ ہی میں اسے قریب کے ایک علاقہ کے ماتحت حکمران یوسف ترکمان سے خطرہ پیدا ہوگیا جو مخالفانہ سرگرمیوں میں مصروف تھا وہ گرم سیر کی بجائے خراسان کے اس علاقے میں داخل ہوگیا جو سلطان حسین بیقارہ کے قبضۂ اختیار میں تھا۔ اس نے سلطان حسین بیقارہ کے ہاں پناہ لی۔[1]

سلطان ابو سعید بہادر خان کے قتل کے بعد اس کے ورثا میں اس کی جانشینی کے مسئلہ پر خانہ جنگی کا آغاز ہونے والا تھا کہ مرزا سلطان حسین بیقارہ جو عمر شیخ مرزا کا پوتا تھا۔ اپنے حریفوں کو نیچا دکھا کر ہرات میں برسراقتدار آیا۔ اس کے برسراقتدار آنے سے حالات معمول پر آگئے۔ ملک خوشحال ہو گیا اور تیموری خاندان کا زوال کچھ عرصہ کے لیئے رک گیا۔[2]

سلطان حسین بیقارہ کے برسراقتدار آنے سے ایک سال پیشتر کئی کوتاہ اندیش امرا و منصبدار اس کے آخری حریف یادگار ناصر مرزا کی عارضی کامیابی سے متاثر ہو کر اس سے علیحدہ ہو گئے تھے اور مختلف علاقوں کا رخ کر لیا تھا تاکہ آخری فیصلہ کا انتظار کر کے موقعہ کے مطابق کوئی قدم اٹھا سکیں۔ ان موقعہ پرستوں میں مرزا پیر محمد کے بھائی مرزا محمد سلطان کا پوتا مرزا محمد عمر اور

---

[1] :- RAVERTY. NOTIS ON AFGHANISTAN AND BALUCHISTAN.

[2] :- ASID.

مذکورہ بالا یوسف ترکان بھی شامل تھے جو ۱۴۶۷ء میں دوسرے امرا کے ساتھ مل کر دشت ساکلمان میں اس کے کیمپ سے بھاگ نکلے اور گرم سیر اور قندھار کی طرف چل پڑے ۔ ان دنوں سلطان ابو سعید کے ایک بلند مرتبت امیر توکل برلاس کا بیٹا نظام الدین احمد قندہار کا ماتحت حکمران تھا جس نے ابھی تک اپنی وفاداریاں سلطان حسین بیقارہ سے وابستہ نہیں کی تھیں۔ اس کو جب مرزا محمد عمر کی قندہار کے علاقے میں آمد کی خبر ملی تو اس نے اپنے قاصد روانہ کر کے مرزا محمد عمر سے اپنی وفاداریاں وابستہ کیں۔ مرزا محمد عمر موقع کو غنیمت خیال کر کے فوراً قندھار پہنچا اور اقتدار اعلیٰ کے اختیارات سنبھال لئے اور خراسان کے مغربی علاقوں میں حملے شروع کر دیئے۔ لہ

اس اثنا میں سلطان حسین بیقارہ اندخود سے لوٹ کر کا ئین کو تاخت و تاراج کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے مرزا محمد عمر کے خلاف چند فوجی دستے روانہ کئے اور خود قندھار کی طرف لوٹ کر چلا گیا۔ جہاں اس نے کسی جرم کی پاداش میں نظام الدین احمد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک لشکر جمع کر کے فراہ پر چڑھائی کی۔ مرزا سلطان حسین بیقارہ نے اس کے خلاف چند فوجی دستے روانہ کئے۔ اس موقعہ پر دونوں فریق کے درمیان جو لڑائی ہوئی اس کے دوران مرزا محمد عمر کو ایک تیر لگا اور وہ مارا گیا۔ سلطان حسین مرزا نے قندھار پر قبضہ کر لیا۔ ٹہ

لہ RAWERTY .

ٹہ ۱- ABID.

مرزا سلطان حسین بیقارہ نے اپنے دورِ حکومت میں کئی ارغون سرداروں کو مختلف ممالک کی حکومت سپرد کر دی۔ سیستان پہ امیر سلطان ارغون کی تقرری عمل میں آئی۔ ۱۴۷۰ء میں شجاع الدین ذوالنون کو غور اور زمینداوڑ کی حکومت سپرد کر دی گئی۔ اس امیر نے نقودریوں اور ہزاروں کے برخلاف ۱۴۷۹ء میں ایک زبردست مہم چلا کر ان کا قلع قمع کر دیا۔ جنہوں نے قندہار اور ہرات کے درمیان لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر کے ایک طوفان برپا رکھا تھا۔ اس کے تھوڑا عرصہ بعد اس کو قندہار کی حکومت پہ فائز کیا گیا۔ بعد میں فراہ اور سخر طوبک کا انتظام اس کے سپرد ہوا۔ آخر میں شال مستونگ فشنگ (پشین) اور سیوی کے علاقے اس کے دائرہ اختیار میں دے دیئے گئے۔ [1]

ارغونوں کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ چنگیز خان کی نسل سے تھے جس کے ایک پوتے کا نام ارغون تھا جو اباقا خان بن ہلاکو خان کا بیٹا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے منگول سردار امیر ارغون کی اولاد تھے جس نے تیس سال تک ایران پر حکومت کی اور ۱۳۲۵ء میں طوس میں وفات پائی۔ [2]

اس زمانہ میں جبکہ ازبک اور تیموری شہزادوں کے دوسرے دشمن خراسان کو تاخت و تاراج کر رہے تھے، اس افراتفری کے دوران شجاع الدین

---

[1]۔ RAVERTY.

[2]۔ ABID.

ذوالنون ولدیت قندہار میں مرکزی حکومت کا برائے نام ماتحت تھا اور عملی طور پر وہ خود مختار بن گیا تھا۔ اس نے کئی بار شہزادہ بدیع الزماں اور اس کے باپ سلطان حسین مرزا کے درمیان مخالفت پیدا ہونے کے دوران شہزادہ بدیع الزمان کی مدد کی اور شہزادے کو اپنا داماد بنایا۔[1]

۱۴۹۴ء میں مرزا سلطان حسین بیقارہ کو امیر سلطان ارغون کے متعلق خبر ملی کہ وہ سیستان میں خود مختار بن بیٹھا ہے۔ شہزادہ ابوالحسن ایک لشکر کے ساتھ اس کی سرکوبی کے لئے سیستان جا پہنچا۔ ادھر ارغون امرا بھی جو مختلف صوبوں کے حکمران تھے۔ امیر سلطان ارغون کی امداد پر سیستان آ گئے۔ قندہار سے شجاع بیگ اور زمینداوڑ سے ذوالنون بیگ اپنے اپنے لشکر کے ساتھ سیستان میں وارد ہوئے۔ شہزادہ ابوالحسن کے مقابلے میں وہ زیادہ طاقتور تھے۔ شہزادے کی فوج کو ارغون سرداروں کے لشکر کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی اور وہ خود زخمی ہو گیا۔[2]

اہم واقعات

سولہویں صدی کے اوائل میں ایشیا میں بڑے بڑے اہم واقعات رونما ہونے لگے۔ سلطان ابوسعید بہادر خان تیموری کے قتل سے پیشتر ۱۴۶۹ء میں اس کا بڑا بیٹا مرزا الغ بیگ ولایات غزنی اور کابل کا حکمران اعلیٰ بن گیا تھا۔ اس شہزادے نے ۱۵۰۱ء میں ایک ایسے موقعہ پر وفات

---

[1]:- RAVERTY.

[2]:- ABID.

پائی جبکہ ماوراء النہر کے علاقے میں تیموری شہزادوں کی طاقت دن بدن کمزور ہو رہی تھی اور شیبانی خان کی قیادت میں ازبکوں کی طاقت میں بڑا اضافہ ہو رہا تھا۔ ۱۵۰۱ء میں بابر کو ثمرقند سے نکال باہر کر دیا گیا اور اس نے ولایت کابل اور غزنی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۱۵۰۴ء میں سلطان حسین بیقارہ نے بادغیس کے نزدیک بابا الہی کے مقام پر وفات پائی۔ ۱۵۰۶ء میں شیبانی خان نے مرزا سلطان حسین بیقارہ کے بیٹوں مرزا بدیع الزمان اور مظفر حسین مرزا کو زمینداوڑ کے علاقے میں ایک خونریز جنگ میں شکست دی جو ازبکوں اور ان کے بھائی بند منگولوں کے درمیان ہوئی۔ شیبانی خان نے ہرات پر قبضہ کر لیا۔ قندہار کے ماتحت حکمران شجاع الدین ذوالنون اسی لڑائی میں ازبکوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ شجاع الدین ذوالنون کے بیٹے شاہ بیگ خان نے اس خوف سے کہ بابر قندھار پر قبضہ نہ کرے۔ ازبکوں کی بالادستی تسلیم کر کے اپنے آپ کو شیبانی خان سے وابستہ کر لیا۔[۱] اسی زمانے میں ایران میں صفوی خاندان کا ستارہ اقبال عروج پر تھا۔ وہ ایک فوجی اور سیاسی طاقت کی صورت میں ابھر رہے تھے۔ شاہ اسماعیل صفوی نے ایران کے مغربی صوبوں میں اپنی طاقت مستحکم کر لی۔ اس موقعہ پر ایرانیوں اور ازبکوں کے درمیان چپقلش شروع ہوئی اور ازبکوں نے خراسان کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔ ۱۵۱۰ء میں مرو کے نزدیک ایرانیوں اور ازبکوں کے

۱۔ RAVERTY.

درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی اس لڑائی میں ازبکوں نے ایرانیوں کے ہاتھوں شکست کھائی ان کا سردار شیبانی خان اس خونریز لڑائی میں مارا گیا اور ہرات پر ایرانیوں کا قبضہ ہوگیا۔ خراسان فتح ہونے سے مشہد کی اہمیت بڑھ گئی اور صفوی خاندان کے وقار میں بڑا اضافہ ہوا[۱]۔ اب شاہ بیگ خان ارغون نے قندہار کو بابر سے بچانے کی خاطر ایرانیوں سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی اور بابر کے لئے قندھار پر قبضہ کرنے کا راستہ ہموار ہوگیا۔ ۱۵۱۰ء میں شاہ بیگ خان کے بیٹے مرزا شاہ حسین نے قندہار کی کنجیاں بابر کے سپرد کر دیں۔ مرزا شاہ بیگ خان اور مرزا شاہ حسین دونوں شال اور سیوی کی طرف منتقل ہوگئے اور انہوں نے یہاں کے قلعوں کے استحکامات کو از سر نو درست کر لیا۔ بابر نے ۱۵۲۲ء میں قندھار اور اس کے متعلقہ علاقوں پر مکمل قبضہ کر لیا ارغون قندہار کی حکومت سے پوری طرح محروم کر دیئے گئے۔ انہوں نے اپنی توجہ کلیتاً سندھ کی طرف مبذول کی انہوں نے ولایت قندہار کو خیرباد کہہ کر سیوی اور گنداوہ پر قبضہ کر لیا[۲]۔

بابر نے ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر دلی پر قبضہ کر لیا اور ہندوستان میں خاندان مغلیہ کی بنیاد ڈالی جو چغتائی کہلاتے تھے[۳]۔

۱:- RAVERTY

۲:- ABID . ۳:- ABID .

یہی وہ سیاسی پس منظر تھا۔ جس کے دوران بلوچستان میں ایک قومی حکومت قائم ہونے کے لئے راستہ ہموار ہو گیا لیکن بلوچوں کی اس قومی حکومت کو معرض وجود میں آنے کے لئے ڈیڑھ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ لگا۔ اس زمانہ میں بلوچستان کے مشرق میں مغلیہ خاندان اور اس کے مغرب میں صفوی خاندان کی طاقتور حکومتیں قائم تھیں۔ اس دوران قندھار کی ولایت پر کبھی ہندوستان کے مغلیہ خاندان اور کبھی ایران کے صفوی خاندان کا قبضہ ہو جایا کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ بلوچستان کی قسمت بھی کبھی ہندوستان کے چغتائیوں اور کبھی ایران کے صفوی بادشاہوں کے ساتھ وابستہ ہو جاتی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں جب یہ دونوں طاقتور حکومتیں بہ یک وقت زوال سے دوچار ہوئیں تو اس کے بعد کہیں جا کر بلوچستان میں صحیح معنوں میں ایک قومی حکومت قائم ہوئی اور اس کو ترقی کرنے کا موقعہ ملا۔ ✣

اٹھارہواں باب

بانیان خاندان احمدزئی

بمرور زمانہ قلات کے سیوا خاندان، مغل حاکمان ما سبق اور بانیاں خاندان احمدزئی کے گرد افسانہ واساطیر کا ایک ہالہ سا بن گیا ہے۔ تاریخ کے اوراق ان کے ذکر سے یکسر خالی ہیں۔ عموماً روایت یہی ہے کہ قلات میں سب سے پہلے ایک مسلمان خاندان سحرائی برسر اقتدار آیا تھا۔ اس خاندان کے متعلق بقول ہیں اس کے سوا کہ ان کا قبرستان ابھی تک قلات میں موجود ہے کوئی اور دستاویزی ثبوت فراہم نہیں ہوسکا ہے۔ اس کے بعد قلات میں ایک ہندو خاندان راجہ سیوا کی حکومت قائم ہوگئی تھی لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ کونسا سیاسی اور سماجی پس منظر تھا کہ جس کی بنا پر ایک ہندو خاندان کو عہد وسطیٰ میں قلات میں اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کا موقعہ ملا۔ اکثر مورخین نے اس سلسلہ میں زیادہ تر روایات کا سہارا لیا ہے۔ برطانوی عہد کا مورخ اے ڈبلیو ہیوز اپنی کتاب دی کنٹری آف بلوچستان میں لکھتا ہے:۔

"روایت یہی ہے کہ میروانیوں کے عہد سے قبل قلات میں ایک مسلمان خاندان حکومت کرتا تھا۔ جو سحرائی کہلاتا تھا ـــ اس خاندان کی جگہ ایک ہندو خاندان

نے لے لی لیکن یہ معلوم نہیں کہ ان خاندانوں کے حکمرانوں نے کب اور کتنا عرصہ حکومت کی۔ البتہ فقط اتنا معلوم ہے کہ سیوا خاندان کا خاتمہ میر قنبر کی سرکردگی میں ایک براہوئی خاندان قبیلہ میروانی کے ہاتھوں ہوا۔

برطانوی عہد کا سیاح پاٹنجر اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے ا۔

اس سے پہلے صدیوں سے قلات پر ایک ہندو خاندان سیوا کی حکومت قائم تھی۔ اس خاندان کے آخری حکمران کا نام راجہ سیوا تھا یا اس خاندان کے اراکین گدی پر بیٹھنے کے بعد یہی لقب اختیار کرتے تھے۔ یہ آخری مفروضہ درست معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ قلات ابھی تک قلات سیوا کے نام سے مشہور چلا آتا ہے۔ اس نام کا ایک فرد واحد کی بجائے حکمرانوں کے ایک سلسلہ کی طرف منسوب ہونا زیادہ قرین قیاس ہے لیکن اگر یہ نام ایک فرد واحد کی طرف منسوب ہے تو ضروری بات ہے کہ یہ فرد واحد نصیر خان کی مانند اعلیٰ قابلیت اور بہترین خوبیوں کا مالک ہوگا۔

سیوا خود قلات میں مستقل قیام کرتا تھا۔ اور اس کا واحد اکلوتا بیٹا سنگین اس کے نائب کی حیثیت سے جھالاوان کے علاقہ زہری میں بود و باش رکھتا تھا۔ ان دونوں شہزادوں کا انتظام حکومت منصفانہ اصولوں کے مطابق چلتا تھا۔ اس سے تجارت اور دوسرے پرامن پیشوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ آخر سیوا کو قریب کی پہاڑیوں میں رہنے والے خانہ بدوش گڈریوں سے امداد طلب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ وہ ایک ایسے ٹولے کی کارستانیوں اور چیرہ دستیوں کا قلع قمع کر سکے جس نے اس کی حکومت کی حدود میں داخل ہو کر لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ان مداخلت کاروں اور شرپسندوں کا سرغنہ ایک

افغان تھا۔ اس کے ساتھ اپنے پیروکاروں کے علاوہ ایک زند بلوچ قبیلہ جو مزاری کے نام سے موسوم تھا کے افراد بھی شامل ہو گئے تھے۔ یہ قبیلہ لوٹ مار کے لئے اب بھی مشہور ہے۔ سارے ملک کی تباہی کے علاوہ خود دارالحکومت کو بھی ان شرپسندوں اور لٹیروں سے خطرہ درپیش تھا۔

وہ سردار جس سے امداد طلب کی گئی میر قنبر تھا۔ اس کے مورثِ اعلیٰ حبشہ کے رہنے والے خیال کئے جاتے تھے وہ ایک پیر اور مرد بزرگ کی اولاد میں سے تھا جس سے روایات کے مطابق کئی ایک کرامتیں ظہور میں آئی تھیں اسی بنا پر میر قنبر اور اس کی برادری کے لوگوں کو اپنے ہم وطنوں کی نظروں میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ یہ وقعت اور عزت ان کی جائداد اور تعداد افرادِ خاندان کی وجہ سے نہ تھی کیونکہ ان کی جائداد جو پنجگور کے علاقے میں تھی۔ زیادہ بڑی جائداد نہ تھی اور اس پر یہ لوگ مشکل سے گذارہ کرتے تھے۔

جھالاوان اور سراوان کے بلند و بالا پہاڑوں میں داخل ہونے کے بعد راجہ سیوا نے ان کو زمین کا ایک ٹکڑا بھی دیا۔ یہ بھی ان کے گذارے کے لئے کچھ زیادہ کافی نہ تھا۔ انہوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں تمام چوروں اور ڈاکوؤں کا خاتمہ کر دیا۔ جن کا قلع قمع کرنے کے لئے ان کو طلب کیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے آپ کو علاقے کا سب سے بڑا طاقتور قبیلہ خیال کرنے لگے۔ اور اس علاقے کا بلاشرکت غیر مالک بننے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ قنبر نے رسمی طور پر راجہ کو گدی سے اتار دیا اور قلات کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور دوسرے ہندوؤں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ مذہبی جذبہ اور دینی ولولہ

کے بہانے سے ان ہندوؤں کو تہ تیغ کر دیا جو اپنا دین بدلنے پر راضی نہ تھے۔

راجہ سیوا اپنے افراد خاندان کے ساتھ زہری کی طرف چلا گیا اور اپنے بیٹے کے پاس رہنے سہنے لگا۔ زہری میں اس کا بیٹا بدستور برسراقتدار تھا۔ لیکن ان کے دشمنوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ جو ان کے مخالفوں کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے۔ وہ لوگ آخر کار ان کو زہری سے بھی نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے وہاں سے بھی بھاگ کر سکھر اور ملتان کی راہ لی اور اپنے ہم وطنوں کے پاس جاکر پناہ لی۔

سیوا کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ وہ اس بغاوت کے آخری دور میں فوت ہو گیا۔ اس کے بیٹے سنگین نے گرفتار ہونے کے بعد اپنا مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے پیروکاروں اور برادری کے لوگوں میں سے ایک بڑی تعداد نے اس کی پیروی کی ہوگی۔ جنہوں نے گردانی قبیلہ کا نام اختیار کر کے اپنی اصلیت اور نصب کو برقرار رکھا۔ قلات کے دہواروں میں سیوازئی طائفہ کی موجودگی سے بھی اس تبدیلی مذہب کا پورا پورا پتہ چلتا ہے۔

مندرجہ بالا روایات جزوی طور پر درست ہو سکتی ہیں۔ کچھ نہ کچھ تاریخی اشارات بھی موجود ہیں۔ جن سے اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ رہنمائی ہوتی ہے امیر تیمور گرگان نے ۱۳۹۵ء میں دلی پر حملہ کے دوران پنجاب کے علاوہ ملتان اور اوچھ کو بھی تاخت و تاراج کیا تھا، منگولوں کے اس حملہ نے سلطنت دلی کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور رفتہ رفتہ سرے سے اس کا شیرازہ ہی بکھرنے لگا

دلّی میں خاندان سادات کے آخری حکمران سلطان علاؤالدین عالم شاہ کے طوفانی دور کے اختتام پر ۱۴۴۳ء میں تمام صوبائی گورنر اور ماتحت حکمران ایک ایک کر کے خود مختار ہو بیٹھے۔ ایک عرصہ سے ملتان کا کوئی صوبیدار ہی نہیں تھا۔ اس موقعہ پر ملتان کے باشندوں نے جو دلّی کی مرکزی حکومت سے مایوس اور بدظن ہو چکے تھے۔ شیخ بہاؤالحق والدین ذکریا کی درگاہ کے متولی شیخ یوسف قریشی کو اس کی اپنی مرضی اور منشا کے برخلاف اپنا حکمران بنا لیا اور اپنے آپ کو خود مختار تصور کرنے لگے۔[۱]

اس زمانہ میں لانگاہ قبیلہ کا سرگردہ اور سردار رائے سحرا تھا۔ جس کے متعلق روایت ہے کہ وہ لہڑی واقع کچھی کا باشندہ تھا اور وہاں اس کی جاگیر تھی۔ سندھی مورخین کے مطابق لانگاہ بلحاظ نسل جٹ تھے۔ زبدت التواریخ کے مطابق رائے سحرا کا اصل نام بادھن خان سندھی تھا۔ خیال ہے کہ اس نے سیوی پر بھی حکومت کی تھی۔ رائے سحرا کے نام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندو تھا لیکن درحقیقت وہ ایک مسلمان تھا۔ لانگاہ بہت عرصہ پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔ عابد کا خیال ہے کہ وہ سولنکی راجپوت تھے۔[۲]

چونکہ بھکر کا علاقہ کچھی سمیت اس زمانہ میں ملتان کا ایک صوبہ تھا۔ لہٰذا رائے سحرا اپنے اہل خاندان اور قبیلہ کے لوگوں کو ساتھ لے کر ملتان چلا گیا اور ملتان کے خود مختار حکمران شیخ یوسف قریشی کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔ اور اس

۱۔ RAVERTY.

۲۔ ABID.

کے کچھ عرصہ بعد اپنے دوران ملازمت میں رائے سحرا نے شیخ کی قربت حاصل کرنے کی خاطر اپنی بیٹی کو اس کے نکاح میں دے دیا۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنے کی خاطر اکثر شیخ کے حرم میں آیا جایا کرتا تھا۔ اس نے شیخ کے ساتھ اپنے قریبی تعلقات کے دوران محسوس کر لیا کہ شیخ موصوف حکومت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ اس نے مناسب موقع آنے پر شیخ کو ملتان کی حکومت سے علیحدہ کر دیا اور ملتان کی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور قطب الدین کا لقب اختیار کر کے شیخ یوسف کے مقبوضات پر حکومت کرنے لگا۔ رائے سحرا کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شاہ حسین لانگاہ ملتان کا خود مختار حکمران بنا جو سندھ کے حکمران جام نظام الدین سمہ عرف ننده کا ہمعصر تھا۔[۱]

خیال ہے کہ ملتان کے حکمران رائے سحرا نے اپنی حکومت کو جس میں کچھی کا علاقہ بھی شامل تھا وسطی بلوچستان تک وسعت دی تھی۔ غالباً اسی نے اپنی طرف سے راجہ سیوا کو قلات میں حاکم بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ ورنہ بصورت دیگر اس زمانے میں ایسے کوئی سماجی اور سیاسی حالات نہیں تھے جن کی بنا پر ایک ہندو قلات میں برسر اقتدار آسکتا۔ بلا مبالغہ قلات کی میری کا طرز تعمیر ہندوانہ تھا اور راجہ سیوا ہی نے پہلے پہل یہ قلعہ تعمیر کیا تھا۔ اسی بنا پر قلات کا یہ قدیم قصبہ قلات سیوا کے نام سے موسوم تھا جو بعد میں قلات بلوچ کے نام سے موسوم ہوا۔

مرزا سلطان حسین بیقارہ جیسا کہ اس سے پیشتر بیان کیا جا چکا ہے ۱۴۸۰ء

---

[۱] RAVERTY.

میں ہرات میں برسرِ اقتدار آیا۔ اس نے سنہ ۱۴۷۹ء میں قندہار کی حکومت ایک ارغون سردار امیر شجاع الدین ذوالنون کے سپرد کر دی۔ بعد میں شال، مستونگ اور سیوی کے علاقے اس کے دائرہ اختیار میں دے دیئے گئے سنہ ۱۴۸۷ء میں اس کے بیٹے شجاع بیگ بصورت دیگر شاہ بیگ خان نے جھالاوان کی طرف ایک فوجی مہم کی رہنمائی کی تھی خیال ہے کہ قندھار کے ارغون حکمرانوں نے راجہ سیوا کی زندگی یا اس کی وفات کے بعد قلات پر قبضہ کر کے اسے ولایت قندہار میں شامل کر لیا تھا۔ غالباً اس سے پیشتر جھالاوان کا علاقہ ملتان کے صوبہ بھکر کا ایک حصہ تھا۔ [۵۰]

اخوند ملا محمد صدیق تاریخ خوانین احمد زئی میں لکھتا ہے۔

"قلات سیوا ہندو کا تھا۔ سیوا کے بعد قلات پر مغل قابض ہو گئے۔ مغلوں کو خراسان میں لڑائی درپیش آئی۔ میر عمر میروانی قلات کا حاکم بن گیا۔"

اخوند کا مندرجہ بالا بیان مختصر ہونے کے باوجود بڑا اہم اور معنی خیز ہے کہ اس نے ایک اہم حادثہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو منگولوں کو خراسان میں درپیش آیا تھا اور یہ حادثہ بلا مبالغہ وہ خونریز جنگ تھی جو سنہ ۱۵۰۷ء میں خراسان میں منگولوں اور ازبکوں کے درمیان ہوئی۔ اسی لڑائی میں قندہار کا مقتدر گورنر امیر شجاع الدین ذوالنون ازبکوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ منگولوں کی اس شکست کے بعد ولایت قندہار میں ارغونوں کا اقتدار زوال پذیر ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۱۵۱۰ء میں مرو کے مقام پر ازبکوں نے ایرانیوں کے ہاتھ سے شکست کھائی اور ایرانیوں نے خراسان پر قبضہ کر لیا۔ اسی

۵۰۔ RAVERTY.

زمانہ میں مرزا بابر جو ۱۵۰۴ء میں ولایات کابل اور غزنی کا حکمران بن گیا تھا قندھار کا صوبہ حاصل کرنے کے درپے ہوا شاہ بیگ خان ارغون کو قندھار کے صوبے کے بارے میں مرزا بابر کی طرف سے زبردست خوف دامن گیر تھا۔[ئ] اخوند ملا محمد صدیق کے مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں گمان کیا جا سکتا ہے کہ میروانیوں نے اسی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر قلات پر قبضہ کر لیا اور میر عمر میروانی قلات کو مغلوں سے خالی پا کر قلات کا حکمران بن گیا۔

اس اثنا میں سردار رند چاکر بلوچ اور گوہرام لاشاری کمران سے قلات کی طرف نکل آئے۔ میروانیوں اور میر چاکر کے باپ شیہک (شیخ حق) کے درمیان لڑائی ہوئی۔ بلوچوں کا لشکر غالب آیا۔ میر عمر میروانی مارا گیا۔ میر عمر کی قبر ابھی تک قلات میں مستونگی دروازے کے نزدیک موجود ہے۔ قلات کو میروانیوں سے فتح کرنے کے بعد بلوچ دو سال تک قلات میں مقیم رہے۔ یہ لوگ اپنے مویشیوں کو چرانے کی غرض سے سردیوں کے دوران کچھی چلے جاتے تھے اور گرمیوں کے موسم میں واپس قلات آتے تھے اس موقعہ پر شیہک، چاکر اور گوہرام نے باہم مشورہ کر کے کچھی پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کچھی کی طرف روانہ ہو گئے۔ شیہک اور چاکر رند درہ بولان کے راستے سے ڈھاڈر پہنچ گئے۔ لاشاریوں کا سردار میر گوہرام درہ مولہ کے راستے سے گنداوہ میں آیا۔ انہوں نے مندو بلوچ کو جو جتوئی قبیلہ کا سردار اور میر چاکر کا خسر تھا۔ قلات میں

ئ:۔ RAVERTY.

حاکم بنا دیا۔ لہ

مکران میں بلوچوں کی ہمہ گیر ہجرت پندرہویں صدی کے وسط میں شروع ہوئی اور وہ درہ گاج ناڑی، درہ مولہ اور درہ بولان کے راستے سندھ اور کچھی کے میدانی علاقوں میں وارد ہوئے۔ بلوچوں کی اپنی روایت کے مطابق وہ جام نظام الدین سمہ کے عہد حکومت میں سندھ میں داخل ہوئے تھے جس نے ۱۴۶۱ء سے لے کر ۱۵۱۷ء تک سندھ پر حکومت کی۔ جام نظام الدین ملتان کے حکمران شاہ حسین لانگاہ کا ہمعصر تھا۔ لانگاہ خاندان کے حکمران تلات میں بحرانی کہلانے لگے۔

۱۴۵۹ء میں ملک سحراب دودائی جو ہوت قبیلہ کا سوار تھا۔ مکران سے اپنے قبیلہ کے بیشمار لوگوں کو ساتھ لے کر ملتان میں وارد ہوا اور ملتان کے حکمران شاہ حسین کے ہاں ملازمت اختیار کرلی۔ ملک سحراب کے ساتھ اس کے دونوں بیٹے اسماعیل خان اور فتح خان کے علاوہ اس کے خاندان کے دوسرے لوگ بھی ملتان چلے آئے تھے۔ شاہ حسین لانگاہ نے ان کو ملتان کے مشرق میں کوٹ کبرور کے مقام پر رہنے کے لئے جگہ دی۔ لیکن جب بعد میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوا تو شاہ حسین نے ان کو دریائے سندھ کے مغربی جانب اپنے مقبوضات کی حفاظت پر متعین کر دیا۔ تاکہ دریائے سندھ کی مغربی جانب کے افغانوں کی دست برد سے اس کا علاقہ محفوظ رہے۔ رفتہ رفتہ وہ تمام علاقہ جو اس وقت

لہ :۔ تاریخ خوانین قلات۔ اخوند ملا محمد صدیق۔

ٹہ RAVERTY ۔۔

ڈیرہ اسماعیل کے ضلع پر مشتمل ہے۔ ان کے زیر اختیار آ گیا۔ اسی علاقے میں بلوچوں
کی دو بڑی بستیاں ملک سحراب کے دونوں بیٹوں کے نام پر بدستور ڈیرہ
اسماعیل خان اور ڈیرہ فتح خان کہلاتی ہیں۔ تقریباً اسی زمانہ میں ڈیرہ غازی خان
کے ضلع میں بلوچوں کی ایک کثیر تعداد آباد ہو گئی اور سردار غازی خان مرلانی بلوچ
نے یہاں ایک بستی کی بنیاد ڈالی جو اب بھی ڈیرہ غازی خان کے نام سے مشہور
ہے۔[1]

شاہ حسین لانگاہ کی طرف سے ملک سحراب اور اس کے قبیلے کے لوگوں
کو جو اس کے ساتھ یا اس کے آنے کے بعد مکران سے نقل مکانی کر کے چلے
آئے تھے ان فوجی خدمات کے عوض جو وہ لانگاہ حکمران کے لئے سرانجام دے
رہے تھے۔ سندھ ساگر دو آبہ کے اندر کالا باغ کے بالمقابل ایک دوسرے کنارے
دھن کوٹ کے درمیان جاگیریں ملیں۔ ان کی یہ جاگیریں خان سے بہت دور اوپر
کی طرف موجودہ ڈیرہ اسماعیل خان کی بستی سے چند میل کے فاصلے پر اس کے
جنوب مشرق میں واقع تھیں۔[2]

بعض شواہد سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ میر چاکر رند بلوچ اور میر گوہرام لاشاری
بلوچ اپنے قبیلوں کو ساتھ لے کر سولہویں صدی کے اوائل میں مکران سے نقل
مکانی کر کے قلات کے علاقے میں داخل ہو گئے تھے اور میر عمر میروانی کو شکست
دینے کے بعد قلات پر قبضہ کر لیا تھا۔ جی پی ٹیٹ کا خیال ہے کہ مکران سے

---

[1] RAVERTY.

[2] ABID.

بلوچوں کی ہجرت ایران میں صفوی خاندان کے برسر اقتدار آنے کے باعث عمل
میں آئی تھی جن کے عمال حکومت نے مکران پر ایرانیوں کی بالادستی قائم ہونے
کے بعد ٹیکسوں کی وصولی کے معاملہ میں بلوچوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کیا
تھا۔ لہ حقیقت یہ ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی کے دوران بلوچستان کے
طول و عرض میں قحط اور خشک سالی کا ایک طویل دور شروع ہو گیا تھا۔ اس خشک
سالی نے زندگی کی اقتصادی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ بارش کے فقدان کے باعث
چراگاہوں کا دامن بتدریج تنگ ہوتا چلا گیا۔ اس خشک سالی اور طویل قحط کے
نتیجہ میں مکران کے بعض بلوچ قبائل کو جن کی معیشت کا دارومدار بھیڑ بکریوں
اور دوسرے مویشیوں کی پرورش پر تھا مجبوراً اپنے اصلی وطن سے ہجرت کرنی
پڑی اور وہ جاہو لک سے ہو کر پہلے لسبیلہ کے علاقے میں داخل ہوئے اور
اس کے بعد گاج ناڑی کے درہ سے سندھ میں وارد ہوئے۔ ان کے دوسرے
کاروان ذرا شمال کا رخ کر کے درّہ مولہ اور درہ بولان کے راستوں سے کچھی
کے میدانی علاقے میں داخل ہو گئے اور ان کے بعض قبائل سندھ اور کچھی کو بھی
خیرباد کہہ کر پنجاب کی طرف منتقل ہو گئے۔ مکران سے بلوچوں کی یہ ہجرت بیک وقت
عمل میں نہیں آئی تھی۔ بلکہ بتدریج نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ تک جاری تھی
ان کا جو گروہ سطح مرتفع قلات میں وارد ہوا۔ یہاں اس کو مکران کی نسبت کوئی بڑا فرق
نظر نہ آیا بلکہ چارہ کے اعتبار سے کچھی کا علاقہ ان کے لئے نسبتاً زیادہ جاذب نظر

لہ:- MEMORES ON THE COUNTRY OF FAMILY OF THE KHANS OF KALAT.

تھا جہاں کے وہ دو سال تک چکر کاٹتے رہے۔ غالباً قلات کی شدید سردی بھی ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ انہوں نے قلات کو بھی خیرباد کہہ کر اپنی توجہ میدانی علاقوں کی طرف مبذول کی اور میدانی علاقوں میں جن میں سندھ اور پنجاب کے زرخیز علاقے بھی شامل تھے مستقل سکونت اختیار کر لینے کا فیصلہ کیا ان کی یہ ہجرت بنیادی طور پر معاشی وجوہات کی بناء پر عمل میں آتی تھی میدانی علاقوں میں وارد ہونے کے بعد انہوں نے قلات کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ غالباً اسی خشک سالی اور طویل قحط کا نتیجہ تھا کہ مکران سے بلوچوں کے ہجرت کرنے کے بعد خاران اور جھالاوان میں ایک طرف براہوئی اور دوسری طرف جدگال (جٹ) قبائل کے درمیان انہی چراگاہوں پر کئی بار لڑائی ہوئی اور اس خانہ جنگی کے نتیجہ میں ان علاقوں کی جٹ آبادی کا ایک بڑا حصہ شکست کھا کر سندھ کی طرف منتقل ہو گیا اور بلوچ براہوئی زبان بولنے والے قبائل نے جدگالوں کی جگہ لے کر ان علاقوں سے ان کے اقتدار کا بھی خاتمہ کر دیا۔

باور کیا جاتا ہے کہ سردار میر چاکر خان رند بلوچ نے مکران میں اپنی طاقت کو مستحکم کرنے کے بعد خاران کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے قلات پر حملہ کر کے قلات کا علاقہ بھی میرانیوں سے چھین لیا۔ اسی دوران اس نے جام نظام الدین سمہ کی حکومت کا سیوی سے خاتمہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے سیوی ہی کو اپنا دارالحکومت بنا کر پچیس سال تک اپنی وسیع مملکت پر حکومت کی۔ جام نظام الدین کی سازش سے سیوی کا علاقہ ارغونوں کے ہاتھ کھو دینے کے بعد وہ اپنے رند شاہسواروں کو لے کر پنجاب

میں وارد ہوا اور ملتان کے صوبے میں سکونت اختیار کی۔ بعد میں مرزا ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی باہمی آویزش کے دوران اس نے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ بالآخر مرزا ہمایوں کی حمایت کر کے اسے تخت دلی پر بٹھانے کا شرف حاصل کیا۔

بلا مبالغہ یہ تمام واقعات بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور میر چاکر رند کے اقتدار کو نہ صرف بلوچستان بلکہ سندھ اور ہند کی تاریخ میں ایک اہم باب قرار دیا جا سکتا ہے لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ ابھی تک ان واقعات کا کوئی دستاویزی ثبوت فراہم نہیں ہوا ہے اور نہ مرزا ہمایوں کی سوانح حیات میں اس قسم کے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اخوند ملا محمد صدیق کے بیان سے فقط اس قدر معلومات فراہم ہوتی ہیں کہ میر چاکر رند اور میر گوہرام لاشاری نے میر چاکر کے باپ میر شیہک کی قیادت میں قلات پر حملہ کر کے ایک مختصر عرصہ کے لئے میر چاکر کے خسر میر مندو بلوچ کو قلات کا حاکم بنا کر بٹھا دیا تھا اور خود کچھی پر قبضہ کرنے کے ارادے سے درہ بولان اور درہ مولہ کے راستوں سے کچھی میں وارد ہوئے تھے لیکن کچھی پر بحیثیت حکمران رندوں کے قبضہ کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہو سکا ہے۔

سندھ کے حکمران جام نظام الدین سمہ نے اپنے دور اقتدار میں ملتان کے صوبہ بھکر کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا تھا لیکن سیوی کا علاقہ کبھی بھی اس کے مقبوضات میں شامل نہیں تھا۔ سیوی زمانہ قدیم سے ولایت قندھار کا ایک اہم حصہ چلا آتا تھا جو اس زمانہ میں ولایت قندھار کے ارغون

حکمرانوں کے زیر اقتدار تھا[1]۔ ابتدا میں سیوی کا علاقہ ارغونوں کے ماتحت سلطان[2] پردل برلاس کی جاگیر چلا آتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس علاقے پر بدستور سلطان پردل برلاس کی اولاد قابض تھی۔[3]

۱۵۰۴ء میں جب مرزا بابر ولایات کابل اور غزنی کا حکمران بنا تو اسی زمانہ سے اس کی للچائی ہوئی نظریں ولایت قندہار پر لگی ہوئی تھیں۔ ۱۵۰۷ء میں جب سلطان حسین بیقارہ کے بیٹوں کو خراسان میں ازبکوں کے ہاتھ سے شکست ہوئی تو امیر شجاع الدین ذوالنون کے بیٹے مرزا شاہ بیگ خان نے جو اپنے باپ کے قتل کے بعد ولایت قندھار کا حکمران بنا ولایت قندھار کو بابر سے بچانے کی خاطر ازبکوں کی بالادستی تسلیم کر لی اور شیبانی خان ازبک کا باجگذار بن گیا۔ ۱۵۰۷ء ہی میں بابر نے پہلی بار قندہار پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا لیکن شیبانی خان کی بروقت مداخلت کی وجہ سے قندہار پر اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکا لیکن اس حملے کے دوران مرزا بابر کو یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ ارغونوں کا سارا خزانہ زر و جواہرات اس کے ہاتھ لگے اور اس نے اسی دولت کے بل بوتے پر بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا۔ بدقسمتی سے ۱۵۱۰ء میں ازبکوں نے مرو کے مقام پر ایرانیوں سے شکست کھائی اور ان کا قائد شیبانی خان اسی لڑائی میں مارا گیا۔ شاہ اسماعیل صفوی شاہ ایران نے ہرات پر قبضہ کر لیا۔ اس عظیم المیہ کی وجہ سے مرزا شاہ بیگ خان ازبکوں کی سرپرستی سے بھی محروم ہو گیا۔ مرزا بابر نے

لے :- RAVERTY.

[2] بعض مورخین نے اسے سلطان پیرولی لکھا ہے۔

شاہ اسماعیل صفوی کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کر لیے۔ ان واقعات کی وجہ سے مرزا شاہ بیگ خان نے پوری طرح محسوس کر لیا کہ وہ ایک طرف بابر اور دوسری طرف شاہ اسماعیل کی موجودگی میں ولایت قندھار پر زیادہ عرصہ تک اپنا اقتدار قائم نہ رکھ سکے گا۔[۱]

۱۵۱۱ء میں شاہ بیگ خان شال پہنچا جہاں اس کے ماتحت حاکم اور کوتوال میر فاضل کوکتاش اور عبدالعلی ترکان منگول مقیم تھے۔ یہاں مشورہ کرنے کے بعد مرزا شاہ بیگ خان نے سیوی پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سلطان پردل برلاس کی ابنائے کو جب مرزا شاہ بیگ خان کے اس ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے اس کے پاس پیشکش بھیج کر اس کو سیوی پر قبضہ کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ وہ لوگ ہر قسم کی شرائط قبول کرنے پر تیار تھے۔ لیکن مرزا شاہ بیگ خان نے ان کی درخواست مسترد کر دی اور سیوی پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا درحقیقت مرزا شاہ بیگ خان ارغون کو ولایت قندھار سے مایوس ہونے کے بعد ایک ایسی محفوظ جائے پناہ کی اشد ضرورت تھی جہاں وہ اپنے اہل خاندان، لواحقین اور اپنی سپاہ کو حفاظت سے رکھ کر خاطر خواہ طور پر ان کی کفالت کا اہتمام کر سکے۔ سلطان پردل برلاس کی ابنائے نے یہاں سے جنوب کی طرف کوچ کر کے فتح پور کے قلعہ میں پناہ لی جہاں سامیجہ اور زہر کچہ قبیلوں کے لوگ قیام پذیر تھے۔ بلوچ ابھی نو وارد تھے اور وہ اس زمانہ میں یہاں سے بہت دور جنوب میں سندھ کی سرحد پر سکونت پذیر تھے۔[۲]

---

[۱] RAVERTY. [۲] ABID.

سلطان پردل کی ابنائے کے پاس ایک ہزار دولت شاہی گھوڑ سوار تھے انہوں نے برغدائی، کوزبائی، نورکائی اور بلوچوں پر مشتمل ایک لشکر بھی اکٹھا کر کے مرزا شاہ بیگ خان کی فوج کے مقابلے پر روانہ کیا لیکن مرزا شاہ بیگ خان کی سپاہ نے تھوڑی سی جدوجہد کے بعد ان کو شکست دی اور ان لوگوں نے بھاگ کر جام نظام الدین سمہ کے علاقے میں پناہ لی۔ اس کے بعد مرزا شاہ بیگ خان دوبارہ لوٹ کر سیوی چلا گیا۔ یہاں اس نے چند دن قیام کر کے سیوی کے قلعہ کے استحکامات درست کر لئے اور اس کی حفاظت کا خاطر خواہ اہتمام کرنے کے بعد اپنے ساتھ ایک مختصر فوج لے کر قندہار چلا گیا۔

شاہ بیگ خان نے قندہار پہنچنے کے بعد ایک طرف بابر بادشاہ کو خوش رکھنے کی خاطر اس کے پاس کابل میں پیش کش بھیجی اور دوسری طرف شخصی طور پر ہرات جا کر شاہ اسماعیل صفوی کی سرپرستی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن شاہ اسماعیل نے اس کو گرفتار کر کے ظفر کے قلعہ میں قید کر دیا۔ وہ تھوڑے دنوں کے بعد قید خانے سے بھاگ نکلا اور بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر قندہار پہنچ گیا۔[1]

اس موقع پر بابر بادشاہ نے قندہار پر حملہ کر دیا۔ شاہ بیگ خان بھی قندہار کا دفاع کرنے پر تیار ہو گیا لیکن بابر بادشاہ کی فوج میں وبا پھوٹ پڑی اور وہ قندہار فتح نہ کر سکا۔ اس واقعہ کے بعد شاہ بیگ خان دوبارہ سیوی پہنچا اور یہاں سے اس نے ایک ہزار گھوڑ سواروں پر مشتمل ایک لشکر مرزا عیسیٰ ترکان کی قیادت میں سندھ پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ ارغونوں کا یہ لشکر ۱۵۱۴ء میں کاہان

---

[1] RAVERTY.

دگایان، باغبانان پہنچا۔ جام نظام الدین کے مقبوضات پر ارغونوں کا یہ پہلا حملہ تھا[1]

۱۵۱۶ء میں بابر بادشاہ نے قندہار پر دوبارہ حملہ کر دیا۔ لیکن اس کی فوج میں دوبارہ وبا پھوٹ پڑی اور اب کی بار بھی قندہار اس کے ہاتھوں فتح نہ ہو سکا۔ اس موقعہ پر شاہ بیگ خان اور اس کے بیٹے مرزا شاہ حسین کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اور شاہ حسین نے بابر بادشاہ کے ہاں کابل میں پناہ لی۔ اس سے مرزا شاہ بیگ خان کی مشکلات میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔[2]

دوسرے سال بابر بادشاہ نے قندہار پر دوبارہ حملہ کر دیا اور اسے خوب تاخت و تاراج کیا۔ اس موقعہ پر فصلات کی کٹائی ابھی نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر زیادہ عرصہ تک شہر کا محاصرہ جاری رہا تو اس کے نتیجہ میں شاہ بیگ خان کی فوج اور وہ لوگ جو محصور ہو گئے تھے خوراک کی کمی کا شکار ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ باربار کے حملوں سے سب لوگ تنگ آ گئے تھے۔ آخرکار شاہ بیگ خان نے مجبور ہو کر بابر بادشاہ کے سامنے تجویز پیش کر دی کہ اگر اب کی بار شہر کا محاصرہ اٹھا لیا جائے تو دوسرے سال قندہار کی ولایت اس کے حوالے کی جائے گی۔ بابر بادشاہ نے شہر کا محاصرہ اٹھا لیا۔ ۱۵۱۷ء میں قندہار کی کنجیاں اس کے پاس بھجوا دی گئیں۔ اور شاہ بیگ خان قندہار خالی کر کے سیوی چلا آیا۔ اسی سال اس نے کوٹ ماچھیاں اور چندوکہ کی طرف ایک لشکر بھیج کر ان علاقوں کو تاخت و تاراج کیا۔ ۱۵۱۷ء میں

ف[1]:- RAVERTY

ف[2]:- ABID.

جبکہ شاہ بیگ خان زہری کی طرف ایک فوجی مہم کے دوران سیری سے غیر حاضر تھا۔ جام نظام الدین سمہ کے سپہ سالار دریا خان جو اس کا غلام اور متبنیٰ بھی تھا ایک لشکر کے ساتھ سندھ سے نکل آیا اور سیوی پر حملہ آور ہوا۔ سکین ارغون اور ہزاروں پر مشتمل ایک مٹھی بھر فوج سے شکست کھائی اور سندھ کی طرف پسپا ہونے پر مجبور ہوا۔ اس لڑائی کے دوران مرزا شاہ بیگ خان کا بھائی ابو محمد مرزا مارا گیا۔ ایک روایت ہے کہ یہ لڑائی درہ بولان میں بی بی نانی کے نزدیک جلوگر کے مقام پر ہوئی جس کے دوران ابو محمد مرزا ہلاک ہوگیا۔[1]

اسی سال ۱۵۰۸ء کے اختتام پر جام نظام الدین نے وفات پائی اور اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جام فیروز اس کا جانشین اور سندھ کا خود مختار حکمران بنا۔ اس واقعہ سے شاہ بیگ خان ارغون کو سندھ فتح کرنے کا موقعہ مل گیا اور اسے سندھ فتح کرنے کی ترغیب ملی۔[2]

۱۵۱۰ء میں مرزا شاہ بیگ خان۔ نے سندھ فتح کرنے کے خیال سے ایک مختصر سی فوج منظم کی۔ اس نے روانگی سے قبل سیوی گنجاوہ ڈگنداوا اور فتح پور کے قلعوں کی حفاظت پر اپنے قابل اعتماد مسلح آدمی متعین کئے اور فتح پور ہی سے جو سیوی سے پچھتر میل کے فاصلے پر اس کے جنوب میں واقع تھا سندھ کی طرف کوچ کیا۔ اس موقعہ پر اس کی فوج کا سپہ سالار میر فاضل کوکلتاش تھا جو ہراول دستوں کی قیادت اور رہنمائی پر مامور کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ فقط دو سو چالیس

---

[1]- RAVERTY.

[2]- ABID.

گھوڑ سوار تھے۔ ارغونوں کا لشکر باغبان اور گاہان پہنچا۔ یہ موخر الذکر علاقہ جام کے غلام اور اس کے متبنیٰ دریا خان کی جاگیر تھا۔ اس زمانے میں دریائے مہران یا سندھ ٹھٹھہ کے شمال کی طرف بہتا تھا۔ ارغونوں کی فوج جنوری ۱۵۱۹ء میں دریائے مہران کو عبور کر کے ٹھٹھہ کے سامنے پہنچ گئی اور ان کی آن میں ٹھٹھہ پر قبضہ کر لیا۔[۱]

جام فیروز نے بھاگ نکلنے کا ارادہ کیا لیکن جلد ہی یہ ارادہ ترک کر کے اپنے اپنے آپ کو مرزا شاہ بیگ خان کے حوالے کر دیا۔ شاہ بیگ خان اس کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا اور اسے ٹھٹھہ سمیت نشیبی سندھ کی حکومت پر بحال کر دیا۔ اس کے بعد ٹھٹھہ سے لوٹ کر اس نے سیوستان حویلی پر قبضہ کر لیا۔ اس نے سیوستان کے وسیع صوبہ اور صوبہ بھکر کو ملا کر اپنی تحویل میں رکھ لیا اور بھکر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا جس کا ایک بڑا حصہ پہلے ہی سے جام نظام الدین کے مقبوضات میں شامل تھا۔ اس نے یہاں شہر کے ارد گرد ایک شہر پناہ تعمیر کی اور باغات لگوائے اور عمارتیں تعمیر کیں۔[۲]

اسی زمانہ میں مرزا شاہ بیگ خان حملہ کے ارادے سے گجرات کی طرف ایک فوجی مہم کی رہنمائی کر رہا تھا کہ ۱۵۲۲ء کے وسط میں راستہ ہی میں فوت ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مرزا شاہ حسین اس کا جانشین بنا۔[۳]

اس زمانہ میں شاہ حسین لانگاہ بدستور ملتان کا خود مختار حکمران چلا آتا تھا

۱۔ RAVERTY.

۲۔ ABID.

۳۔ ABID.

مرزا شاہ حسین ارغون نے ملتان فتح کرنے کا مصمم ارادہ کر کے اس کے لئے تیاری شروع کر دی اور ایک ہزار گھوڑ سواروں پر مشتمل ایک لشکر اپنے ساتھ لے کر سیوی پہنچا۔[1]

اس زمانہ میں کئی بلوچ قبائل جن میں مگسی رند اور لاشاری شامل تھے کچھی کے علاقے میں وارد ہو کر چتر، چھلگری اور لہڑی وغیرہ میں آباد ہو چکے تھے اور سنی سوران وغیرہ میں بس گئے تھے۔ مرزا شاہ حسین نے سیوی سے مڑ کر چتر اور لہڑی کا رخ کر کے سب سے پہلے رند مگسی اور لاشاری بلوچوں پر دھاوا بول دیا اور انہیں اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس لڑائی کے دوران بلوچوں کے کئی سردار گرفتار کر لئے گئے۔ دونوں فریقوں کے درمیان کچھ شرائط طے پا گئیں۔ بلوچوں کے سردار بھکر تک مرزا شاہ حسین ارغون کے ساتھ گئے جہاں طے شدہ شرائط پر دونوں فریقین نے مہر تصدیق ثبت کر دی اور گرفتار شدگان کو رہا کر دیا گیا۔[2]

مرزا شاہ حسین نے ۱۵۲۴ء میں ملتان پر چڑھائی کی اور اوچ پر قبضہ کر لیا۔ راستہ میں مرزا شاہ حسین کی فوج نے بلوچوں پر حملہ کر کے ان کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس موقعہ پر مرزا شاہ حسین ارغون اور ملتان کے حکمران شاہ حسین لانگاہ کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا۔ جس کی شرائط کے تحت لانگاہ حکمران کے مقبوضات کا ایک حصہ مرزا شاہ حسین ارغون کے قبضہ میں چلا گیا۔ دوسرے سال دونوں حکمرانوں کے درمیان دوبارہ عداوت کی آگ بھڑک اٹھی اور خون خرابہ شروع ہو گیا۔ بالآخر ارغونوں

---

[1] :- RAVERTY.

[2] :- ABID.

کے ہاتھ سے شاہ حسین لانگاہ نے شکست کھائی. ملتان پر ارغونوں کا قبضہ ہوگیا اور ملتان سے لانگاہ خاندان کی حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔

۱۵۴۳ء میں مرزا شاہ حسین ارغون نے سیوی اور اس سے متعلقہ علاقوں کی حکومت میر فاضل کوکلتاش کے بیٹے سلطان محمود کے سپرد کر دی جس کا باپ مرزا شاہ بیگ خان ارغون کی وفات سے تھوڑا عرصہ پیشتر فوت ہوچکا تھا اس اثناء میں بلوچوں نے سیوی کے علاقے میں کئی قلعوں پر قبضہ کر لیا تھا. سلطان محمود نے حملہ کر کے وہ تمام قلعے بلوچوں سے واپس لے لئے۔[۱]

روایت ہے کہ رندوں اور لاشاریوں کے درمیان سیوی کے علاقے میں گھوڑ دوڑ پر شدید اختلاف پیدا ہوگیا. لاشاریوں نے اپنے سردار میر گوہرام کے اشارے پر ایک خوبرو عورت بی بی گوہر جو اونٹوں کے ایک بڑے گلے کی مالک تھی کے اونٹوں کے پیر کاٹ دیئے. جو سردار رند میر چاکر بلوچ کی محبوبہ تھی اور اسی گوہر پر لاشاریوں کا سردار میر گوہرام بھی دل و جان سے فریفتہ تھا. اس رقابت کی وجہ سے رندوں اور لاشاریوں کے درمیان قبائلی جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جو تیس سال تک جاری رہا. غالباً اسی زمانہ میں جبکہ سلطان محمود سیوی کا ماتحت حکمران تھا بعض رند بلوچ قبائل سیوی اور کچھی کے علاقہ کو خیرباد کہہ کر پنجاب کی طرف منتقل ہوگئے. غالباً اس نقل مکانی کی وجہ قبائلی عصبیت اور تصادم کے علاوہ بلوچوں کے خلاف ارغون اور مغلوں کی فوجی کارروائیاں بھی تھیں جن کو بلوچ ترک کا نام دیتے تھے۔

---

[۱] RAVERTY.

۱۵۵۵ء میں مرزا شاہ حسین ارغون نے وفات پائی۔ اس کی وفات کے بعد اُس کی وسیع مملکت سلطان محمود خان کوکلتاش اور مرزا عیسیٰ ترکان (منگول) کے درمیان تقسیم ہوگئی جو سندھ کے ارغون حکمرانوں مرزا شاہ بیگ خان اور مرزا شاہ حسین کے دور حکومت میں ان کے دست راست تھے۔ سلطان محمود کے باپ میر فاضل کوکلتاش نے بھی ارغونوں کے لئے خدمات سرانجام دی تھیں۔ سندھ فتح کرکے اس پر قبضہ برقرار رکھنے میں ان امرا نے اس کی بڑی مدد کی تھی۔ بالائی سندھ سیوی اور کچھی سمیت جس کا دارالحکومت بھکر تھا، سلطان محمود کے حصے میں آیا اور نشیبی سندھ پر جس کا دارالحکومت ٹھٹھہ کا پر عظمت شہر تھا، مرزا عیسیٰ ترکان کا قبضہ ہوگیا۔[۵۰]

اب ہم دوبارہ قلات کے معاملات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ میر عمر کے قتل کے وقت اس کا بیٹا خوردسال اور صغیر سن تھا۔ اس کا نام بجار تھا بجار کو اس کی والدہ (بی بی ماہناز) مستونگ لے گئی اور خواجہ خیلوں میں کہ جن سے وہ تھی نکاح کر لیا۔ جب میر بجار بڑا ہوا تو انتقام کا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوا اس نے خواجہ خیلوں سے اجازت طلب کی۔ اس زمانہ میں خواجہ خیل کمزور ہوگئے تھے اور کچھ زیادہ امداد کی طاقت نہیں رکھتے تھے انہوں نے اس کو جانے کی اجازت دے دی اور اس کو کچھ روپے (زر) گھوڑے اور اسلحہ بھی دیا۔ میر بجار منگوچر میں وارد ہوا اور وہاں کے کسانوں سے میر مندو کا حال دریافت کیا کسانوں نے جواب دیا کہ میر مندو قلات کا حاکم ہے۔ میر عمر مارا گیا۔ میروانی دربدر ہوگئے اس کا بیٹا

۵۰: RAVERTY.

میر بجار مستونگ میں خواجہ خیلوں کی روٹیوں پر گزارہ کرتا ہے۔ اس نے کہا میر عمر کا بیٹا میں ہوں اپنے باپ کا انتقام لینے کی غرض سے آیا ہوں۔ کسانوں نے کہا اس علاقے میں سب بلوچ ہیں۔ اپنا نام ظاہر نہ کرنا ورنہ تجھے قتل کر دیں گے پھر اس نے اپنے معاملہ میں کسانوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ سیاہی اور اس کے بیٹے قلات کے نزدیک چھپر میں رہتے ہیں۔ سیاہی رئیس کا بیٹا ہے اسی وجہ سے ان کو رئیسانی کہتے ہیں۔ اس کے پاس جا کر اپنے معاملہ میں مشورہ کرو۔ اس کے بعد میر بجار وہاں سے سیدھا سیاہی کے پاس چلا گیا اور اس کو بلایا کہ میں میر عمر کا بیٹا ہوں۔ تمہارے پاس آیا ہوں کہ میری مدد کرو اور مجھے قلات کا قبضہ دلا دو۔ سیاہی نے جواب دیا کہ قلات کے حاکم کے ساتھ مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ البتہ میں تجھ کو اپنے گھر سے نہیں نکالوں گا۔ لیکن قلات پر لشکر کشی کرنے کا وعدہ نہیں کر سکتا ہوں۔ اس کے باوجود اگر حاکم نے تجھ کو گرفتار کرنے کے لئے اپنا لشکر روانہ کیا تو اپنا سر دے کر بھی تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔[1]

اس کے بعد سیاہی بجار اور سیاہی کے بیٹوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مشورہ کیا اور میر سندو کے اونٹوں کے گلہ پر ہاتھ ڈالا۔ ادھر سے میر سندو کے لشکر نے ان کا پیچھا کیا۔ لڑائی ہوئی، سندو کے لشکر سے کچھ آدمی مارے گئے۔ ان کو شکست ہوئی۔ سیاہی کی طرف سے چار گھوڑے مارے گئے ان گھوڑوں کا اس کو بڑا رنج ہوا۔ اس نے کہا ان گھوڑوں کی بجائے اگر میرا کوئی بیٹا مارا جاتا تو

---

[1] اخوند محمد صدیق۔ تاریخ خوانین احمد زئی

اس کا مجھے اتنا رنج نہ ہوتا جتنا مجھے ان گھوڑوں کے مارے جانے سے رنج ہوا ہے۔ بجار نے اس کو تسلی دی اور کہا کہ مت کرو. میں قلات پر قابض ہو گیا تو تیرے گھوڑوں کا عوض تجھے مل جائے گا۔"[1]

"اس کے بعد دوسرے براہوئی قبیلے بھی پہاڑوں سے نیچے اتر آئے اور بجار اور سیاہی کے ساتھ مل گئے، میر مندو نے بلوچوں کو جمع کیا میر بجار اور سیاہی پوری تیاری کے ساتھ قلات کی طرف روانہ ہو گئے. ان کے درمیان شہر سے باہر لڑائی ہوئی. بلوچوں نے شکست کھائی، میر مندو قتل ہوا اس کی قبر ستونگی دروازے کے ساتھ ابھی تک موجود ہے اس کے بعد میر بجار نے سوراب اور دڑھ کا رخ کیا اور بلوچوں کو قتل کر کے وہ علاقہ جنگوں کو دیا. دڑھ میں ایک جگہ کا نام نھڑو ہے وہ علاقہ رئیسانیوں کو بخش دیا جو سیاہی زئی کہلاتے ہیں. ابھی تک وہ علاقہ ان کے قبضہ میں ہے. چار شانہ آب و اراضی دوران کے چشمہ میں سیاہی کے بیٹے کو ان کے گھوڑوں کے عوض میں دے دیا۔"[2]

میر مندو میر بجار کا خسر تھا. اس کی اولاد مندوانی کہلاتی ہے. میر بجار نے میر مندو کو قتل کر کے قلات کا دوبارہ قبضہ حاصل کر لیا. اس کے بعد اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور گوشہ نشینی ہی میں اس کی وفات ہو گئی. قلات بے حاکم ہو گیا اور مغل نے قلات پر قبضہ کر لیا۔[3]

---

[1] ۔ اخوند ملا محمد صدیق

[2] ۔ ایضاً

[3] ۔ ایضاً

۱۵۲۶ء میں بابر بادشاہ نے شہنشاہ ہندوستان ابراہیم لودھی کو پانی پت کے تاریخی میدان میں شکست دی اور دلی کے تخت پر قبضہ کر کے ہندوستان میں مغلیہ خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس کو صرف چار سال ہندوستان پر حکومت کرنے کا موقعہ ملا۔ ۱۵۳۰ء میں اس کی وفات ہو گئی۔ اس کی سلطنت اس کے دونوں بیٹوں مرزا ہمایوں اور مرزا کامران کے درمیان تقسیم ہو گئی۔ دلی کے تخت پر مرزا ہمایوں جلوہ گر ہوا۔ مغربی ولایات جن میں کابل غزنی اور قندھار کے صوبے شامل تھے۔ مرزا کامران کے حصے میں آئیں۔[1] غالباً اسی زمانہ میں میر بجار میروانی کی وفات ہو گئی قلات پر بھی مغلوں نے قبضہ کر لیا۔

مرزا کامران کی حکومت اگرچہ تخت دلی کے ماتحت تھی لیکن وہ اپنے بھائی ہمایوں بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اس اثنا میں ہمایوں بادشاہ کو شیر شاہ سوری نے شکست دے کر دلی پر قبضہ کر لیا اور مرزا ہمایوں کے لئے راہ فرار اختیار کرنے کے سوائے کوئی اور چارہ کار باقی نہ رہا۔ ہمایوں ایران جانا چاہتا تھا لیکن اس کے بھائی مرزا کامران نے اس پر کابل غزنی اور قندھار کے راستے بھی مسدود کر دیئے۔ ہمایوں پہلے پنجاب گیا لیکن شیر شاہ سوری نے وہاں اس کو ٹکنے نہ دیا۔ ۱۵۴۱ء میں اس نے اپنے خاندان کی خواتین اور پیروکاروں سمیت سندھ کا رخ اختیار کیا اور بھکر کے صوبے میں داخل ہونے کے بعد روہڑی کو اپنی قیام گاہ بنایا اس نے دو سال تک جدوجہد کر کے بھکر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن سندھ کے حکمران مرزا شاہ حسین ارغون اور بھکر کے والی سلطان محمود کوکلتاش نے فصلوں

---

[1] ۔ SIR OLAF CAROE. THE PATHAN

کو جلا کر اور قحط کی کیفیت پیدا کر کے سندھ میں اس کے پاؤں جمنے نہ دیئے یہی مرزا شاہ حسین تھا جس نے اپنے باپ سے ناراض ہو کر کسی زمانہ میں بابر بادشاہ کے پاس کابل میں پناہ لی تھی۔ اسی مرزا شاہ حسین نے لنگاہ خاندان سے ملتان کا صوبہ حاصل کرنے کے بعد اسے پیش کش کے طور پر بابر بادشاہ کے حوالے کر دیا تھا مرزا ہمایوں نے بعد میں جب دلّی کے تخت کو رونق بخشی تو اسی مرزا شاہ حسین نے اس کے پاس پیش کش بھیج کر اسے اپنی وفاداری اور اطاعت گذاری کا یقین دلایا تھا۔ ہمایوں بھی اسی خوش فہمی میں سندھ چلا آیا کہ سندھ کا حکمران مرزا شاہ حسین اس کی خاطر خواہ طور پر مدد کرے گا۔ لیکن مرزا شاہ حسین سندھ میں ہمایوں کی موجودگی کو اپنے مفادات کے خلاف تصور کرتا تھا۔[۵]

جب مرزا ہمایوں کو سندھ میں کامیابی کی کوئی امید نظر نہ آئی تو وہ جون پہنچا اور ۱۵۴۳ء میں اس نے سیوی سے ہو کر درہ بولان کے راستے شال جانے کا فیصلہ کیا۔ ہمایوں کا سندھ چھوڑ کر چلا جانا مرزا شاہ حسین کے مفاد میں تھا۔ اس موقعہ پر اس نے ہمایوں کی مدد کر کے اس کے لئے سفر کی سہولتیں فراہم کر دیں اس زمانہ میں سیوی کا علاقہ بھکر کے صوبے میں شامل تھا۔ جب ہمایوں سیوی کے قرب وجوار میں پہنچا تو اس کو معلوم ہوا کہ مرزا کامران کے گماشتے پہلے ہی سے سیوی میں وارد ہو گئے تھے تاکہ وہ مرزا شاہ حسین اور سلطان محمود کو ہمایوں کی مدد کرنے سے باز رکھیں۔ اسی وجہ سے وہ سیوی میں داخل نہ ہو سکا اور اس نے شال ومستونگ کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔[۶]

۵۔ ۔۔۔ RAVERTY

ان دنوں مرزا کامران کی طرف سے جلال الدین بیگ شال کا حاکم تھا۔

ہمایوں شال جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن جوجی ازبک نے جو مستونگ کا ایک زمیندار تھا اور جس نے اس سے پیشتر ہمایوں کے پاس ملازمت کر لی تھی، بادشاہ کو خبردار کیا کہ شال کا حاکم اس کی گرفتاری کی تاڑ میں ہے اس نے یہ بھی تبلایا کہ اس کا بھائی مرزا عسکری بھی اسی مقصد کے لیے عنقریب شال پہنچنے والا ہے۔ ہمایوں کو جب ان باتوں کا علم ہو گیا تو اس نے شال جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ایک ایسے راستے سے ایران پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جو ایک چولی بیابان سے ہو کر گذرتا تھا اور جہاں کے باشندے چولی کہلاتے تھے[1]۔ یہ چول بیابان چاغی اور خاران کا علاقہ ہو سکتا ہے۔

ہیبت خان نیازی کا شمار شیر شاہ سوری کے بلند مرتبت امراء اور منصبداروں میں ہوتا تھا جس نے ۱۵۴۰ء میں دریائے گنگا کے کنارے جولنہ کے مقام پر ہمایوں بادشاہ کو شکست دینے میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا جب ہمایوں اس شکست کے بعد پنجاب کی طرف لپا ہوا تو شیر شاہ خود بھی اس کے تعاقب میں نکلا۔ اس کے بعد جب ہمایوں دریائے راوی کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ سندھ کی طرف جا رہا تھا تو اسی ہیبت خان نیازی کا بھائی عیسیٰ خان ایک بڑے لشکر کے ساتھ اس کا پیچھا کرتے ہوئے دریائے جہلم کے کنارے خوشاب کے مقام پر اپنی لشکر گاہ قائم کر کے اس کی تاڑ میں بیٹھ گیا۔

---

[1] :- RAVERTY.

[2] ہمایوں نامہ کے مطابق ہمایوں سیوی سے روانہ ہو کر شال مستان کے نزدیک ایک گاؤں ژنی یا دلی میں قیام کیا عسکری کی آمد کی اطلاع پا کر وہ عصر کے وقت چند لوگوں اور رحمت بیگم بانو کی معیت میں کوچ کر کے رات قریب کی ایک پہاڑی میں گزاری جو برف سے

شیر شاہ سوری کے قیام پنجاب کے دوران دور اور نزدیک کے بیشمار عمائدین اور زعما اس کے سلام کو آئے۔ ان میں ڈیرہ جات کے سردار غازی خان سردار اسماعیل خان اور سردار فتح خان بلوچ بھی شامل تھے۔ جنہیں شیر شاہ سوری بادشاہ ہندوستان کے حضور میں باریابی حاصل ہوئی۔ لیکن سردار میر چاکر کا ذکر کسی مؤرخ نے نہیں کیا ہے۔ ان واقعات کے تھوڑا عرصہ بعد جب شیر شاہ سوری کو پنجاب چھوڑ کر اپنی مملکت بنگال کی طرف بعض اہم امور کے سلسلے میں واپس جانا پڑا تو پنجاب کا انتظام حکومت اسی ہیبت خان نیازی کے سپرد ہوا۔[1]

۴۴-۱۵۴۳ء میں شیر شاہ سوری نے پنجاب کے گورنر ہیبت خان نیازی کے نام احکامات صادر کئے کہ وہ ملتان پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لے اور بلوچوں کو ملتان کے صوبہ سے فوراً باہر نکال دے۔ ہیبت خان نے اس حکم کی فوری تعمیل کی۔ یہ وہی موقعہ تھا جبکہ ہمایوں بادشاہ سندھ میں قیام پذیر تھا۔ شیر شاہ نے ان خدمات کے صلہ میں جو اس نے شیر شاہ سوری کے لئے مختلف مواقع پر سرانجام دی تھیں اس کا عہدہ بڑھا کر اسے "مسندِ اعلیٰ اعظم ہمایوں" کا خطاب دیا تھا۔[2]

جولائی ۱۵۴۵ء میں شیر شاہ سوری نے وفات پائی اور اس کا چھوٹا بیٹا اسلام شاہ کے لقب سے اس کا جانشین بنا۔ اگست یا ستمبر ۱۵۴۵ء میں ہمایوں نے شاہ طہماسپ شاہ ایران کی مدد سے قندھار کے صوبہ پر قبضہ کر لیا۔ شال کے

---

[1] :- RAVERTY [2] ABID.

ڈھکی ہوئی تھی دوسری صبح کو وہ یہاں سے کوچ کر کے دو دن کے بعد ایک دوسری پہاڑی کے دامن میں بلوچوں کی بستی میں پہنچا اور اپنا کیمپ لگا دیا دوسرے دن شام کے وقت وہ یہاں سے کوچ کرنا چاہتا تھا کہ بلوچ مانع ہوئے اور اپنے سردار کے آنے تک بدستور ٹھہرنے کو کہا

قلعہ کو سر کرنے میں چھ مہینے لگے۔ حیدر سلطان کو شال کا حاکم مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہمایوں ولایت کابل اور غزنی پر قابض ہوگیا۔ مرزا کامران کابل سے بھاگ نکلا۔ شہ

ہمایوں بادشاہ کے کابل میں قیام کے دوران میر سید علی نے جو دکی کا ایک مقبول عام اور ہر دلعزیز زمیندار تھا اس کے حضور میں باریابی حاصل کرلی۔ بادشاہ نے اس کی بڑی عزت افزائی کی اور دکی کا علاقہ اسے جاگیر میں دے دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد میر لونگ خان بلوچ نے بھی اپنے لواحقین کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں باریابی حاصل کی۔ بادشاہ نے مستونگ کے علاقے میں اسے بھی آب واراضی کی صورت میں جاگیر عطا کی۔

اس عرصہ میں مرزا کامران ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ ۱۵۵۲ء میں ہمایوں بادشاہ نے پشاور سے متصل علاقوں سے گھگڑوں کے علاقے میں وارد ہوکر مرزا کامران کو گرفتار کرلیا اور اس کی آنکھوں میں گرم سلائی پھروا کر اسے اندھا کر دیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے نومبر ۱۵۵۲ء کی سردیاں کابل میں گذاریں۔ اسلام شاہ نے نومبر ۱۵۵۴ء میں وفات پائی۔ ہمایوں بادشاہ نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے ارادے سے دلّی کی طرف کوچ کیا۔ جولائی ۱۵۵۵ء میں اس نے دلّی پر قبضہ کرلیا لیکن ایک سال بعد ایک حادثہ میں اس کی وفات ہوگئی۔ شہ

برطانوی دور کے محققین نے اپنی تحریروں میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سردار رند میر چاکر بلوچ اور اس کے بلوچ پیروکاروں نے پہلے شیر شاہ

شہ RAVERTY.

آدھی رات کے قریب ان کے سردار نے باریابی حاصل کرلی اور عسکری اور مرزا کامران کے احکامات کے برعکس اسے کوچ کرکے جانے کی اجازت دیدی یہ سردار غالباً لونگ خان عروج تھا یہاں سے کوچ کرنے کے بعد ہمایوں قلعہ حاجی آباد سے ہوکر ہلمند کے راستے ایران چلا گیا۔

سوری کے ساتھ مل کر ہمایوں کو شکست سے دوچار کیا۔ اس کے بعد ہمایوں کی مدد کر کے اسے دلی کے تخت پر بٹھایا۔ ریورٹی ان واقعات کا سختی سے منکر ہے۔ اس کا موقف ہے کہ سردار میر چاکر رند بلوچ ہمایوں کے ایران جانے سے پیشتر اس کے سندھ میں قیام کے دوران اور اس کے کافی عرصہ بعد تک ملتان کے عین شمال مشرق اس سے ایک سو پچاس کلو میٹر دور چنہاٹ دوآبہ میں مسندِ اعلیٰ اعظم ہمایوں ہیبت خان نیازی کے ماتحت ایک چھوٹا سا جاگیردار تھا۔ اسی ہیبت خان نے ۹۴۹ھ - ۱۵۴۳ء میں شیر شاہ کے حکم سے ہمایوں بادشاہ کے قیام سندھ کے دوران ملتان پر حملہ کر کے بلوچوں کو اس علاقہ سے نکال باہر کر کے ملتان پر قبضہ کر لیا تھا۔ شیر شاہ سوری کا یہ بلند مرتبت منصبدار اس زمانہ میں پنجاب کی حکومت کا انتظام سرانجام دینے پر مجبور تھا۔ میک گریگر کا خیال ہے کہ میر چاکر خان رند بلوچ ۱۵۴۲ء میں ہمایوں بادشاہ کے ساتھ دلی چلا گیا تھا لیکن اس زمانہ میں ہمایوں سندھ میں مقیم تھا۔[1]

ریورٹی کا خیال ہے کہ ہمایوں بادشاہ کا سابقہ اس کی زندگی کے کسی مرحلے پر رندوں کے ساتھ نہیں پڑا۔ جب وہ ایران جا رہا تھا تو رندوں نے کسی وقت بھی اس پر حملہ نہیں کیا اور نہ ہی ایران کے اس کے سفر واپسی کے دوران رندوں سے اسے کبھی نقصان پہنچا۔ ہمایوں بادشاہ کی ایران کی طرف مراجعت اور دلی پر اس کے قبضہ حاصل کرنے میں پورے ساڑھے دس سال گئے۔ وہ ایران سے سندھ کے راستے واپس نہیں آیا۔ اور نہ ایران سے

---

[1] :. RAVERTY.

قندہار کی طرف جاتے ہوئے وہ کبھی مڑکر سندھ کے علاقے میں داخل ہوا. ایران سے واپسی کے دوران سندھ کی بجائے کابل، جلال آباد، دریائے کابل، پشاور اور لاہور کے راستے سفر کرتے ہوئے اس نے دریائے سندھ کو نیل آب کے مقام پر عبور کیا. اس راستے پر نہ رند سکونت رکھتے تھے اور نہ ان سے اپنے سفر کے دوران ہمایوں کا کبھی واسطہ پڑا. رندوں نے نہ اس موقعہ پر اس کی مدد کی اور نہ اس کے ساتھ دلی تک گئے ۱؎

ریورٹی کا خیال ہے کہ برطانوی دور کے بعض لکھنے والوں نے جن میں مسٹر ڈیلوک، ڈیمز اور میک گریگر کا نام قابلِ ذکر ہے. شیر شاہ سوری کے بلند مرتبت منصبدار ہیبت خان نیازی کو جو مسندِ اعلیٰ اعظم ہمایوں کے لقب سے ملقب تھا اور جس کے زیرِ فرمان چنہاٹ میں سردار میر چاکر خان رند بلوچ ایک جاگیردار کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا تھا. تاریخ سے اپنی ناواقفیت کی بنا پر ہمایوں بادشاہ تصور کر کے اس کے زیرِ فرمان جاگیردار میر چاکر رند بلوچ سے اس قسم کے واقعات منسوب کیئے جو اس زمانہ میں کبھی بھی درپیش نہیں آئے. ریورٹی کا خیال ہے کہ اس کی رائے کے مطابق ہمایوں بادشاہ اپنے دورِ اقتدار میں کبھی میر چاکر رند کے نام سے بھی واقف نہیں ہوا.

فروری ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کی وفات کے بعد اس کا ہونہار بیٹا جلال الدین اکبر اس کا جانشین بنا جو ہمایوں بادشاہ کے قیام سندھ کے دوران امرکوٹ کے مقام پر ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوا تھا. اس زمانہ میں قندہار کا صوبہ

۱؎ :- RAVERTY.

خان خاناں بیرم خان ترکمن کی جاگیر تھا اور اس کی جانب سے شاہ محمد قندہاری، قندہار میں اس کا نائب تھا۔ اسی زمانہ میں جبکہ قندہار کا انتظام شاہ محمد کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ زیمنداوڑ میں علی قلی خان زمان کے بھائی بہادر خان کو حاکم مقرر کیا گیا تھا اور زمینداوڑ کے علاقے کا انتظام اسی کے سپرد تھا۔ ؎۱

مرزا ہمایوں کی وفات کی خبر جونہی زمینداوڑ پہنچی اس علاقے کے حاکم بہادر خان نے قندہار پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کیا۔ اسی زمانہ میں بیرم خان کی جانب سے ایک منصبدار قلات کا حاکم تھا۔ بیرم خان جو اکبر بادشاہ کا اتالیق رہ چکا تھا اور اب اس کا مشیر خاص اور وزیر اعظم تھا۔ اس موقعہ پر دلی میں تھا۔ شاہ محمد کو معلوم تھا کہ بیرم خان اور اکبر جس کی عمر فقط چودہ سال کی تھی دلی میں اپنی طاقت کو مستحکم کرنے میں مصروف تھے۔ اور خصوصیت کے ساتھ وہ دونوں اسلام شاہ سوری کے بیٹے سکندر سوری کے خلاف کارروائی میں مصروف تھے جو اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت دلی کا دعویدار تھا۔ شاہ محمد یہ بھی جانتا تھا کہ ہندوستان سے کسی قسم کی امداد تاخیر سے قندھار پہنچ سکتی ہے۔ ؎۲

جب مرزا ہمایوں نے قندہار فتح کیا تو اس کی کامیابی ایران کے

؎۱: - RAVERTY - NOTES ON AFGHANISTAN BALUCHISTAN

؎۲: - ABID.

صفوی بادشاہ شاہ طہماسپ کی مرہونِ منت تھی اور مرزا ہمایوں نے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ قندہار فتح کر کے اسے شاہ ایران کے حوالہ کرے گا۔ لیکن اس نے قندہار بیرم خان کو اس کی جاگیر کے طور پر دے دیا۔ شاہ محمد نے مجبور ہو کر زمینداوڑ کے حاکم کے خلاف شاہ ایران سے امداد طلب کی اور اس کو ہمایوں بادشاہ کا وعدہ یاد دلایا کہ قندہار پر شاہ ایران کا حق ہر حالت میں فائق ہے۔ شاہ ایران نے فوراً امداد روانہ کر دی اور اس کے قزلباشوں نے سیستان سے قندہار میں داخل ہو کر محاصرین کو مار بھگایا۔ اس کے باوجود شاہ محمد نے قندہار شاہ ایران کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔ شاہ محمد کے اس رویہ سے شاہ ایران سخت ناراض ہو گیا اس نے قندہار کا محاصرہ کرنے کے لئے دوبارہ فوج روانہ کر دی۔ شاہ محمد نے شاہ ایران کے اس متوقع حملہ کے لئے خوب تیاری کر لی تھی۔ ایرانیوں کو دوبارہ قندہار فتح کرنے میں ناکامی ہوئی۔ لیکن شاہ ایران ہر حالت میں قندہار فتح کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس اثناء میں شاہ محمد نے جلال الدین اکبر اور بیرم خان کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا اکبر اور بیرم خان کو قندہار کے لئے امداد روانہ کرنے کی فرصت نہ تھی اکبر نے شاہ محمد کو ہدایت کر دی کہ وہ ہمایوں کے وعدہ کا لحاظ کرتے ہوئے قندہار کا صوبہ شاہ ایران کے حوالے کر دے۔ شاہ محمد نے اس حکم کی فوری طور پر تعمیل کی اور وہ قندہار خالی کر کے ہندوستان چلا گیا اس کے بعد تیس سال تک قندہار کا صوبہ ایرانیوں کے قبضہ میں رہا۔[لہ]

لہ:- RAVERTY.

اس اثناء میں زمینداوڑ کا حاکم بہادر خان بھاگ کر ہندوستان میں اکبر اور بیرم خان کے پاس چلا گیا جنہوں نے اس موقعہ پر مانکوٹ کے قلعہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا جس کے اندر سکندر سوری نے پناہ لی ہوئی تھی۔ اس محاصرہ کے دوران بہادر خان نے بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ اکبر نے خوش ہو کر اس کی گزشتہ خطا معاف کر دی۔لہ

۱۵۶۵ء میں اکبر بادشاہ نے بہادر خان کو جو اس کے حضور میں موجود تھا۔ ملتان کا صوبہ جاگیر کے طور پر عطا کر کے اسے حکم دیا کہ وہ فوراً ملتان جا کر اس صوبے کا انتظامِ حکومت سنبھال لے۔ جس کی سرحدوں پر بلوچ باغیانہ سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ بہادر خان شاہی ہدایات کے مطابق فوراً ملتان پہنچا اور بلوچوں کے خلاف فوجی کارروائیاں شروع کر دیں۔ اس موقعہ پر اس کی مڈھ بھیڑ بلوچوں کی ایک بھاری جمعیت سے ہوئی جو پیادہ اور گھوڑ سوار دستوں پر مشتمل تھی۔ وہ ایک مہینہ تک ان کے خلاف لڑا اور بدقت تمام ان کو شکست دینے میں کامیاب ہو سکا۔

اس افراتفری کے نتیجہ میں جو ولایت قندہار میں شروع ہوئی تھی سیوی کے علاقے میں بلوچوں نے حالات کو سازگار پا کر جاگیروں کے وسیع رقبوں پر قبضہ کر لیا۔ بلوچوں کے دیکھا دیکھی بعض افغان قبیلوں نے بھی جو سیوی کے شمالی پہاڑوں میں سکونت پذیر تھے، پہاڑوں سے نیچے اتر کر اس علاقے کی ان اراضیات پر قبضہ کر لیا جو ان کے پہاڑوں کے نزدیک واقع تھیں۔ٹہ

لہ ، ٹہ RAVERTY.

اسی افراتفری کے دوران جو قندہار میں مچی ہوئی تھی۔ قلات کے دہواروں نے حکومت کی تبدیلی سے فائدہ اٹھا کر قلات کے مغل حاکم کو قتل کر کے قلات میں انقلاب پیدا کر دیا اور اس کے بعد ایک بار پھر اپنے اتحادی میردانیوں کو قلات کی حکومت سنبھالنے کی دعوت دی۔

اس انقلاب کے متعلق ساؤدے گزیٹیر آف بلوچستان میں لکھتا ہے: "اس انقلاب کے متعلق لیچ کا خیال ہے کہ قلات کی حکومت راجہ سیوا سے ایرانیوں کے ہاتھ منتقل ہو گئی۔ انہوں نے چارزینی نسل کے ایک شخص کو حاکم بنا کر قلات میں بٹھا دیا۔ خضدار میں اس کا ایک نائب بھی مقرر کر دیا ان دونوں حاکموں کی بدچلنی اس حد تک زبان زد خلائق تھی کہ دونوں مقامات کی آبادیوں نے ان کے خلاف بیک وقت بغاوت کر کے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس تحریک میں سب سے اہم کردار دہواروں نے ادا کیا۔

میجر لیچ کے بیان کے مطابق قلات اور خضدار کے دہواروں نے اپنے ان بدکردار اور ظالم حاکموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد رئیس تاج محمد کو اس کام پر مامور کر دیا کہ وہ مشکے جا کر وہاں سردار قنبر کے بیٹوں میں سے ایک کو قلات کا حاکم بننے کی دعوت دے۔ یہ قبیلہ اپنی فوجی طاقت کے لئے مشہور تھا جبکہ دہواروں کو اپنی کمزوری کا احساس تھا اور وہ اپنے میں سے کسی شخص کو قلات کا حاکم بنا کر اس کا دفاع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ بڑے لڑکوں نے اس پیش کش کو اس بنا پر ٹھکرا دیا کہ اپنے گھر اپنے خاندان اپنی اراضیات اور مویشیوں کے گلوں کی دیکھ بھال

کی خاطر ان کا اپنے گھر میں موجود رہنا ضروری ہے لیکن یہ اعتراض سب سے چھوٹے لڑکے احمد کے بارے میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا انہوں نے اس کو جانے کی اجازت دے دی. اس طرح احمد دہواروں کے ساتھ اپنے وقار کو قائم رکھنے اور اپنے اخراجات کے بارے میں پکا وعدہ لینے کے بعد ان کے ساتھ معاہدہ کر کے قلات جا کر عنانِ حکومت سنبھالنے پر راضی ہو گیا۔"

اس سلسلے میں اخوند ملا محمد صدیق کا بیان زیادہ واضح اور پختہ روایات پر مبنی ہے:۔

"مغل نے قلات پر قبضہ کر لیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد دہواروں کے ساتھ حلفیہ معاہدہ کر لیا کہ ایک دوسرے کو تلوار، بندوق، تیر و کمان نیزہ چھری لکڑی پتھر، ڈھیلہ، زہر اور جوتیوں سے ہلاک نہیں کرینگے تاکہ دونوں فریق کے درمیان دوستی اور محبت بڑھ جائے۔ لیکن مغل نے جیسا کہ اس کی عادت تھی دہواروں پر ظلم کرنا شروع کر دیا۔ قلات کے دہواروں نے باہم مشورہ کر کے سوچا کہ اگر ہتھیاروں سے یا زہر سے اسے ہلاک کریں گے تو ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ کے نزدیک ماخوذ اور مجرم بن جائیں۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ بیرزن کی موٹی اور سخت روٹیاں پکا کر اور ان کو دھوپ میں سکھا کر اور زیادہ سخت کرنے کے بعد مغل پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیں۔ یہ لوگ ان روٹیوں کو بغل میں دبائے

لے :۔ اس قسم کی روٹیاں آج بھی مستونگ میں تیری کے میلہ بہاراں کے دوران

مغل کے سلام کو گئے کہ حاکم وقت تھا۔ تمام لوگ بیک وقت ردیٹوں
کو بغل سے نکال کر اس پر پل پڑے اور اس کو مار مار کر ہلاک کر دیا۔ اب
بھی دہواروں کے اس طائفہ کو ڈوڈکی زئی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے"

اس کے بعد دہواروں کے معتبرین میر ابراہیم کے پاس چلے گئے
جو میروانیوں قنبرانیوں اور احمدزیئوں کا مورث اعلیٰ تھا۔ انہوں نے
کہا کہ مغل دہواروں پر ظلم کرتا تھا ہم نے اس کو ہلاک کر دیا ہے اب
تمہارے پاس آئے ہیں کہ اپنے بیٹوں میں سے ایک کو ہمارے ساتھ کر
دو تاکہ اس کو قلات لے جا کر قلات کا حاکم بنا لیں۔ میر ابراہیم نے
حیل وحجت اور پس و پیش کے بعد میر حسن کو جو اس کا پوتا اور میر گوہرام
کا بیٹا تھا دہواروں کے ساتھ کر دیا اور دہواروں نے اس کو اپنے ساتھ
قلات لے جا کر میری میں مغل کی جگہ مسند پر بٹھا دیا اور اپنا حاکم بنا لیا"

"میر حسن نے اس موقعہ پر دہواروں سے دریافت کیا کہ میرے
مہمانوں کی لکڑی، ان کے جانوروں کی گھاس، میرے سرائے کی مرمت
کا خرچ کہاں سے آئے گا۔ دہواروں نے یہ سب کچھ اپنے ذمہ لیا اور اب

ہر سال اس واقعہ کی یاد میں پکائی اور تقسیم کی جاتی ہیں ان کا وزن پانچ
کلوگرام کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ ان کی موٹائی دو انچ اور قطر دو فٹ کے برابر
ہوتا ہے۔ اس کے پکانے کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں ریگ زیادہ مقدار میں ہوتا
ہے لوگ وہاں جا کر ریت کو ایک مخصوص کانٹے والی جھاڑی سے گرم
کرتے ہیں جس کو مقامی زبان میں کوکوڑ کہا جاتا ہے۔ جب ریت گرم ہو جاتا

بھی وہ یہ سب کچھ اسی عہد نامہ کے تحت کرتے ہیں۔"

ولایت قندہار پر قبضہ کرنے سے تمام بلوچستان سندھ کی سرحدوں تک شاہ ایران کے اقتدار کے تحت آگیا۔ اس سے سندھ اور خصوصاً بھکر کی اہمیت بڑھ گئی جہاں سے دلی کے مغلوں کی فوج قندہار کے صوبے میں آسانی سے داخل ہو سکتی تھی۔ انہی وجوہات کی بنا پر شاہ ایران سندھ کے حکمرانوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے کا خواہشمند تھا۔ سندھ کے حکمران بھی ایک طرف ہندوستان کے مغل بادشاہوں اور دوسری طرف شاہ ایران کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔[۱]

۶۲-۱۵۶۱ء میں حق بردی بیگ شاہ طہماسپ کے نمائندہ کی حیثیت سے بھکر چلا آیا اور سلطان محمود والی بھکر کے لئے شاہ کی طرف سے نہایت بیش قیمت تحفے تحائف لایا جو سلطان محمود جیسے ایک معمولی حکمران کے لئے بڑی عزت افزائی کا موجب تھے۔ سلطان محمود نے طویل عمر پائی۔ ۱۵۷۴ء میں اس کی وفات ہوگئی۔ اس کی آخری عمر میں اس کی گرفت سیوی کے علاقے پر ڈھیلی پڑ گئی تھی اور پانی افغانوں نے سیوی کے علاقے پر جس میں کچھی بھی شامل تھا پوری طرح قبضہ کر لیا تھا۔[۲]

۱۵۷۶ء میں جب شاہ طہماسپ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ ایران کا بادشاہ بنا تو اس نے قندہار کا صوبہ شہزادہ سلطان حسین کے سپرد کر دیا

---

[۱] RAVERTY.

ہے تو آٹے سے یہ موٹی روٹیاں تیار کر کے گرم ریت میں دبا دی جاتی ہے جب یہ روٹیاں پک جاتی ہیں تو بڑی لذیذ ہوتی ہیں۔

جس نے ۱۵۵۶ء میں قندہار کے محاصرے کے دوران کارہائے نمایاں سرانجام دیئے تھے اور اس کی وفات تک قندہار اس کی جاگیر چلا آتا تھا اس کے بعد اسے اس کے بیٹے مرزا مظفر حسین کے سپرد کردیا اور وہی اس کا والی بنا۔ زمینداوڑ اور گرم سیر کے علاقے اس کے چھوٹے بھائی رستم مرزا کی جاگیر ٹھہرے۔ یہ دونوں بھائی ایک طرف ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہتے تھے اور دوسری طرف سیستان پر حملہ کرکے اس علاقے کو اپنے اقتدار کے تحت لانا چاہتے تھے۔ شاہ ایران ان سے ناراض تھا۔ اکبر بادشاہ کی انگیخت پر ازبک بھی قندہار کے صوبے میں داخل ہوکر قتل و غارت کا بازار گرم کر رہے تھے۔ جب رستم مرزا سیستان کا علاقہ حاصل کرنے سے مایوس ہو گیا اور قندہار پر قبضہ کرنے کی اس کی امید بھی بر نہ آئی تو اس نے ہندوستان جاکر اکبر بادشاہ کے ہاں پناہ لینے کی ٹھان لی۔[۱]

اکبر بادشاہ کو اطلاع ملی کہ ایک طرف شاہ ایران اور دوسری طرف عبداللہ خان شاہ توران قندہار پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس نے فوراً بیرم خان کے بیٹے عبدالرحمان خان خاناں کو ملتان اور بھکر کا صوبہ جاگیر میں دے کر اسے حکم دیا کہ وہ بھکر سے جو سلطان محمود کی وفات کے بعد مملکت ہند میں شامل کر لیا گیا تھا۔ ایک فوج تیار کرکے ولایت قندہار پر چڑھائی کرے۔ اسے یہ بھی حکم ملا کہ وہ بلوچستان سے گذرتے وقت بلوچوں کا ایک لشکر بھی اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھے اگر بلوچ اس کا ساتھ دینے پر

۱۔ RAVERTY ص

آمادہ نہ ہوں تو ان کو قرار واقعی سزا دی جائے۔[1]

اسی دوران اکبر بادشاہ نے اپنے ایک معتمد منصبدار کے توسط سے رستم مرزا اور مرزا مظفر حسین کو ہندوستان آنے کی خفیہ طور پر دعوت دی۔ اسی زمانے میں اکبر بادشاہ لاہور میں مقیم تھا۔ اسے رستم مرزا کے ہندوستان چلے آنے کی خبر مل گئی۔ اکتوبر ۱۵۹۳ء میں وہ اپنے بال بچوں اہل خاندان اور لواحقین سمیت اکبر بادشاہ کے پاس لاہور پہنچا۔ اکبر بادشاہ نے اس کا شاندار استقبال کیا اور بڑی خاطر مدارات کی۔[2]

ابھی خان خاناں مرزا عبدالرحمٰن بھکر کے صوبے کو پوری طرح ہندوستان میں ضم کرنے میں مصروف تھا کہ مظفر حسین مرزا قندھار پر آئے دن ازبکوں کی دراز دستی اور شاہ ایران کی بے پروائی سے مایوس ہو کر ہندوستان چلے آنے کی خواہش ظاہر کی اور اکبر بادشاہ سے استدعا کی کہ وہ اپنا ایک منصبدار بھیج کر قندھار کا قبضہ حاصل کرے۔ اکبر بادشاہ نے فوراً شاہ بیگ کابلی کو اس اہم کام پر مامور کر دیا۔ اور وہ دس ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج کے ساتھ ولایت قندھار میں داخل ہو گیا اور قندھار کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اپریل ۱۵۹۵ء میں قندھار کا صوبہ بلوچستان سمیت سندھ کی سرحدوں تک دلّی کی حکومت کے زیر فرمان آ گیا۔ اگست ۱۵۹۵ء میں مظفر حسین خود بھی ہندوستان پہنچا۔ اکبر بادشاہ نے اس کا بھی شاندار استقبال کیا اور اس کی بڑی خاطر مدارات کی۔[3]

---

[1]:- RAVERTY.　　[2]:- RAVERTY.

[3]:- ABID.

ان واقعات سے کچھ عرصہ پیشتر دسمبر ۱۵۹۴ء اور جنوری ۱۵۹۵ء میں صوبہ ملتان کے کئی ماتحت حاکموں اور جاگیرداروں نے اکبر بادشاہ کے حکم سے اپنے میویز کے دستوں کو لے کر سیوی کے علاقے پر حملہ کیا جو کسی وقت بھکر کے صوبے میں شامل تھا اور اب ولایت قندھار کا حصہ بن گیا تھا۔ اس ناگہانی حملہ کے دوران گنداوہ کے زمیندار دریاخان اور داؤد خان نے بلا مزاحمت شہنشاہ ہندوستان کی اطاعت قبول کر لی لیکن جب یہ لشکر سیوی کے نزدیک پہنچا تو ان کی مڈبھیڑ افغانوں کی ایک بھاری جمعیت سے ہوئی جو پانچ ہزار مسلح افراد پر مشتمل تھی۔ ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد افغانوں نے شکست کھائی اور انہوں نے اکبر بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی۔[۵۳]

۱۶۲۲ء میں ایران کے بادشاہ شاہ عباس کبیر نے ہندوستان کے مغل بادشاہ جہانگیر کے عہد حکومت میں ولایت قندھار پر حملہ کر کے اس پر بزور شمشیر قبضہ کر لیا۔ یہاں کے باشندوں کے سرداروں نے جن میں افغان ہزارے اور بلوچ شامل تھے ایرانیوں کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا۔[۵۴]

۱۵۹۵ء میں جب قندھار پر ہندوستان کے مغل بادشاہ کا قبضہ ہو گیا تو اس زمانہ میں سردار عبدالقادر ترین کے بیٹے سردار حسن خان نے جو اپنے باپ کی وفات کے بعد خشتگ کا سردار بن گیا تھا۔ اپنے اہل و عیال سمیت ایران میں پناہ لی۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے شیر خان نے حکومت ایران کے لئے بڑی خدمات سرانجام دی تھیں۔ شاہ ایران نے قندھار حاصل کرنے کے

۵۳۔ RAVERTY   ۵۴۔ RAVERTY

بعد شیر خان کو دوبارہ خٹک کے افغانوں کا سردار مقرر کر دیا۔ شاہ عباس کبیر کی وفات کے بعد بھی وہ بدستور خٹک کے افغانوں کا سردار تھا۔ شاہ عباس کبیر نے اپنی زندگی میں گنج علی خان ذک کرد کے بیٹے علی مردان خان کو ولایت قندہار کا والی مقرر کر دیا تھا۔ لیکن شیر خان نے اپنے غرور کی وجہ سے کبھی اس کے آگے سر تسلیم خم نہ کیا۔ اس کے علاوہ عراق اور ہندوستان سے آنے جانے والے تجارتی کارروان بھی اس کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھے انہی وجوہات کی بنا پر علی مردان خان اس کا بڑا مخالف تھا اور موقعہ کی تاک میں رہتا تھا۔ شیر خان اسی قسم کی ایک مہم جوئی کے دوران خٹک سے غیر حاضر تھا کہ ۱۶۳۰ء میں علی مردان خان نے خٹک پر حملہ کر کے شیر خان کے گھر بار کے علاوہ اس کے مال و دولت پر قبضہ کر لیا اور اس کے تمام مال و اسباب کو اسکے خاندان کے اراکین سمیت قندہار روانہ کر دیا۔[۵۰]

شیر خان کو جب علی مردان خان کی اس کارروائی کا علم ہوا تو وہ کوہستان کے افغانوں کی ایک جمعیت کے ساتھ جس کو اس نے سیوی اور گنجابہ کی حدود میں لوٹ مار کرنے کی غرض سے جمع کر لیا تھا فوراً موقعہ پر پہنچا۔ افغانوں اور علی مردان خان کے قزلباشوں کے درمیان ایک شدید جنگ ہوئی۔ اور افغانوں نے قزلباشوں کو بڑا سخت نقصان پہنچایا۔ لیکن آخر میں شکست کھائی۔ شیر خان نے دکی اور چوٹیالی میں جا کر سکونت اختیار کر لی جہاں اس کی زندگی بڑی عسرت سے گزرتی تھی۔ اس نے شہنشاہ ہندوستان کو بھی ایک عرضداشت روانہ کر کے اسے اپنی حالتِ زار سے آگاہ کر دیا۔ اس کے بعد

خود بھی دلی جاکر شاہ جہان کے دربار میں حاضر ہوا اور گھوڑا بطور پیشکش
پیش کیا۔ شاہ جہاں نے نفشنگ کی اہمیت کے پیش نظر اس کی بڑی عزت افزائی
کی اور اسے خلعت و انعام واکرام کے علاوہ پنجاب کی سرحد پر ایک چھوٹی سی
جاگیر بھی عطا کردی۔

۱۶۳۸ء میں ولایت قندہار کے گورنر، علی مردان خان نے شاہ صفی
کی بدسلوکی سے ناراض ہوکر قندہار کا صوبہ شہنشاہ ہندوستان کے حوالے کردیا
اور خود بھی دلی چلاگیا۔ شاہ جہان کے دربار میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہوئی
اور اسے ولایت کابل کا گورنر بنادیا گیا۔ قندہار فتح ہونے سے بلوچستان کا تمام
علاقہ ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے زیر اقتدار آگیا۔ لیکن شیر خان ترین
کو اپنا منصب بڑی تاخیر سے ملا۔ ۱۳۳۶ء میں وہ دوبارہ فشنگ کے افغانوں
کا سردار بنا۔ لیکن اسی سال اس کی وفات ہوگئی۔ [1]

۱۶۴۹ء میں ہندوستان کے بادشاہ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں
ایرانیوں نے دوبارہ قندہار کا محاصرہ کرلیا۔ شاہ جہاں نے اپنے بیٹے شہزادہ
اورنگ زیب اور اپنے وزیر سعد اللہ خان کو والی قندہار کی امداد پر روانہ کر
دیا تاکہ ایرانیوں کو قندہار کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور کرکے ان کو قندہار پر
قبضہ کرنے سے باز رکھا جائے لیکن ۱۶۵۰ء میں جب مغلوں کی فوج کابل
سے غزنی پہنچی تو معلوم ہوا کہ قندہار پر ایرانیوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ [2]

لے۔ RAVERTY.

کے۔ RAVERTY.

۱۶۵۳ء میں شہزادہ اورنگ زیب اور سعد اللہ خان نے دوبارہ قندہار کا محاصرہ کر لیا۔ شاہ ایران کی طرف سے چند فوجی دستے ہرات سے قندہار پہنچے تاکہ مغل فوج کو قندہار کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور کیا جائے لیکن مغلوں نے ان کو شکست دی۔ اس موقعہ پر ان فوجی کارروائیوں کی نگرانی کے لئے شاہ جہاں خود کابل میں موجود تھا۔ اس کے باوجود مغلوں کو قندہار کا قلعہ سر کرنے میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کو کامیابی کی کوئی امید نظر نہ آئی اور انہوں نے قندہار کا محاصرہ اٹھالیا۔[له]

شاہ جہاں کو قندہار کا محاصرہ اٹھانے کا بڑا افسوس ہوا۔ قندہار کھو دینے کا اسے بڑا رنج تھا، کیونکہ مغل بادشاہ قندہار کو ہندوستان کی کنجی خیال کرتے تھے۔ ۱۶۵۳ء میں شاہ جہاں کے بیٹے دارا شکوہ بڑی تیاریوں کے بعد ایک بھاری بھر کم فوج کے ساتھ جو ہر قسم کے اسلحہ سے لیس تھی تل دچوٹیالی اور دکی کے راستے قندہار پر حملہ آور ہوا۔ اس کے ساتھ دو بھاری توپیں بھی تھیں جو درہ بولان کے راستے لائی گئیں تھیں لیکن فنی خرابی کے باعث ان کو استعمال نہ کیا جا سکا۔ بارود کے ذخیرے کے ساتھ بھی کچھ ایسا واقعہ پیش آیا۔ قندہار کے صوبے میں ان کے قیام کے دوران قبائلیوں نے شاہی مال و اسباب کو بھی لوٹنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے مغل فوج میں بد دلی پھیل گئی اور دارا شکوہ کی مہم بری طرح ناکام ہو گئی۔ قندہار کا صوبہ ہمیشہ کے لئے مغلوں کے ہاتھ

له:- RAVERTY.

سے نکل گیا۔ ۱

مکران

سولھویں صدی کے وسط میں جبکہ میروانی خاندان نے قلات میں ایک قومی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔ مکران میں ایک دوسرا خاندان برسراقتدار آیا جس کے اراکین ملک کے لقب سے ملقب تھے ان کی اصلیت غالباً ایرانی تھی۔ اس خاندان کے متعلق سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں کہ ان کے نام ملک بازون، ملک عباس، ملک سیف الدین اور ملک معزالدین تھے۔ جنہوں نے یکے بعد دیگرے مکران پر حکومت کی ان کے دورِ اقتدار میں مکران کا علاقہ بڑا خوشحال تھا۔

فروری ۱۶۱۴ء میں کرمان کا گورنر گنج علی خان ذک کرد جرفت سے ہو کر مکران پر حملہ آور ہوا۔ ملک دینار کا بیٹے ملک شمس الدین کیچ مکران سے ایک بڑا لشکر جمع کر کے اس کے مقابلے پر آیا۔ بمپور کے نزدیک کوچ گردان میں دونوں فریق کے درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی اور ملک شمس الدین نے شکست کھائی۔ گنج علی خان نے جو شاہ ایران کی طرف سے کرمان کے صوبے کا والی تھا۔ ملک دینار کو اس کے خاندان اور بیٹوں سمیت گرفتار کر کے اصفہان پہنچا دیا۔ ملک شمس الدین نے ۱۶۱۸ء میں وفات پائی۔ گنج علی خان نے اسی خاندان کے ملک مرزا کو مکران کا حاکم مقرر کر دیا۔ ملک مرزا نے ۱۶۲۲ء میں شاہ عباس کبیر کے دربار میں

---

۱ RAVERTY.

اصفہان میں حاضر ہو کر باریابی حاصل کر لی۔ اس نے شاہ ایران سے شکایت کی کہ اس کا علاقہ ہندوستان کی مغل سلطنت کا ایک حصہ ہے جس کے مرکز دلی اور آگرہ مکران سے بہت دور واقع ہیں۔ اگرچہ اس کو ایک معمولی رقم شہنشاہِ ہند کو دینی پڑتی ہے۔ لیکن مرکز سے دوری اس کے لئے باعث دقت ہے۔ اس نے یہ بھی شاہِ ایران سے دریافت کیا کہ یہ صورتحال کب تک برقرار رہے گی۔ شاہ ایران نے خلعت اور انعام و اکرام دے کر اس کی بڑی عزت افزائی کی۔ ملک مرزا اور اس کا دادا ملک دینار اس خاندان کے قابل حکمران شمار کئے جاتے تھے۔ ملک مرزا نے ۱۰۳۰ھ ہجری میں اختیار الدین کے دربار میں حاضر ہو کر باریابی حاصل کر لی۔ اس نے نان فحال (زان فال) کے ضلع کا انتظام بھی اس کے سپرد کر دیا۔

ملک مرزا نے ۱۶۳۵-۳۴ ہجری میں ایرانی فوج کے ساتھ شامل ہو کر شاہی پرچم تلے اپنے لیویز دستوں کی قیادت کی اور شاہی فوج کے ساتھ شامل ہو کر بغداد کی مہم میں حصہ لیا۔ اس کے لشکر میں کیچ مکران کے جنگجو افراد شامل تھے ملک مرزا اس خاندان کا آخری حکمران تھا اس کے جانشین بتدریج زوال سے دوچار ہوئے۔ عیش پرستی کی وجہ سے ان میں حکمرانی کی صلاحیت مفقود تھی۔ ان کی حکومت مکران کے دو طاقتور خاندانوں بلیدی اور گچکی بلوچوں کے ہاتھ منتقل ہو گئی۔

انیسواں باب

میر احمد اوّل

سولھویں صدی کے وسط میں میر ابراہیم میروانی کا پوتا جو میر گوہرام کا بیٹا تھا دہواروں کی اعانت سے قلات کا حاکم بنا اور مغلوں کے اتباع میں خان کا لقب اختیار کیا۔ اس کی وفات کے بعد اسی خاندان کے کوئی نصف درجن اراکین کے نام ملتے ہیں جنہوں نے یکے بعد دیگرے قلات کی اس چھوٹی سی ریاست پر حکومت کی جس کی آبادی کلیتاً دہواروں پر مشتمل تھی لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنی حکومت کو وسعت دینے کی کوشش نہ کی۔ ان کی حکومت فقط قلات اور اس کے مضافات تک محدود تھی یا زیادہ سے زیادہ خیس دون محمد تادہ اور منگچر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں بلوچستان کے دونوں طرف دو نہایت طاقتور حکومتیں قائم تھیں۔ ایران میں صفوی خاندان کے مقتدر بادشاہ برسر اقتدار تھے اور ہندوستان میں چغتائی مغل بادشاہ ایک وسیع مملکت کے مالک تھے جن کا اقتدار وادی کابل اور غزنی پر بھی قائم تھا قندہار کی ولایت اس زمانہ میں ایرانیوں کے زیر اقتدار آئی ہوئی تھی۔ بلوچستان کے اندر سماجی حالات بھی سازگار نہیں تھے کہ ان کی بنا

پر قلات کے ان ابتدائی حاکموں کو مقامی قبائل کی امداد حاصل ہو سکتی اور وہ اپنی حکومت کو ان کی امداد اور اعانت سے وسعت دے سکتے

۱۶۶۶ء میں جب میر احمد اول قلات میں برسر اقتدار آیا تو اس زمانہ میں کچھ سماجی تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں اور مقامی قبائل میں باہمی ربط و ضبط کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ بلوچستان کے دونوں طرف ایران اور ہندوستان میں سیاسی صورتحال کچھ مختلف تھی۔ اگرچہ بلوچستان کے ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف ایران میں بظاہر دو مقتدر خاندان چغتائی مغل اور قزلباش صفوی برسراقتدار تھے لیکن ان دونوں کا اقتدار فقط ظاہری دبدبہ اور گزشتہ شان و شوکت کے بل بوتے پر قائم تھا۔ اسی ظاہری دبدبہ شان و شوکت نے ان کی کمزوریوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا۔

ایران میں شاہ حسین صفوی کے طویل پر امن دور کی وجہ سے جس کا سارا وقت ادب، شاعری، مصوری، تعمیرات کے مشاہدوں اور دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ ایرانی سپاہ کی قوت مدافعت اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ ۱۷۰۸ء میں میر والئس غلزئی نے کھلم کھلا بغاوت کر کے قندہار کی صوبائی حکومت پر قبضہ کر لیا اور شاہ کی حکومت اس کو قندہار سے نکال باہر کرنے میں ناکام ہو گئی۔ شاہ کی زندگی کے آخری ایام میں انحطاط کے جراثیم ایرانی قوم کی رگ و پے میں اس حد تک سرایت کر گئے تھے کہ غلزئیوں نے اصفہان پر بھی حملہ کر کے ایران کے صفوی خاندان کا چراغ ہمیشہ کے لئے

لے:- HISTORY OF AFGHANISTAN. G.P. TATE

گل کر دیا۔ دوسری طرف ہندوستان میں آخری زبردست شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر نے اپنے طویل دور حکومت میں اپنے اقتدار کو فقط فوجی طاقت کے بل بوتے پر برقرار رکھا ہوا تھا۔ اس کی آخری عمر میں دکن کا ناسور حکومت کے جسم میں کچھ اس حد تک پھیل گیا تھا کہ ۱۷۰۷ء میں شہنشاہ کی وفات کے فوراً بعد ہندوستان میں مغل حکومت کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔[1]

میر احمد اول قلات کا پہلا خان تھا جس نے دونوں حکومتوں کی کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی حکومت کو وسعت دینے کی سعی کی۔ اس زمانے میں مستونگ کا حاکم آغا جعفر تھا جو ایران کے صوبہ قندہار کے والی کی جانب سے شال مستونگ اور ڈھنگ وغیرہ علاقوں کا انتظام چلانے پر مامور کیا گیا تھا۔ غالباً والی قندہار کی ہدایت پر آغا جعفر ایرانی فوج کے چند دستے اپنے ساتھ لے کر قلات کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب خان میر احمد کو مستونگ کے ایرانی حاکم کی اس فوجی نقل و حرکت اور اس کے ارادوں کا علم ہوگیا تو اس نے بھی جوابی کارروائی کے طور پر مستونگ پر حملہ کر دیا۔ اس لڑائی کے دوران ایرانی فوج کو شکست ہوگئی اور میر احمد نے مستونگ پر قبضہ کر لیا۔[2] آغا میر جعفر ایرانی فوج کے شکست خوردہ دستوں کو لے کر قندہار کی طرف پسپا ہوگیا۔ مستونگ کے علاوہ شال اور چاغی پر بھی خان کا قبضہ ہوگیا۔

---

[1]:- HISTORY OF AFGHANISTAN. G.P. TATE.

[2]:- اخوند ملا محمد صدیق۔

میر احمد کے حوصلے اپنی اس کامیابی کی وجہ سے بڑھ گئے اس نے اپنی طاقت کو سراوان میں مستحکم کرنے کے بعد اپنی توجہ جھالاوان کی طرف مبذول کی جو سندھ کے سمہ خاندان کے مقبوضات میں شامل چلا آتا تھا۔ اس نے میر قنبر کی قیادت میں ایک لشکر تیار کر کے جھاوان پر حملہ کر دیا جہاں زیادہ تر جیٹ ہی برسر اقتدار تھے۔ اس نے سوراب، باغبانہ، خضدار، کرخ، چکو اور وڈھ پر قبضہ کر لیا اور جھالاوان میں بھی اپنی طاقت مستحکم کر لی۔ لے

کچھی کا علاقہ زمانہ قدیم سے روائتی طور پر جھالاوان کا ایک حصہ شمار کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں بھی سراوان اور جھالاوان کے باشندوں کی معیشت کا دارومدار زیادہ تر بھیڑ بکریوں کی پرورش پر تھا اور ان کی معیشت میں اس علاقے کو بڑی اہمیت حاصل تھی سراوان اور جھالاوان کے باشندے درہ مولہ اور درہ بولان کے راستوں سے موسم سرما میں ہر سال اپنے مویشیوں کو ساتھ لے کر نقل مکانی کر کے کچھی چلے جاتے تھے اور سردیوں کے موسم میں وہاں ان کا گذارہ بھی اچھی طرح ہو جاتا تھا اور گرمیوں کے موسم میں وہ واپس آجایا کرتے تھے۔ ایک عرصہ دراز سے یہ موسمی نقل مکانی ان کا معمول بن گئی تھی۔ اس زمانہ میں کچھی کا علاقہ پانی افغانوں کے ایک طائفہ بارد زئیوں کے قبضہ و اختیار میں تھا جو ہندوستان کے مغل بادشاہوں کے باجگذار تھے۔ سیوی ان کا صدر مقام تھا جو

لے :۔ اخوند ملا محمد صدیق

ولایت قندہار میں شامل تھا۔ بارودزئیوں نے سندھ کے سمہ خاندان کے مقبوضات پر بھی قبضہ کر کے اپنی حکومت میں شکارپور اور لاڑکانہ کے علاقے بھی شامل کر لئے تھے۔ بارودزئی سرداروں نے کچھی کے علاقے کو سراوان اور جھالاوان کے باشندوں کے لئے ممنوعہ علاقہ یا علاقہ غیر بنا رکھا تھا اور جو لوگ یہاں سے نقل مکانی کر کے کچھی چلے جاتے تھے تو ان کے ساتھ بارودزئی سرداروں کا سلوک بھی اچھا نہیں تھا اس سلسلے میں جب خان پر سراوان اور جھالاوان کے باشندوں کی طرف سے سخت دباؤ پڑا تو اس نے کچھی پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

میر احمد نے کچھی پر سترہ حملے کئے لیکن کسی دفعہ بھی اس کو کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بارودزئیوں کی فوج زیادہ منظم اور مسلح تھی اور ان کو میدان میں لڑنے کا تجربہ تھا لیکن میر احمد کا لشکر میدان میں لڑنے کا تجربہ نہیں رکھتا تھا اور وہ زیادہ مسلح بھی نہیں تھا۔ آخری لڑائی کے دوران میر احمد اور اس کا وزیر اخوند ملا صالح محمد دونوں زخمی ہو گئے۔ میر شاہنواز خان میروانی کے علاوہ سردار میر ابراہیم خان نوشیروانی سردار خاران اس لڑائی میں ہلاک ہو گئے۔[۵]

دوسرے سال میر زنگی رئیسانی کی ایما سے کچھی پر حملہ کرنے کی ایک بار پھر تیاری شروع ہوئی۔ اس موقع پر میر زنگی کی تجویز کے مطابق خان کے بیٹے میر محراب خان کو بھی جو ابھی کم سن تھا۔ قبائلی لشکر میں شامل کر لیا گیا تاکہ

---

۵ :۔ اخوند ملا محمد صدیق

نوجوان شہزادہ کی موجودگی سے خان کا لشکر غیرت میں آکر کوئی کارنامہ
سرانجام دے.[1]

اس موقعہ پر میرزا خان بارزئی اور اس کا بیٹا بختیار خان دونوں
شکار پور میں مقیم تھے. ان کی طرف سے دو سید صاحبان سید صفی اور سید نبی
بطور نائبین سیوی میں موجود تھے. ان دونوں بزرگوں نے بارزیئوں
کی فوج کے علاوہ مقامی بلوچ قبیلوں مغیری رند لاشاری ڈومبکی اور مگسی
وغیرہ سے جو کچھی کے مقامی باشندے تھے ایک بڑا لشکر جمع کیا اور آگے
بڑھ کر شیخ کٹھے کے مزار کے نزدیک خان کے لشکر کا مقابلہ کیا. بڑی گھمسان
کی لڑائی ہوئی بارزیئوں کی فوج نے شکست کھائی. دونوں سید صاحبان
نے لڑائی کے دوران دادِ شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش
کر لیا. لیکن یہ جنگ بھی ایک فیصلہ کن جنگ ثابت نہ ہوئی ور کچھی کے علاقے
پر قبضہ نہ کیا جا سکا. خان کے لشکر نے واپس خراسان کی راہ لی. جب مرزا خان
بارزئی کو اس خونریز جنگ کا علم ہوا تو وہ اپنے بیٹے بختیار کو ساتھ لے کر
فوراً سیوی پہنچا یہ دونوں ایک بڑا لشکر تیار کرکے کوہستانی دردں سے ہو کر
قلات کی جانب روانہ ہوئے. موسم سردیوں کا تھا اور پہاڑوں میں لڑنا ان
کے بس کی بات نہ تھی. میرزنگی پسر میر قلندر ریئسانی کے توسط سے بارزئی
سرداروں نے چشمہ قلات کے نزدیک خان میر احمد خان سے ملاقات کی
اور معاملہ رفع دفع ہوگیا. ان کا مقصد یہ تھا کہ میر احمد آئندہ کچھی پر حملوں کا سلسلہ

---

[1] اخوند ملا محمد صدیق

بندکر دے۔[۱] ان حملوں کے دوران اگرچہ کچھی کا علاقہ فتح نہ ہو سکا لیکن خان کے لشکر کو مالِ غنیمت بڑی مقدار میں ہاتھ آیا۔ میر احمد نے ۹۵-۱۶۹۴ء میں وفات پائی۔

خان محراب خان

خان میر احمد کی وفات کے بعد ۱۱۰۶ھ ہجری (۹۵-۱۶۹۴ء) میں میر محراب خان قلات کی مسند پر جلوہ افروز ہوا۔ اسی سال شہنشاہِ ہندوستان اورنگ زیب عالمگیر کا پوتا شہزادہ معزالدین شہنشاہ ہندوستان کی جانب سے ملتان کے صوبے کا صوبیدار مقرر ہو کر آیا۔[۲] شہزادہ کی تقرری کے موقع پر سندھ کے ماتحت حکمران میاں دین محمد کلہوڑہ کے سپہ سالار شاہ بہارا کے بھائی مقصود فقیر نے ماتھیلا اور اُچ میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔[۳] کلہوڑوں کی یہ حرکتیں شہنشاہِ اورنگ زیب عالمگیر کی ناراضگی کا سبب بن گئیں۔ کلہوڑہ خاندان کا دار الخلافہ ٹھٹھہ تھا جہاں ملتان کے صوبیدار کا ایک نائب متعین رہتا تھا۔[۴]

شہزادہ معزالدین ملتان کا انتظام حکومت سنبھالنے کے بعد اپنے ماتحت اور زیر نگران علاقوں کے دورے پر نکلا اور سیوستان کی سرکار میں بھی وارد ہوا۔ لیکن سندھ کا کلہوڑہ حکمران میاں دین محمد اپنی جان کے خوف سے

---

۱ :۔ اخوند ملا محمد صدیق

۲ :۔ RAVERTY.

۳ :۔ تحفتہ الکرام.

۴ :۔ RAVERTY.

اس کے سلام کو نہیں آیا۔ شہزادہ نے قرآنِ مجید پر لکھ کر اور اسے مہر کر کے میاں دین محمد کو یقین دلایا کہ اسے اور اس کے خاندان کو کوئی جانی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ اس یقین دہانی کے بعد میاں دین محمد لاکھی اپنے دو دوسرے عزیزوں کو ساتھ لے کر شہزادہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ شہزادہ نے اس کو اپنے پاس روک کر ایک فوجی دستہ ٹھٹھہ روانہ کر دیا اور حکم دیا کہ وہ کلہوڑہ خاندان کے تمام افراد کو ان کے خاندان اور اہل و عیال سمیت گرفتار کر کے شہزادہ کے حضور میں پیش کریں[۱]۔

میاں دین محمد کے چھوٹے بھائی میاں یار محمد کو جب شہزادہ کی ان کارروائیوں کی خبر ملی تو اس نے فوراً کلہوڑہ خاندان کے تمام اراکین اور ان کے اہل و عیال کو قریب کی پہاڑیوں میں ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا اور اس کے بعد اپنے پیروکاروں کو لے کر شہزادہ کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے چلا آیا۔ میاں یار محمد کے پیروکاروں اور شہزادہ کی فوج کے درمیان گاج درہ کے نزدیک گاج ندی کے کنارے ایک زبردست جنگ ہوئی جس کے دوران شہزادہ کی فوج نے شکست کھائی اور وہ سیوستان کی طرف پسپا ہو گیا اپنی اس کامیابی سے میاں یار محمد کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ مزاحمت پر اتر آیا۔ اس نے پہاڑوں کا رخ کیا اور شہزادہ کی فوج اسے گرفتار نہ کر سکی[۲]۔

شہزادہ معزالدین میاں یار محمد کی گرفتاری سے مایوس ہو کر فقط میاں

۱:- RAVERTY.

۲:- ABID.

دین محمد اور اس کے دو عزیزوں کی گرفتاری کو غنیمت خیال کر کے ان کو اپنے ساتھ ملتان سے آیا اور ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس اثناء میں میاں یار محمد نے اپنے خاندان کے تمام افراد کے ساتھ کرخ اور چکو کے علاقے میں پناہ لی۔ شہزادہ معزالدین نے اس موقع پر ایک فرمان بھیج کر خان محراب خان سے استدعا کی کہ وہ میاں یار محمد اور اس کے لواحقین کو جو بلوچستان کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں گرفتار کر کے ملتان پہنچا دے۔ خان ان دوستانہ تعلقات کی بنا پر جو خان اور شہنشاہ ہندوستان کے درمیان عرصہ سے استوار چلے آتے تھے شہزادہ کے اس حکم کی تعمیل کو ضروری خیال کرتا تھا۔ خان ایک مختصر سا قبائلی لشکر لے کر اس مقام پر پہنچا جہاں میاں یار محمد اور اس کے لواحقین قیام پذیر تھے۔ میاں یار محمد کلہوڑہ اور اس کے رفقاء اور ساتھی جن میں کلہوڑہ خاندان کی عورتیں اور بچے بھی شامل تھے اپنے آپ کو خان کے حوالے کرنے پر تیار نہ ہوئے اور اصرار کیا کہ گرفتار کرنے کی بجائے ان کو ایران جانے کی اجازت دی جائے۔ آخر کار نوبت لڑائی تک آئی۔ بدقسمتی سے اس کشمکش کے دوران میر محراب خان کو اپنے ہی لشکر کی طرف سے ایک گولی لگی جس کا فریق ثانی کو علم نہ تھا اور وہ دو تین دن کے بعد فوت ہو گیا۔ اس حادثہ کے بعد خان کے چچازاد بھائی میر سمندر نے میاں یار محمد اور اس کے لواحقین کو اپنی حفاظت میں لے کر قلات پہنچا دیا۔ یہ واقعہ ۱۱۱۱ھ (۱۷۰۰ء / ۱۶۹۹ء) میں پیش آیا۔ میر محراب خان اپنے باپ کی مہمات میں حصہ لینے کی وجہ سے فن حرب کا بڑا ماہر تھا۔

بیسواں باب

میر سمندر

میر محراب خان کی شہادت کے بعد اس کی اپنی وصیت کے مطابق اس کے چچازاد بھائی میر سمندر کو جو میر قنبر کا بیٹا تھا. قلات کی مسند پر بٹھایا گیا میر محراب خان کے اپنے فرزند میر احمد اور میر عبداللہ خان صغیر سن تھے. میر سمندر کے دورِ اقتدار میں میاں یار محمد اور اس کے خاندان کے جملہ افراد بدستور قلات میں زیرِ نگران زندگی بسر کرتے تھے. خان نے مناسب جگہ کے علاوہ ان کو مناسب سہولتیں بھی مہیا کی تھیں. اس کے باوجود وہ قلات میں بڑی تنگی محسوس کرتے تھے. آخر کار خان اور میاں کے درمیاں مصالحت سی ہو گئی اور خان نے دو سال کے بعد ۱۷۰۲ء میں میاں یار محمد کو اپنے عزیزوں سمیت سندھ جانے کی اجازت دے دی اور اس کے دونوں بیٹوں میاں نور محمد اور میاں داؤد کو ان کے اہل و عیال سمیت یرغمال کے طور پر اپنے پاس قلات میں رکھا۔[۱]

میاں یار محمد کلہوڑہ اس کے لواحقین اور پیروکار قلات سے سندھ کی

---

[۱] اخوند ملا محمد صدیق

طرف روانہ ہو گئے اور انہوں نے میر ایلتاز خان میردانی سے مدد حاصل کر کے اس کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ یہ لوگ ندی سے گزرنے کے بعد ایک بڑا فاصلہ طے کر کے سندھ میں مانچھر جھیل کے کنارے فروکش ہوئے۔ اس کے بعد میاں یار محمد نے میر ایلتاز خان کی اعانت سے کئی علاقے فتح کئے اور اسے بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ میاں یار محمد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے بعد میر ایلتاز خان رخصت ہو کے قلات چلا گیا۔[1] میاں یار محمد کی طاقت اس قدر بڑھ گئی کہ اس نے سندھ کے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کرنے کے علاوہ بختیار خان باروزئی کے بھائی ملک اللہ بخش سے چندوکہ اور لاڑکانہ چھین لیا۔ اسی دوران مبارک خان داؤد پوترہ نے باروزئیوں کے رویے سے تنگ آکر شکارپور چھوڑ دیا اور اس علاقے کی طرف چلا گیا جہاں ناتھ قبیلہ کے لوگ بود و باش رکھتے تھے۔[2]

بختیار خان باروزئی نے مجبور ہو کر ملتان کے صوبیدار شہزادہ معز الدین کی توجہ یار محمد کلہوڑہ کی سرگرمیوں کی طرف مبذول کی اور اس سے میاں یار محمد کے خلاف امداد طلب کر لی۔ شہزادہ کی فوج فوراً حرکت میں آگئی لیکن بختیار خان نے جلد ہی پشیمان ہو کر شہزادے سے اپنی فوجی کارروائی بند کرنے کی درخواست کی اور کہا کہ وہ خود کلہوڑوں سے اپنا معاملہ طے کرے گا۔ مبارک خان داؤد پوترہ نے ملتان جا کر پہلے ہی سے شہزادہ کو بختیار خان سے بدظن کر دیا تھا۔ شہزادہ معز الدین کو بختیار خان کا رویہ مشکوک نظر آنے لگا

---

[1]:- تحفۃ الکرام۔ [2]:- ریورٹی

شہزادہ کی فوج نے جس میں داؤد پوتروں کا لشکر بھی شامل تھا۔ مبارک خان داؤد پوترہ کی قیادت میں شکارپور پر چڑھائی کی۔ بختیار خان بھی جس کو اس فوجی نقل وحرکت کی نوعیت معلوم نہ تھی اپنا لشکر لے کر شہر کے باہر اس کے مقابلے پر آیا۔ اس لڑائی میں جس کا نتیجہ ابھی نہیں نکلا تھا۔ بختیار خان مغل فوج کے ایک خان کے ہاتھ سے مارا گیا اور اس کا لشکر منتشر ہو گیا۔ شہزادہ نے شکارپور، خان پور اور بختیارپور اس کی خدمات کے عوض میں مبارک خان داؤد پوترہ کے حوالے کر دیئے۔ یہ واقعہ ۱۱۱۳ھ ہجری (۲-۱۷۰۱ء) میں پیش آیا۔[1]

بختیار خان باروزئی کے قتل کے بعد میاں یار محمد کے تعلقات شہزادہ معزالدین صوبیدار ملتان کے ساتھ کسی قدر بہتر ہو گئے۔ شہزادہ نے ڈھاڈر اور گنجابہ کے درّوں کی حفاظت کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ اسی دوران خان نے ایک لشکر بھیج کر گنجابہ کا محاصرہ کر لیا۔ جب میاں یار محمد کو خان کی اس کارروائی کا علم ہوا تو اس نے اپنے چھوٹے بھائی میاں میر محمد کو حقیقت حال معلوم کرنے اور خان کو اس کارروائی سے باز رکھنے کے لئے قلات روانہ کیا۔ میاں یار محمد کو خان کی اس کارروائی سے بڑی پریشانی لاحق تھی۔ لیکن خان نے نہیں مانا اور گنجابہ پر خان کے لشکر نے قبضہ کر لیا۔[2]

اس زمانہ میں میاں یار محمد کلہوڑہ کے صاحبزادے میاں نور محمد اور میاں داؤد بدستور قلات میں زیر نگران تھے۔ خان میر سمند رخان اور اس کے

---

[1] ریورٹی۔

[2] تحفۃ الکرام۔

وزیر آخوند ملا محمد صالح کے حسنِ سلوک شرافت اور رواداری سے ان کو بڑی
سہولتیں حاصل تھیں اور وہ آزادی کے ساتھ گھومتے پھرتے تھے ان پر
کسی قسم کی پابندی عائد نہ تھی۔ دونوں بھائی اس آزادی کا غلط فائدہ اٹھاکر
قلات سے بھاگ نکلے اور جو ہاں میں خیار لہڑی کے پاس ٹھہرے ہوئے
تھے کہ خان کے سپاہیوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ جب دونوں بھائیوں
کو میر سمندر کے سامنے پیش کیا گیا تو میاں نور محمد کا سر اس وقت ننگا تھا
آخوند نے فوراً ہی اپنی پگڑی اتار کر میاں نور محمد کے سر پر رکھ دی۔[۱]

اس سے بیشتر دونوں میاں صاحبان کو ان کے قیام کے لئے
قلعہ سے باہر مکان مہیا کیا گیا تھا۔ ان کی دوبارہ گرفتاری کے بعد ان کے
قیام کے لئے قلعہ کے اندر جگہ کا انتظام کیا گیا۔ دونوں اس متبادل انتظام
سے خوش نہیں تھے اور اسے اپنی اور اپنے اہل و عیال کی بے عزتی تصور
کرتے تھے۔[۲] اس کے باوجود ان کے آرام و آسائش کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا
اس کے بعد کچھ مدت کے لئے دونوں میاں صاحبان بدستور قید میں تھے
آخرکار جب شہنشاہِ ہند کے فرمان کے مطابق سندھ کی حکومت دوبارہ میاں
یار محمد کلہوڑہ کو مل گئی تو ان کو سندھ جانے کی اجازت ملی اور ان کی طرف
سے مبلغ چالیس ہزار روپے سالانہ خداباد ان کے چبوترہ سے خان میر سمندر
کو اور مبلغ دو ہزار روپے سالانہ اسی مد سے آخوند ملا محمد صالح کو ملا کرتے

---

[۱] اخوند ملا محمد صدیق۔

[۲] تحفۃ الکرام۔

تھے. میاں صاحبان کی رہائی کے بعد جب خیار لبڑی نے جاکر خدابادان میں
ان سے ملاقات کی تو انہوں نے خیار کو ایک سو روپے انعام اور خلعت بھی
عطا کی۔[1]

اس زمانہ میں جب کہ شہزادہ معزالدین بدستور ملتان کا صوبیدار تھا شہزادہ
موصوف نے خان میر سمندر خان کو ملتان آنے کی دعوت دی. ملتان میں اس
کا شاندار استقبال کیا گیا. اس کی بڑی عزت افزائی کی گئی۔ اس کو اور اس
کے سرداروں کو انعام واکرام سے نوازا گیا۔[2]

شہزادہ نے خان کے قیام کے دوران اسے مبلغ ایک لاکھ روپے
شاہی خزانے سے عطا کر دیئے. اس حاتم طائی صفت انسان نے یہ ساری کی
ساری رقم اپنے سرداروں، ملازموں اور لشکر میں تقسیم کر دی اور اپنے لئے کچھ
بھی نہ چھوڑا. شہزادہ نے حیران ہو کر اسے مزید ایک لاکھ روپے عطا کر دیئے
اور تاکید کر دی کہ یہ رقم خان کے ذاتی خرچ اور اس کے زادِ سفر کے لئے مخصوص
ہے اس رقم کو اسی مقصد کے لئے محفوظ رکھا جائے. خان نے اس رقم کا بھی
ایک حصہ اپنے سرداروں اور لشکر میں تقسیم کر دیا۔[3]

اس موقعہ پر شہزادہ موصوف نے کراچی کی بندرگاہ سندھ کے کلہوڑہ
حکمرانوں سے لے کر میر محراب خان کے خون کے عوض میں میر سمندر کے حوالہ
کر دی رخصت کے وقت از روئے لطافت و مہربانی خان کے لئے دو لاکھ

---

[1] :۔ اخوند ملا محمد صدیق
[2] :۔ ایضاً
[3] :۔ ایضاً

روپے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ شہزادہ کی ان مہربانیوں اور خوش سلوکی سے خان کا وقار بہت بڑھ گیا۔[۱]

شہزادہ معزالدین کی خان کے ساتھ ان مہربانیوں کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں بلوچستان، ایران اور ہندوستان کے درمیان واقع تھا اور دونوں مملکتوں کے راستے بلوچستان ہی سے ہو کر گذرتے تھے۔ اس لحاظ سے بلوچستان دونوں مملکتوں کے درمیان ایک درمیانی ریاست (بفر سٹیٹ) کی حیثیت رکھتا تھا اور شہزادہ بلوچستان کے حکمران کو خوش رکھ کر اسے پوری طرح اپنا طرفدار بنانا چاہتا تھا لیکن قندہار کی صوبائی حکومت کا رویہ خان کے ساتھ کچھ مختلف تھا۔[۲]

ایرانی حکومت اس زمانہ میں قندہار کے ابدالیوں کے خلاف ہو گئی تھی جنہوں نے بند مولگ کے مقام پر اس کی فوج کو شکست دی تھی لیکن قندہار کے غلزئیوں کے ساتھ حکومت ایران کے تعلقات خوشگوار تھے ۱۷۰۲ء میں گرگین خان جو جارجیا کے شاہی خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ شاہ ایران کی طرف سے قندہار کا والی مقرر ہو کر آیا۔ اسی زمانہ میں غلزئیوں کا سردار میر وائس بھی قندہار کے افق پر نمودار ہوا۔ گرگین خان والی قندہار کے تعلقات میر وائس سے بڑے گہرے تھے اس نے میر وائس کے توسط ہی سے ابدالیوں کے سردار دولت خان اور اس کے بیٹے نظر خان کو گرفتار کر کے قتل کر دیا لیکن

---

[۱] :۔ اخوند ملا محمد صدیق

[۲] :۔ جی پی ٹیٹ

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد اس نے دولت خان کے دوسرے بیٹے رستم خان کو اس شرط پر ابدالیوں کا سردار تسلیم کر لیا کہ وہ اپنے دوسرے بھائی زمان خان کو یرغمالی کے طور پر حکومت ایران کے حوالہ کرے گا۔ رستم خان نے یہ شرط قبول کر لی اور زمان خان کو یرغمال بنا کر کرمان بھیج دیا گیا حکومت ایران کے تعلقات ابدالیوں کے ساتھ کسی قدر بہتر ہو گئے۔[۱]

اس موقعہ پر گرگین خان نے بلوچستان کی طرف ایک مہم طہماسپ بیگ کی قیادت میں روانہ کی۔ خان میر سمندر خان ان دنوں شہزادہ معزالدین سے رخصت لے کر ملتان سے نیا نیا قلات آیا تھا۔ اس کی آمد کے عین موقعہ پر خان کو اطلاع ملی کہ قندہار کی جانب سے ایک ایرانی سپہ سالار طہماسپ بیگ فوج لے کر بلوچستان کی حدود میں داخل ہو گیا ہے اور وہ مستونگ پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ خان فوراً ایک لشکر جمع کر کے اس کے مقابلے پر نکلا اور بڑی تیزی کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مستونگ پہنچا۔ طہماسپ بیگ پہلے ہی سے لڑائی کے لئے تیار بیٹھا تھا لیکن خان کے لشکر نے ایرانی فوج کو شکست دی اور خان نے لڑائی کے دوران طہماسپ بیگ پر حملہ کر کے اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ ایرانی سپاہ شکست کھانے کے بعد قندہار کی طرف بھاگ نکلی۔ اس کے بعد خان نے جوابی کارروائی کے طور پر جنوبی قندہار کے اضلاع ژوب، بوری اور تل چوٹیالی کو تاخت و تاراج کیا جہاں زیادہ تر کاکڑ افغان

۱۔ HISTORY OF AFGHANISTAN. G. P. TATE.

بود و باش رکھتے تھے۔[۱]

اتفاقاً اس لشکر میں جو گرگین خان والی قندہار نے بلوچوں کے خلاف روانہ کیا تھا۔ رستم خان ابدالی بھی ایرانی فوج کے ساتھ شامل تھا۔ میر والس نے اس شکست کی ذمہ داری رستم خان پر ڈال دی اور گرگین خان والی قندہار کو اس سے بدظن کر دیا۔ بعد میں رستم خان کو میر والس کے ایک رفیق کار عطل سدوزئی نے اس کے اپنے چچا جعفر سلطان کے قتل کے بدلے میں قتل کر دیا۔ ابدالی والیٔ قندہار کے رویہ سے تنگ تھے اور انہوں نے اپنے سردار سے محروم ہو کر قندہار سے نقلِ مکانی کی اور شوراوک میں سکونت اختیار کر لی۔[۲]

ڈیرہ غازی خان کا بلوچ سردار نواب غازی خان دودائی ایک عرصے حکومت ہند کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ شہزادہ معزالدین والی ملتان کی فوج نے نواب غازی خان کے خلاف فوجی کارروائی شروع کر دی اس موقعہ پر مبارک خان داؤد پوترہ کے لشکر نے بھی مغلوں کی فوج میں شامل ہو کر خدمات سرانجام دیں بالآخر ۵-۱۷۰۴ء میں ہی جا کر نواب غازی خان کو پوری طرح شکست ہو گئی اور اس نے شہنشاہِ ہند کی اطاعت قبول کر لی۔[۳]

۱۷۰۷ء میں شہنشاہِ ہندوستان اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے فوراً بعد ملتان کے صوبیدار شہزادہ معزالدین اپنے باپ شاہ عالم بہادر شاہ کے حکم پر

۱۔ HISTORY OF AFGHANISTAN. G. P. TATE.

۲۔ ABID

۳۔ ABID.

دلّی چلا گیا۔ ایک عرصہ تک ملتان میں کوئی صوبیدار موجود نہیں تھا۔ کچھ زیادہ عرصہ
نہیں گزرا تھا کہ سندھ کے کلہوڑہ حکمرانوں اور مبارک خان داؤد پوترہ کے
درمیان دوبارہ عداوت اور دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی اور میاں نور محمد نے
داؤد پوتروں کو شکارپور سے نکال کر اس پر قبضہ کر لیا۔ شہنشاہِ ہند اورنگزیب
عالمگیر کی وفات کے بعد اس کی جانشینی پر جو خانہ جنگی شروع ہوئی۔ اس
کے نتیجہ میں ملک کا انتظام درہم برہم ہوگیا۔ میاں یار محمد نے حکومت کی
کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت کو اور زیادہ مستحکم کر لیا۔ شاہ عالم
بہادر شاہ کی وفات کے بعد جو ۱۷۱۲ء[1] میں واقع ہوئی۔ دلّی کے تخت کے
لئے اورنگزیب عالمگیر کے بیٹوں اور پوتوں میں دوبارہ بڑی سخت خانہ جنگی
شروع ہوئی اور آخر کار شہزادہ معزالدین ان سب پر فوقیت حاصل کر کے
جہاں دار شاہ کے لقب سے دلّی کے تخت پر بیٹھا لیکن دوسرے ہی سال
فرخ سیر اس کو اپنے باپ عظیم الشان کے قتل کے بدلے میں قتل کر کے
دلّی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ میاں یار محمد نے ان خانہ جنگیوں سے فائدہ
اٹھا کر ٹھٹھہ کی سرکار سیوستان اور بھکر کا محال سیوی کے علاوہ شلہ دیرو پر بھی
قبضہ کر لیا۔ اس دوران گنجابہ بدستور خان کے مقبوضات کا ایک حصہ تھا۔[2]

فرخ سیر کے دورِ اقتدار میں میاں یار محمد کلہوڑہ نے شہنشاہ ہند کی
اطاعت قبول کر لی اور فرخ سیر نے اس کو اپنا طرفدار بنانے کی غرض سے

ح ۱۔ RAVERTY.

ح ۲۔ ABID.

اسے معافی دی اور خدا یار خان کا خطاب دے کر اسے اپنے امراء اور منصبداروں کے زمرے میں شامل کر لیا۔[1]

میر سمندر نے سولہ سال تک حکومت کی اور ۱۱۲۵ھ ہجری میں اس نے وفات پائی۔ روایت ہے کہ اس نے اپنے بھائی میر قلندر کو مستونگ کے نزدیک شیریں آب کے مقام پر اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ یہ ایک واقعہ اس کے دامن پر ایک بدنما داغ تھا۔ بصورتِ دیگر وہ ایک نیک سیرت، پاک طینت، حلیم الطبع اور دور اندیش شخص تھا۔ شجاعت اور سخاوت میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔[2]

میر احمد ثانی

میر سمندر کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا میر احمد ثانی (یا ثالث) رواج کے مطابق سرداروں کے مشورے سے قلات کی گدی پر بیٹھا۔ اس کا چھوٹا بھائی میر عبداللہ خان شروع ہی سے اس کا مخالف تھا اور وہ خود اس کی جگہ خان بننے کا خواہشمند تھا۔ وہ کھلم کھلا اس بات کا پرچار کیا کرتا تھا کہ اگر عنانِ حکومت میر احمد کے ہاتھ رہی تو اس کی عیش پرستی اور نالائقی کی وجہ سے باپ دادا کی یہ ریاست دیرپا ثابت نہ ہو گی اور وہ اسے تباہ کر کے رکھ دے گا۔ تقریباً ایک سال کے بعد اس نے میر فیروز خان رئیسانی کو اپنے پاس بلا کر اس سے کہا کہ یہ ملک ہم نے خون دے کر حاصل کیا ہے خون دے کر

---

[1] ۔ ریورٹی

[2] ۔ اخوند ملا محمد صدیق

اس کی آبیاری کی ہے اور خون دے کر اسے برقرار رکھا ہوا ہے یہ کسی فرد واحد کے باپ کی میراث نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میر احمد کی نالائقی سے یہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔ میر فیروز خان رئیسانی کے مشورہ سے وہ میر عیسیٰ رستم زئی کے پاس کانک گیا اور میر لشکری رئیسانی کے توسط سے اس نے اس کے بڑے بھائی میر عمر سے ملاقات کی جو میر جبال کا بیٹا اور رئیسانی قبیلہ کا سردار تھا۔ [۱]

میر عبداللہ خان کے یہ خیالات حقیقت پر مبنی تھے۔ بلوچستان کے اطراف میں ایسے خاندانوں کی حکومت قائم تھی جن کو بلوچوں سے عداوت تھی سندھ میں کلہوڑہ خاندان کے حکمران برسر اقتدار تھے جن کے ساتھ ایک عرصہ دراز سے حکومت قلات کے تعلقات کشیدہ چلے آتے تھے۔ ایران میں شاہ حسین صفوی برسر اقتدار تھا جس کو بلوچوں کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی اور وہ ان کا مخالف تھا۔ ۱۷۰۸ء میں میر وائس غلزئی نے شاہ ایران کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر کے قندھار کے والی گرگین خان کو قتل کرنے کے بعد قندھار پر قبضہ کر لیا۔ ابدالیوں نے اس کے خوف سے شوراوک کو بھی خیرباد کہہ کر ہرات کی طرف نقل مکانی کر لی اور خراسان میں بقوہ اور فراہ کے علاقے میں پھیل گئے ۱۷۱۲ء میں غلزئیوں کے سردار میر وائس نے ہرات کو بھی تاخت و تاراج کیا اور وہ بھی بلوچوں کا جانی دشمن تھا۔ ان حالات میں میر احمد جیسے کمزور حکمران کے لئے بلوچستان کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنا ایک دشوار مسئلہ تھا۔

---

[۱]: اخوند ملا محمد صدیق۔

ابتدا میں اخوند محمد صالح نے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کر کے شال کی نیابت اس کے ذاتی اخراجات کے لئے میر عبداللہ خان کے سپرد کر دی لیکن وہ بدستور مطمئن نہیں تھا۔ آخرکار اس نے دوسرے سال موسم بہار میں رندیانیوں اور رستم زئیوں کی حمایت حاصل کر لی۔ کچھی سے واپس آنے کے بعد ان کا ایک بڑا لشکر اس کے گرد جمع ہو گیا۔ قلات میں جب میر احمد کو رندیانیوں اور رستم زئیوں کے جمع ہونے اور میر عبداللہ خان کے مستونگ اور قلات پر چڑھائی کرنے کے ارادے کا علم ہوا تو وہ اور اس کا وزیر آخوند ملا محمد صالح جھالاوان کے علاوہ سراوان کے بعض قبیلوں سے ایک لشکر جمع کر کے مستونگ میں اس کے مقابلے پر آ گئے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی۔ اتفاق سے اس موقعہ پر میر داد شاہی زئی مینگل کا آمنا سامنا میر عبداللہ خان سے ہوا۔ میر داد مینگل نے اس کے چہرے پر ایک ضرب لگائی اور لڑائی کے دوران اس کے جسم پر بھی کئی زخم لگے لیکن میر احمد کے لشکر نے شکست کھائی اور وہ قلات کی طرف پسپا ہو گیا۔ بعد میں اخوند ملا محمد صالح نے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کر کے شال کے علاوہ مستونگ کی نیابت بھی اس کے ذاتی اخراجات کے لئے میر عبداللہ خان کے سپرد کر دی۔ لیکن میر عبداللہ خان کی سیمابی طبیعت بدستور غیر مطمئن تھی۔[1]

دونوں بھائیوں کے درمیان صلح صفائی کے بعد ۱۱۲۶ھ ہجری میں میر عبداللہ خان قلات چلا آیا اور اخوند ملا محمد صالح کے مکان پر قیام پذیر ہوا۔

---

[1]: اخوند ملا محمد صدیق

اتفاق سے میر احمد ان دنوں بیمار تھا اور اس نے ایک دن قلات کی میری میں بلوچی علاج کے مطابق بھیڑ کی کھال پہن رکھی تھی۔ میر عبداللہ خان کو جب اس کا حال معلوم ہوا تو اس نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر قلات کی میری پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کے بعد اس نے اپنے بھائی میر احمد کو پکڑ کر قلات کی حکومت سے معزول کر دیا اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔[1]

اس موقعہ پر جبکہ میر عبداللہ خان آخوند ملا محمد صالح کے مکان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اخوند خود اپنی کاریز کے نزدیک خیمے لگا کر ان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میر عبداللہ خان نے فوراً اس کو بلوا کر قلمدانِ وزارت اس کے سپرد کر دیا اور اسے خلعت فاخرہ اور انعام و اکرام سے بھی نوازا میر احمد نے صرف چار سال حکومت کی۔[2]

---

[1] اخوند ملا محمد صدیق

[2] ایضاً

اکیسواں باب

میر عبداللہ خان

میر عبداللہ خان نے ۱۱۲۸ھ ہجری (۱۷۱۶ء) میں قلات کی عنانِ حکومت سنبھالی۔ اسے ابتداء ہی سے لشکر کشی اور فتوحات کا بڑا شوق تھا۔ اسی شوق کی بنا پر اس نے اپنے بھائی میر احمد کو معزول کر کے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تاکہ وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنا سکے اور فتوحات حاصل کر کے اپنی حکومت کی حدود کو وسعت دینے کے علاوہ اسے بیرونی حملوں سے بھی محفوظ رکھے۔

میر عبداللہ خان نے اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں سب سے پہلا یہ کام کیا کہ اس نے کچھی پر حملہ کر کے گاجان کو تاخت و تاراج کر دیا۔ میر احمد کے دورِ حکومت میں کچھی پر خان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اور اس موقعہ پر کلہوڑہ خاندان کے نائبین اس موقعہ پر گنداوہ میں موجود تھے۔ انہوں نے خان کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد میر عبداللہ خان نے دیرہ جات پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا جہاں سے ایک شخص بھاگ کر خان کے پاس چلا آیا اور اسے دیرہ جات کے حاکموں کی داستان ظلم سنائی

لیکن سرداروں نے مخالفت کی اور اس کو دیرہ جات پر حملہ کرنے سے باز رکھا کیونکہ خان کا لشکر اس حملے کے لئے تیار نہ تھا اس کی تعداد بھی کم تھی اس کے باوجود عبداللہ خان بضد تھا کہ وہ دیرہ جات پر ضرور حملہ کرے گا۔ آخر سرداروں نے زبردستی خیموں کو اکھاڑ لیا اور کھینچ کر اس کو قلات لے گئے۔[۱] اس کے بعد اس نے مکران پر چڑھائی کی اور سارے علاقے کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے کلانچ جا پہنچا۔ مکران کے ان علاقوں کے باشندوں نے جن کو خان نے تاخت و تاراج کیا بھاگ کر ڈرامب کے پہاڑ میں پناہ لی جو گوادر کے شمال مشرق میں ایک سخت دشوار گذار پہاڑ ہے اور اس میں فوجی نقل و حرکت نہیں ہو سکتی اس نے ان کو وہاں بھی نہ چھوڑا اور سب کو تہ تیغ کر دیا۔ اس کے بعد مکران کے مغربی علاقوں کسر قند، بمپور وغیرہ کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے بندر عباس جا پہنچا اور شہر کو لوٹ لیا۔ اس حملہ کے دوران بہت سا مال غنیمت اس کے ہاتھ لگا۔[۲] یہ واقعہ غالباً ۱۷۲۳ء میں پیش آیا جس کے دوران پانچسو افراد پر مشتمل بلوچوں کے ایک لشکر نے جن کو مال غنیمت کی بڑی امید تھی بندر عباس پر حملہ کر دیا اور یورپی فیکٹریوں سے زبردستی نکال باہر کر دیئے گئے۔[۳]

اس اثناء میں ایران میں اہم واقعات رونما ہونے لگے۔ ۱۷۱۶ء میں

۱۔ اخوند ملا محمد صدیق

۲۔ ایضاً

۳۔ ریورٹی

غلزئیوں کا سردار میروائس بیمار ہوکر فوت ہوگیا اور اس کا نوجوان بیٹا محمود غلزئی اس کا جانشین بنا۔ غلزئی سرداروں نے اس کے چچا عبدالعزیز کو اس کا وکیل مقرر کر دیا۔ لیکن اس نے عبدالعزیز کو قتل کر کے اس کے بیٹے اشرف کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ اور قندہار پر ایک خود مختار حکمران کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا۔

اسی اثناء میں ابدالیوں کا سردار اور اس کا بیٹا اسداللہ خان ہرات پہنچ گئے۔ ہرات کے باشندوں نے اس موقعہ پر ہرات کے والی عباس قلی کے خلاف بغاوت کر دی اور ابدالیوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر ہرات پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد ایک وسیع علاقے پر ان کا قبضہ ہوگیا۔[1]

سنہ ۱۷۱۸ء میں ابدالی قندہار کے غلزئیوں کے ساتھ الجھ گئے۔ محمود نے فراہ کی طرف پیش قدمی کی اور لڑائی کے دوران ابدالیوں کا سردار اسداللہ خان خاش رود کے نزدیک دلآرام کے مقام پر غلزئیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ہرات کے ابدالیوں نے اس کی جگہ زمان خان کو اپنا سردار بنا لیا۔

سنہ ۱۷۲۱ء میں محمود غلزئی سیستان میں تھا کہ سردار شہداد خان بلوچ نے جو عموماً شادلو کے نام سے مشہور تھا۔ کرمان پر حملہ کر دیا۔ کرمان کے باشندوں نے محمود سے امداد طلب کر لی اور محمود نے کرمان کا محاصرہ کر لیا۔ اسی دوران محمود کے خلاف قندہار میں تاجکوں نے بغاوت کر دی اور محمود قندہار کی

۱۔ HISTORY OF AFGHANISTAN. G.P.TATE

کی طرف چلا گیا۔ [1]

۱۷۲۲ء میں محمود غلزئی نے دوبارہ کرمان پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اصفہان کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے ایران کے بادشاہ شاہ حسین صفوی کو شکست دی اور ایران سے صفوی خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر کے شاہ محمود کے لقب سے ایران کا بادشاہ بن گیا۔ اس نے اپنے بھائی شاہ حسین غلزئی کو قندھار کا والی مقرر کر دیا۔ آئے دن کی قتل و غارت کی وجہ سے چھ سال کے اندر اندر شاہ محمود کا دماغ خراب ہو گیا اور وہ اپنے ہی منصب داروں کے لیئے خطرہ کا موجب بن گیا۔ غلزئی سرداروں نے اس کے چچازاد بھائی اشرف کو قید سے نکال کر ایران کا بادشاہ بنا دیا اور اشرف نے اپریل ۱۷۲۵ء میں محمود کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا۔ [1]

اسی دوران نادر علی قلی ایران کے افق پر نمودار ہوا اور شہزادہ طہماسپ کا سپہ سالار بنا۔ اس نے افغانوں کے خلاف اپنی جدوجہد شروع کر دی سب سے پہلے اس نے مشہد اور سیستان پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد خراسان میں ابدالیوں کے خلاف مہمات کا آغاز کر کے ان کو شہزادہ طہماسپ کی بالادستی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ [2]

نادر علی قلی نے ۱۷۲۹ء کے دوسرے نصف کے دوران شاہ اشرف کو مہمان دوست، اصفہان اور شیراز میں پے در پے شکستیں دے کر افغانوں

ح ۱۔ HISTORY OF AFGHANISTAN. G.P.TATE.

ح ۲۔ ABID.

کی طاقت توڑ دی اور وہ قندہار کی طرف بھاگ نکلنے پر مجبور ہو گئے شاہ اشرف قندہار جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اس کا چچازاد بھائی شاہ حسین جو اب قندہار کا خود مختار حکمران بن گیا تھا۔ شاہ اشرف کی گرفتاری کے در پے ہوا اور دریائے ہلمند کے کنارے ملا خان کی گھاٹ پر اس کا راستہ روک کر بیٹھ گیا۔[1]

اشرف کو جب شاہ حسین کے ارادوں کی خبر ملی تو اس نے اپنا راستہ تبدیل کر کے اس راستہ پر اپنا سفر جاری رکھا۔ جو بلوچستان کے ایک غیر آباد اور بنجر علاقے سے ہو کر گذرتا تھا اور وہ اسی راستہ سے ہندوستان جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔[2]

نادر علی قلی نے بھی ان واقعات کے دوران بلوچستان کے حکمران میر عبداللہ خان سے رابطہ پیدا کر کے اسے اپنا طرفدار بنا لیا تھا اور اسے تاکید کی تھی کہ وہ بھی اشرف کا راستہ روک کر اس کو گرفتار کرے۔[3]

اس زمانہ میں سردار خاران میر پردل خان نوشیروانی نے شاہ حسین والی قندہار سے گہرے تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ اور شاہ حسین نے اس کو ہلمند کے علاقے میں جاگیر بھی دی تھی۔ شاہ حسین نے قبل از وقت اس کو بھی ہدایت کی تھی کہ اگر اشرف کا گذر اس کے علاقے سے ہو تو

ملہ[1]:- HISTORY OF AFGHANISTAN. G.P.TATE.

ملہ[2]:- ABID.

ملہ[3]:- ABID.

وہ اسے گرفتار کرکے قندہار پہنچا دے۔ اشرف اس سفر کے دوران ایک رات اپنے خاندان لواحقین اور پیروکاروں سمیت دن بھر کے سفر سے تھک کر زرد کوہ کے دامن میں پانی کے ایک کنویں کے نزدیک سو رہا تھا کہ سردار خاران کے بھائی میر ابراہیم کو زرد کوہ کے دامن میں اس کی موجودگی کا علم ہوگیا۔ اس نے اپنے مختصر سے لشکر کے ساتھ ان پناہ گزینوں پر حملہ کر دیا۔ اشرف اس لڑائی کے دوران میر ابراہیم خان نوشیروانی کے ہاتھ سے قتل ہوگیا۔ میر ابراہیم نے اس کے بعد اشرف خاندان کے جملہ اراکین کو جن میں صفوی خاندان کی دو شہزادیاں بھی تھیں گرفتار کرکے قندہار بھیج دیا۔ یہ واقعہ ۱۷۳۰ء کے اوائل میں پیش آیا۔[لہ]

نومبر ۱۷۲۹ء میں شیراز کے معرکے میں شاہ اشرف کی شکست کے بعد اس کا سپہ سالار سیدل خان راہِ فرار اختیار کرکے قندہار چلا گیا۔ نادر نے ۱۷۳۱ء میں ہرات میں ابدالیوں کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کیا۔ جو ایک سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی۔ اس موقعہ پر اس کو اطلاع ملی کہ شاہ حسین والی قندہار ابدالیوں کے لئے ہرات میں کمک بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس خبر سے اس کو تشویش پیدا ہوگئی اس نے اپنے ایک خاص ایلچی عبدالمومن خان کو میر عبداللہ خان کے پاس قلات روانہ کر دیا اور اسے قندہار پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ اسی دوران وہ گرمسیر کے بلوچوں کے خلاف جو شاہ حسین غلزئی کے طرفدار تھے ایک مہم بھیجنے کا

لہ HISTORY OF AFGHANISTAN. G.P. TATE

کا ارادہ رکھتا تھا کہ شاہ حسین غلزئی نے ایک طرف سیدل خان ناصر کی قیادت میں ابدالیوں کے لئے کمک اور امداد روانہ کر دی اور دوسری طرف خیر سگالی کے طور پر نادر کے پاس تحفے تحائف روانہ کر دیئے نادر نے گرم سیر کے بلوچوں پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ نادر نے اپنا ایلچی قلات روانہ کر کے میر عبداللہ خان کو اس بنا پر قندھار پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔ تاکہ شاہ حسین غلزئی بلوچوں کے ساتھ الجھ کر ہرات کے ابدالیوں کے لئے کمک روانہ نہ کر سکے۔[۱] چنانچہ میر عبداللہ خان نے نادر کی منشا کے مطابق قندھار پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ اس نے میر عیسٰی خان رستم زئی کو اپنے لشکر کا سپہ سالار بنایا اور اسے قندھار پر چڑھائی کرنے کا حکم دیا۔[۲]

قندھار کے قلعہ کے استحکامات بڑے زبردست تھے۔ افغانوں کی فوج بھی بڑی منظم تھی اور ان کے پاس اسلحہ کی بھی کمی نہ تھی۔ خان کی یہ مہم بری طرح ناکام ہوئی۔ خان کے لشکر نے افغانوں کے ہاتھوں بری طرح شکست کھائی اور اس کے لشکر کا سپہ سالار میر عیسٰی خان رستم زئی میدانِ جنگ میں کام آیا۔[۳]

میر عبداللہ خان نے اس شکست کا بدلہ لینے کی خاطر قندھار پر

۱:- RAVERTY

۲:- اخوند ملا محمد صدیق

۳:- ایضاً

حملہ کرنے کی دوبارہ تیاری کر لی اور ایک بڑی جمیعت کے ساتھ جواب کی باراسلحہ سے پوری طرح لیس تھی قندہار کی طرف روانہ ہوا۔ شاہ حسین غلزئی والی قندہار کو بلوچوں کے اس حملے کی خبر پہلے ہی سے مل گئی تھی وہ بلوچوں کے اس حملے کو روکنے کی خاطر اپنی فوج کو لے کر قندہار سے باہر نکل آیا لیلیٰ مجنوں کے مقام پر افغانوں اور بلوچوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ افغانوں نے شکست کھائی۔ شاہ حسین غلزئی قندہار کی طرف پسپا ہوگیا۔ میر عبداللہ خان کے لشکر نے مرکز فشنگ اور شورارود پر قبضہ کر لیا۔ میر عبداللہ خان نے فشنگ میں میر فیروز خان رئیسانی اور شورارود میں میر سلطان قائم خان شاہوانی کو حاکم مقرر کیا[1]

اس واقعہ کے بعد شاہ حسین غلزئی نے سندھ کے حکمران میاں نور محمد کلہوڑہ کو جس کو شاہنشاہِ ہند نے خدایار خان کا لقب دیا تھا۔ اپنا طرفدار بنایا اور اس سے میر عبداللہ کے خلاف امداد حاصل کی۔ وہ افغانوں کی ایک زبردست فوج لے کر قندہار سے نکل کھڑا ہوا اور درہ کوژک کو عبور کر کے پشین (فشنگ) پہنچا اور فشنگ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ افغانوں نے میر فیروز خان رئیسانی کو جسکو میر عبداللہ خان نے فشنگ (پشین) کا حاکم مقرر کر دیا تھا قتل کر دیا۔ اس کے بعد شورارود کا رخ کر کے میر سلطان قائم خان شاہوانی کو شورارود سے نکال باہر کیا اور شورارود پر بھی قبضہ کر لیا[2]

---

[1] اخوند ملا محمد صدیق

[2] ایضاً

اسی دوران کلہوڑوں کی ایک ٹڈی دل فوج میاں نور محمد کلہوڑہ (خدا یار خان ثانی) کی قیادت میں درہ بولان کو عبور کر کے وادی شال میں داخل ہو گئی اور شال کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا جو وادی کے وسط میں ایک ٹیلے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ خان نے اس قلعہ کی حفاظت کے لیے جو لشکر مقرر کیا تھا، وہ بھی قلعہ کے اندر محصور ہو گیا۔ اس اثناء میں افغانوں کا لشکر بھی غزبند کے درے کو عبور کر کے شال پہنچا اور محاصرین کے ساتھ شامل ہو گیا۔ [1]

اس موقعہ پر میر عبداللہ خان اپنے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مستونگ میں موجود تھا کہ میر سلطان قائم خان بھی شوراورد چھوڑ کر اس کے پاس چلا آیا۔ خان کو مستونگ ہی میں فیروز خان رئیسانی کے قتل کی خبر مل گئی۔ سندھی اور افغان فوج نے مل کر کئی مہینوں تک شال کے قلعہ کا محاصرہ جاری رکھا لیکن قلعہ کو سر کرنے میں ان کو کوئی کامیابی نظر نہ آئی اس موقعہ پر باہر سے ایک طرف میر عبداللہ خان کے لشکر نے رات کے وقت ان پر شب خون مار کر ان کا ناطقہ بند کر دیا اور دوسری طرف قلعہ کے اندر سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ کچھ عرصہ بعد سردیوں کا موسم بھی شروع ہو گیا اور سرد ہوائیں چلنے لگیں۔ جس کی وجہ سے سندھیوں پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ آخر کار تنگ آ کر محاصرین نے قلعہ کا محاصرہ اٹھا لیا وہ اپنے اپنے وطن کی طرف مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئے ان کو کوئی

---

[1] اخوند ملا محمد صدیق

کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ یہ واقعہ سنہ ۱۷۳۰ء میں پیش آیا۔[۱]

۱۱۴۲ھ ہجری (۱۷۲۹-۳۰ء) میں مراد کہیری جو مراد گنجا کے نام سے بھی مشہور تھا۔ کلہوڑہ حکمران میاں نور محمد کی طرف سے سیوی کا ناظم مقرر ہوا۔ اس نے قیصر مگسی زمیندار گنجابہ میرو کودری زند سردار علاقہ شوران محال سنی کے سردار میر گوہرام لاشاری کی اولاد محال کچھی کے مالک میر وبلیدی بھاگ کے زمیندار میہر ایری دلیھیا ماچھی ڈھاڈر کے مالکوں کالا خان باروزئی اور کوہستان کے دوسرے بلوچ زمینداروں کنگانی کے محالدار بہادر خان عومرانی وغیرہ کو جن میں سے ہر ایک ایک ہزار کے لشکر کا سردار تھا شکستیں دے کر مطیع کرنے کے بعد تحفتہ الکرام کے دعویٰ کے مطابق خان قلات عبداللہ خان براہوئی سے جو اپنے آپ کو شہباز کوہستان کہتا تھا جاکر پنجہ ملایا۔ مراد گنجا کی یہ کارروائیاں میر عبداللہ خان کو للکارنے کے مترادف تھیں۔[۲]

سندھ کے کلہوڑہ حکمران میر سمندر کے عہد حکومت میں چالیس ہزار روپے سالانہ خان کو دیا کرتے تھے۔ میرا محمد ثانی کے دورِ حکومت میں انہوں نے خان کو یہ رقم دینی بند کر دی۔ میر عبداللہ خان اس معاملہ کو بہانہ بنا کر سندھ پر حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ اور اپنا قبائلی لشکر لے کر بولان کے راستے سندھ کی طرف روانہ ہوا۔[۳] اس کی خبر جب سندھ کے کلہوڑہ حکمران کو ملی تو

---

[۱] :۔ اخوند ملا محمد صدیق

[۲] :۔ ایضاً [۳] :۔ اخوند ملا محمد صدیق۔

اس نے فوراً چالیس ہزار روپے کی یہ رقم بقایاجات سمیت یکمشت اپنے نمائندوں کے توسط سے خان کے پاس روانہ کر دی۔ اس وقت خان درہ بولان میں بی بی نانی کے مقام پر فروکش تھا کہ کلہوڑہ حکمران کے نمائندوں نے مذکورہ بالا رقم پہنچا دی۔[1] خان اتنی بڑی رقم حاصل کرنے کے بعد سندھ پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر کے دیرہ جات پر حملہ کرنے کے خیال سے روانہ ہوا اور دیرہ جات کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے ہڑند اور داجل پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد میر عبداللہ خان نے اسی سال لورالائی پر حملہ کر کے تل وچوٹیالی پر بھی قبضہ کر لیا جو غلزئیوں کے مقبوضات میں شامل تھے۔[2]

۱۱۴۳ھ ہجری میں خان نے بالآخر کچھی پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے تیاری شروع کر دی۔ اس مقصد کے لئے اس نے سراوان اور جھالاوان سے دو لشکر مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جھالاوان کے لشکر کے سرکردوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنی تیاریاں مکمل کر کے درہ مولہ کے راستہ چنڈڑ کے مقام پر اس کے ساتھ جا کر ملیں۔ وہ خود سراوان کے لشکر کے ساتھ درہ بولان کے راستے کچھی کی طرف روانہ ہوا۔ سب سے پہلے اس نے ڈھاڈر پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ گنداوہ کا رخ کر کے چنڈڑ پہنچا جو خان پور کے نزدیک واقع ہے بدقسمتی

---

[1] تحفۃ الکرام۔

[2] اخوند ملا محمد صدیق

سے جھالاوان کا لشکر منصوبہ کے مطابق وقت مقررہ پر چندڑ نہ پہنچ سکا وہ تو اس وقت جھالاوان کی حدود میں اپنی روانگی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔[1]

سندھ کے حکمران میاں نور محمد کلہوڑہ کو جب میر عبداللہ خان کی کارروائیوں کا علم ہوا تو وہ اپنے آبائی گاؤں خدا باد دان سے لاڑکانہ چلا آیا اور یہاں سے اپنی فوج کو اپنے سپہ سالار شاہ بہار اور مراد گنجا کی قیادت میں میر عبداللہ خان کے مقابلے پر روانہ کر دیا۔ جھالاوان کے لشکر کے وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے خان اور اس کے سرداروں نے محسوس کر لیا کہ ان کا منصوبہ ناکام ہو گیا ہے اور وہ اب دشمن کے نرغے میں پھنس کر اس کی ٹڈی دل فوج کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔[2]

اس موقعہ پر میر عبداللہ خان کو موقع کی نزاکت کا احساس ہو گیا اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے وزیر آخوند ملا محمد صالح کو حکم دیا۔ کہ وہ اس کے بڑے بیٹے میر محبت کو جو ان کے ساتھ لشکر میں موجود تھا فوراً قلات پہنچا دے تاکہ حادثہ پیش آنے کی صورت میں قلات کا مسند خالی نہ رہے۔ آخوند نے پہلے تو انکار کر دیا کہ وہ کس منہ سے اپنے آقا کو دشمن کے نرغے میں چھوڑ کر قلات چلا جائے۔ لیکن سرداروں کے زور دینے پر وہ راضی ہو گیا اور شہزادے کو اپنے ساتھ لے کر قلات چلا گیا۔[3]

---

[1] - آخوند ملا محمد صدیق

[2] - ایضاً [3] آخوند ملا محمد صدیق

میر عبداللہ خان کے لشکر اور کلہوڑہ فوج کے درمیان چنڈڑ کے مقام پر ایک شدید جنگ ہوئی۔ خان کے لشکر کی نفری کم تھی اور دشمن کی فوج کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ خان کا لشکر اس موقعہ پر جان توڑ کر لڑا اور بہادری کے جوہر دکھائے اور دشمن کی فوج کو کئی بار پیچھے دھکیل کر کو بار پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ ہر بار جب ان کو پیچھے دھکیل دیا جاتا تھا وہ ہمت ہار بیٹھتے تھے تو ان کے سرکردہ ہر بار ان کو غیرت دلا کر خان کے لشکر پر حملہ کرنے کی ہدایت دیتے تھے۔ اس کشمکش کے دوران میر عبداللہ خان بڑی سرعت کے ساتھ دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اور اپنے لشکر کو اس نے پیچھے چھوڑ دیا اس موقعہ پر چونکہ خان اکیلا تھا سندھی فوج نے موقعہ کو غنیمت جان کر اس کو گھیرے میں لے لیا اور اس پر یکبارگی ٹوٹ پڑی۔ خان اپنے لشکر سے کٹ کر دشمن کے نرغے میں پھنس گیا۔ اس نے نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں جامِ شہادت نوش کیا۔[1]

اس شکست کے تھوڑے سے عرصہ بعد مراد گنجا کہیری کلہوڑوں کا ایک لشکر لے کر سیوی سے درہ بولان میں داخل ہو گیا اور کرتہ کے قلعہ کا محاصرہ کر کے ایک شدید جنگ کے بعد اس پر قبضہ کر لیا اور مبارک خان نے اس کے ہاتھ سے شکست کھائی اس کے بعد اس نے درہ بولان سے آگے بڑھتے ہوئے اسماعیل اور کاکڑی کو شکست دی اور کاکڑی میدان جنگ میں ہلاک

---

[1] اخوند ملا محمد صدیق

ہو گیا۔ ~~~

تحفتہ الکرام کے مطابق میاں نور محمد کلہوڑہ (خدایار خان ثانی) کے دونوں بیٹے میاں خداداد اور میاں مرادیاب خان عبداللہ خاں کے داماد تھے۔

بلا مغالغہ میر عبداللہ خان ایک جرأت مند، دلیر، بہادر اور باہمت انسان تھا۔ مہم جوئی اس کی فطرت میں داخل تھی۔ وہ فقط عمل میں ایمان رکھتا تھا۔ یہی جوشِ کردار اس کی شہادت کا باعث بنا۔ وہ عظیم بلوچستان کا خواب دیکھتا تھا جو شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس کے بلند پایہ کارناموں کی وجہ سے اس کے ہم وطن اس کو "شہبازِ کوہستان" کے لقب سے یاد کرتے تھے اس کی شہادت کا المیہ ۳۱-۱۷۳۰ء میں پیش آیا۔

لے :- تحفتہ الکرام

بائیسواں باب

خان میر محبت خان

میر عبداللہ خان کی شہادت کے بعد سرداروں نے خان شہید کی خواہش کے مطابق اس کے بڑے بیٹے میر محبت کو قلات کی مسند پر بٹھایا۔ وہ ایک جٹ خاتون کے بطن سے تھا۔ اس کے دونوں بھائی میر ایلتاز اور میر نصیر ایک دوسری خاتون بی بی مریم کے بطن سے تھے جو خان کے اپنے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس موقعہ پر اخوند ملا محمد صالح کے مشورہ اور تجویز سے مستونگ کی نیابت دونوں بھائیوں اور ان کی والدہ کے اخراجات کی کفالت کے لئے میر ایلتاز کے سپرد کر دی گئی۔[1]

نادر کے نمائندے عبدالمومن نے جو اس سے پیشتر اس کا ایلچی بن کر خان میر عبداللہ خان کے پاس آیا تھا اور اس کو قندھار پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی اس کی شہادت کے فوراً بعد میر محبت اور میر ایلتاز کو اپنے ساتھ لے کر نادر کے پاس ہرات پہنچا دیا۔ جہاں وہ ابدالیوں کے خلاف نبرد آزما ہو کر ان کو زیر کرنے میں مصروف تھا۔ بلا مبالغہ نادر کو میر عبداللہ

---

[1] اخوند ملا محمد صدیق

خان کی شہادت کا رنج تھا جو اس نازک دور میں اس کا طرفدار اور ہم نوا تھا اور اس نے اسی کی ایما پر قندہار پر فوج کشی کر کے غلزئیوں کو ابدالیوں کی مدد کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس موقعہ پر ۱۷۴۰ء کے اوائل میں (فروری مارچ) جب میر محبت اور میر ایلتاز ہرات پہنچے تو ان کی شاندار طریقے سے پذیرائی ہوئی۔

ان کو خلعت فاخرہ کے علاوہ انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا۔ انہوں نے بھی اپنے اور اپنے سرداروں اور قبائل کی طرف سے نادر کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ نادر نے میر محبت کو اس کے باپ کی بجائے کل بلوچستان کا سردار تسلیم کر لیا۔[۵]

اس کے عہد کے اکثر واقعات ریورٹی سے ماخوذ ہیں۔ آگے اس کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

"میر عبداللہ خان جو ۱۱۴۳ہجری میں سندھ کے حکمران خدایار خان کلہوڑہ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا قلات کا نہیں بلکہ گنجابہ کا حکمران تھا۔ اس دور میں قلات کا حکمران میر محراب خان بلوچ تھا۔ اس زمانہ میں نوشکی کا حاکم شیر خان بلوچ تھا۔ یہ تمام ماتحت حاکم ایران کے صفوی خاندان کے بادشاہوں کے باجگذار، وہ انکے زیر فرمان تھے ان کے علاقے ولایت قندہار میں شامل چلے آتے تھے۔"

"محراب خان بلوچ نے جو قلات کا ماتحت حکمران تھا۔ صفوی

---

۵ :۔ RAVERTY

خاندان کے بعد اپنے آپ کو خودمختار سمجھ کر شال یا شال مستونگ پر قبضہ کریں جو عموماً شال کے نام سے موسوم تھا۔"

قندہار کے خودمختار بادشاہ ۔ شاہ حسین غلزئی نے شال کوٹ کو دوبارہ حاصل کرنے اور قلات کے حکمران محراب خان بلوچ کو مطیع کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ ۱۱۴۵ھ ہجری کے شروع (جون جولائی ۱۷۳۳ء) میں اپنے ساتھ افغانوں اور ہزاروں پر مشتمل ایک فوج لے کر قندہار سے نکلا اور درہ کوژک کو عبور کر کے فشنگ پہنچا۔ یہاں اس نے از سرِ نو فشنگ کے قلعہ کی مرمت کی اور اس کے استحکامات درست کیے۔ یہاں اس نے قلعہ کی حفاظت کی غرض سے فوج متعین کی۔ اس کے بعد کوتل گز (غز بند) کو عبور کر کے شال میں داخل ہوا۔ بلوچ اس کی آمد پر قلعہ بند ہو گئے۔ انہوں نے قلعہ کے نزدیک توپیں کھڑی کر دیں اور اپنے ایک رہنما سالار خان کی قیادت میں جس کی بدکرداریوں نے شاہ حسین کو شال چلے آنے پر مجبور کیا تھا مقابلہ پر اتر آئے لیکن ان کے حملے کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔ جب ان کے ایک دوسرے حملے کو بھی ناکام بنا دیا گیا تو وہ کچھ دنوں کے بعد رات کے اندھیرے میں مستونگ اور قلات کی طرف بھاگ نکلے۔ شاہ حسین نے قلعہ پر جس کو بلوچ اپنی زبان میں کوٹ کہتے تھے قبضہ کر لیا۔ اس کی فوج کے قائد شیر دل خان بابوزئی کے ساتھ اس موقعہ پر پانچسو جزائرچی پیادہ اور دو سو گھوڑ سوار تھے جن کو ساتھ لے کر شاہ حسین نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ مستونگ پہنچا۔

بلوچ پہلے ہی سے مستونگ پہنچے ہوئے تھے۔ یہاں شاہ حسین کو معلوم ہوا کہ شال سے نکل کھڑے ہونے کے بعد بلوچ کچھ دوسرے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر گنجابہ اور کچھی کی طرف بھاگ نکلے ہیں۔ ان میں سے کچھ قلات کی طرف گئے ہیں۔ انہوں نے مستونگ کو خالی کر دیا ہے۔ شاہ حسین نے ان کا پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ ان کی ایک جمعیت قلات کے ضلع کی حدود میں دوسری طرف ملی۔ یہ لوگ اپنے اہل و عیال، مویشیوں کے ریوڑ اور دوسرے مال و اسباب کو افغانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف بھاگ نکلے۔ اس موقعہ پر فوج کے قائد اسحاق خان اسحاق زئی نے ان کے بال بچوں کے ساتھ کوئی تعرض نہ کیا لیکن ان کے اثاثوں اور مویشیوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔

جب بلوچ بھاگ کر قلات پہنچے جو ایک بڑی جگہ اور حکومت کا مرکز تھا تو محراب خان بلوچ نے جو تمام بلوچوں کا سردار تھا محسوس کیا کہ افغانوں کا دوسرا حملہ قلات ہی پر ہوگا۔ اس نے اطاعت قبول کر لی اور مطلوبہ شرائط کو قبول کر کے مصالحت پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے گھوڑوں کے علاوہ دوسرے تحفے تحائف بھی پیش کئے۔ اس موقعہ پر نوشکی کے حاکم شیر خان کے علاوہ جو نوشکی اور چاغی کے درمیان بود و باش رکھتا تھا گنجابہ کے حاکم عبداللہ خان نے بھی اطاعت قبول کر لی اور شاہ حسین کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ اوّل الذکر یعنی میر محراب خان نے تمام بلوچوں کے سردار کی حیثیت سے تمام پیش کردہ شرائط کو بھی تسلیم و قبول کر کے

اپنے آپ کو شاہ حسین سے وابستہ کرنے کا عہد کیا۔ اس نے یہ بھی وعدہ کیا کہ شوراوک اور قشنگ سے جو مویشی زبردستی حاصل کئے گئے تھے ان کو واپس کر دیا جائے گا۔ اس نے یہ شرط بھی قبول کر لی کہ وہ نہ صرف شال کے باشندوں کے نقصانات کا معاوضہ ان کو ادا کر دے گا۔ بلکہ قندھار کے بادشاہ کو جب بھی فوج کی ضرورت پڑے گی تو وہ اس کو پانچ ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر فراہم کرنے کا پابند ہوگا۔ اس نے ان شرائط کی پابندی کے لئے بطور ضمانت اپنے پانچ سرکردوں کو بھی یرغمال کے طور پر شاہ حسین کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد جب دونوں طرف سے طے شدہ شرائط کی توثیق کی گئی تو شاہ حسین نے دوبارہ قندھار کی طرف مراجعت کی اور وہ بلوچوں کے پانچوں سرکردوں کو بھی اپنے ساتھ یرغمال بنا کر قندھار لے گیا[1]

اسی مہم کے دوران شاہ حسین غلزئی نے ڈیرہ جات پر بھی حملہ کر کے سردار غازی خان سردار فتح خان اور سردار اسماعیل خان بلوچ کو اطاعت قبول

---

[1] ۔ ریورٹی کا شمار عصر حاضر کے ممتاز محققوں میں ہوتا ہے لیکن اس کا بیان جس مؤرخ کی تحریروں سے ماخوذ ہے اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ میر عبداللہ خان اپنی زندگی میں کبھی بھی گنجابہ کا حاکم نہیں تھا۔ بلکہ گنجابہ حاصل کرنے کی خاطر اس نے اپنی جان قربان کر دی۔ میر محراب خان میر عبداللہ خان کا باپ تھا جو ۱۶۹۵ء میں قلات کا حکمران بنا۔ وہ اسی سال شہزادہ معزالدین کی خواہش پر میاں یار محمد کلہوڑ کی گرفتاری کے سلسلے میں ایک حادثہ کا شکار ہو کر فوت ہو گیا۔ میر محبت

کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس علاقے میں اس نے جو فوجی کارروائی کی اس کے نتیجہ میں بلوچ ہزاروں کی تعداد میں اس کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔

میر محبت کی مسندنشینی کو ابھی دو سال کا عرصہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس کے بھائی میر ایلتاز نے میر لشکر ریسانی کی ایما پر اور اس کی اعانت سے قلات پر زبردستی قبضہ کر لیا اور میر محبت کو معزول کر کے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ میر محبت قلات کو خیرباد کہہ کر اس امید پر جھالاوان چلا گیا کہ شاید وہ وڈھ کے مینگلوں سے اپنے بھائی کے خلاف کوئی امداد حاصل کر سکے لیکن مینگلوں نے اس کی امداد پر کوئی آمادگی ظاہر نہ کی وہ مایوس ہو کر دوبارہ قلات چلا آیا اور قلات ہی میں سکونت اختیار کر لی۔[۵۸]

میر ایلتاز کوئی اعلیٰ قابلیت کا مالک نہیں تھا۔ اس نے فقط وہ روایت زندہ کی جو اس کے باپ میر عبداللہ خان نے اپنے بھائی میر احمد ثانی کے حق میں روا رکھی تھی۔ وہ ان صلاحیتوں سے بھی محروم تھا جو اس کے باپ

---

* میر عبداللہ کا بیٹا تھا۔ جو اس کی شہادت کے بعد ۳۱-۱۷۳۰ء میں قلات کا حکمران بنا۔ باپ بیٹے اور دادا کو حکمرانی کے معاملے میں کسی صورت میں ہمسر نہیں بنایا جا سکتا۔ شیر خان نہ بلوچ تھا اور نہ نوشکی کا حاکم تھا، وہ شوراوک کے بڑے قبیلے کا سردار تھا۔ ۱۱۲۵ھ ہجری میں شاہ حسین نے ڈیرہ جات کی طرف ایک فوجی مہم روانہ کر دی تھی لیکن اس مہم کے دوران افغان بلوچستان کی حدود میں داخل ہی نہیں ہوئے تھے

۵۸۔ اخوند ملا محمد صدیق۔

میر عبداللہ خان کے حصے میں آئی تھیں اس دوران وہ کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہ دے سکا۔ اس کا انتظام حکومت بھی ناقص تھا۔ اسی وجہ سے اخوند ملا محمد صالح بھی اس کا طرفدار نہ بن سکا۔ رفتہ رفتہ سردار بھی اس سے برگشتہ ہو گئے اور میر لشکری رنیائی اکیلا ہی اس کا طرفدار تھا۔ اس اثنا میں اخوند ملا محمد صالح نے وفات پائی اور ان کے بیٹے اخوند ملا محمد حیات نے وزارت کا عہدہ سنبھالا۔[1]

جولائی ۱۷۳۱ء میں شاہ اشرف کا سابق سپہ سالار سیدل خان ناصر ہرات سے بھاگ نکلا اور اسفرار میں جا کر ٹھہرا۔ اس اثنا میں ابدالیوں نے کئی بار مزاحمت کا راستہ اختیار کیا اور کئی بار مصالحت پر آمادگی ظاہر کی ان مواقع پر ابدالیوں کا سردار ذوالفقار خان اور اس کا بھائی احمد خان جو زمان خان کے بیٹے تھے ہرات چھوڑ کر اسفرار میں سیدل خان ناصر کے پاس چلے گئے اور یہاں سے اس کے ساتھ مل کر قندہار پہنچ گئے۔ شاہ حسین غلزئی نے ان دونوں کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔[2]

۱۷۳۲ء میں نادر کا ہرات پر مکمل قبضہ ہو گیا۔ ابدالیوں نے طویل مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ ابدالیوں کے ساتھ نادر کا رویہ بڑا نرم تھا۔ اس نے افغانوں پر مشتمل جو فوج تیار کی تھی اس کے

۱۔ اخوند ملا محمد صدیق

۲۔ HISTORY OF AFGHANISTAN - G.P. TATE

قائد عموماً ابدالی سردار ہوا کرتے تھے[1]

نادر اکتوبر ۱۷۳۶ء میں قندہار فتح کرنے کے ارادے سے اصفہان سے نکلا اور کرمان اور سیستان سے ہوکر جنوری ۱۷۳۷ء میں قندہار کے قریب پہنچا اور اس نے دریائے ارغنداب کے کنارے بابا ولی کے مزار کے قریب اپنی لشکرگاہ قائم کر لی۔ اس عرصہ میں نادر نے شاہ طہماسپ کو معزول کرکے نادر شاہ کا لقب اختیار کر لیا تھا۔

قندہار پر نادر شاہ کا حملہ ایک عرصہ سے متوقع تھا۔ افغانوں نے اس کے لیئے خوب تیاری کی ہوئی تھی ابتدا میں افغانوں نے ایرانیوں کا خوب مقابلہ کیا لیکن نادر کے آگے ان کی کوئی چال کارگر نہ ہوئی۔ قندہار کے قلعہ پر ابھی ایرانیوں کا شدید حملہ جاری تھا کہ شاہ حسین غلزئی ہتھیار ڈال کر قندہار نادر شاہ کے حوالے کرنے پر راضی ہوگیا۔ مارچ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ نے قندہار پر قبضہ کر لیا اور قندہار سے غلزئیوں کے اقتدار کا ہمیشہ کے لیئے خاتمہ ہوگیا۔ اسی موقعہ پہ ابدالیوں کا سردار ذوالفقار خان اور اس کا بھائی احمد خان قید سے رہا کر دیئے گئے اور نادر شاہ نے احمد خان کو اپنا میاول بنالیا۔[2]

نادر شاہ جنوری ۱۷۳۷ء کے وسط میں ابھی گرشک میں تھا کہ اس کو خبر ملی کہ بلوچوں نے مکران میں باغیانہ سرگرمیاں شروع کی ہوئی ہیں۔

۱۔ HISTORY OF AFGHANISTAN. G.P. TATE.

۲۔ ABID.

اس نے سیستان کے والی ملک لطف علی خان کو حکم دیا کہ وہ فوراً مکران جاکر باغیوں کا قلع قمع کر کے مکران میں امن و امان بحال کرے۔ ملک لطف علی خان اپنی فوج کو لے کر سرباز پہنچا جہاں بلوچوں کا سردار بود و باش رکھتا تھا۔ سرباز میں بلوچوں کے سردار نے قرب و جوار کے پہاڑوں سے جلدی میں جتنا کہ ممکن تھا ایک مختصر لشکر جمع کیا اور اس کے مقابلے پر آیا۔ بلوچ جان توڑ کر لڑے لیکن تعداد کی کمی کی وجہ سے شکست کھا گئے انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔ ان کی معاندانہ سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔ اور امن و امان بحال ہو گیا۔[۱]

اس موقعہ پر حملہ آوروں نے سرباز کے نزدیک اپنی لشکر گاہ قائم کر لی تھی۔ اسی اثنا میں دور و نزدیک سے بلوچوں کا ایک اور لشکر جن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ موقعہ پر پہنچا۔ یہ لوگ اپنے سردار اور دوسرے بھائی بندوں کی امداد پر آئے تھے لیکن وہ تاخیر سے پہنچے اور ان کی آمد سے پیشتر لڑائی ختم ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ لڑائی پر آمادہ ہو گئے اور اپنے سردار کو معاہدہ توڑ کر دوبارہ جنگ شروع کرنے پر مجبور کر دیا اور اس کے بعد سیستانیوں کی فوج پر حملہ بول دیا۔[۲]

ملک لطف علی خان کو اس تازہ دم لشکر کے آنے کا علم نہیں تھا وہ اپنی فوج کو لے کر بلوچوں کے حملہ کو روکنے کے لئے آگے بڑھا بلوچوں

ا:۔ SEISTAN- G.P.TAE

۲:۔ ABID.

میں سے ایک جوان نے جو پہلے ہی سے اس کا منتظر تھا. نشانہ باندھ کر اسے ایک ایسا تیر مارا کہ وہ وہیں زمین پر ڈھیر ہو گیا. اس سے سیستانی فوج کے حوصلے پست ہو گئے. ان میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر سیستان کی طرف بھاگ نکلے. بلوچوں کے خلاف ملک لطف علی خان کا یہ حملہ بری طرح ناکام ہو گیا[1]

اپریل ۱۷۳۷ء میں نادر شاہ نے قندہار میں اپنی لشکر گاہ سے محمد علی بیگ سرپولیلو کو چند فوجی دستوں کے ساتھ شیر خان بلوچ اور اس کے قبیلے کے لوگوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا. بلوچوں نے شورادک سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایرانی فوج کے خلاف نبرد آزما ہو کر بڑی بے جگری سے اس کا مقابلہ کیا. لیکن شکست کھائی اور اس کے سات سو آدمی میدانِ جنگ میں کام آئے. بیشمار لوگ زخمی ہو گئے اور گرفتار کر لئے گئے حملہ آوروں نے ان کے اونٹوں پر بھی قبضہ کر لیا. اس کے بعد محمد علی بیگ نے ایرانی سپاہ کے ساتھ بڑی تیزی کے ساتھ سفر کرتے ہوئے نوشکی اور چاغی کے درمیان شیر خان کے ڈیرے پر ہلہ بول دیا. اس لڑائی کے دوران شیر خان اور اس کے قبیلہ کے بہت سے لوگ ایرانیوں کے خلاف لڑتے ہوئے ہلاک ہو گئے[2]

نادر شاہ نے اس حملہ سے پیشتر پیر محمد اور اسلام خان کو چند فوجی

---

۱ :- SEISTAN. G.P.TAE.

۲ :- RAVERTY.

دستوں کے ساتھ خاران روانہ کر کے حکم دیا تھا کہ وہ خاران کے باغیوں کو کچلنے کے بعد جالک پر قبضہ کر لیں۔ محمد علی بیگ کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ شیر خان اور اس کے قبیلہ کے لوگوں کو نیست و نابود کرنے کے بعد خاران جاکر جالک میں پیر محمد خان اور اسلام خان سے ملے، محمد علی بیگ بلوچوں کو شکست دینے کے بعد جا کر جالک میں ان دونوں کے ساتھ مل گیا۔[۱]

اس مہم سے واپسی کے دوران پیر محمد اور اسلام خان راستہ میں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ پیر محمد خان کا رتبہ اسلام خان سے اونچا تھا لیکن عقل میں وہ اس سے کم تھا۔ سفر کے دوران اس کا گذر ایک ایسے دشت بیابان سے ہوا جہاں پینے کا پانی دور دور تک دستیاب نہیں تھا۔ اس سفر کے دوران اس کے بیشمار سپاہی پیاس کی شدت سے ہلاک ہو گئے نادر شاہ کو جب اس خطرے کا علم ہوا تو اس نے اپنے ایک منصبدار فتح علی چرخچی کو چند فوجی دستوں کے ساتھ پیر محمد خان کی تلاش میں روانہ کر دیا۔ فتح علی کو جب یہ لوگ بڑی تلاش کے بعد ملے تو اس نے پیر محمد خان کا سر کاٹ کر اس کے بچے کچھے سپاہیوں سمیت نادر شاہ کے پاس قندھار پہنچا دیا۔[۲]

نادر شاہ نے قندھار میں اپنے قیام کے دوران خان میر ابتیاز خان اور اس کے بھائی میر محبت کو اپنے حضور میں قندھار طلب کر لیا۔[۳] اس موقع

۱:- RAVERTY.　　　۲:- RAVERTY

۳:- ABID.

پر دونوں بھائی اپنے سرداروں اور اخوند ملا محمد حیات کی معیت میں قندہار کی طرف روانہ ہو گئے۔ قبائلی سردار میر ایتاز کے خلاف ہو گئے اور فقط میر لشکری رئیسانی اس کا حامی تھا۔ اس نے میر ایتاز خان کو خبردار کیا کہ قندہار پہنچتے ہی نادر شاہ اس کو گرفتار کر کے قید کر دے گا۔ لیکن میر ایتاز نے پرواہ نہ کی۔ کیونکہ اس کے لئے کوئی دوسرا چارہ بھی نہیں تھا۔ ۲۴ اپریل ۱۷۳۷ء کو میر ایتاز خاں اور میر محبت اپنے سرداروں اور وزیر کی معیت میں قندہار پہنچے۔ نادر شاہ کے دربار میں ان کی شاندار پذیرائی ہوئی نادر شاہ نے ان کو اور ان کے سرداروں کو خلعت اور انعام واکرام سے نوازا۔ اس کے بعد سرداروں کی درخواست پر نادر شاہ نے میر ایتاز خان کو معزول کر کے میر محبت کو بلوچستان کی حکومت پر دوبارہ بحال کر دیا میر ایتاز خان کو بادشاہ نے قندہار میں اپنے پاس یرغمال کے طور پر رکھا۔ اس موقعہ پر میر نصیر خان کو اس کی صغیر سنی کے پیش نظر مستونگ میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ نادر شاہ نے اس کو بھی طلب کر کے اپنے پاس قندہار میں رکھا بعد میں میر ایتاز خان کے بیٹے میر مراد علی کو بھی ان میں شامل کر لیا گیا۔ قندہار میں ان کے قیام کے دوران ان کی والدہ بی بی مریم بھی ان کے ساتھ تھی نادر شاہ نے شال کی نیابت کو الگ کر کے اس کی آمدنی کو ان کے اور ان کی والدہ کے اخراجات کے لئے مخصوص کر دیا۔ بعد میں بی بی مریم کی شکایت پر کہ ان کو شال کی آمدنی ٹھیک طرح سے نہیں مل رہی ہے۔ نادر شاہ نے شال کا انتظام اپنے عمال کے سپرد کر دیا اور شال کی آمدنی کے برابر

ان کو شاہی خزانہ سے رقم مہیا کرنے کا انتظام کر دیا۔ اس سے ان کی کفالت کا پورا انتظام ہوگیا۔ اس کے بعد ان کو اپنے روز مرہ کے اخراجات کے لیے کوئی دقت پیش نہ آئی۔[1]

نادر شاہ نے میر محبت کو بگلربیگی کا خطاب بھی دیا جو احمد زئی خاندان کے حکمرانوں کا طرۂ امتیاز خیال کیا جاتا تھا۔ قندہار سے میر محبت کی واپسی بھی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ جب وہ قندہار سے قلات کی طرف روانہ ہوا تو ایک ایرانی فوجی منصبدار کی قیادت میں پانچ سو سواروں پر مشتمل ایک فوجی دستہ اس کے ہمرکاب تھا۔ قلات پہنچنے کے بعد میر محبت نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور بڑے اطمینان سے حکومت کرنے لگا۔

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے پشاور سے ہو کر دلی پر حملہ کر دیا۔ وہ ہندوستان کے شہنشاہ محمد شاہ کو شکست دینے کے بعد فاتحانہ انداز سے دلی میں داخل ہوگیا۔ ایرانیوں نے نادر شاہ کے حکم سے شہر میں قتلِ عام کر کے ہزاروں افراد کو بلا امتیاز موت کے گھاٹ اتار دیا اور ہندوستان کے اس عظیم الشان دارالسلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ مئی ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اور ہندوستان کے شہنشاہ محمد شاہ کے درمیان جو معاہدہ طے پایا۔ اس کی رو سے ہندوستان کی تمام مغربی ولایات وادی کابل وغزنی وادی پشاور، افغانوں کا تمام کوہستانی علاقہ، سکھر و بھکر کے قلعے حمید آباد

---

[1] :- اخوند ملا محمد صدیق۔

ڈیرہ جات کے تمام اضلاع چوکی سوختہ، ٹھٹھہ کے صوبے کا تمام علاقہ بدین کا قصبہ۔ سرن کا پرگنہ۔ بیاولی کنڈھ کا پرگنہ اور باقی ماندہ پرگنے جو پشاور سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ پرگنے جو پشاور سے متصل واقع ہوئے ہیں۔ اٹک کی سرحد سے لے کر سنکڑہ نالہ کے ساتھ ساتھ سندھ ساگر کی انتہائی سرے تک جہاں وہ سمندر میں گرتا ہے۔ نادر شاہ کے حوالے کئے گئے۔ اس کے بعد نادر شاہ واپس کابل چلا گیا۔[۱]

دسمبر ۱۷۳۹ء میں جبکہ سخت سردی کا موسم تھا۔ نادر شاہ دریائے سندھ کے کنارے کے علاقوں کا جائزہ لینے کی خاطر کابل سے روانہ ہوا اور بنگش کے علاقے سے پہلے ڈیرہ اسماعیل خان اور اس کے بعد ڈیرہ غازی خان پہنچا۔ یہاں کے بلوچ سردار۔ سردار اسماعیل خان اور سردار غازی خان بلوچ نے باریابی حاصل کر کے نادر شاہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ نادر شاہ نے ان کے منصب کی توثیق کر دی۔[۲]

نادر شاہ نے سندھ کے حکمران میاں نور محمد کلہوڑ کو جو خدایار خان کے لقب سے ملقب تھا اپنے پاس ڈیرہ جات میں بلایا لیکن خدایار خان اس کے خوف کی وجہ سے گجرات کی سرحد کی طرف بھاگ نکلا۔ اس سے پیشتر جبکہ وہ شہنشاہ ہندوستان کے ماتحت تھا کئی بار عرضداشتیں بھیج کر نادر شاہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ اب جبکہ شہنشاہ ہندوستان نے سندھ کا علاقہ نادر شاہ کے حوالے کر دیا تھا۔ سندھ کے ماتحت حکمران خدایار خان

۱:- RAVERTY. ۲:- ABID.

کلہوڑہ کو اس کے سامنے پیش ہونے کی جرأت نہ تھی۔ نادر شاہ جب لاڑکانہ پہنچا تو یہاں اس کو خدا یار خان کلہوڑہ کے فرار ہونے کا حال معلوم ہوا۔ وہ اس کے پیچھے شہداد پور گیا۔ لیکن وہ شہداد پور میں موجود نہیں تھا بلکہ اس نے امرکوٹ میں پناہ لی تھی۔[۱]

جب نادر اس کے تعاقب میں امرکوٹ آیا تو معلوم ہوا کہ خدا یار خان دریائے سندھ کی ایک شاخ سنگڑہ کے دریائی راستہ سے بھاگ نکلنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ایرانی فوج نے اس کو گرفتار کرنے کی غرض سے امرکوٹ پر حملہ کر کے شہر کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ خدا یار خان نے جان بخشی کی شرط پر ایرانی فوج کے آگے ہتھیار ڈالنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ نادر شاہ نے اس کو معاف کر کے اسے کئی دن تک قید میں رکھا اور اس کے بعد اسے رہا کر دیا۔[۲]

نادر شاہ نے چند دن لاڑکانہ میں قیام کیا۔ یہاں اس نے میر محبت خان کو بھی بلایا جس کی سوتیلی ماں بی بی مریم نے نادر شاہ کے پاس عرضداشت بھیج کر کلہوڑوں سے میر عبداللہ خان کے خون کا عوضانہ دلوانے کا مطالبہ کیا تھا۔ نادر شاہ نے میاں نور محمد اور اس کے بیٹے غلام شاہ کو خان میر محبت خان کے حوالے کرنا چاہا تاکہ وہ ان میں سے جس کو اپنے باپ کی ہلاکت کا ذمہ وار ٹھہراتا ہے۔ اس سے اپنی مرضی کے مطابق بدلہ لے

۱۔ RAVERTY.

۲۔ ABID.

لیکن میر محبت نے یہ کہہ کر اس پیشکش کو قبول نہ کیا کہ قیدیوں سے بدلہ لینا بلوچوں کے دستور کے خلاف ہے۔[1]

نادر شاہ نے اپنے قیام سندھ کے دوران سندھ کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ لاڑکانہ یا ٹھٹھہ اور سیوستان کا علاقہ اس نے سندھ کے ماتحت حکمران میاں نور محمد کلہوڑہ کے قبضہ میں بدستور رہنے دیا۔ سندھ کے بالائی علاقے جو ملتان کے صوبہ میں شامل نہ تھے۔ شکارپور سمیت داؤد پوترہ خاندان کے سرکردوں کے حوالے کر دیا۔ مغربی سندھ کا علاقہ جو عموماً کچھی کے نام سے موسوم ہے۔ خان گڑھ اور شہداد پور سمیت میر محبت کے حصہ میں آئے۔ اس تقسیم کی بنیاد یہ تھی کہ ان علاقوں پر داؤد پوترہ اور قلات کے احمدزئی خاندان ایک عرصہ دراز سے قابض چلے آتے تھے اور سندھ کے کلہوڑہ حکمرانوں نے اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کے بعد ان خاندانوں سے یہ علاقے زبردستی چھین لیئے تھے۔ نادر شاہ نے سندھ کے حکمران میاں نور محمد (خدایار خان ثانی) کو شاہ قلی خان کا خطاب بھی دیا۔ لیکن حفظ ماتقدم کے طور پر اس کے تینوں بیٹوں غلام شاہ محمد مراد اور عطر خان کو اپنے ساتھ یرغمال بنا کر لے گیا۔[2]

نادر شاہ نے کابل سے سندھ کی طرف اپنی روانگی کے موقعہ پر فارس کے بگلر بیگی محمد تقی خان کو حکم دیا کہ وہ فارس کرمان کوہ گلوگہ

---

[1] :۔ اخوند ملا محمد صدیق

[2] :۔ ریورٹی۔

اور ساحل سمندر کی بستیوں کی فوجوں کو جہاں وہ مسقط پر چڑھائی کرنے کی غرض سے اکٹھی کر لی گئی تھیں اپنے ساتھ لے کر مکران کے راستے ٹھٹھہ پہنچ جائے۔ اسے یہ بھی حکم ملا تھا کہ وہ اپنے توپخانہ اور بھاری ساز و سامان کو کشتیوں میں لاد کر سمندری راستہ سے سندھ بھجوا دے۔ نادر شاہ کو لاڑکانہ میں اس کے قیام کے دوران خبر ملی کہ محمد تقی خان بلگر بیگی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ مکران پہنچ گیا ہے اسے یہ بھی اطلاع ملی کہ اس نے ملک دینار گچکی والی مکران کے خلاف کامیابی حاصل کر لی ہے جو کیچ کے قلعہ میں محصور کر لیا گیا تھا۔[۱]

اس سے قبل مکران میں ملک خاندان کے اراکین برسر اقتدار تھے اس خاندان کے آخری حکمران ملک مرزا کو بلیدیوں اور گچکیوں نے باہم مل کر شکست دی اور ملک مرزا کو قتل کر کے مکران پر قابض ہو گئے انہوں نے مکران کے علاقے کو آپس میں بانٹ لیا۔ مغربی مکران کا علاقہ بلیدیوں کے حصہ میں آیا اور مشرقی مکران پر گچکی قابض ہو گئے لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان دونوں خاندانوں کے درمیان عداوت پیدا ہو گئی۔ محمد تقی خان کی مکران میں آمد سے تھوڑے عرصہ پیشتر گچکیوں اور بلیدیوں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ شیخ قاسم بلیدی کے لشکر نے شکست کھائی اور ملک دینار گچکی نے مغربی مکران پر قبضہ کر لیا جس میں سرباز کسر قند۔ بمپور گس اور دیگوار وغیرہ شامل تھے۔[۲]

---

[۱] : RAVERTY.

[۲] اخوند ملا محمد صدیق

محمد تقی خان نے اس موقعہ پر گچکیوں کے مرکز کیچ پر حملہ کر کے کیچ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا جس کے استحکامات بڑے مضبوط تھے۔ ملک دینار کے حامیوں نے شکست کھائی اور ملک دینار اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔[1] بلیدیوں کے متعلق روایت ہے کہ ابو سعید ان کا مورثِ اعلیٰ تھا اور اس نے بلند کے علاقہ سے مکران میں وارد ہو کر یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی وہ بلیدہ کی وادی میں بود و باش رکھتے تھے۔ گچکیوں کے متعلق روایت ہے کہ وہ ابتداء میں راجپوت ہندو تھے۔ مارسنگھ ان کا مورثِ اعلیٰ تھا اور وہ پنجاب سے ہجرت کر کے مکران میں وارد ہوئے اور انہوں نے وادی گچک میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بلوچوں میں مارسنگ ایک مقبول نام ہے جس کے معنی زہر مورہ کے ہیں۔

نادر شاہ نے لاڑکانہ ہی سے مکران میں محمد تقی خان کے پاس پیغام بھیج دیا کہ سندھ فتح ہو گیا اور اب سندھ میں اس کے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ محمد تقی خان نادر شاہ کے حکم کے مطابق مکران ہی سے واپس فارس چلا گیا۔[2]

نادر شاہ مارچ ۱۷۴۰ء میں لاڑکانہ سے سیوی اور ڈھاڈر پہنچا اور یہاں سے وہ درہ بولان کے راستے شال میں وارد ہوا اور اس کے بعد کوژک کے درے کو عبور کر کے اپریل ۱۷۴۰ء میں قندھار پہنچ گیا۔[3]

---

[1]:- RAVERTY. [2]:- RAVERTY.

[3]:- ABID.

لسبیلہ میں ایک عرصہ سے بلفات خاندان کی حکومت قائم چلی آتی تھی۔ اس خاندان کا آخری حکمران سردار عزت خان جو پہاڑ خان کا بیٹا تھا فوت ہوگیا۔ اس کا بیٹا صغیر سن تھا۔ سردار عزت خان کی وفات کے بعد عملی طور پر حکومت کی باگ ڈور اس کی بیوی شاہ گل کے ہاتھ آئی جو چاہ گلی کے نام سے مشہور تھی اور ایک بڑی قابل عورت تھی۔[۱]

لسبیلہ کے جاموٹ قبیلہ کا سردار جام علی خان لسبیلہ میں اپنی حکومت قائم کرنے کا خواہشمند تھا لیکن وہ خان میر محبت خان کی امداد اور اعانت کے بغیر یہ کام سرانجام نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے میر محبت خان سے امداد طلب کی اور دونوں کے درمیان معاہدہ ہوا کہ لسبیلہ فتح ہونے کے بعد اس کی خالص آمدنی خان اور جام کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کی جائے گی۔ ۱۷۴۲ء میں جام علی خان نے خان سے کمک حاصل کر کے بیلہ پر حملہ کر دیا۔ بی بی شاہ گل کا لشکر اس کے مقابلے پر آیا۔ لیکن بیلہ کے نزدیک جام علی خان کے لشکر سے شکست کھائی۔ جام علی خان نے بیلہ پر قبضہ کر کے لسبیلہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔[۲]

میر محبت کے دور کے آخری زمانہ میں کیچ کے والی ملک دینار گچکی نے پنجگور پر حملہ کر کے سردار شاہو گچکی کو پنجگور سے نکال باہر کیا اور پنجگور پر قبضہ کر لیا۔ سردار شاہو گچکی کا ایک قریبی عزیز میر اللہ داد اور اس کا بیٹا

---

[۱] ۔ تاریخ بلوچستان میر گل خان نصیر

[۲] ۔ ایضاً

میر عیسیٰ گچکی پنجگور کے نزدیک گرمکان میں سکونت رکھتے تھے انہوں نے بھی محسوس کیا کہ ملک دینار گچکی پنجگور پر قبضہ کرنے کے بعد ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا جو اس نے سردار شابو گچکی کے ساتھ کیا تھا. میر اللہ داد کی بیوی خان میر احمد ثانی کی بیٹی تھی. اس قرابت داری کی بنا پر میر عیسیٰ گچکی نے ملک دینار کے خلاف خان میر محبت خان سے امداد طلب کر لی. اور میر محبت کی مدد سے میر اللہ داد گچکی اور میر عیسیٰ نے ملک دینار کو شکست دے کر اس سے پنجگور دوبارہ چھین لیا۔[1]

نادر شاہ کے ہاتھ سے اس کے دورِ اقتدار میں ہزاروں بے گناہ انسان قتل ہوئے تھے. اس قتل و غارت کی وجہ سے وہ انسانی خون کا اس قدر پیاسا اور ظالم بن گیا تھا کہ اس نے اپنے بڑے فرزند رضا قلی کی آنکھیں نکال کر اسے اندھا کر دیا. حالانکہ رضا قلی نے نادر شاہ کے لئے قابلِ قدر خدمات سرانجام دی تھیں اس کے بڑے منصبداروں کی جان بھی اس کی دیوانگی کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے خطرہ میں تھی. اس اثناء میں وہ فتح آباد کے نزدیک جبوشان (کچن) میں تھا کہ اس کے بھتیجے علی قلی کی ایما پر اس کے قزلباش (سرخ سر) فوجی منصبدار ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق رات کے وقت اس کی خواب گاہ میں گھس گئے اور معمولی مزاحمت کے بعد اس کا سر تن سے جدا کر دیا. یہ واقعہ جون ۱۷۴۷ء میں پیش آیا.

اس موقعہ پر احمد خان نادر شاہ کی افغان فوج کا سپہ سالار تھا. اور اس

---

[1] گل خان نصیر

کا محافظ دستہ بھی ابدالیوں پر مشتمل تھا جن پر وہ بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔

احمد خان کو اپنے بادشاہ کے قتل کا رنج بھی ہوا اور افسوس بھی۔ افسوس اس وجہ سے کہ وہ نادر شاہ کی حفاظت کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے نادر شاہ کی لاش کا آخری دیدار کر کے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا اور اس کے بعد افغان فوج کو اپنے ساتھ لے کر قندھار کی طرف روانہ ہوا۔[1]

قندھار میں ابدالی سرداروں نے ایک مجلس منعقد کر کے ایک مجذوب فقیر صابر شاہ کی تجویز پر احمد خان کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ اس نے نادر شاہ کے مشرقی مقبوضات کو ملا کر افغانستان کے نام سے افغانوں کی ایک خودمختار مملکت کی بنیاد ڈالی جو بڑی دیرپا ثابت ہوئی۔ اس نے قندھار ہی کو اپنا دارالحکومت بنا لیا اور احمد شاہ درانی کے لقب سے افغانستان پر حکومت کرنے لگا۔[2]

نادر شاہ کے قتل کے وقت میر نصیر خان میر ایتاز اور ان کی والدہ قندھار میں بدستور مقیم تھیں۔ نادر شاہ کے قتل کے بعد میر نصیر خان اپنے پیروکاروں کی معیت میں جن میں میر کمال خان ایتاز زئی، سلطان زہری، مینگل علی دربان اور داروغہ مہر علی شامل تھے شیراز پہنچے۔ شیراز سے انہوں نے داروغہ مہر علی کو اپنے اہل و عیال کی دیکھ بھال کے لئے قندھار روانہ کر دیا۔ میر نصیر خان اور اس کے دوسرے پیروکار کیچ مکران سے ہو کر حب ندی کے کنارے

---

[1] ۔ G.P. TATE.

[2] ۔ ABID.

باہوٹ چھٹا کے گھر پر ٹھہرے جہاں باہوٹ نے ان کی بڑی خدمت کی۔ میر نصیر خان یہاں سے میاں نور محمد کلہوڑہ کے پاس خدا باد ان چلا گیا اور وہاں دو سال تک قیام کیا۔ اس دوران میر نصیر خان نے احمد شاہ درانی کے پاس عرضداشت بھیجنے کے علاوہ شاہ ولی خان بامیزی سے بھی خط وکتابت کی جو احمد شاہ درانی کا وزیر تھا۔ شاہ ولی خان کی دعوت پر ہی میر نصیر خان دوبارہ قندہار چلا گیا۔ شاہ ولی خان نے اسے اپنے پاس ٹھہرالیا۔ شاہ ولی خان اس پر اتنا مہربان تھا کہ اس کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ اس موقعہ پر شاہ ولی خان نے اسے اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ جس کو احمد شاہ درانی کے ہاں بڑا اثر ورسوخ حاصل تھا۔[۱]

اس اثناء میں قبائلی سردار اور دوسرے زعما میر نصیر خان کی شخصیت سے متاثر ہو گئے تھے انہوں نے قندہار میں بھی میر نصیر خان سے رابطہ پیدا کر کے اس سے خط وکتابت شروع کی تھی اور خان میر محبت خان سے رفتہ رفتہ وہ بدظن ہو گئے اور میر نصیر خان کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ خان میر محبت خان کو خوب معلوم تھا کہ اس کے خلاف احمد شاہ کے دربار میں سازش ہو رہی ہے۔ اس نے میر سلطان قائم خان شاہوانی کو ان سازشوں کا سدباب کرنے کی غرض سے قندہار روانہ کر دیا۔

قندہار میں میر سلطان قائم خان نے احمد شاہ کے دربار کا رنگ دیکھ کر محسوس کر لیا کہ حالات خان میر محبت خان کے حق میں سازگار نہیں ہیں۔

---

[۱] ۔ اخوند ملا محمد صدیق۔

اس نے اس خیال سے کہ خان کے تعلقات احمد شاہ درانی کے ساتھ مستقل طور پر استوار رہیں اس نے احمد شاہ درانی کے سامنے یہ تجویز پیش کر دی کہ وہ خان میر محبت خان کی بیٹی بی بی گوہر سے نکاح کرے۔ احمد شاہ درانی نے یہ تجویز فوراً قبول کر لی۔ جب میر سلطان قائم خان اس رشتہ کے بارے میں خان کی رائے معلوم کرنے کی غرض سے قلات آیا تو خان میر محبت خان نے یہ تجویز رد کر کے احمد شاہ کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ خان میر محبت خان کا موقف یہ تھا کہ جس طریق پر اس رشتہ کی تجویز اس کے سامنے آئی ہے اس سے اس کی بے عزتی کا پہلو نکلتا ہے۔ خان کے اس انکار سے احمد شاہ درانی بہت زیادہ برافروختہ ہوا۔ اور اپنی فوج کو لے کر حملے کے خیال سے قلات کی طرف روانہ ہوا۔ بلوچستان کی حدود میں داخل ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے اپنی توپیں کوہ تاختہ کے دامن میں کھڑی کر کے تیری کے قلعہ پر گولہ باری کی اور اس کے شمال مشرقی برج کو اڑا دیا جو ملک سعید خان کے نام سے موسوم تھا۔ اس کے بعد مستونگ پر حملہ کر کے محمد شئی قبیلہ کی بستی کو مسمار کر دیا۔ اس قتل و غارت کے دوران محمد شئی قبیلہ کے لوگوں نے سخت مزاحمت کی اور لڑائی کے دوران جو لوگ بچے ان کا گولہ بارود ختم ہو گیا اور وہ خفیہ راستوں سے بھاگ کر مستونگ شہر میں جا گھسے۔ شہر کے خواجہ خیلوں اور دوسرے معزز سرکردوں نے اس نازک موقعہ پر شہر میں ان کے گھس آنے کی جب وجہ دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ وہ گولہ بارود حاصل کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔ خواجہ خیلوں نے

فوراً ان پر واپس اپنی بستی جانے کے راستے مسدود کر دیئے کیونکہ حالات خراب تھے اور واپس جانے میں ان لوگوں کے ہلاک ہونے کا قوی امکان تھا. یہی وہ واقعہ تھا جس کے بعد محمد شئی اور دہوار ایک دوسرے کے بھائی بند بن گئے. اس کے بعد احمد شاہ درانی نے قلات کی طرف کوچ کیا، لیکن منگوچر کے علاقے میں ایک مرد بزرگ حاجی عبدالرحیم بابی کی مداخلت پر جو احمد شاہ درانی اور خان میر محبت خان دونوں کا روحانی پیشوا تھا اور جس نے ہاتھ میں قرآن شریف لے کر احمد شاہ کو قلات پر حملہ کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی اس نے قلات پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور منگوچر ہی سے جو قلات سے فقط تائیس کلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے لوٹ کر قندھار چلا گیا. میر محبت خان احمد شاہ کے اس حملے سے بڑا خوفزدہ تھا اس نے مجبور ہو کر اپنی بیٹی بی بی گوہر کو اخوند ملا محمد حیات کے ساتھ احمد شاہ کے پاس قندھار روانہ کر دیا. احمد شاہ نے غزنی میں اس کے ساتھ نکاح کر لیا. اگرچہ وقتی طور پر خان کے سر سے بلا ٹل گئی اور اس کے تعلقات احمد شاہ کے ساتھ کسی قدر بہتر ہو گئے لیکن احمد شاہ درانی کے دربار میں اس کے خلاف سازشیں بدستور جاری تھیں. آخرکار خان میر محبت خان کے خلاف اس کے مخالفین کی سازشیں بارآور ثابت ہوئیں. احمد شاہ درانی نے خان میر محبت خان کو قندھار طلب کر کے اس کو معزول کر دیا اور اس کی بجائے اس کے چھوٹے بھائی میر نصیر خان کو سرداروں کی مرضی کے مطابق بلوچستان کا حکمران تسلیم کر لیا. اس موقعہ پر احمد شاہ درانی نے خان نصیر خان کو بیش قیمت خلعت اور

گراں قدر انعام واکرام سے نوازا۔ اس نے اس کے سرداروں کو بھی انعام واکرام دے کر خان میر نصیر خان کو بڑی عزت سے رخصت کیا۔ میر نصیر خان نے ۱۱۶۴ہجری، ۵۱-۱۷۵۰ء میں قلات پہنچ کر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔[1]

---

[1] ۔ اخوند ملا محمد صدیق

تینتسواں باب

خان میر نصیر خان کبیر

میر نصیر خان کبیر کی شخصیت اپنی ملکی اصلاحات، فوجی تنظیم، اندرونی نظم ونسق، عدل وانصاف، زراعت، تجارت اور حرفت میں ترقی اور قابلِ قدر فتوحات کی وجہ سے روشنی کے ایک ایسے بلند و بالا مینار کی حیثیت رکھتی تھی کہ جس کی روشنی سے بلوچستان کی سرزمین چمک اٹھی تھی اور یہی روشنی بلوچستان کے باشندوں کے لئے رہنمائی کا ایک اہم سبب بن گئی اس کو بلوچ قبائل میں فقید المثال ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل تھی۔ وہ صوم وصلوٰة کا پابند تھا۔ علماء فضلا اور شعراء کا قدردان تھا۔ عام لوگ اس کو ولی خیال کرتے تھے۔ وہ جہاں قیام کر کے نماز ادا کرتا تھا۔ وہ جگہ مسجد نصیر خان نوری کے نام سے مشہور ہو جاتی تھی۔ اس قسم کی بے شمار اور ان گنت مسجدیں جو فقط چاروں طرف قدرتی پتھر رکھ کر بنائی جاتی تھیں۔ بلوچستان کے طول و عرض میں اکثر پہاڑی چوٹیوں پر یا ان کے دامن میں پانی کے صاف وشفاف چشموں کے نزدیک جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ یہی سیدھی سادی مسجدیں آج بھی اس کی اہم یادگار ہیں اور بلوچستان کے باشندوں نے ان مسجدوں کو تاحال

قائم رکھا ہوا ہے۔

میر نصیر خان نے اپنی حکومت کا دائرہ وسیع کرنے کی غرض سے فتوحات کا جو سلسلہ شروع کیا تھا نہ صرف اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ جو علاقے اس کے زیرِ فرمان آ گئے اس نے وہاں اپنی حکومت کو پوری طرح مستحکم کیا۔ جب اس کی حکومت کا دائرہ بلوچستان کے تمام بلوچی علاقوں تک پھیل گیا تو اس نے سارے ملک میں نظامِ حکومت کو عوام کی ضروریات کے مطابق ڈھال دیا اس کی ان اصلاحات سے اس نظامِ حکومت کی تکمیل ہو گئی جس کی بنیاد میر حسن میروانی کے دورِ حکومت میں پڑی تھی۔

میر نصیر خان جب قلات کی مسند پر جلوہ افروز ہوا تو اس زمانہ میں بلوچستان کے اکثر علاقے کسی نہ کسی رنگ میں خان کے زیرِ فرمان آ چکے تھے سراوان اور جھالاوان کے صوبے میر احمد اول کے دورِ حکومت میں فتح کئے گئے۔ کراچی کی بندرگاہ میر سمندر کے عہدِ حکومت میں بلوچستان میں شامل کر لی گئی۔ کچھی کا علاقہ جس میں خان گڑھ اور شہداد پور تک کے علاقے شامل تھے۔ میر محبت کے عہدِ اقتدار میں بلوچستان کا ایک حصہ بن گئے۔ اسی زمانہ میں لسبیلہ کے سردار نے بھی خان کی بالادستی تسلیم کر لی اور جام لسبیلہ بلوچ نظام قومداری کا ایک اہم رکن بن گیا۔ ہڑند و داجل (ڈیرہ جات) اور تل چوٹیالی (لورالائی) کی بلوچستان میں شمولیت میر عبداللہ خان کا کارنامہ تھی۔ فقط مکران ہی ایک ایسا علاقہ تھا جہاں گچکیوں کی چھوٹی چھوٹی سرداریاں قائم تھیں اور وہ آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے اور ان کے ساتھ خان کے

فقط دوستانہ تعلقات قائم تھے وہ کبھی کبھار اپنے معاملات میں خان سے مدد بھی حاصل کرتے تھے لیکن مکران پر خان کو کسی قسم کی بالادستی حاصل نہ تھی اور وہ خان کے دسترس سے باہر تھے۔ خان میر نصیر خان نے آگے چل کر مکران پر بھی اپنی بالادستی قائم کر لی۔ خاران کا نوشیروانی سردار میر احمد اول کے زمانہ سے نظام قوم داری کا ایک اہم رکن چلا آتا تھا مکران پر خان کی بالادستی قائم ہونے سے وہاں کے گچکی سردار بھی نظام قوم داری کے اہم رکن بن گئے۔

نادر شاہ کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا علی قلی جو اس کا داماد بھی تھا اس کا جانشین بنا اور اس نے قلات نادری سے نادر شاہ کے خزانے مشہد منتقل کر کے عادل شاہ کا لقب اختیار کر لیا۔ عادل شاہ کو اس کے بھائی ابراہیم نے تخت سے اتار کر اندھا کر دیا لیکن ابراہیم کو بھی اس کے فوجی مفسداروں نے تخت سے اتار کر قتل کر دیا۔ اس کے بعد ایرانی امراء نے نادر شاہ کے پوتے شاہ رخ کو ایران کے تخت پر بٹھا دیا جو نادر شاہ کے مظلوم فرزند اکبر رضا قلی کا بیٹا تھا۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مشہد میں امام رضا کے مزار کے مجاور سید محمد مرزا نے شاہ رخ کو شکست دے کر اندھا کر دیا اور سلیمان شاہ کے لقب سے ایران کے تخت پر بیٹھا۔[۱]

اس اثناء میں ہرات بدستور ایرانیوں کے قبضہ میں تھا اور احمد شاہ درانی ہرات فتح کر کے تمام افغانی علاقوں کو جہاں افغان کثیر

---

[۱] G.P. TATE

تعداد میں آباد تھے۔ آپس میں مل کر ایک مکمل افغان مملکت قائم کرنے کی بڑی خواہش رکھتا تھا۔ شاہ رخ کی جانب سے امیر خان جو ایک عرب خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ہرات کا والی تھا۔ احمد شاہ درانی ۱۷۴۹ء کے موسم بہار میں بیس ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج لے کر قندھار سے نکلا اور ہرات پر حملہ کر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ شاہ رخ نے اپنے سپہ سالار یوسف کی قیادت میں ایک فوج افغانوں کے مقابلے پر ہرات کی طرف روانہ کی لیکن یوسف ابھی راستہ ہی میں تھا کہ اسے مشہد میں سلیمان شاہ کی حرکتوں کی خبر ملی۔ اور وہ مڑ کر مشہد کی طرف بڑھا اور سلیمان شاہ کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس نے شاہ رخ کو دوبارہ ایران کے تخت پر بٹھا دیا اور خود اس کا مدارالمہام بن گیا۔ شاہ رخ کی بحالی کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ سیستان کے سپہ سالار میر عالم خان نے مشہد پر حملہ کر کے یوسف کو بھی اندھا کر دیا۔[۱]

ہرات کے محاصرے نے بہت طول کھینچا۔ امیر خان والی ہرات کو امید تھی کہ شاہ رخ اس کے لئے مشہد سے کمک بھیجے گا۔ لیکن شاہ رخ اپنی مصیبتوں میں گرفتار تھا اور وہ ہرات کو افغانوں سے نجات دلانے کے لئے کوئی فوج نہ بھیج سکا۔ آخر کار امیر خان نے طویل مزاحمت کے بعد افغانوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور ہرات پر احمد شاہ کا قبضہ ہو گیا۔[۲]

ہرات کے محاصرے کے دوران احمد شاہ درانی نے خان میر نصیر خان سے امداد طلب کی تھی اور خان میر نصیر خان بارہ ہزار افراد پر مشتمل

---

۱ - G.P.TATE

۲ - G.P.TATE

ایک لشکر کے ساتھ اس وقت ہرات پہنچا جبکہ ہرات کا قلعہ سر کر لیا گیا تھا اب احمد شاہ درانی نے مشہد اور نیشا پور فتح کرنے کا قصد کیا۔ مشہد کا مالک میر علم خان تھا۔ وہ اس موقعہ پر نیشا پور کا محاصرہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ اس نے ہرات کے سقوط کا حال سنا اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ احمد شاہ مشہد پر حملہ کرنے والا ہے وہ نیشا پور کے محاصرے کا ارادہ ترک کر کے مشہد کی طرف لوٹ آیا۔ یہاں اس نے قلعہ کے استحکامات مستحکم کر لئے اور خوراک کی وافر مقدار جمع کر لی اس کے بعد وہ ہرات پر حملہ کرنے کی نیت سے مشہد سے نکل آیا۔[۱]

احمد شاہ درانی نے سردار جہاں خان پوپلزئی کی قیادت میں پانچ ہزار آزمودہ کار افغانوں پر مشتمل ایک ہراول دستہ اس کے مقابلہ پر روانہ کیا جس کی کمک پر میر نصیر خان کو مامور کیا گیا تھا۔ یہ لوگ مشہد پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ تربت شیخ جام کے مقام پر سردار جہاں خان پوپلزئی میر علم خان کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔ لیکن میر علم نے سردار جہاں خان کے اس زوردار حملہ کو رد کرنے کے بعد افغانوں پر ایسا زوردار حملہ کیا کہ وہ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے لیکن میر نصیر خان نے اپنے تین ہزار سواروں کے ساتھ میر علم خان کے لشکر پر جھپٹ کر لڑائی کا نقشہ ہی بدل دیا میر علم خان لڑائی کے دوران میدانِ جنگ میں کام آیا اور اس کے سپاہی ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔[۲]

---

[۱] ۔ احمد شاہ درانی۔ گنڈا سنگھ۔ [۲] ۔ احمد شاہ درانی۔ گنڈا سنگھ

اس موقعہ پر احمد شاہ اپنی بقایا فوج کو لے کر اسی مقام پر پہنچا اور مشہد کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوسری اہم جگہ تون کا قلعہ تھی جس کی حفاظت پر میر علم خان کا بھائی معصوم خان مامور تھا۔ اس کے پاس فوج کم تھی لیکن اس کو امید تھی کہ اس کا بھائی اس کی مدد پر فوج بھیجے گا۔ احمد شاہ نے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ معصوم خان کچھ زیادہ عرصہ مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی ہلاکت کی خبر سن کر ہمت ہار بیٹھا اور امن کی درخواست کی احمد شاہ نے اس کو اپنے روبرو بلایا اور اس نے قلعہ کی کنجیاں احمد شاہ کے حوالے کر دیں۔[1]

احمد شاہ نے اس کے بعد مشہد کی طرف نقل و حرکت شروع کر کے اس کا محاصرہ کر لیا۔ ایرانیوں نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کر کے قلعہ کا دفاع کیا اور افغانوں کے کئی حملوں کو ناکام بنا دیا۔ احمد شاہ نے مشہد کی ناکہ بندی اور زیادہ سخت کر دی، بالآخر ایرانی شہر کا دفاع کرنے سے مایوس ہو گئے۔ شاہ رخ احمد شاہ سے ملنے کے لئے باہر نکل آیا۔ احمد شاہ اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آیا اور اپنے ماتحت اس کو اس شرط پر ایران کے تخت پر بٹھا دیا کہ وہ احمد شاہ کو ایک بڑی رقم ادا کرے گا اس کے علاوہ اس کے خاندان کے اراکین کو جن میں اس کا خورد سال بیٹا تیمور شامل تھا احمد شاہ کے حوالے کرے گا۔ شاہ رخ نے بڑی خوشی سے احمد شاہ کی سرپرستی قبول کر لی۔ احمد شاہ کے خاندان کے بعض اراکین نادر شاہ کے

---

[1] HISTORY OF AFGHANISTAN. G. P. TATE.

قتل کے وقت سے شاہ رخ کی قید میں تھے اور احمد شاہ کا مشہد پر حملہ کا ایک سبب اپنے بیٹے تیمور اور خاندان کے دوسرے اراکین کی بازیافت تھا۔[۱]

احمد شاہ نے اس کے بعد شاہ پسند خان کو فتح علی خان کے بیٹے محمد حسین خان قاچار کے مقابلے پر استرآباد بھیجا۔ اور خود نیشاپور کا محاصرہ کرنے کے خیال سے نیشاپور کی طرف روانہ ہوا۔ شاہ پسند خان نے محمد حسین خان قاچار کے ہاتھ سے بری طرح شکست کھائی۔ احمد شاہ نے نیشاپور کا محاصرہ کر لیا جہاں عباس قلی خان شاہ رخ کی جانب سے نیشاپور کا دفاع کرنے پر مامور تھا۔ سردی کا موسم قریب آرہا تھا۔ عباس قلی خان قلعہ کے استحکامات کو درست کرنے میں مصروف تھا کہ سیف الدین نے بڑی چالاکی سے احمد شاہ کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے۔ ان مذاکرات نے اتنا طول کھینچا کہ سردیوں کا موسم شروع ہو گیا۔ احمد شاہ کے پاس کوئی بڑی توپ نہ تھی۔ سخت سردی سے تنگ آکر احمد شاہ نے نیشاپور کا محاصرہ اٹھا لیا۔ اس کے بیشمار سپاہی اور باربرداری کے جانور سخت سردی کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ ایرانیوں نے بھی قلعہ پر افغانوں کے حملہ کے دوران بڑی تعداد میں احمد شاہ کے فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔ احمد شاہ دوبارہ ہرات کی طرف لوٹ آیا اور یہاں سے ۱۷۵۰ء کے اوائل میں قندھار کی طرف مراجعت کی۔[۲]

ہ۱ ہ۲:- HISTORY OF AFGHANISTA. G.P. TATE

احمد شاہ اپنی گذشتہ سال کی شکست کے داغ کو مٹانے کی غرض سے ۱۷۵۱ء کے اوائل میں دوبارہ نیشاپور کی طرف روانہ ہوا۔ اس کو معلوم تھا کہ پچھلے سال توپوں کے فقدان کی وجہ سے نیشاپور فتح نہ ہو سکا تھا اب کی بار اس نے مطلوبہ دھات کا انتظام کر لیا تھا۔ نیشاپور کے محاصرہ کے دوران ہی اس کے کاریگروں نے ایک بڑی توپ ڈھال لی۔ قلعہ میں اب کی بار خوراک کی بھی قلت تھی۔ جب یہ تیار ہو گئی تو اس میں گولہ بارود ڈال کر یہ توپ چلا دی گئی۔ پہلے گولے نے جو آخری گولہ ثابت ہوا تھا۔ کئی مکانوں کو چیرتے ہوئے انہیں خاک کا ڈھیر بنا کر شہر میں ایسی دہشت طاری کر دی کہ محصورین ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ توپ پھٹ کر دوبارہ استعمال کے قابل نہ تھی۔ نیشاپور کا بہادر والی ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن افغانوں نے اس کے سپاہیوں کو حملوں کے دوران ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔[ل]

اس موقعہ پر احمد شاہ نے ایک فوجی مہم اپنے دو نہایت معتمد اور قابل سپہ سالاروں سردار جہان خان پوپلزئی اور میر نصیر خان والی بلوچستان کی قیادت میں تون اور تبس فتح کرنے کے لئے جنوب مغرب کی طرف روانہ کر دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے قرب و جوار کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے لوگوں میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے تبس کے والی علی مراد خان کے خلاف فوجی نقل و حرکت شروع کر دی۔

ل:- HISTORY OF AFGHANISTAN. G. P. TATE

تبس کا والی علی مراد خان بھی اپنی فوج لے کر ان کے مقابلے پر آیا۔ دونوں فریقوں کے درمیان کاخک کے مقام پر جو تون کے شمال مشرق میں فردوس کے نام سے اب بھی موجود ہے ایک زبردست مقابلہ ہوا اور ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ جس کی مثال ایران کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس لڑائی نے اس قدر طول کھینچا کہ اس خونریز جنگ میں دونوں طرف کی فوجوں کا بارود ہی ختم ہو گیا اور نوبت دست بدست لڑائی تک آگئی۔ دونوں فریقین کا پلہ بھاری تھا اور بڑی سخت لڑائی ہو رہی تھی کہ اچانک تبس کا والی علی مراد خان لڑائی کے دوران ہلاک ہو گیا۔ اس سے لڑائی کا فیصلہ افغانوں اور بلوچوں کے حق میں ہو گیا۔ ایرانی فوج کے سپاہیوں نے راہِ فرار اختیار کی اور تون و تبس پر افغانوں اور بلوچوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس کامیابی کا سہرا ایک بڑی حد تک خان میر نصیر خان اور اس کے بلوچ لشکر کے سر تھا جو بڑی بہادری سے لڑا اور خصوصاً خان نصیر خان نے اس موقعہ پر بہادری کے بڑے جوہر دکھائے حقیقت یہ ہے کہ بلوچ تلوار کے دھنی تھے اور انہیں ایرانیوں اور افغانوں کی بہ نسبت تلوار سے لڑنے کا زیادہ تجربہ تھا۔ خان میر نصیر خان کے لشکر میں سے میر جنگی خان اور میر علم خان جو مستونگ کے دہوار قبیلہ کے سازگمزئی طائفہ سے تعلق رکھتے تھے۔ میدان جنگ میں کام آئے اور خان میر نصیر خان نے احمد شاہ درانی کی خواہش پر ان کے پسماندگان کو

ؔ۔ احمد شاہ درانی۔ گنڈا سنگھ۔

ان کے نان ونفقہ کے لئے کچھی کے علاقہ احمد پور (بالاناڑی) میں جاگیر عطا کر دی جو ابھی تک ان کے ورثا کے قبضہ میں ہے۔ اس خونریز لڑائی کے بعد بلوچوں اور افغانوں نے آس پاس کے علاقہ کو خوب لوٹا اور بڑی مقدار میں مالِ غنیمت ان کے ہاتھ آیا۔

اپریل ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ درانی نے پنجاب پر حملہ کر کے لاہور پر چڑھائی کی اور پنجاب کے ہندوستانی صوبیدار معین الملک کو لاہور کے قرب وجوار میں شکست دی۔ معین الملک کا دست راست راجہ کوڑا مل اس لڑائی میں مارا گیا۔ احمد شاہ نے معین الملک کو گرفتار کر کے قید کر دیا لیکن بعد میں اسے رہا کر دیا۔ اسی موقعہ پر اورنگ آباد، پرساد ور، سیالکوٹ اور گجرات افغانستان کی مملکت میں شامل کر لئے گئے جو چار محال کہلاتے تھے۔[1]

اسی اثناء میں احمد شاہ درانی سندھ اور بلوچستان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے لگا۔ خصوصاً بلوچستان کے متعلق اس کا رویہ یہ تھا کہ اس کے خیال کے مطابق خان کی تابع حیثیت اسے نادر شاہ سے ورثہ میں ملی تھی۔ اسی بنا پر وہ اپنے آئے دن کی مہمات کے لئے بھاری رقومات اور کثیر تعداد میں لشکر فراہم کرنے کے مطالبات میں اضافہ کر رہا تھا لیکن بلوچستان کے متعلق نادر شاہ کی حکمت عملی فقط خان کی طرفداری حاصل کرنے تک محدود تھی اس نے اپنے دورِ اقتدار میں کبھی بھی خان سے زر اور لشکر کی فراہمی

۱۔ G.P. TATE.

کا مطالبہ نہیں کیا تھا اور نہ اس نے کبھی بلوچستان کے معاملات میں مداخلت کی تھی۔ احمد شاہ درانی کے اس رویے سے خان میر نصیر خان غیر مطمئن رہا کرتا تھا۔[1]

۱۷۵۷ء کے اوائل میں احمد شاہ درانی نے دلی پر حملہ کیا اور کسی بڑی مزاحمت کے بغیر دلی پر قابض ہو گیا۔ اس نے محمد شاہ کو دلی کے تخت پر رہنے دیا اور دلی سے واپسی کے دوران اس نے اپنے بیٹے شہزادہ تیمور کو پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا اور سردار جہان خان پوپلزئی شہزادے کا معاون بنا لیکن شہزادہ تیمور اور سردار جہان خان کو سکھوں کے ہاتھ سے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سکھوں نے پنجاب کے اکثر افغان منصبداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مارچ ۱۷۵۸ء میں شہزادہ تیمور اور سردار جہان خان لاہور خالی کر کے پشاور کی طرف منتقل ہو گئے مرہٹوں نے ان کا پیچھا کر کے دریائے سندھ کے کنارے تک کے علاقہ کو بری طرح روند ڈالا۔[2]

۱۷۵۸ء کے اواخر میں میر اللہ داد گچکی کے بیٹے میر گاجیان گچکی نے عیسائی کے قلعہ پر حملہ کر کے اپنے بھائی میر عیسیٰ گچکی کو جو اپنے باپ کی وفات کے بعد پنجگور کا سردار بنا تھا قتل کر دیا۔ میر عیسیٰ گچکی کا بیٹا شے کرم پنجگور سے بھاگ کر قلات پہنچا اور میر نصیر خان سے اپنے چچا میر گاجیان کے خلاف امداد طلب کی۔[3]

۱۔ میر گل خان نصیر۔ ۲۔ G. P. TATE۔ ۳۔ ایضاً

سندھ کے حکمران میاں نور محمد کلہوڑہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا
میاں محمد مراد یاب خان اس کا جانشین بنا۔ اس نے کل پونے چار سال
حکومت کی۔ اس نے تشدد پسند طبیعت پائی تھی۔ اس کے امراء نے تنگ
آکر اسے گرفتار کر کے سندھ کی حکومت سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ
اس کے بھائی غلام شاہ کو سندھ کا حکمران بنا دیا۔ اسی دوران غلام شاہ
کے بھائی عطر خان نے جو قندھار میں احمد شاہ کے دربار میں موجود رہتا
تھا۔ احمد شاہ سے سندھ کی حکومت کا شاہی پروانہ اپنے نام حاصل کر لیا
وہ حاجی عطائی خان کے زیر قیادت ایک فوج کے ساتھ شکارپور پہنچا
حاجی عطائی خان اس کو باقاعدہ سندھ کی مسند پر بٹھا کر واپس قندہار چلا
گیا۔ میاں غلام شاہ سندھ چھوڑ کر راجپوتانہ میں جیسلمر کی طرف بھاگ
نکلا۔ اس کے بعد اس نے امیر مبارک خان ثانی عباسی سے جو بہاولپور
کا حکمران تھا رابطہ پیدا کر کے اس سے امداد طلب کی۔ بہاولپور کے حکمران
نے میاں غلام شاہ کی امداد پر اپنے بھائی محمد فتح خان کی قیادت میں ایک
فوج سندھ کی طرف روانہ کر دی۔ عطر خان اور اس کے بھائی احمد یار خان
داؤد پوتروں کی فوج کے مقابلے پر اپنی فوج لے کر نکلے۔ روہڑی کے
مقام پر کلہوڑہ فوج اور داؤد پوترہ فوج کے درمیان لڑائی ہوئی۔ میاں عطر
خان اور احمد یار خان نے شکست کھائی اور دونوں بھائی گنجابہ کے راستے قلات
کی طرف بھاگ نکلے جہاں سے وہ قندھار جانے کا ارادہ رکھتے تھے
قلات پہنچنے پر خان میر نصیر خان نے دونوں بھائیوں کو گرفتار کر کے

قید کر دیا۔ احمد شاہ کے دربار میں کلہوڑوں کے نمائندہ گدھومل نے احمد شاہ سے شکایت کی اور کہا کہ میر نصیر خان کی یہ حرکت شاہی اختیارات میں مداخلت کے مترادف ہے۔[۵] یہ واقعہ خان سے احمد شاہ کی ناراضگی کا سبب بن گیا

۱۷۵۸ء کے اوائل میں خان میر نصیر خان کو اطلاع ملی کہ مکران کے گچکی سرداروں کے درمیان خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور اس خانہ جنگی کی وجہ سے مکران کا نظم و نسق درہم برہم ہو گیا ہے۔ مکران کے گچکی سردار ذکری مذہب کے پیروکار تھے۔ اسی لاقانونیت کو روکنے کی خاطر خان میر نصیر خان کو مکران کے معاملات میں مداخلت کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ مکران پر حملہ کر کے شے کرم گچکی کی امداد کرنا چاہتا تھا۔ غالباً وہ مکران کے باشندوں میں جو ذکری مذہب کے پیروکار تھے دینی تبلیغ کا خواہشمند بھی تھا۔

خان نے اپنے لشکر کے ساتھ سب سے پہلے پنجگور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اور کچھ عرصہ کے لئے سردار میر بوہر خان موسیانی کو پنجگور کا حاکم بنا دیا۔ اس کے بعد اس نے میر شے کرم گچکی کو پنجگور کی سرداری پر بحال کر کے خود کیچ کی طرف چڑھائی کی اور راستہ میں ناصر آباد کے باشندوں سے مالگذاری اور مالیہ کا مطالبہ کیا۔ لیکن انہوں نے مالیہ ادا کرنے سے انکار کر دیا اور لڑائی پر آمادہ ہو گئے۔ جس کے لئے انہوں نے

---

[۵]:۔ تحفۃ الکرام۔

خوب تیاری کی ہوئی تھی. خان کے لشکر نے ناصر آباد پر حملہ کر دیا۔ ناصر آباد کے نزدیک خان کے لشکر اور ناصر آباد کے باشندوں کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی. اس لڑائی میں اگرچہ ناصر آباد کے باشندوں نے خان کے لشکر کے ہاتھ سے شکست کھائی لیکن خان کے لشکر سے کوئی سات سو آدمی میدانِ جنگ میں کام آئے. جن میں سردار پردل خان ذگر مینگل بھی شامل تھا. اس شکست کے بعد ملک دینار گچکی سردار کیچ کا بیٹا میر شاہ بیگ گچکی قندہار کی طرف بھاگ نکلا اور احمد شاہ کے دربار میں خان کے خلاف شکایت کی. احمد شاہ درانی نے اپنا ایک قاصد مکران میں خان کے پاس بھیج کر اسے فوری طور پر قندہار پہنچنے کی ہدایت کر دی. خان میر نصیر خان مکران میں اپنی فوجی کارروائیاں ترک کر کے احمد شاہ کی خواہش کے مطابق قندہار جانے کے ارادے سے قلات پہنچا۔[۱]

اسی اثناء میں اسککو (دشت کان کوہ) کے شاہوانی قبیلہ کے لوگوں نے جو حاصل خان زئی طائفہ سے تعلق رکھتے تھے خان کے خلاف بغاوت کی. خان نے اسککو پر چڑھائی کی اور شاہوانیوں کو بڑی سخت زک پہنچائی اس موقعہ پر میر سلطان قائم خان شاہوانی کا بھتیجا بہادر خان چپکے سے قندھار کی طرف بھاگ نکلا اور احمد شاہ درانی کے دربار میں جاکر خان کی زیادتیوں کے خلاف سخت شکایت کی۔[۲]

---

[۱] :۔ اخوند ملا محمد صدیق

[۲] :۔ ایضاً

خان میر نصیر خان قندہار جانے کے ارادے سے نکران چھوڑ کر قلات چلا آیا تھا۔ لیکن قلات میں اس کے ارادے بدل گئے۔ اس نے قندہار جانے سے انکار کر دیا۔ اس موقعہ پر احمد شاہ درانی کچھ مشکلات سے دوچار تھا۔ اس کی فوج نے ہندوستان میں شکست کھائی تھی اور اس کے بیٹے شہزادہ تیمور کو پنجاب سے نکال باہر کر دیا گیا تھا۔ اس کا قابل سپہ سالار سردار جہان خان پوپلزئی اپنے آپ کو بے یار و مددگار پاکر پنجاب سے پشاور کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ اس کے دو بڑے منصبدار عبدالصمد خان اور جانباز خان مرہٹوں اور سکھوں کے ہاتھ گرفتار ہو چکے تھے۔ جنہوں نے اس کے ہندوستانی مقبوضات پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب اسے خان میر نصیر خان کی حکم عدولی کا معاملہ درپیش تھا۔[1]

خان کو احمد شاہ درانی سے کئی شکایات تھیں۔ پہلی شکایت یہ تھی اس نے غیر ذمہ دار لوگوں کی معمولی شکایت پر خان سے باز پرس کرنے کو اپنا وطیرہ بنایا تھا جو بلوچستان کے اندرونی معاملات میں بیجا مداخلت کے مترادف تھا۔ دوسری شکایت یہ تھی کہ احمد شاہ بلوچستان پر اپنی گرفت مضبوط کر کے اپنی آئے دن کی اندرونی اور بیرونی مہمات کے لیئے خان سے بھاری رقومات اور کثیر تعداد میں لشکر فراہم کرنے کے مطالبات کیا کرتا تھا۔[2] آخر کار سرداروں کے اصرار پر وہ قندہار جانے کے لیئے تیار ہو گیا

---

[1] :۔ G.P TATE.

[2] :۔ ABID.

لیکن فشنگ پہنچنے پر اس کی نیت دوبارہ بدل گئی۔ اس نے احمد شاہ کے قاصد کو رخصت کر دیا اور خود قلات کی طرف روانہ ہوگیا۔ مستونگ پہنچنے پر اس نے خواجہ خیلوں میں سے کئی لوگوں کو گرفتار کر کے بعض کو قتل اور بعض کو قید کر دیا۔ اگرچہ اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی۔ لیکن گمان ہے کہ وہ ان کو احمد شاہ کا طرفدار خیال کرتا تھا۔ میر محبت کے عہد حکومت میں جب احمد شاہ ابدالی قلات پر حملہ کے خیال سے مستونگ پہنچا تو خواجہ خیلوں نے اس کی حمایت کی تھی۔ [۱]

احمد شاہ اس موقعہ پر ہندوستان کی طرف ایک فوجی مہم روانہ کرنے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اب اپنی تیاریوں کو ملتوی کر کے اپنی توجہ خان کی طرف مبذول کی۔ اس نے خان کے ساتھ مصالحت آمیز رویہ اختیار کر کے اسے اپنا طرفدار بنانے کی کوشش کی کیونکہ وہ اسے اپنا گہرا دوست اور ایک مذہبی اتحادی خیال کرتا تھا۔ خان نے اس کی تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے برعکس اس نے اپنے لشکر کی ایک فہرست اس کے پاس روانہ کر دی جس میں دو لاکھ پچاس ہزار افراد کے نام درج تھے جن کو وہ اپنے ساتھ لے کر احمد شاہ کے خلاف میدان جنگ میں اتر سکتا تھا۔ [۲] جب مفاہمت اور مصالحت کی کوئی امید باقی نہ رہی تو احمد شاہ نے اپنے وزیر شاہ ولی خان کی قیادت میں خان نصیر خان کے

---

[۱] خوانین قلات۔ غلام کبریا خان ترکانی۔

[۲] گنڈا سنگھ۔

خلاف ایک فوج روانہ کی۔ خان نصیر خان مستونگ سے جب قلات پہنچا تو اس نے اہالیانِ قلات کے خلاف بھی کارروائی کر کے ان کو سزا دی اور شہر قلات کو تاراج کر دیا۔[1]

احمد شاہ درانی کا حملہ متوقع تھا۔ اسی لئے خان اس حملہ کو روکنے کے لیے خوب تیاری کر کے مستونگ میں شاہی فوج کا انتظار کرنے لگا۔ وہ شاہی فوج کی آمد سے گھبرانے کی بجائے اس کے مقابلے کے لئے مستونگ سے باہر نکل آیا۔ بلوچ لشکر اور افغان فوج کے درمیان پڑنگ آباد کے نزدیک ایک زبردست معرکہ ہوا۔ افغانوں نے بلوچوں کے ہاتھ سے شکست کھائی اور شاہ ولی خان لڑائی کے مقام سے پنتالیس کلومیٹر کے لگ بھگ پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔

شاہ ولی خان نے فوری طور پر تیز رفتار گھوڑ سوار قندھار روانہ کر کے احمد شاہ کو بلوچوں اور افغانوں کے درمیان لڑائی کے نتیجہ سے آگاہ کیا اور مزید کمک روانہ کرنے کی استدعا کی۔ اگرچہ اس شکست کی کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی مگر جس رنگ میں اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا تھا اس سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں اس کا اثر دوسرے بلوچ قبیلوں پر نہ پڑے۔ احمد شاہ فوری طور پر اپنی بقایا فوج کو لے کر اپنے وزیر کی امداد پر پہنچ گیا اس کی موجودگی سے صورتِ حال کچھ بدل گئی۔[2]

---

[1] غلام کبریا خان ترکانی۔

[2] گنڈا سنگھ

احمد شاہ کی آمد کے بعد بلوچوں اور افغانوں کے درمیان مستونگ سے فقط پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر اس کے جنوب میں دوسری لڑائی ہوئی جس میں بلوچوں نے شکست کھائی اور میر نصیر خان اپنے لشکر کے ساتھ تیزی سے قلات کی طرف پسپا ہو گیا جو نسبتاً ایک محفوظ اور مستحکم قلعہ تھا۔ خان میر نصیر خان نے پہلے ہی سے اس قلعہ کے استحکامات مستحکم کر لئے تھے جہاں سے وہ افغان حملہ آوروں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکتا تھا۔ میر نصیر خان اپنے بلوچ لشکر کو لے کر قلات کے قلعہ میں داخل ہو گیا اور احمد شاہ درانی کی فوج نے ان کا پیچھا کرتے ہوئے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔[1]

کرنل ملیسن کا بیان ہے کہ کوہ نوردوں اور گھوڑ سواروں پر مشتمل فوج کے لئے کھلے میدان میں کارنامے سرانجام دینا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے لیکن افغان سپاہی کے لئے قلعوں کا محاصرہ کر کے انہیں سر کر لینا ہمیشہ ایک دشوار مسئلہ رہا ہے۔ اس موقعہ پر بھی کچھ یہی معاملہ درپیش آیا۔ افغانوں نے گولے برسا کر قلعہ کی دیواروں میں شگاف ڈالنے کے بعد متواتر اور پے در پے چار حملے کئے لیکن ان کو کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ برخوردار خان نے شاہ مردان کے ٹیلے سے ایک موقعہ پر قلعہ پر زبردست حملہ کیا۔ جس کے نتیجے میں خان کے لشکر سے دو اہم افراد قاسم خان اور امیر خان محمد حسنی ہلاک ہو گئے۔ قلات کے قلعہ پر یہ پانچواں حملہ تھا اور یہ حملہ بھی ناکام ہو گیا۔ قلعہ کے استحکامات اور

---

[1] ۔ احمد شاہ درانی۔ گنڈا سنگھ۔

محصورین پر اس کا کچھ بھی اثر نہ پڑا۔ ان ناکامیوں کے لئے عموماً یہ جواز پیش کیا جاتا ہے کہ افغان سردار کلیتاً قلات کے قلعہ کو سر کرنے کے حق میں نہ تھے۔ بلوچستان غیر مطمئن افغانوں کے لئے دائمی طور پر مصیبتوں کے وقت ایک محفوظ جائے پناہ کا کام دیتا رہا تھا۔ احمد شاہ کے وزیر شاہ ولی خان کا جھکاؤ نصیر خان کی طرف تھا۔ برخوردار خان کے بغیر جو شاہ ولی خان کا مخالف تھا۔ باقی تمام افغان سردار خان نصیر خان کے طرفدار تھے۔ شاہ ولی خان کا رابطہ اس دوران خان سے برابر قائم تھا۔ اور وہ اسے اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کی ترغیب دیا کرتا تھا اور قلات کے محاصرے کی طوالت سے احمد شاہ کو بڑی تشویش تھی۔ عموماً روایت مشہور ہے کہ احمد شاہ دو وجوہات کی بنا پر قلات کا محاصرہ مختصر کرنے پر آمادہ ہوا۔ محاصرہ کے دوران ایک دن احمد شاہ درانی مغرب کی نماز ادا کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ قلعہ کے اندر سے اذان کی گرجدار آواز آئی اور معاً احمد شاہ کو خیال آیا کہ محاصرین اور محصورین دونوں اسلام کے پیروکار اور مسلمان ہیں۔ ان کا ناحق خون بہانا جائز نہیں۔ انہی ایام میں ایک دن احمد شاہ درانی مصلہ بچھا کر نماز ادا کر رہا تھا کہ خان میر نصیر خان نے خوب شست باندھ کر قلعہ کی دیوار سے توپ کا ایک گولہ داغ دیا اور گولہ احمد شاہ کے خیمے کے آگے اس جگہ پر پہنچا جہاں اس نے مصلہ بچھا کر نماز کے لئے دوران ابھی ابھی سجدے سے سر اٹھایا تھا۔ احمد شاہ اس سے بڑا متاثر ہوا اس نے تیراندازی میں خان کی مہارت کی بڑی تعریف کی اور مصالحت کے لئے

فوراً تیار ہو گیا ؎

قلات کے قلعہ کے محاصرے کو چالیس دن گذر چکے تھے لیکن اس کے سر کر لینے کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ احمد شاہ اس صورت حال سے بڑا تنگ آ گیا تھا۔ دوسری طرف خان نصیر خان بھی اس صورتِ حال سے خوش نہیں تھا۔ اس مرحلہ پر شاہ ولی خان نے خان کے پاس ایک رقعہ لکھ کر بھیجا کہ اگر آپ شاہ کے سلام کو آئیں گے تو میں اس کے وزیر کی حیثیت سے آپ کی سلامتی کا ذمہ دار ہوں لیکن اگر آپ بدستور اپنی ضد پر اڑے رہیں گے تو میرے لئے بحیثیت وزیر شاہ کو باز رکھنا بہت مشکل ہو گا کہ وہ ظل اللہ ہے۔" خان نصیر خان اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر مذاکرات کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے اپنے وزیر اخوند ملا محمد حیات کو اپنا ایلچی بنا کر شاہ ولی خان کے پاس بھیج دیا۔ شاہ ولی خان نے اخوند کو احمد شاہ کے حضور میں باریابی دلوا دی۔ شاہ نے اخوند سے دریافت کیا کہ خان کس وجہ سے میرے سلام پر نہیں آ رہا ہے۔ اخوند نے شاہ کے حضور میں عرض کیا کہ خان اپنی سلامتی اور آبرومندانہ پزیرائی کا خواستگار ہے۔ شاہ نے دریافت کیا کہ کس طریقہ پر خان کو اس کی سلامتی کی یقین دہانی کی جا سکتی ہے۔ اور وہ کس قسم کے آبرومندانہ سلوک کی توقع رکھتا ہے؟ اخوند نے عرض کیا کہ وہ اپنی سابقہ خطاؤں سے درگذر چاہتا ہے۔ شاہ نے فوراً منظور کر لیا۔ اخوند نے مزید گزارش کی کہ قرآن مجید پر سلامتی کی یقین دہانی اور ایسا

؎ احمد شاہ درانی۔ گنڈا سنگھ

باعزت سلوک کرے شاہ ولی خان اس کو جناب والا کے حضور میں عزت کے ساتھ لے آدے۔ شاہ نے اخوند کی یہ تجاویز قبول کرلیں۔ اس نے قرآن پہ لکھ کر اسے مہر کردیا اور شاہ ولی خان یہ قرآن لے کر خان کے پاس گیا اور اس کو شاہ کے حضور میں لے آیا۔ شاہ نے اسے اس کے رتبے کے مطابق ایک دوست کی حیثیت میں بڑی عزت دی۔ اس ملاقات کے دوران خان کے خلاف ان شکایات کا ذکر چھڑ گیا۔ جو بعض لوگوں نے احمد شاہ سے کی تھیں جن میں آدم خان واجوانی، سلطان قائم خان کا بھتیجا بہادر خان اور شاہ بیگ خان کچکی قابلِ ذکر تھے۔ خان نے شاہ سے کہا کہ اس قسم کے غیر ذمہ دار اور فتنہ پرداز افراد کی شکایات پر اگر حضور باز پرس کرتے ہیں تو میں قلات چھوڑ کر قندھار میں حضور کے زیر سایہ زندگی بسر کروں گا اور حضور بلوچستان کی حکومت کسی دوسرے موزوں شخص کے حوالہ کردیں اگر اس قسم کے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی تو ان کی بیجا شکایتوں کا لامتناہی سلسلہ بھی ختم نہ ہوگا [illegible] لئے بلوچستان میں نظم و نسق قائم کرکے انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا دشوار ہوجائے گا۔ احمد شاہ درانی بلوچستان کو نہ اپنی مملکت میں شامل کرنے کا خواہاں تھا اور نہ کسی دوسرے شخص کو بلوچستان کی حکومت سپرد کرنے کے لئے تیار تھا۔ شاہ خان کی راست گوئی سے بڑا متاثر ہوا اور کہا کہ خدا نے قلات تجھ کو بخش دیا ہے۔[1] اس کے بعد احمد شاہ درانی اور خان میر نصیر خان کے درمیان حسب ذیل معاہدہ

---

[1] احمد شاہ درانی۔ گنڈا سنگھ۔

طے ہوا۔

۱ :۔ خان میر نصیر خان احمد شاہ درانی کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہوئے وعدہ کرتا ہے کہ جب کبھی اس کو اپنے بیرونی دشمنوں کے خلاف فوج کشی کی ضرورت پڑے گی تو خان حسبِ ضرورت لشکر مہیا کرنے کا پابند ہوگا۔

۲ :۔ احمد شاہ درانی آئندہ کے لئے خان کو اس کے لشکر کے سفر کے اخراجات اسلحہ و بارود وغیرہ کے لئے ایک لاکھ روپے سالانہ شاہی خزانہ سے فراہم کرے گا۔

۳ :۔ احمد شاہ درانی آئندہ کے لئے خان سے کسی قسم کے خراج کا مطالبہ نہیں کرے گا۔

۴ :۔ احمد شاہ درانی اپنی اندرونی مہمات کے سلسلے میں خان سے کسی قسم کے لشکر کا مطالبہ نہیں کرے گا۔

۵ :۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے مخالفین کو ایک دوسرے کے ممالک میں پناہ دے کر ان کی امداد نہیں کریں گے۔ الّا سوائے اس صورت کے کہ پناہ گزیدہ محض پناہ گیر کی حیثیت سے زندگی گذار کر کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں اپنے آپ کو ملوث نہ کرے۔

۶ :۔ خان افغانستان سے آنے والے تجارتی کاروانوں کی حفاظت کا ذمہ دار ہوگا۔ اور نقصان کی صورت میں ہرجانہ ادا کرنے کا پابند ہوگا

۷ :۔ احمد شاہ آئندہ کے لئے خان کے کسی علاقے کو اپنی تحویل میں

نہیں رکھے گا۔[1]

اس معاہدے سے ان لوگوں کی ریشہ دوانیوں کا خاتمہ ہوگیا جو وقت بے وقت اور جابے جا احمد شاہ کے دربار میں جاکر خان کے خلاف شکائتیں کیا کرتے تھے اس معاہدے سے بلوچستان پر شاہ کی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔[2]

اس اثناء میں ہندوستان میں حالات روز بروز خراب ہو رہے تھے اور وہاں افراتفری پھیل گئی تھی۔ مغل بادشاہوں نے اپنی حکمرانی کی صلاحیت کھودی تھی۔ وہ اپنے امراء کے ہاتھ کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ پہلے نادر شاہ نے اس کے بعد احمد شاہ درانی نے دلّی پر حملہ کر کے مغل بادشاہوں کے وقار کو سخت مجروح کر دیا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ شہنشاہ کے وزیر غازی الدین عماد الدولہ اور اس کے وکیل نجیب الدولہ روہیلہ ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار تھے۔[3]

اس زمانے میں ہندوستان میں مرہٹے ہی سب سے زیادہ طاقتور تھے انہوں نے دکن میں مہاراشٹر سے شمال کا رخ کر کے دلّی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ پنجاب پر حملہ کرنے کے بعد سرہند اور لاہور پر بھی قابض ہو گئے۔ پنجاب میں سکھ بھی ایک منظم طاقت بن کر ابھر آئے تھے شہنشاہ ہند کے وزیر عماد الدولہ نے پہلے بھی مرہٹوں اور ہندو جاٹوں اور سکھوں

---

1 :- میر گل خان نصیر۔ 2 :- میر گل خان نصیر

3 :- HISTORY OF AFGHANISTAN. G. P. TATE

سے مدد حاصل کر کے افغانوں کو پنجاب سے نکال باہر کروا دیا تھا۔ اب
بھی وہ افغانوں کے خلاف مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں سے امداد حاصل
کر کے انہیں روکنے کے حق میں تھا۔ اس کے برعکس شہنشاہِ ہند عالم گیر
ثانی خفیہ طور پر اور اس کا وکیل نجیب الدولہ برملا احمد شاہ درانی سے رابطہ
پیدا کر کے اسے ہندی مسلمانوں اور اسلام کو ہندو کافروں سے نجات
دلانے کی خاطر ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔[۱]
مرہٹوں کا رجحان زیادہ تر لوٹ مار کی طرف تھا۔ وہ مفتوحہ علاقوں
کا نظام خوش اسلوبی سے چلانے کا تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ جس علاقے
میں سے ان کا گزر ہوتا وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو بلا امتیاز اپنی لوٹ مار
کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔ ان کے رویّہ سے ہندو اور مسلمان دونوں بڑے
تنگ تھے۔ سکھوں کا فرقہ مذہبی نوعیت کا تھا۔ شہنشاہِ ہند کی سخت گیری
اور مسلمانوں کے ہاتھوں اپنے گرو کی ہلاکت کی وجہ سے وہ مسلمانوں
کے خلاف بڑا سخت تعصب رکھتے تھے۔ ان حالات میں وہ افغانوں
کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی پوری طرح صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔
یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مغل شہنشاہوں کے زوال کے بعد جب
ہندوستان میں ایک سیاسی خلا پیدا ہو گیا تو اس خلا کو پُر کرنے کے
لئے ہندوستان میں کوئی طاقت موجود نہیں تھی۔ اس کو انگریزوں نے
ہی پُر کیا۔ جو محض تجارت کی غرض سے یہاں آئے تھے۔[۲]

۱: HISTORY OF AFGHANISTAN. G.P. TATE ۲: G.P. TATE.

۱۷۵۸ء میں سردار جہاں خان پوپلزئی نے پشاور سے دوبارہ پنجاب میں داخل ہوکر نظم و ضبط قائم کیا، لیکن ہندوستان میں لاقانونیت کا دور دورہ تھا اور مرہٹوں نے ہر طرف حملہ کرکے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا تھا۔ ۱۷۵۹ء کے آواخر میں احمد شاہ درانی درہ بولان کے راستے پنجاب میں داخل ہوا۔ اس نے خان میر نصیر خان سے ہندوستان کی طرف اس فوجی مہم کے لیے لشکر طلب کر لیا۔ خان بلوچستان سے بیس ہزار افراد پر مشتمل ایک بڑا لشکر جمع کر کے پنجاب میں جاکر اس کے ساتھ شامل ہوگیا۔[۵]

اس موقعہ پر جب شہنشاہ ہند کے وزیر عماد الدولہ کو احمد شاہ درانی کی پنجاب میں آمد کی خبر ملی تو وہ اس صدمہ کی وجہ سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا اور اس نے عالمگیر ثانی کو اس شک کی بنا پر قتل کروا دیا کہ احمد شاہ کے حملہ میں اس کا ہاتھ بھی ہے۔ اس نے عالمگیر کی بجائے اسی خاندان کے ایک رکن محی الملت کو دلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس کام کو سرانجام دینے کے لیے اس نے مرہٹوں کی اعانت حاصل کر لی تھی۔[۶]

احمد شاہ لاہور سے دلی کی طرف کوچ کرتے ہوئے دریائے جمنا اور گنگا کے دوآبہ میں داخل ہوگیا جو روہیلوں کے زیر اثر تھا۔ ۹ جنوری ۱۷۶۰ء کو اس علاقے میں داخل ہوتے وقت مرہٹوں کے ساتھ اس کی ایک جھڑپ ہوئی۔ یہاں فرخ آباد کا نواب احمد خان بنگش اس کے ساتھ آکر شامل ہوگیا۔ یہاں سے اس نے اپنے ہراول دستے کو آگے بڑھنے

۵۔ G.P.TATE

۶۔ G.P.TATE

کا حکم دیا۔ اس نے سرہند کے علاقے میں مرہٹوں کو جالیا۔ مرہٹوں نے دلّی سے تھوڑے فاصلے پر لڑائی کی غرض سے اپنی فوج اکٹھی کر لی تھی۔ اس اثنا میں احمد شاہ بھی اپنی بقایا فوج کو لے کر اسی مقام پر اپنے ہراول دستے کے ساتھ جا ملا۔ اسی مقام پر فروری سنہ ۱۷۶۰ء میں افغانوں اور مرہٹوں کے درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی۔ مرہٹوں نے شکست کھائی اور میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔ مرہٹوں کا سردار دتاجی سندھیا اسی لڑائی میں ہلاک ہوگیا۔ افغانوں نے فرار ہونے والی مرہٹہ فوج کا پیچھا کیا۔ اسی اثنا میں ہلکر نے ایک بڑی فوج کے ساتھ احمد شاہ کے سامانِ رسد کو لوٹنے کی خاطر نقل و حرکت شروع کر دی۔ سامانِ رسد کا بیشتر حصہ بچ گیا۔ شاہ نے پندرہ ہزار گھوڑ سوار ہلکر کے خلاف روانہ کر دیئے۔ انہوں نے دوسرے ہی دن دلّی سے آگے سکندرہ میں جاکر اسے جا لیا۔ ہلکر اپنی فوج کو چھوڑ کر تین سو سواروں کے ساتھ بھاگ نکلا۔ شاہ نے برسات کا موسم الوپ شہر میں گذارا۔ یہاں اودھ کا نواب شجاع الدولہ جولائی سنہ ۱۷۶۰ء میں اس کے ساتھ آکر شامل ہوگیا۔[1]

مرہٹوں کی شکست کے بعد دتاجی سندھیا کا بھتیجا جانکوجی پونا پہنچا۔ پونا میں مرہٹوں نے ایک بہت بڑی فوج جمع کر لی اور اسے اسلحہ سے بھی لیس کر دیا۔ باقاعدہ مرہٹہ گھوڑ سوار فوج کی صفوں میں مزید نو پیادہ دستوں کا بھی اضافہ کر دیا جن میں سے ہر ایک دستہ ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا جو

---

[1] C.P. TATE.

بندوقوں سے مسلح تھے۔ ان کے ساتھ توپخانہ بھی تھا۔ یہ تمام سپاہی یورپی طرز پر تربیت یافتہ تھے ان کا قائد ابراہیم گاردی تھا جس نے اس سے پیشتر فرانسیسی فوج میں تربیت حاصل کی تھی۔ پنڈاری باقاعدہ گھوڑسواروں کی حیثیت سے مرہٹوں کے قومی پرچم تلے جمع ہو گئے۔ جب یہ فوج پونا سے روانہ ہوئی تو ہلکر بھی متھرا میں ان کے ساتھ آکر مل گیا۔ اس کے بعد مرہٹہ فوج دلّی کی طرف چل پڑی۔ گاردی کی توپوں نے دلّی کے قلعہ پر گولے برسائے اور اس کی دیواروں میں شگاف ڈال دیئے۔ شاہی قلعہ کے محافظ یعقوب علی خان بامیزئی نے ہتھیار ڈال دیئے اور قلعہ خالی کر دیا۔ مرہٹہ فوج نے دلّی پر قبضہ کر کے شاہی محل کو خوب لوٹا۔[۵۰]

مرہٹہ فوج ۱۰ اکتوبر کو دلّی سے روانہ ہوئی۔ اس نے جمنا کے کنارے کنج پورہ پر حملہ کر کے ابراہیم گاردی کی توپوں کی مدد سے قلعہ پر قبضہ کر لیا احمد شاہ کا ایک بڑا منصبدار مرہٹہ فوج کے ہاتھ سے ہلاک ہو گیا۔ افغانوں نے کنج پور مرہٹوں کے حوالے کر دیا۔ احمد شاہ نے ۲۰ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو طغیانی کے باوجود باغپت کے گھاٹ سے جمنا پار کر لیا۔ اس موقعہ پر مرہٹوں کی فوج سرہند کی طرف کوچ کر رہی تھی۔[۵۱]

مرہٹوں نے اپنے روایتی گوریلا اور چھاپہ مار جنگ کے طور طریقوں کو ترک کر کے اس موقعہ پر ایک ہی مقام سے جم کر لڑنے کا فیصلہ کیا

۵۰:- G.P.TATE

۵۱:- ABID.

اس کے بعد مرہٹہ فوج پانی پت پہنچی۔ اس نے خندقیں کھود لیں اور مورچے بنوالئے اور شہر کو دفاعی شکل دے دی۔[۱]

یکم نومبر کو احمد شاہ آگے بڑھا اور سملکا کی دوسری جانب اپنی لشکرگاہ قائم کرلی۔ پورے دو مہینے تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے پڑی رہیں۔ احمد شاہ درانی جان بوجھ کر لڑائی میں تاخیر سے کام لے رہا تھا۔ اسے اپنی فوج کے لئے خوراک وافر مقدار میں گنگا جمنا کے دوآبہ سے حاصل ہو رہی تھی لیکن مرہٹہ فوج کے راستے مسدود تھے اور اس کو خوراک کی قلت کا سامنا تھا۔ ۶ر دسمبر کو دونوں فریقوں کے درمیان ایک جزوی مگر سخت جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں افغانوں نے کامیابی حاصل کرلی۔[۲]

گوبند پنت بنڈیلا جو ایک مرہٹہ منصبدار تھا۔ افغانوں کی فوج میں تقسیم پیدا کرنے کی غرض سے نجیب الدولہ کے صدر مقام میرٹھ کی طرف بڑھا۔ احمد شاہ نے اس کو روکنے کی خاطر پانچ ہزار سوار عبدالصمد خان کے بیٹے کی قیادت میں روانہ کر دیئے۔ انہوں نے باغپت کے گھاٹ سے جمنا پار کرکے مرہٹوں کو شاہدرہ اور غازی آباد سے نکال دیا۔ اسی دن ۱۸ر دسمبر کو افغانوں کی یہ فوج پنڈت گوبند پنت کے لشکرگاہ پر جلال آباد میں حملہ آور ہوئی۔ پنڈت لڑائی میں ہلاک ہوگیا۔ افغان اس کے سازوسامان

---

[۱]:۔ G.P. TATE.

[۲]:۔ G.P. TATE.

کو لوٹنے کے بعد اپنی فوج سے جا ملے۔[1]

مرہٹوں کا ایک دستہ جو خزانہ لے کر مرہٹہ فوج کی طرف جا رہا تھا غلطی سے افغانوں کی لشکر گاہ میں جا گھسا۔ افغان ان کو شناخت کرتے ہی ان پر ٹوٹ پڑے اور سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔[2]

۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو صبح سویرے دونوں فوجیں لڑائی کے لیے حرکت میں آگئیں۔ سب سے پہلے مرہٹہ فوج توپوں کی گرج کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی اور آتشیں اسلحہ کے استعمال میں اضافہ ہو گیا اس کے بعد ابراہیم گارڈی نے آتشیں اسلحہ کا استعمال بند کرنے کا حکم دیا اور اپنے ساتھ سات ہزار ہندوستانی پیادہ دستوں کو جن کی بندوقوں میں سنگینیں لگی ہوئی تھیں لے کر روہیلوں پر حملہ کر دیا۔ جن کی قیادت حافظ رحمت خان اور ڈھنڈی خان کے ہاتھ میں تھی اور روہیلوں کو کچل کر رکھ دیا۔ اس موقعہ پر اس نے دو ہندوستانی پیدل دستے اپنی صف کے بازو کو افغان گھوڑ سواروں کی زد سے محفوظ رکھنے کی خاطر متعین کر رکھے تھے۔ ان دو دستوں نے افغان گھوڑ سواروں کی پیش قدمی روک کر انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ اس کامیابی کے باوجود ابراہیم گارڈی کے ہندوستانی پیدل فوج کے چھ دستے تقریباً نیست و نابود کر دیئے گئے۔ گارڈی کو بھی نیزوں کے کئی زخم لگے۔ اس کے بعد دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ بارک زئی جوانوں اور بلوچوں کے لشکر

---

[1] :- G.P. TATE

[2] :- G.P. TATE.

کو فوج کے قلب میں رکھا گیا تھا۔ جن کی قیادت شاہ ولی خان کے ہاتھ میں تھی۔ اور خان میر نصیر خان اس کا معاون تھا۔ مرہٹہ فوج نے اپنے دو سرداروں سداشیو بھاؤ اور وشواس راؤ کی قیادت میں افغانوں پر بڑی جرأت اور دلیری سے حملہ کر کے ان کو ہزاروں کی تعداد میں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور مرہٹہ فوج کامیابی سے ہمکنار ہونے والی تھی کہ شاہ ولی خان موقعہ کی نزاکت کو بھانپ کر اپنے قبیلے بارک زئی کے جوانوں اور بلوچوں کے لشکر کو ساتھ لے کر بڑی تیزی سے مرہٹہ فوج پر پل پڑے۔ دوسری طرف اس نے قاصد بھیج کر احمد شاہ سے جو اپنے مرکز میں تھا مزید کمک اور امداد طلب کر لی۔ احمد شاہ نے فوراً اپنے محافظ دستوں میں سے پندرہ سو تازہ دم گھوڑ سوار اس کی امداد پر روانہ کر دیئے اور انہیں ہدایت کی کہ لڑائی سے لشکر گاہ کی طرف پسپا ہونے والے سپاہیوں کو دوبارہ میدانِ جنگ کی طرف دھکیل دیا جائے۔ اس سے لڑائی کا پانسہ ہی بدل گیا۔ مرہٹوں کا زور ٹوٹ گیا تھا اور مزید مقابلہ کی طاقت جواب دے گئی تھی۔ مرہٹہ سردار وشواس راؤ کو اچانک گولی لگی وہ اپنے گھوڑے سے گر گیا اور اسے ہاتھی پر بٹھانا پڑا۔ مرہٹہ فوج اچانک بھاگ نکلی اور افغانوں نے اس کا پیچھا کیا۔ افغانوں نے جانکوجی سندھیا کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ نجیب الدولہ نے ابراہیم گاردی کو بچانے کی کوشش کی لیکن احمد شاہ نے اسے قتل کر دیا۔ داتاجی گائیکوار اور ہلکر بھاگ نکلے۔ بعد میں وشواس راؤ کی لاش ملی اور میدانِ جنگ سے

تقریباً تیس کلو میٹر دور بغیر سر کے ایک دوسری لاش ملی جس کے متعلق خیال کیا گیا وہ سداشیو بھاؤ کی لاش تھی۔ مرہٹے لاکھوں کی تعداد میں میدانِ جنگ میں کام آئے۔ اس کے بعد احمد شاہ درانی دلی میں داخل ہو گیا۔ مارچ ۱۷۶۱ء میں دوبارہ اپنے وطن کی طرف مراجعت کی[1]

خان نصیر خان نے ۱۷۶۲ء کے اوائل میں اپنی توجہ مکران کی طرف مبذول کی اور اپنے وزیر اخوند ملا محمد حیات کو مکران روانہ کر دیا۔ تاکہ وہ کیچ میں قیام کر کے خان کے مفادات کی نگرانی کرے اس سے کچھ عرصہ پیشتر ۱۷۶۱ء کے اواخر میں اس نے خاران پر حملہ کر کے سردار خاران میر شہداد خان نوشیروانی کی گوشمالی کی جس نے احمد شاہ درانی کے حملہ قلات کے دوران شاہ کی طرف داری کی تھی اور اس نے قلات کی حفاظت کے لیے خان کو لشکر مہیا کرنے سے گریز کیا تھا۔[2]

خان نے اخوند ملا محمد حیات کو مکران روانہ کرتے وقت اسے حکم دیا تھا کہ مکران کے حالات کو درست کرنے کے بعد جب اسے واپس قلات آنے کا موقع ملے تو وہ ہر صورت میں ملک دینار گچکی کو ترغیب دے کر اپنے ساتھ قلات لے آئے۔ اخوند کچھ عرصہ کیچ میں قیام کر کے وہاں کے حالات درست کرنے کے بعد ملک دینار کی سلامتی کا ذمہ اپنے سر لے کر اسے اپنے ساتھ قلات لے آیا۔ اور خان کے سامنے پیش

---

[1] :۔ جی پی ٹیٹ

[2] :۔ میر گل خان نصیر

کر دیا۔ خان کچھ عرصہ تک اس کے ساتھ نہایت مہربانی اور خوش سلوکی سے پیش آیا تاکہ اخوند نے اس کی سلامتی کی جو ذمہ داری لی تھی وہ اس سے بری الذمہ ہو سکے۔ اس خوش سلوکی سے ملک دینار کو بھی یقین ہو گیا کہ خان اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا لیکن کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد خان نے ملک دینار کو قتل کر دیا۔ اس واقعہ کی خبر جب کیچ پہنچی تو کیچ کے باشندوں نے خان کے خلاف بغاوت کر دی۔ خان نے کیچ کے باشندوں کی بغاوت فرد کرنے کی غرض سے سردار حاجی محمد خان شاہوانی کو ایک لشکر کے ساتھ کیچ روانہ کیا۔ سردار حاجی محمد خان نے کیچ پہنچ کر ملک دینار کے بیٹے شے عمر کو راضی کر لیا اور کیچ پر قبضہ کر کے وہاں کے باشندوں کو خان کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا اور بغاوت فرو ہو گئی۔ جب کیچ میں پوری طرح نظم وضبط قائم ہو گیا اور نقضِ امن کا کوئی خدشہ باقی نہ رہا تو وہ ملک دینار کے بیٹے شے عمر کو اپنے ساتھ قلات لے آیا اور خان کے سامنے پیش کر دیا۔ خان اس کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا اور اس کو دوبارہ کیچ روانہ کر کے کیچ کی حکومت اس کے حوالے کر دی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کے بھائی شکر اللہ خان گچکی نے کیچ کی میری پر قبضہ کر کے اس کو کیچ سے نکال باہر کیا۔ شے عمر اپنے بھائی کے خلاف مدد حاصل کرنے کے لئے گنداوہ پہنچا جہاں خان سردیوں کے دوران قیام پذیر تھا۔ اور خان کے پاس اپنے بھائی کے خلاف شکایت کی۔[1]

---

[1] ۔ اخوند ملا محمد صدیق۔

خان کچھی ہی سے سراوانی قبائل کا ایک لشکر جو سردیاں گذارنے کی خاطر کچھی میں موجود تھا اپنے ساتھ لے کر گاج درہ کے راستے گنداوہ سے کیچ کی طرف روانہ ہوا۔ وہ بڑی تیزی سے سفر کرتے ہوئے ایک ہفتہ کے بعد کیچ پہنچا اور کیچ کے علاقے کو تاخت و تاراج کیا اسی موقعہ پر اس نے تفتان پر بھی حملہ کر دیا جو بلیدیوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لڑائی میں بلیدیوں نے شکست کھائی اور ان کے ستر کے قریب افراد میدان جنگ میں کام آئے اور اس کے بعد خان کیچ چلا آیا اور شے عمر کے بھائی شکر اللہ کو کیچ کی میری خالی کرنے پر مجبور کر دیا اور کیچ کی حکومت دوبارہ شے عمر کے حوالے کر دی۔ ان واقعات سے شے عمر کو یقین ہو گیا کہ وہ تنہا کیچ میں بحیثیت حکمران اپنی حیثیت برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ چنانچہ میر شے عمر گچکی اور خان کے درمیان مندرجہ ذیل معاہدہ طے ہو گیا۔

۱۔ میر شے عمر کیچ کا سردار ہو گا اور خان اس کو اس کی سرداری پر قائم رکھنے کے لئے ہر قسم کی امداد کرے گا۔

۲۔ کیچ کا انتظام خان نصیر خان کے ہاتھ میں رہے گا۔ اور وہ مکران میں نظم و ضبط قائم کرنے کا ذمہ دار ہو گا۔

۳۔ کیچ کی سالم آمدنی کا نصف حصہ اس کی ذمہ داریوں کے اخراجات کو پورا کرنے کی خاطر خان کے خزانے میں جائے گا اور بقایا نصف حصہ شے عمر اور دوسرے گچکی سردار حاصل کریں گے۔

۴۔ اس معاہدے کی رو سے مکران کی مغربی حد ملکی چیدگ قرار پائی

جو دریائے مینا کے کنارے واقع ہے۔[1]

اسی اثناء میں ملا محمد حیات نے وفات پائی اور اس کی جگہ اس کے بیٹے اخوند ملا فتح محمد نے دستور کے مطابق قلمدان وزارت سنبھال لیا۔

کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد گچکیوں اور بلیدیوں میں دوبارہ اقتدار کی جنگ شروع ہوئی۔ شے قاسم بلیدی نے کیچ پر حملہ کر کے شے عمر گچکی کو قتل کر دیا۔ شے عمر کا بیٹا شے محمد اور اس کا چچا زاد بھائی میر بھائیاں قلات کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور بلیدیوں کے خلاف خان سے امداد طلب کر لی۔ خان نے اپنے وزیر اخوند ملا فتح محمد کو ایک لشکر کے ساتھ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے مکران روانہ کر دیا۔ بعد میں میر جنگو خان شاہوانی کو بھی اخوند کی امداد پر مکران روانہ کر دیا۔ اخوند نے میر جنگو کی آمد سے پیشتر مکران میں امن و امان قائم کر لیا تھا۔ اس نے میر شے محمد کو کیچ کی میری میں اس کی سرداری پر دوبارہ بحال کر دیا اور شے قاسم بلیدی کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ قلات لے آیا۔ خان اس کو شے عمر کے قتل کے بدلے میں قتل کر دینا چاہتا تھا لیکن اس نے اخوند ملا فتح محمد کی سفارش پر اس سے درگذر کی۔[2]

کچھ عرصہ کے بعد بلیدیوں نے کیچ میں دوبارہ بغاوت کر دی۔ خان نے اس دفعہ میر بھائیاں گچکی اور شے قاسم کو میر جنگو خان کے ساتھ کیچ روانہ

---

[1]:۔ میر گل خان نصیر

[2]:۔ ایضاً

کر دیا تاکہ وہاں پوری طرح امن بحال کیا جائے۔ بعد میں خان نے ان کی امداد کے لئے میر چیپر خان ایتاززئی اور میر شہباز خان محمد حسنی کو بھی ایک لشکر کے ساتھ کیچ روانہ کر دیا۔ بلیدیوں نے جو میری پر قابض تھے ہتھیار ڈال دیئے۔ میر جمشید خان نے خان کی منشا کے مطابق ان سب کو قتل کر کے کیچ کی سرداری میر محابتیاں کے حوالے کر دی۔[1]

ایک دوسری روایت ہے کہ خان نے ملک دینار کو قتل کرنے کے بعد کیچ پر قبضہ کر لیا اور ملک دینار کے بیٹے شئے عمر کو گرفتار کر کے اپنے پاس قلات میں رکھا اس کے بعد سردار زہری میر زرک کو سات سو افراد پر مشتمل ایک لشکر کے ساتھ کیچ روانہ کر دیا جس نے کیچ کی میری پر قبضہ کر کے انتظام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خان نے میروانی قبیلہ کے سردار فتح محمد کے بیٹے میر دوستین کو میر زرک کی امداد پر بھیج کر اسے بھی وہاں کیچ میں رکھا۔ خان کا خیال تھا کہ مکران کا علاقہ گچکی سرداروں کے حوالے کرنا کچھ سود مند نہ ہوگا۔ لیکن خان کے اس فیصلے کے خلاف کیچ کے باشندوں نے بغاوت کی اور اس بغاوت کا سرکردہ میر عیسیٰ گچکی کے بھائی میر داد کریم کا بیٹا میر شہداد گچکی تھا۔ باغیوں نے میر دوستین اور اس کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور میر زرک مجبور ہو کر کیچ کا قلعہ باغیوں کے حوالے کر کے خود قلات چلا گیا۔ خان نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے میر زرک کو دوبارہ ایک بڑے لشکر

---

[1] :۔ اخوند ملا فتح محمد۔

کے ساتھ کیچ روانہ کر دیا۔ لیکن اس کو کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ آخرکار خان نے
محسوس کیا کہ میر شئے عمر کے بغیر مکران میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔
اس نے میر شئے عمر کو اپنے روبرو طلب کر کے انعام و اکرام سے نوازا
اور اسے کیچ کی سرداری پر بحال کر دیا اس موقعہ پر دونوں کے درمیان
وہ معاہدہ طے پایا جس کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں گزر چکا ہے اس معاہدہ
کے تحت مکران کے گچکی سرداروں نے مکران پر خان کی بالادستی تسلیم
کرلی۔ وہ بلوچ نظام قوم داری کے رکن بن گئے اور مکران کا سارا علاقہ
خان کے زیر انتظام آگیا جس میں دیزک۔ بمپور کسر قند سرباز وغیرہ شامل
تھے۔ مکران فتح ہونے سے بلوچستان کے وہ تمام علاقے خان کے زیر
اقتدار آگئے جہاں بلوچ کثیر تعداد میں بود و باش رکھتے تھے۔[سه]

۱۷۶۱ء میں جونہی کہ احمد شاہ درانی نے مرہٹوں کو شکست دینے
کے بعد اپنے وطن کی طرف مراجعت کی پنجاب میں سکھوں کی سرگرمیاں
تیز ہوگئیں۔ سکھ سرداروں نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنے لئے قلعے
تعمیر کر لئے تھے۔ سردار رنجیت سنگھ کے دادا سردار چڑھت سنگھ نے اپنی
بیوی کے گاؤں گوجرانوالہ کو اپنا گڑھ بنا کر یہاں اپنے لئے ایک قلعہ
تعمیر کر لیا تھا جو لاہور کے شمال میں واقع ہے۔ سکھوں نے لاہور کے
نائب صوبیدار خواجہ عبید کو شکست دی جس نے گوجرانوالہ پر حملہ کر دیا تھا۔
انہوں نے سرہند پر بھی حملہ کر دیا۔ احمد شاہ درانی نے ۱۷۶۱ء کے اواخر

سه :- میر گل خان نصیر

میں پنجاب میں داخل ہو کر سکھوں کو لاہور سے مار بھگایا اور سرہند کی طرف پیش قدمی کر کے سکھوں کو عبرتناک شکست دی اور ۱۷۶۲ء کے اوائل میں امرتسر پر حملہ کر کے سکھوں کے ہر مندر کو بارود سے اڑا دیا اور اس کی متعلقہ عمارتوں کو گرا دیا اور حوض مقدس کی بے حرمتی کی۔ پھر مارچ ۱۷۶۳ء کو اس نے اپنی واپسی پر کابلی مل ہندو کو لاہور کا صوبیدار مقرر کر کے خود قندہار کی طرف مراجعت کی۔ لیکن سکھوں نے تھوڑے سے عرصہ میں سردار جسا سنگھ آب کار کی قیادت میں ۶۳ - ۱۷۶۲ء میں پنجاب میں دوبارہ غلبہ حاصل کر لیا۔ [ٹ]

جب احمد شاہ ابدالی کو لاہور اور ملتان میں سکھوں کی بغاوت اور سرہند اور جالندھر دوآبہ پر ان کے قبضہ کا علم ہوا تو اس نے دوبارہ پنجاب پر فوج کشی کر کے سکھوں کی بغاوت کو کچلنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے اتحادی میر نصیر بلوچ سے بھی خواہش کی کہ وہ اپنا لشکر لے کر کفار کے خلاف جہاد میں اس کے ساتھ شامل ہو جائے۔ اس نے خان کے نام ایک فرمان بھیج کر لکھا: "ان ملعون کتوں اور بدکردار کافروں نے مسلمانوں پر غلبہ پا کر ملتان اور ڈیرہ جات کے علاقوں تک کو تاخت و تاراج کر دیا ہے۔ انہوں نے مسجدیں گرا دی ہیں، مسلمانوں کو قیدی بنا لیا ہے ان حالات میں آپ کیونکر حج کے لئے مکہ مبارک جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس ذلیل فرقہ نے یہاں اودھم مچا رکھا ہے۔ آپ اس طرف سے اپنا

ٹ :- G. P. TATE.

لشکر لے کر چل پڑیں اور میں اس طرف سے اپنی فوج لے کر روانہ ہوجاتا ہوں تاکہ ہم دونوں مل کر ان کافروں کی بیخ کنی کریں۔ ان بت پرستوں کے خلاف جہاد حج پر فوقیت رکھتا ہے۔ میں تجھ کو اپنا بیٹا خیال کرتا ہوں اور تم بحیثیت مسلمان میرے بھائی ہو۔ فوراً نکل پڑو تاکہ ہم ان منکرین حق کو تباہ و برباد کر کے ان کی عورتوں کو باندی اور ان کے بچوں کو بندی بنا لیں۔" لے

میر نصیر خان کو بھی اس اثناء میں ملتان اور ڈیرہ جات سے سکھوں کی سرگرمیوں کی خبر ملی تھی اس نے علمائے سکھوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ حاصل کر کے احمد شاہ سے پنجاب پر حملہ کرنے کی درخواست کی تھی اور وہ احمد شاہ درانی کی اجازت اور منظوری کا منتظر تھا کہ اسے پنجاب کی طرف لشکر کشی کرنے کا فرمان ملا۔ اکتوبر ۱۷۶۴ء میں احمد شاہ اٹھارہ ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج لے کر قندھار سے نکلا اور اپنی روانگی کے وقت ایک تیز رفتار گھوڑ سوار قلات میں خان کے پاس روانہ کر کے اس سے خواہش کی کہ وہ بھی اپنا لشکر لے کر پنجاب میں اس کے ساتھ جا کر ملے۔ خان نصیر خان فوراً بارہ ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر تیار کر کے پنجاب کی طرف روانہ ہوا۔ احمد شاہ درانی امین آباد کے مقام پر خیمہ زن تھا کہ بلوچوں کا لشکر خان میر محمد نصیر خان کی قیادت میں اس کے ساتھ جا کر شامل ہو گیا احمد شاہ دریائے راوی عبور کر کے لاہور پہنچا۔ اس نے پہلے ہی سے کابلی مل کو لاہور کا صوبیدار مقرر کر دیا تھا۔ اب کی بار اس نے اس کے بھانجے

لے ۱- AHMED SHAH DURRANI . GANDA SINGH .

امیر سنگھ کو فوج کا بخشی مقرر کر دیا۔ کابلی مل نے اپنے بھانجے امیر سنگھ اور اپنے داماد جگن ناتھ کو لاہور میں چھوڑا اور خود احمد شاہ کے پاس اس کی لشکر گاہ میں گیا اس مہم کے اختتام تک وہ شاہ کا ہمرکاب تھا۔[۱]

جب احمد شاہ شمال مشرق کی طرف سے لاہور کی طرف بڑھ رہا تھا تو سکھ سردار شاہ کی آمد کی خبر سنتے ہی اپنے اپنے سکھ جتھوں کو لے کر شاہی شاہراہ پر چل پڑے اور پھر غائب ہو گئے۔ شاہ نے اپنے منصبداروں کی ایک فوجی مجلس منعقد کی اور ان سے سکھوں کے قلع قمع کرنے کی تدبیروں پر تبادلۂ خیال کیا جنہوں نے جم کر مقابلہ کرنے کی بجائے شاہی فوج پر چوری چھپے چھاپہ مارنے کے طریقہ کو اپنا لیا تھا۔ جب تمام دوسرے منصبداروں نے اظہارِ خیال کر دیا تو اس کے بعد شاہ نے خان میر نصیر خان بلوچ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی رائے دریافت کی۔ خان نصیر خان نے عرض کیا " شاہ جو بھی تدبیر تجویز کرے گا ہم لوگ اس پر عملدرآمد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ شاہ کی جس طرف بھی منشا ہو گی ہم اسی طرف جا کر دشمن کا قلع قمع کرنے سے دریغ نہیں کریں گے اگر ہمارے سامنے لوہے کا پہاڑ بھی سدِ راہ بنے گا تو ہم اس کو بھی پاش پاش کر کے رکھ دیں گے۔ سکھوں کی مزاحمت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو کھلے میدان میں ہمارا مقابلہ کرنے کی بجائے چوروں کی طرح آتے ہیں اور بھیڑیوں کی طرح پیچھے سے حملہ کرتے ہیں"۔[۲]

---

[۱] [۲] :- AHMED SHAH DURRANI :- GANDA SINGH.

اس موقعہ پر سکھوں کی قیادت سردار چرھت سنگھ کے ہاتھ میں تھی. سکھوں نے افغان فوج کے ہراول دستہ پر جس کی قیادت میر گوہرام خان گمسی اور میر احمد خان بلیدی کر رہے تھے اچانک ہلہ بول دیا. یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ میر احمد خان اور اس کا بیٹا موقعہ پر ہی ہلاک ہو گئے. خان میر نصیر خان بلوچ اور میر عبدالنبی رئیسانی فوراً اپنے ساتھیوں کی مدد پر پہنچ گئے اس کشمکش میں خان میر نصیر خان کے گھوڑے کو ایک سکھ سوار نے گولی ماردی اور وہ زمین پر گر پڑا. خان کے دو بہادر ملازمین میر مہنگا اور محمد حسین خان کو بچانے کے لئے فوراً موقعہ پر پہنچ گئے. انہوں نے سکھ گھوڑ سوار کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور خان میر نصیر خان کی جان بچالی. سکھوں کے ساتھ اس پہلے معرکہ میں نظر محمد، غلام حسین جنگازئی، میر برفی. فتوئی دارغہ بہادر خان ساسولی اور ملا درسنے بہادری کے بڑے جوہر دکھائے. یہ شدید جنگ دیر تک جاری رہی اور رات ہونے پر ختم ہوئی. دوسرے دن سکھوں نے حسب معمول اپنی جنگی چالوں کا مظاہرہ کیا. ان کا ایک گروہ بندوقیں لے کر کچھ فاصلے سے افغان فوج پر گولیاں برساتا تھا اور اس کے بعد ان کو بھرنے کے لئے پیچھے ہٹ جاتا تھا. اس کے بعد دوسری طرف سے ان کا دوسرا گروہ آگے بڑھ کر اسی عمل کو دہراتا تھا لڑائی کے خاتمہ پر جب خان نصیر خان احمد شاہ درانی سے ملنے گیا تو شاہ نے اس کو اس کی بہادری پر مبارک باد دی اور اس کے ساتھ ساتھ اس

ماخذ:- GANDA SINGH

کو متنبہ بھی کیا کہ وہ اکیلا جا کر دشمن پر حملہ کر کے اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالے[1]

دوسرے دن احمد شاہ درانی کو خبر ملی کہ سکھ راتوں رات لاہور چھوڑ کر امرتسر کی طرف چک گرو چلے گئے ہیں جو لاہور سے تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ احمد شاہ امرتسر پر چڑھائی کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا اور چوتھی رات کو امرتسر پہنچا لیکن سکھ وہاں موجود نہیں تھے اور فقط تیس سکھ بنگائے اکال تخت کے اندر موجود تھے جنہوں نے فوراً بنگاہ سے باہر نکل کر افغانوں پر ہلہ بول دیا اور سب کے سب افغانوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے۔ شاہ نے اس سے پیشتر بھی کئی بار امرتسر پر حملہ کر کے سکھوں کے ہر مندر کو گرا کر ان کے حوض مقدس کی تقدیس کو پامال کر دیا تھا۔ اور ہر بار سکھوں نے اپنے مندر کو دوبارہ تعمیر کر کے حوض مقدس کے تقدس کو دوبارہ بحال کر دیا تھا احمد شاہ نے قرب وجوار میں سکھوں کی تلاش میں گھوڑ سوار روانہ کر دیئے لیکن ان کا کھوج نہ لگایا جا سکا[2]

چونکہ سکھوں کی بڑی جمعیت جم کر افغانوں کا مقابلہ کرنے سے گریز کر رہی تھی اس سے احمد شاہ درانی نے اپنے منصبداروں کو صلاح مشورے کے لیئے اپنے پاس بلایا اور ان سے دریافت کیا کہ سکھوں کو تباہ کرنے

---

[1]:- GANDA SINGH

[2]:- ABID.

کے لئے کونسی تدبیر اختیار کرنی چاہیئے جن کا دور دور تک پتہ نہیں چل رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کوئی مقررہ ٹھکانا ہی نہیں ہے اس موقعہ پر بھارت پور کے سردار سورج مل کا بیٹا راجہ جواہر سنگھ پندرہ ہزار سکھوں کی مدد سے نجیب الدولہ کے ساتھ برسر پیکار تھا میر نصیر خان نے تجویز پیش کی کہ افغان فوج سرہند کی طرف کوچ کر کے راستے میں سکھوں کا قلع قمع کرے تاکہ سرہند میں قیام کر کے نجیب الدولہ کا بھی حال معلوم کیا جا سکے ۔[۱]

خان کی یہ تجویز شاہ کو پسند آئی اور اس نے افغان فوج کو جالندھر دوآبہ سے ہوکر سرہند کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ جالندھر دوآبہ کے علاقے پر سکھوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ افغان فوج نے اپنے سفر کے دوران اس علاقے کو تاخت و تاراج کر کے بری طرح لوٹ لیا چار دن میں افغان فوج بٹالہ پہنچ گئی اور اس نے دوبارہ سرہند کی طرف اپنا سفر جاری رکھا ۔[۲]

اس سفر کے دوران ایک دن اچانک سکھوں کا ایک بڑا جتھہ نمودار ہوا اور اس نے مورچہ سنبھال کر افغان فوج کا راستہ روک لیا افغان ہراول دستہ کے سپہ سالار سردار جہاں خان اس سے پیشتر کئی بار سکھوں سے نبرد آزما ہو چکا تھا۔ اس کو ان کی جنگی چالوں سے پوری واقفیت

لے :- GANDA SINGH

ٹے :- ABID.

حاصل تھی۔ اس نے ایک جگہ پر جم کر سکھوں کا مقابلہ کیا تاکہ مزید کمک پہنچ سکے۔ سکھ دوڑتے ہوئے میدان جنگ میں چلے آتے تھے انہوں نے اپنی جنگی چالوں سے اودھم مچا دیا۔ ان کے ہاتھ میں بندوق اور آتشگیر فلیتہ تھے وہ کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب کو حرکت کرتے تھے۔ جب افغان فوج کا بڑا حصہ خان میر نصیر خان کی قیادت میں موقعہ پر پہنچا تو سکھ اپنی روائتی چالوں کا مظاہرہ کر کے غائب ہو گئے۔ خان نے دس کلومیٹر تک ان کا پیچھا کیا لیکن ان کا کوئی پتہ نہ چل سکا اور میر نصیر خان واپس لشکر گاہ میں چلا آیا۔ وہ دوبارہ ستلج کے کنارے نمودار ہوئے لیکن افغان ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔[۵]

احمد شاہ سرہند جانے یا سکھوں کا پیچھا کرنے کا ارادہ ترک کر کے سیدھا کنج پورہ کی طرف چل پڑا۔ غالباً وہ نجیب الدولہ کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا جو جواہر سنگھ جاٹ کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ لیکن نجیب الدولہ اور جاٹ کے درمیان فروری ۱۷۶۵ء ہی میں امن قائم ہو گیا تھا اور اب مزید جنوب کی طرف جانے کی ضرورت نہ تھی۔ خان میر نصیر خان نے احمد شاہ درانی کو دلی جا کر گرمی اور برشگال کا موسم گذارنے کا مشورہ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ احمد شاہ درانی شہنشاہ ہندوستان شاہ عالم ثانی کے معاملات درست کرنے کے علاوہ ہندوستان کے امراء کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر کے ان سے سکھوں کے خلاف مدد حاصل کر

---

[۵] :- GANDA SINGH.

سکے گا۔ میر نصیر خان نے کہا۔ "جب سب ٹھیک ہو گیا تو اس کے بعد نجیب، شجاع اور ہندوستانی مسلمان امراء جاٹوں اور مرہٹوں کی فوجوں کو اکٹھا کر کے ان ملعون کتوں پر حملہ بول دیا جائے"۔ اس نے کہا "خرگوش تھاں راسگ تھاں میگر د"۔ لیکن احمد شاہ کے افغان امراء کو میر نصیر خان کی تجویز سے اتفاق نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۷۵۷ء اور ۱۷۶۰ء میں گرمی اور بارش کا موسم ہندوستان میں گذارنے کا ان کو بڑا برا تجربہ ہوا تھا جس کے دوران افغان فوج میں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی تھی اور اس کے سپاہی ہزاروں کی تعداد میں بیماری سے مر گئے تھے اس کے علاوہ بارش اور سیلابوں نے بھی افغان فوج کو بڑا نقصان پہنچا دیا تھا۔ افغان امراء نے احمد شاہ کو گرمیوں کا موسم کابل میں گذارنے کا مشورہ دیا اور شاہ نے بھی ان سے اتفاق کیا۔[۱]

تین چار دن کے بعد احمد شاہ سرہند پہنچا۔ سکھوں نے سرہند میں قتل عام کر کے شہر کو تباہ کر دیا تھا اور وہاں الو بول رہا تھا، بازار اور دکانیں تھیں لیکن دکاندار سکھوں کے ہاتھ سے دوسری دنیا کو سدھار گئے تھے۔[۲]

سرہند پٹیالہ کے سردار آلا سنگھ کے علاقے میں واقع تھا۔ شاہ نے سردار آلا سنگھ کو اپنے حضور میں بلایا۔ اس کی بڑی عزت افزائی کی اور

---

۱ :- GANDA SINGH.

۲ :- ABID.

اسے خلعت اور انعام واکرام سے نواز نے کے علاوہ طبل و علم بھی عطا کر دیا اور سرہند کی حکومت اس کے سپرد کر دی۔ آلا سنگھ شاہ کو تین لاکھ روپے سالانہ خراج دینے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔[۵]

شاہ نے آگے کوچ کیا وہ دریائے ستلج کو روپڑ گھاٹ سے عبور کر کے جالندھر دوآبہ میں داخل ہو گیا۔ دوسرے دن افغان فوج نے کوچ کر کے ڈیڑھ کلو میٹر کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ سکھوں کی ایک جمعیت نمودار ہوئی۔ اس نے افغان فوج کا راستہ روک لیا۔ شاہ نے سب سے پہلے خان میر نصیر خان کو اپنے پاس بلایا اور اسے لڑائی کے لئے تیار ہونے کا حکم دیا۔ اس نے اس کے بعد اپنی فوج کی صف آرائی شروع کر دی۔ اس نے قلب لشکر کی قیادت خود سنبھال لی۔ شاہ ولی خان جہان خان اور انزلا خان کو بارہ ہزار افراد پر مشتمل فوج کے ساتھ اپنے دائیں طرف اور میر نصیر خان کو اس کے بارہ ہزار بلوچ لشکر کے ساتھ اپنے بائیں طرف رکھا۔ سکھوں نے بھی اپنی صفیں ترتیب دیں۔ قلب لشکر کی قیادت جسا سنگھ الوالیہ نے سنبھال لی۔ جسا سنگھ ٹھوکا اور کچھ دوسرے سکھ سردار اس کے معاون بنے۔ میمنہ کی قیادت سردار چڑھت سنگھ، لہنا سنگھ بھنگی اور جے سنگھ کنیا کے سپرد ہوئی اور میسرہ کی قیادت پر ہری سنگھ ننگ، گلاب سنگھ اور گجر سنگھ کو مقرر کیا تھا جو بھنگی مسل سے تعلق رکھتے تھے۔[۶]

۵۔ GANDA SINGH. ۶۔ GANDA SINGH.

سکھوں نے اپنی معمول کی جنگی چالوں پر عمل شروع کر دیا۔ چڑھت سنگھ کچھ فاصلے سے افغان فوج پر گولیاں چلانے لگا۔ بھنگیوں نے ہری سنگھ کی قیادت میں شاہ ولی خان اور جہان خان پر حملہ بول دیا۔ اور اس کے بعد پیچھے ہٹ گئے۔ شاہ ولی خان اور جہان خان کی فوج نے ان کا پیچھا کیا۔ تھوڑا فاصلہ پیچھے ہٹ جانے کے بعد سکھ دوبارہ پلٹ کر افغانوں پر ٹوٹ پڑے۔ جب افغانوں کے دائیں بازو پر دباؤ پڑ رہا تھا تو اس وقت احمد شاہ نے خان نصیر خان کو اپنے پاس بلایا اور اس کو تاکید کرتے ہوئے کہا "بے شک تیرے سینے میں شیر کا دل ہے لیکن سکھوں پر حملہ کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لینا اور اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح ڈٹ کر جمے رہنا تاکہ دشمن خود تمہاری طرف بڑھ کر اپنے سینوں کو تمہاری گولیوں کے لئے نشانہ بنا کر تان لیں۔ سکھ بڑی بے جگری سے لڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی جنگی چالوں کا مقابلہ فقط اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم اپنی جگہ سے بالکل نہ حرکت کرو۔" اس تنبیہ کے باوجود بلوچستان کا یہ مرد میدان سکھوں پر پل پڑا اور شاہ نے اس خیال سے کہ کہیں وہ سکھوں کے جال میں پھنس نہ جائے سردار جہان خان کو اس کے پیچھے روانہ کر دیا وہ میر نصیر خان کو زبردستی کھینچ کر لے آیا۔ اس موقعہ پر جبکہ بلوچوں کا لشکر اپنی مقرر کردہ جگہ سے ہٹ کر سکھوں کا پیچھا کرنے میں مصروف تھا۔ سکھوں کے ایک دوسرے جتھے نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کی جگہ لے لی اور احمد شاہ کی فوج اور بلوچوں کے درمیان آ کر میر

نصیر خان کے بلوچ لشکر اور افغان فوج کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ اس کے بعد بلوچ لشکر کے ارد گرد گھیرا ڈال دیا جو پٹ ہو رہا تھا۔ دونوں فوجیں ایک بار پھر ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئیں اور ایک خونریز جنگ شروع ہو گئی آخر کار اندھیرا چھا جانے کے بعد ہی یہ ختم ہوئی۔[1]

دوسرے دن سورج نکلتے ہی سکھ افغان فوج پر پل پڑے۔ انہوں نے اپنی فوج کی ترتیب بھی بدل لی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے شاہ کی فوج میں گھس آئے اور ہلہ بول دیا۔ شاہ نے فوراً اپنی فوج کو ایک ہی مقام پر جمے رہنے کا حکم دیا۔ اس نے جھنڈے گاڑ دیئے اور خان سے کہا کہ وہ ایک انچ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ تمام فوج کو اسی قسم کا حکم دیا گیا۔ شاہ نے تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد افغان فوج کو دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ سکھ دوبارہ اپنی چالوں کے مطابق بھاگ نکلے۔ افغانوں نے ان کا پیچھا کیا اور اس کے بعد دوبارہ اپنی لشکر گاہ میں چلے آئے۔ سکھ دوبارہ نمودار ہو گئے اور افغان فوج پر حملہ کر دیا۔ احمد شاہ نے فوج کو دوبارہ ایک ہی مقام پر ٹھہرنے کا حکم دے دیا اور نصیر خان سے کہا۔ "کوہ قاف کی مانند ایک ہی مقام پر اپنے آپ کو قائم رکھو اور جب تم دشمن کو اپنی طرف آتے دیکھو تو اس کے بعد اس کے سر پر ہلہ بول دو۔ میں نے سب غازیوں کو یہی مشورہ دیا ہے۔ شام ہوتے ہی سکھ دوبارہ غائب ہو گئے۔ پورے سات دن تک جبکہ افغان فوج جالندھر دوآبہ

---

[1] GANDA SINGH.

کو عبور کر رہی تھی سکھوں کے حملے جاری تھے وہ صبح کو افغان فوج پر حملہ بول دیتے تھے. دن بھر افغان فوج اور سکھ ایک دوسرے کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے تھے اور شام ہوتے ہی سکھ دوبارہ غائب ہوجاتے تھے[1]

شاہ نے لاہور کے نزدیک سے گزرتے ہوئے پہلے راوی اور اس کے بعد دریائے چناب کو عبور کرلیا. یہاں سے اس نے سردار جہان خان کو آگے روانہ کردیا تاکہ وہ دریائے جہلم پر پل بنوانے کا انتظام کردے، وہ خود بڑی سست رفتاری سے سفر کرتے ہوئے جہلم کے کنارے پہنچا. یہاں سے اس نے کابل مل کو لاہور جانے کی اجازت دے دی. اسی موقعہ پر اس نے خان نصیر خان کو اپنے پاس بلایا اور اس کو اس مہم کے دوران قابلِ قدر خدمات سرانجام دینے پر مبارکباد دی اور اسے وطن جانے کی اجازت دے دی. خان میر نصیر خان نے کچھ مطالبات پیش کئے جو شاہ نے فوراً منظور کرلئے. اس میں شال کے علاقہ کا مطالبہ بھی شامل تھا. شاہ نے اس کو چناب، جھنگ، ملتان اور ڈیرہ جات کے علاقے دینے کی پیش کردی لیکن خان نصیر خان نے قبول نہیں کیا اور معذوری ظاہر کی.[2]

شاہ نے دریائے جہلم کو کشتیوں کے پل کے ذریعہ عبور کرلیا. جب شاہی فوج رہتاس کے مقام پر پہنچی تو خان میر نصیر خان اور اس

۱ـ GANDA SINGH.

۲ـ ABID.

کا بلوچ لشکر شاہ سے رخصت ہوکر اپنے وطن کی طرف روانہ ہوگیا۔ اور شاہ بھی افغانستان کی طرف روانہ ہوگیا۔ شاہ کی واپسی مارچ ۱۷۶۵ء میں ہوئی۔[1]

احمد شاہ درانی کی پنجاب سے واپسی کے بعد سکھ دوبارہ پنجاب میں سرگرم عمل ہو گئے اور انہوں نے جہلم تک کے علاقے پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔ شاہ نے دو سال تک ان سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ ۱۷۶۶ء میں وہ دوبارہ پنجاب میں داخل ہوا۔ اس موقعہ پر بھی خان میر نصیر خان اپنے بلوچ لشکر کے ساتھ اس کے ہمرکاب تھا۔ وہ لاہور کی طرف جانے سے اجتناب کرتے ہوئے فقط انبالہ تک بڑھا۔ اس نے پٹیالہ کے سردار امر سنگھ کو اس کے باپ کی جگہ سرہند کا صوبیدار مقرر کردیا۔ سردار امر سنگھ شاہ کا اتنا معتقد اور وفادار خیال کیا جاتا تھا۔ کہ وہ عام لوگوں میں سردار امر سنگھ بامیزئی کے نام سے مشہور تھا۔[2]

اس اثنا میں احمد شاہ درانی کو خراسان میں شاہ رخ کے بیٹے مرزا نصر اللہ خان کی باغیانہ سرگرمیوں کی طرف متوجہ کیا گیا۔ جو مشہد اور اس سے متعلق ایرانی علاقوں کو آزاد کرانے کی فکر میں تھا۔ لیکن اس کے پاس کچھ زیادہ فوج نہ تھی۔ اس نے ۱۱۸۱ھ ہجری (۱۷۶۸ء) میں کریم خان ژند کے دربار میں جاکر امداد حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے

---

[1] GANDA SINGH.

[2] G.P. TATE.

کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس کے بعد اس نے اپنی توجہ کردوں کی طرف مبذول کی اور ۱۱۶۶ھ میں ان کے علاقے میں جا کر ان سے امداد طلب کر لی۔ بجناران میں کردوں کے سردار جعفر خان، یوسف علی اور نقد علی نے چھ ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا اور اسے کچھ جواہرات بھی پیش کر دیئے جو ان کو نادر شاہ کے قتل کے موقعہ پر ہاتھ آئے تھے۔ بعض دوسرے سرداروں نے جن میں محمد حسین ظفرانلو، رضا قلی خان پسر محمد رضا خان خمپکلو اور دولت خان شدلو شامل تھے اس کے پاس ملازمت اختیار کر لی۔ محمد حسین کا بیٹا الله ور[illegible]ی خان حاکم کچن بادل ناخواستہ اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ مرزا نصر اللہ خان نے اسے قید کر دیا۔ اس واقعہ سے کردوں کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ابھی یہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ان کو خبر ملی کہ احمد شاہ خراسان کی طرف کوچ کرتے ہوئے ہرات پہنچ گیا ہے۔ مرزا نصر اللہ نے کردوں کے ساتھ اپنے اختلافات ختم کر کے کچن کے حاکم کو بھی رہا کر دیا۔[1]

احمد شاہ درانی کو جب نابینا شاہ رخ کے بیٹے مرزا نصر اللہ کی حرکتوں کا علم ہوا تو اس نے ہرات کے راستے اپنی فوج لے کر ۱۱۸۳ھ ہجری (۷۰ - ۱۷۶۹ء) میں خراسان کی طرف کوچ کیا۔ اس سے پیشتر نابینا شاہ رخ کو احمد شاہ درانی ہی نے بلند حوصلگی اور سخاوت سے کام لے کر مشہد

---

[1]:- G. P. TATE.

کی حکومت پر بحال کر دیا تھا۔ اور اس کی سرپرستی کا بیڑا بھی اٹھایا تھا تاکہ اس کے دشمن اس کا کچھ بگاڑ نہ سکیں۔[1]

شاہ نے اس موقعہ پر خان نصیر خان کے نام بھی فرمان جاری کر کے خواہش کی تھی کہ وہ اپنا لشکر لے کر مشہد پہنچے۔ خان میر نصیر خان بھی اپنا لشکر لیکر مشہد پہنچنے سے پیشتر شاہ کی فوج کے ساتھ مل گیا تھا۔[2]

احمد شاہ کی فوج نے تربت شیخ اور سنگر پر قبضہ کر لیا۔ مرزا نصر اللہ اپنی فوج کو لے کر فوراً مشہد چلا آیا۔ اس نے شاہ رخ کی ایما پر اپنے چھوٹے بھائی نادر مرزا کو امداد حاصل کرنے کے لئے کریم خان ژند کے پاس روانہ کر دیا۔ مرزا نادر نے راستہ میں طبس جا کر اس کے حاکم علی مردان خان سے بھی ملاقات کی جو کاخک کے جنوب مغرب میں اس سے ایک سو ساٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر واقعہ ہے۔ علی مردان خان اس کی مدد پر تیار ہو گیا اور شاہ کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی فوج منظم کر لی۔ اسی اثناء میں شاہ مشہد پہنچ گیا اور اس نے مشہد کا محاصرہ کر لیا۔ مرزا نصر اللہ نے قلعہ کے دروازے بند کر دیئے اور اس کے استحکامات کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔[3]

مرزا نصر اللہ وقتاً فوقتاً قلعہ کے اندر سے فوجی ٹولیاں بھیج کر محاصرین پر حملے کروایا کرتا تھا اور وہ افغان فوج پر گولیاں چلا کر انغانوں

---

[1] :- G. P. TATE	[2] :- GANDA SINGH.
[3] :- GANDA SINGH.

کے اُن تک پہنچنے سے پیشتر بھاگ کر قلعہ کے اندر گھس جاتے تھے
اس قسم کے ایک حملے میں افغان فوج کے آٹھ سو افراد ہلاک ہو گئے۔
ابھی مشہد کا محاصرہ جاری تھا کہ شاہ کو اطلاع ملی کہ علی مردان خان اور
مرزا نادر طبس سے کمک لے کر مشہد کی طرف آ رہے ہیں۔ احمد شاہ نے تورچاکی
رسول خان کو چار ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج دے کر ان کے مقابلے پر بھیجا
لیکن ایرانیوں نے گناباد میں اس کو شکست دی اور افغان فوج کے کوئی ایک
سو پچاس افراد اس لڑائی میں ہلاک ہو گئے۔ اس کے بعد شاہ نے اپنے دو
نامور سپہ سالاروں سردار جہان خان پوپلزئی اور قلات کے حکمران خان میر نصیر
خان بلوچ کو آٹھ ہزار گھوڑ سوار اور چھ ہزار پیادہ پاہیوں پر مشتمل ایک
فوج دے کر ان کے مقابلے پر روانہ کر دیا جب وہ سلطان آباد پہنچے
تو سلطان آباد کا حاکم ایک دوسرے قلعہ میں منتقل ہو گیا اور اسی رات کو
مرزا نادر اور علی مردان خان بھی اس کے ساتھ آ کر مل گئے۔ دوسرے دن
علی مردان خان نے اپنی فوج لے کر افغانوں پر حملہ بول دیا۔ لیکن جونہی
وہ نزدیک پہنچا افغانوں نے گولی چلائی اور وہ ہلاک ہو گیا۔ ایرانی فوج
بھاگ نکلی ۔ مرزا نادر سلطان آباد کی طرف بھاگ نکلا۔ سردار جہان خان
اور خان نصیر خان نے اس کا پیچھا کیا۔ لیکن وہ مشہد کی طرف بھاگ نکلنے
میں کامیاب ہو گیا۔ احمد شاہ درانی مشہد پر گولہ باری کر کے امام رضا کے
مزار کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شاہ ولی خان کے توسط سے احمد شاہ
شاہرخ اور نصراللہ مرزا کے درمیان مصالحت ہو گئی۔ شاہ مشہد میں داخل

ہوگیا اور شادی ناطوں کے ذریعے دونوں فریق کے درمیان دوبارہ دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ مرزا نصراللہ نے شاہ کو اپنی اطاعت گزاری کی علامت کے طور پر ایک نہایت خوبصورت سفید گھوڑا پیش کیا۔ اور احمد شاہ نے خوش ہو کر مرزا نصراللہ کو فرزند خان کا خطاب دیا۔ شاہ نے خراسان کی حکومت شاہ رخ کے ہاتھ میں رہنے دی اور اس کے بیٹے یزدان بخش کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ قندھار لے گیا۔ اس نے جون ۱۷۷۰ء میں قندھار کی طرف مراجعت کی۔[1]

احمد شاہ درانی نے جون ۱۷۷۲ء میں وفات پائی اور اس کا بیٹا شہزادہ تیمور، تیمور شاہ کے نام سے اس کا جانشین بنا۔

۱۱۹۷ھ ہجری (۱۷۸۳ء) میں سندھ کے حکمران میاں عبدالنبی کلہوڑہ نے اپنے دربار کے ایک معتمد امیر میر بجار ٹالپر کو درباری سازشوں کے نتیجہ میں قتل کر دیا اور ٹالپر بلوچوں کے خوف سے بھاگ کر قلات میں خان میر نصیر خان کے ہاں پناہ لی جس کے ساتھ خان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ میر بجار کے بیٹے میر عبداللہ نے جس کو سندھ کے بلوچوں نے اپنا سردار تسلیم کر لیا تھا۔ میاں عبدالنبی کو سندھ کی حکومت سے معزول کر کے اس کی بجائے میاں صادق علی کلہوڑہ کو کسی تاریک اور گمنام گوشے سے نکال کر سندھ کے مسند پر بٹھا دیا۔ میاں عبدالنبی خان کے پاس قلات اور گنجابہ میں قیام پذیر تھا۔ اور چاہتا تھا کہ خان میر نصیر خان ٹالپر بلوچوں کے خلاف

---

[1] GANDA SINGH.

اس کی مدد کر کے سندھ کی حکومت اسے واپس دلا دے۔ آخر کچھ ردوکد کے بعد خان نے گنجابہ سے ایک لشکر تیار کر کے میاں عبدالنبی کے ساتھ کر دیا اور سردار زہری میر زرک کو اس لشکر کا سرگردہ مقرر کیا۔ میاں عبدالنبی اور میر زرک اپنا لشکر لے کر لاڑکانہ پہنچے اور اس کے بعد آگے بڑھے۔[۱]

میر عبداللہ ٹالپر کو جب اس حملے کا علم ہوا تو وہ میاں صادق علی کلہوڑہ کو لے کر اپنی فوج کے ساتھ پل جالک کے قریب میاں عبدالنبی اور میر زرک کے مقابلے پر آیا۔ میاں عبدالنبی کے ساتھ جتوئی کھوسہ اور بہمردی بھی تھے جو سندھ میں اس کے وارد ہونے کے بعد اس کے ساتھ آکر مل گئے تھے۔ میاں صادق علی اور میر عبداللہ کی فوج میں کلہوڑے ٹالپر اور نظامانی بلوچ شامل تھے۔[۲]

دونوں فریقوں کے درمیان پل جالک کے مقام پر ایک خونریز جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں میاں عبدالنبی کی فوج کو میر عبداللہ، میر فتح خان، میر فتح علی خان اور میر سہراب خان ٹالپر بلوچوں نے میاں صادق علی کی قیادت میں عبرتناک شکست دی اور سردار میر زرک زرک زئی نے اسی لڑائی میں داد شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ میاں عبدالنبی دوبارہ گنجابہ اور قلات کی طرف بھاگ نکلا۔ خان میر نصیر خان نے اس کی ذاتی اخراجات کی کفالت کے لئے حاجی شہر کی نصف مالگذاری مقرر کر

---

[۱]:۔ تحفتہ الکرام   [۲]:۔ تحفتہ الکرام

دی اور وہ اپنی والدہ اور بال بچوں کے ساتھ حاجی شہر میں مقیم ہو گیا
یہ واقعہ ۱۷۸۰ء میں پیش آیا[۱]

میاں عبدالنبی اس شکست کے بعد کابل جا کر تیمور شاہ کے دربار
میں حاضر ہوا اور اپنے حالات سنا کر اس سے امداد طلب کر لی۔ ۱۷۸۱ء
کے موسم خزاں میں خانِ خاناں سردار مدد خان اسحاق زئی تیمور شاہ
کے حکم سے افغانوں کی ایک فوج لے کر سندھ کی طرف روانہ ہوا۔ اس
موقعہ پر تیمور شاہ نے خان میر نصیر خان سے بھی ایک فرمان بھیج کر
خواہش کی کہ وہ بھی اپنا لشکر لے کر مدد خان کے ساتھ شامل ہو جائے
اور سندھ میں فوجی کارروائیوں کے دوران اس کی مدد کرے۔ ان ایام میں
خان میر نصیر خان بیمار تھا۔ اس نے اپنی طرف سے اخوند ملا فتح محمد اور اپنے
دوسرے سرداروں کی قیادت میں ایک لشکر مدد خان کی مدد کے لئے
سندھ روانہ کر دیا۔ میر عبداللہ تالپر اور دوسرے تالپر سرداروں نے بہاولپور
جا کر محمد بہاول داؤد پوترہ کے ہاں ڈیراوڑ کے قلعہ میں پناہ لی۔ خان خاناں
کی فوج نے بہاولپور اور سندھ کو خوب تاخت و تاراج کر کے بے اندازہ
مالِ غنیمت جمع کر لیا اور عام لوگوں پر خوب ظلم ڈھائے۔ خان خانان
میاں عبدالنبی کو دوبارہ سندھ کی حکمرانی پر بحال کر کے واپس افغانستان
چلا گیا۔ اخوند ملا فتح محمد اور دوسرے سرداروں نے بھی اپنا لشکر لے کر
گنجابہ اور قلات کی طرف مراجعت کی[۲]

---

[۱] تحفۃ الکرام   [۲] تحفۃ الکرام

میاں نور محمد اور ٹالپر سرداروں کے درمیان خصومت بدستور موجود تھی۔ میاں عبدالنبی نے دھوکہ اور فریب سے میر عبداللہ اور میر فتح خان ٹالپر کو گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ قتل کے ان واقعات سے ٹالپر بلوچ بہت زیادہ مشتعل ہو گئے اور اپنا لشکر لے کر میاں عبدالنبی کلہوڑہ کے مقابلے پر نکلے۔ دونوں فریقوں کے درمیان ہالانی بیلانی کے مقام پر ایک شدید جنگ ہوئی۔ انتقام کے جذبہ کے تحت بلوچ بڑی بے جگری سے لڑے۔ میاں عبدالنبی نے میر فتح علی خان اور میر سہراب خان کے ہاتھ سے بری طرح شکست کھائی۔ وہ گنجابہ اور قلات کی طرف بھاگ نکلا اور حاجی شہر میں مقیم ہو گیا۔ اس کو سندھ پر فقط چھ مہینے حکومت کرنے کا موقعہ ملا۔ یہ واقعہ ۱۷۸۱ء میں پیش آیا۔ اس شکست کے بعد سندھ سے کلہوڑوں کی حکومت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔[۱]

اس اثناء میں سندھ کی تقسیم پر ٹالپر برادران میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اسی دوران میاں عبدالنبی ڈیرہ جات میں مارا مارا پھر رہا تھا اس نے قمرالدین ناظم ڈیرہ جات کے توسط سے تیمور شاہ کو ایک بڑی رقم کی پیش کش کر کے اسے اپنی مدد پر راضی کر لیا۔ سردار احمد خان نورزئی تیمور شاہ کے حکم سے فوج لے کر ڈیرہ جات کے راستے سندھ کی طرف روانہ ہوا۔ تیمور شاہ نے اس موقعہ پر خان کے نام ایک فرمان بھیج کر خواہش کی کہ وہ بھی اپنا لشکر لے کر سندھ میں سردار احمد خان کے ساتھ

---

[۱] تحفۃ الکرام۔

شامل ہو جائے۔ خان نے اس فرمان کی فوری طور پر تعمیل کی اور اپنا
لشکر لے کر سندھ میں سردار احمد خان نورزئی کے ساتھ مل گیا۔ افغان فوج
نے سب سے پہلے بہاول پور کے علاقے کو تاخت و تاراج کیا اور
محمد بہاول داود پوترہ نے جو تالپیروں کا طرف دار تھا ڈیراوڑ کے قلعہ میں
پناہ لی۔ اس کے بعد افغان فوج سندھ کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ میر
فتح خان تالپیر بھی اپنا لشکر لے کر افغانوں کے مقابلے پر آگے بڑھا۔ دونوں
فریقوں کے درمیان ایک ندی کے کنارے ایک بڑی خونریز جنگ
ہوئی لیکن تالپیر بلوچوں کے ہاتھ سے افغان فوج نے شکست کھائی۔ سردار
احمد خان نورزئی اور میاں عبدالنبی کلہوڑہ کابل کی طرف بھاگ نکلے۔ اس
شکست کے بعد تیمور شاہ نے سندھ پر تالپیروں کی حکومت تسلیم کر لی۔[1] یہ
واقعہ بالاکنڈی کے مقام پر ۱۷۸۶ء میں پیش آیا۔

خان میر نصیر خان نے ۱۷۹۴ء کے موسم بہار میں وفات پائی۔ وہ
نہ صرف ایک عظیم رہنما تھا بلکہ وہ ایک عظیم انسان بھی تھا۔ وہ بلوچوں
میں نصیر خان نوری کے نام سے مشہور تھا۔

تیمور شاہ نے نصیر خان سے ایک سال پیشتر ۱۷۹۳ء میں وفات
پائی۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شہزادہ زمان شاہ زمان کے نام
سے اس کا جانشین بنا۔

---

[1] تحفۃ الکرام۔

چوبیسواں باب

میر محمود خان

خان میر نصیر خان کی وفات کے بعد قبائلی سرداروں نے اس کے بیٹے میر محمود خان کو قلات کی مسند پر بٹھایا۔ اس وقت میر محمود خان کی عمر فقط سات سال کی تھی۔ اس کی خورد سالی کے پیش نظر قبائلی سرداروں نے باہم مشورہ کر کے اس کے وزیر اخوند ملا فتح محمد کو اس کا اتالیق اور سربراہ (ریجنٹ) مقرر کر دیا۔ خان میر نصیر خان کی شخصیت اس قدر اعلیٰ وارفع اور جامع کمالات تھی کہ اس کے مقابلہ میں اس کے جانشین کی شخصیت بہت ہی چھوٹی نظر آتی تھی اس پر طرہ یہ کہ میر محمود خان صغیر سن ہونے کے علاوہ جسمانی اعتبار سے اس قدر کمزور اور نحیف تھا کہ وہ کسی کی نظر میں جچتا ہی نہیں تھا۔ اس کے باوجود قبائلی سردار اور عام لوگ اس کے باپ کی بلند شخصیت اخلاق حمیدہ بلند کردار شان و شوکت اور دبدبہ کی وجہ سے اس کی عزت کرتے تھے اور دل و جان سے اس کے طرفدار تھے۔[1]

نوجوان خان کی صغیر سنی اور کمزوری سے فائدہ اٹھا کر تخت کے

---

[1] - اخوند ملا محمد صدیق۔

ایک دعویدار میر بہرام خان نے جو میر حاجی خان کا بیٹا اور میر محبت کا پوتا تھا، ۱۷۹۴ء کے اوائل ہی میں کچھی میں خان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس موقعہ پر خان ڈھاڈر میں قیام پذیر تھا اور میر بہرام خان کی بغاوت کو فرو کرنے کی خاطر ڈھاڈر چلا آیا تھا۔

میر بہرام خان نے چند غیر معروف بلوچ براہوئی قبیلوں کے علاوہ سیوی کے مرغزانی، دہپال، خڑک اور صافی قبیلوں میں سے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر میر محمود خان کو ڈھاڈر کے قلعہ میں محصور کر لیا۔ یہ ایک بڑا نازک موقعہ تھا۔ خان کے پاس اس موقعہ پر سردار ملا محمد مینانی اور سردار میر نور محمد موسیانی کے علاوہ اور کوئی نامور شخص موجود نہیں تھا۔ اس صورتحال سے سب کو پریشانی ہوئی۔ میاں فتح اللہ بابی جو میاں حاجی عبدالرحیم بابی کا بیٹا تھا اور بی بی ستی نے خان کی صغیر سنی کے پیش نظر میر بہرام خان کو سمجھا بجھا کر قلعہ کا محاصرہ اٹھانے پر راضی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ راضی نہ ہوا اور قلعہ کا محاصرہ بدستور جاری رکھا۔ آخر کار جب دوسرے دن صبح سویرے میدانِ کارزار گرم ہوا اور دونوں مخالف لشکروں میں ایک زبردست معرکہ ہوا تو سردار ملا محمد رمینانی کی جرأت مندی اور حکمت عملی سے میر بہرام خان کے لشکر نے شکست کھائی۔ اس کے غیر معروف اور غیر منظم پیروکار میدان چھوڑ گئے۔ وہ خود سندھ کی طرف بھاگ نکلا۔[1]

اخوند ملا فتح محمد کے کندھوں پر خان کی ذات کی حفاظت اور اس

---

[1] میر گل خان نصیر

کی حکومت کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری آن پڑی تھی۔ اخوند کو معلوم تھا کہ میر بہرام خان شکست کھانے کے بعد کچھی میں اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔ اس نے خان کی ذات کی حفاظت کو زیادہ مقدم خیال کیا اور حسب معمول سردیوں کا موسم کچھی میں گزارنے کی بجائے خورد سال خان کو بحفاظت تمام اپنے ساتھ لے کر اسے قلات پہنچا دیا۔ جہاں خان کی حفاظت کے لئے معقول انتظامات موجود تھے۔ میر بہرام خان کو جب اخوند ملا فتح محمد کی کارروائی کا علم ہوا تو اس نے اخوند کی اس کارروائی کو کمزوری پر محمول کر کے کچھی میں دوبارہ اپنی باغیانہ سرگرمیاں تیز کر دیں اور علاقے کو تاخت و تاراج کرنا شروع کر دیا۔[۱]

شاہ زمان کے دونوں بھائی شہزادہ محمود اور شہزادہ ہمایوں اس کے مخالف تھے۔ شہزادہ محمود ہرات کا والی تھا جبکہ اس کا چھوٹا بھائی شہزادہ ہمایوں قندھار کا والی تھا۔ شہزادہ ہمایوں نے شاہ زمان کی تخت نشینی کے بعد اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اس کا بھائی محمود ہرات میں خاموش تماشائی بنا بیٹھا تھا لیکن اس بات کا امکان تھا کہ وہ کسی وقت بھی اپنے بھائی شہزادہ ہمایوں کی حمایت پر اٹھ کھڑا ہو جائے۔ شہزادہ ہمایوں ۱۷۹۳ء کے وسط میں شاہ زمان کے خلاف لڑائی کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے ابتدائی کارروائی کے طور پر اپنے بیٹے سلطان احمد اور اپنے عرض باشی شادی خان اچکزئی کو آٹھ ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج کے ساتھ

---

[۱] :- اخوند ملا محمد صدیق

قلات غلزئی کی طرف روانہ کر دیا جب پر شاہ زمان کی طرف سے شہاب الدین قابض تھا اور انہوں نے قلات غلزئی پر قبضہ کر لیا لیکن قلات غلزئی پر اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکے۔ اس موقعہ پر شہزادہ ہمایوں نے بھی باغ بیرو کے مقام پر جو قلات غلزئی سے صرف ۹ کلومیٹر کے فاصلے پر اس کے مشرق میں واقع ہے۔ شاہ زمان کے بھائی شہزادہ شجاع اور سردار سرفراز خان بارکزئی کے ہاتھ سے شکست کھائی اور بلوچستان کی طرف بھاگ کر قلات میں پناہ لی۔[1]

ابھی ایام میں احمد شاہ درانی کے وزیر با تدبیر شاہ ولی خان کا بیٹا مختار الدولہ شیر محمد خان شاہ زمان کا معتمد تھا۔ شیر محمد خان بامیزئی کو ان تعلقات کا پورا پورا علم تھا جو احمد شاہ درانی کے زمانہ میں خان نصیر خان اور شاہ ولی خان بامیزئی کے درمیان قائم تھے۔ اخوند ملا فتح محمد نے محسوس کیا کہ شاہ زمان امیر افغانستان کی امداد کے بغیر میر بہرام خان کی بغاوت فرو نہ ہو سکے گی۔ اس موقعہ پر اس بات کا امکان بھی موجود تھا کہ اس کی سرگرمیوں سے شر و فساد کا دروازہ اور زیادہ کھل جائے اور بعض قبائل سردار یا دوسرے لوگ لالچ میں آ کر اس کا ساتھ دیں۔ وہ یہ بھی تاثر دینا چاہتا تھا کہ خان کی پشت پر ایک طاقت موجود ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر اخوند ملا فتح محمد نے میر محراب خان شاہوانی کو کابل روانہ کر دیا تاکہ وہ مختار الدولہ شیر محمد خان بامیزئی کے توسط سے میر بہرام خان کی بغاوت

---

[1] G.P. TATE.

کو فرو کرنے کے لئے شاہ زمان سے امداد حاصل کرے۔ اخوند نے ایک عرضداشت بھی شاہ زمان کے نام اس کے ساتھ بھیج کر شاہ کو یاد دلایا کہ احمد شاہ درانی کے زمانہ میں خان میر نصیر خان نے حکومت افغانستان کے لئے جو گرانقدر خدمات سرانجام دی تھیں۔ ان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ شاہ زمان میر بہرام خان کی بغاوت کو فرو کرنے میں خورد سال خان کی مدد کرے۔ [1]

اسی اثناء میں شہزادہ ہمایوں نے بلوچستان میں پناہ لی اور اس کے بعد شکار پور چلا گیا اور وہاں سے دوبارہ قلات چلا آیا۔ شاہ زمان نے خان نصیر خان کے نام ایک فرمان بھیج کر اس سے خواہش کی تھی کہ وہ فوراً شہزادہ ہمایوں کو گرفتار کر کے بحفاظت تمام اپنی تحویل میں رکھے لیکن ۱۷۹۴ء کے موسم بہار میں میر نصیر خان کی وفات ہو گئی تھی اور اب میر محمود خان اس کا جانشین بنا تھا۔ شاہ زمان نے ایک فرمان اس کے نام بھیج کر اسے شہزادہ ہمایوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا لیکن میر محمود خان اپنی جواں سالی، ناتجربہ کاری اور میر بہرام کی بغاوت کی وجہ سے شہزادہ ہمایوں کو گرفتار کرنے میں ناکام ہوا اور شہزادہ ہمایوں اس کے ہاتھ سے بچ کر دوبارہ شکار پور چلا گیا۔ لیکن وہ شکار پور سے کسی دوسری طرف بھاگ کر نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ شاہ زمان نے ملتان بہاولپور اور سندھ کے حکمرانوں کے نام قبل از وقت فرامین روانہ کر کے شہزادہ ہمایوں پر فرار ہونے کے تمام راستے مسدود کر دیئے تھے اور وہ دوبارہ قلات

---

[1] :۔ اخوند ملا محمد صدیق۔

چلا آیا تھا۔[۵۳]

مئی ۱۷۹۳ء میں جب خان میر محمود خان کے ایلچی میر خراب خان
شاہوانی نے میر محمود خان اور آخوند ملا فتح محمد کی عرضداشت کابل میں شاہ
زمان کی خدمت میں پیش کر دی تو اس نے بر وقت کوئی کارروائی نہ
کی اور ۵ جون ۱۷۹۳ء کو قندہار کی طرف کوچ کیا۔ شاہ زمان خان میر محمود
خان کے رویہ سے مطمئن نہیں تھا اور اس کی طرفداری اور وفاداری کو
شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ شاہ زمان کی ناراضگی کے پیش نظر آخوند ملا فتح
محمد نے ایک دو مہینے کے اندر اندر شہزادہ ہمایوں کو گرفتار کر کے اپنی
تحویل میں رکھ لیا اور اس کی اطلاع مختار الدولہ شیر محمد خان بامیزئی کے
توسط سے شاہ زمان کو پہنچا دی۔[۵۴]

شاہ زمان کے حکم سے اگست ۱۷۹۳ء میں مختار الدولہ شیر محمد خان
بامیزئی دو ہزار سواروں پر مشتمل ایک فوج کو لے کر بلوچستان میں امن و امان
قائم کرنے، بہرام خان کی بغاوت کو فرو کرنے اور شہزادہ ہمایوں کا بازو حاصل
کرنے کی خاطر قندہار سے روانہ ہو گیا۔ اس نے سید خدادلو کو بھی اپنے ساتھ
لے لیا تاکہ شہزادہ ہمایوں کا بازو اس کے حوالے کیا جائے اور وہ اسے
شاہ زمان کے دربار میں پہنچا دے۔ مختار الدولہ شیر محمد خان کی روانگی کے وقت
خان میر محمود خان کے نام ایک فرمان بھیج کر اسے مختار الدولہ کی روانگی
کی اطلاع بھی قبل از وقت دے دی گئی اور اسے تاکید کر دی گئی کہ وہ

۵۳۔ G.P. TATE

۵۴۔ G.P. TATE

شہزادہ ہمایوں کا بازو شاہی فوج کے سپہ سالار کے حوالے کر دے تاکہ وہ اسے سید خداداد کے ذریعے شاہ زمان کے دربار میں پہنچا دے۔[1]

اخوند ملا فتح محمد نے مختار الدولہ شیر محمد خان بامیزئی اور سید خداداد کے قلات پہنچنے پر شہزادہ ہمایوں کا بازو مختار الدولہ کے حوالے کر دیا مختار الدولہ نے شہزادہ ہمایوں کو سید خداداد کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے شاہ زمان کے پاس بحفاظت پہنچا دے۔[2] اس کے بعد میر محمود خان اخوند ملا فتح محمد اور مختار الدولہ شیر محمد خان بامی زئی اپنے اپنے لشکر اور فوج کے ساتھ کچھی کی طرف درہ بولان کے راستے روانہ ہو گئے تاکہ افغان اور بلوچ لشکر مل کر میر بہرام کے خلاف کارروائی کر کے اس کی سرگرمیوں کا خاتمہ کر دیں۔ میر بہرام خان کا لشکر بولان کے آخری دہانے پر ان کا منتظر تھا۔ ان کو اس حملے کی اطلاع پہلے ہی سے مل گئی تھی اور وہ پوری تیاری کر کے آئے تھے۔ درہ بولان کے آخری دہانے پر دونوں فریقین کے درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی۔ میر بہرام خان کے لشکر نے مختار الدولہ خان اور اخوند کے ہاتھ سے بری طرح شکست کھائی اور وہ دوبارہ سندھ کی طرف فرار ہو گیا جہاں ۱۸۰۳ء میں اس کی وفات ہو گئی اور اس کی باغیانہ سرگرمیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔[3]

---

[1] G. P. TATE.

[2] ABID.

[3] اخوند ملا محمد صدیق

یہ خداداد نے شہزادہ ہمایوں کو قلات سے روانگی کے بعد راستہ ہی میں چھوڑ دیا۔ کاکڑ اور اچکزئیوں نے مل کر شہزادے کو قندہار پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی۔ شہزادہ حیدر جو شاہ زمان کا بیٹا تھا۔ اپنے چچا کا کھلے میدان میں مقابلہ کرنے کے لئے نکل آیا لیکن اس نے شکست کھائی اور شہزادہ حیدر زخمی ہو کر اپنے چچا ہمایوں کے ہاتھ گرفتار ہو گیا اور شہزادہ نے قندہار پر قبضہ کر لیا۔ شہزادہ حیدر کی فوج منتشر ہو گئی۔ [1]

اس موقعہ پر شاہ زمان نومبر ۱۷۹۴ء سے پشاور میں موجود تھا کہ شہزادہ حیدر کی گرفتاری اور قندھار پر شہزادہ ہمایوں کے قبضہ کی اطلاع اسے مل گئی۔ شاہ زمان پنجاب کی طرف ایک فوجی مہم روانہ کرنے کی غرض سے پشاور میں قیام پذیر تھا لیکن پنجاب کی طرف ایک فوجی مہم روانہ کرنے کے ارادے کو ترک کر کے اس نے گومل کے راستے درہ گوالارے سے ہو کر قندھار کی طرف کوچ کیا۔ ابھی وہ دریائے ارغنداب کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ شہزادہ ہمایوں کو اس کی آمد کی خبر مل گئی اور وہ قندھار چھوڑ کر اپنے بھائی شہزادہ محمود کے پاس ہرات کی طرف بھاگ نکلا۔ شاہ زمان جنوری ۱۷۹۵ء میں قندھار میں داخل ہو گیا۔ [2]

خان میر محمود خان اخوند ملا فتح محمد اور مختار الدولہ شیر محمد خان بامیزئی میر بہرام خان کی بغاوت کو فرو کرنے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ شاہ زمان کو اپنے دونوں بھائیوں شہزادہ ہمایوں اور شہزادہ محمود کے خلاف فوجی

ا۔ G. P. TATE   ۲۔ G. P. TATE.

کارروائی کرنے کی ضرورت پڑی اور شاہ زمان نے خان میر محمود خان کے نام ایک فرمان بھیج کر اس سے خواہش کی کہ وہ بھی اپنا بلوچ لشکر لے کر مختار الدولہ شیر محمد خان بامے زئی کے ساتھ قندہار پہنچ جائے۔ جنوری ۱۷۹۵ء میں شاہ قندہار میں موجود تھا کہ خان میر محمود خان اور اخوند ملا فتح محمد چھ ہزار افراد پر مشتمل اپنے لیویز کو لے کر مختار الدولہ شیر محمد خان بامیزئی کی معیت میں قندہار پہنچ گئے۔[۱]

شہزادہ ہمایوں نے اپنے بھائی شہزادہ محمود والی ہرات کو شاہ زمان کے خلاف بغاوت پر اکسایا تھا۔ ۳۰ جنوری ۱۷۹۵ء کو شاہ زمان نے قندہار سے ہرات کی طرف کوچ کیا۔ شہزادہ محمود کوئی انتہائی قدم اٹھانے کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے اپنی والدہ کو شاہ زمان کے پاس روانہ کیا۔ اس نے فراہ سے دو منزل آگے دلارام کے مقام پر شاہ زمان کے ساتھ ملاقات کی۔ یہ ملاقات موثر ثابت ہوئی۔ شاہ زمان نے اس کی سفارش پر اپنے بھائی شہزادہ محمود کو معاف کر دیا اور اس کی والدہ کو بیش قیمت تحائف دے کر رخصت کیا۔[۲]

شاہ زمان کا وزیر رحمت اللہ خان سدوزئی تھا۔ جس کو شاہ نے وفادار خان کا لقب دیا تھا۔ وہ مختار الدولہ شیر محمد خان بامے زئی کا بڑا مخالف اور اس کا حریف تھا۔ خان محمود خان کے تعلقات مختار الدولہ کے ساتھ بڑے

۱۔ ص ۱۰ G.P. TATE.

۲۔ ص ۵ ABID.

دوستانہ تھے۔ اسی وجہ سے اس موقعہ پر شاہ زمان کے وزیر نے خان محمود خان، اس کے وزیر اور سرداروں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس سے پیشتر خان، اس کے وزیر اور سرداروں کو اس قسم کے مواقع پر عموماً انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا لیکن اس موقعہ پر خان کے ساتھ بڑی سرد مہری کا برتاؤ کیا گیا[۵۶]۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ شاہ زمان کا وزیر وفادار خان ایک بڑا خود سر، مغرور اور تنگ نظر شخص تھا اس وزیر کے رویہ کی بنا پر تمام افغان امراء اور سردار شاہ زمان سے رفتہ رفتہ بدظن اور ناراض ہو گئے۔ اسی وزیر کا یہ احمقانہ رویہ بعد میں شاہ زمان کے زوال اور اس کی گرفتاری اور حکومت سے معزولی کا باعث بنا جب مختار الدولہ شیر محمد خان بامیزئی میر بہرام خان کی بغاوت کو فرو کرنے کی غرض سے افغان فوج لے کر بلوچستان آیا تھا تو اس سلوک کے برعکس خان محمود خان نے فوج کشی کے تمام اخراجات ادا کر دیئے تھے

شاہ زمان ہرات کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد کابل چلا گیا۔ اس موقعہ پر شہزادہ ہمایوں نے ایک تجارتی کاروان کو لوٹا اور اس ناجائز دولت کے بل بوتے پر اس نے ایک فوج تیار کر کے قندھار پر دوبارہ چڑھائی کی لیکن قندھار سے پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر اس کے مغرب میں باغ مریض کے مقام پر ۹ اگست ۱۷۹۵ء کو سردار احمد خان نورزئی نے اسے شکست فاش دی اور وہ دوبارہ بلوچستان کی طرف بھاگ نکلا۔ ۲۹ ستمبر

---

[۵۶] G. P. TATE

۱۷۹۵ء کو شاہ زمان کو اطلاع ملی کہ کشمیر میں بغاوت ہوئی ہے جس کا سرگروہ میاں خان بلوچ تھا اور اس نے بغاوت کرکے کشمیر کے نائب والی محمد خان کو گرفتار کرلیا ہے۔ شاہ زمان نے میاں خان بلوچ کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے مختار الدولہ کو فوج دے کر کشمیر روانہ کردیا اور خود پشاور جاکر سردیوں کا موسم پشاور میں گذارنے کا فیصلہ کیا۔[1]

اسی اثناء میں شہزادہ ہمایوں قندہار میں شکست کھانے کے بعد بوچیانی پہنچا۔ اس نے سیوی پر قبضہ کرکے کچھی میں گڑبڑ پیدا کرنے کے بعد اپنے بیٹے اور صرف چودہ پیروکاروں کے ساتھ بھاگ کر دریائے سندھ کو عبور کرلیا اس کی آمد کی اطلاع لیہ کے نائب صوبیدار کو ملی۔ اس نے شہزادہ ہمایوں اس کے بیٹے شہزادہ احمد اور اس کے پیروکاروں کو گھیرے میں لے کر ان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ اس کشمکش میں لڑائی کے دوران شہزادہ ہمایوں کے سارے پیروکار اور اس کا بیٹا شہزادہ احمد سب ہلاک ہوگئے اور اسے بڑی مشکل سے گرفتار کرلیا گیا اس موقعہ پر شاہ زمان پشاور کی طرف جاتے ہوئے نملا کے مقام پر فروکش تھا کہ ۲۰ر اکتوبر ۱۷۹۵ء کو اسے شہزادہ ہمایوں کی گرفتاری کی اطلاع ملی۔ شاہ زمان نے فوراً نملا سے کچھ معتمد آدمی بھیج کر شہزادہ ہمایوں کو پشاور منگوالیا اور اس کی آنکھوں میں سلائی پھروا کر اسے اندھا کردیا۔ شاہ زمان ۱۰ر دسمبر کو پشاور پہنچا تھا اور ۳۰ر دسمبر کو شہزادہ ہمایوں کو لیہ سے پشاور پہنچا کر اس کے سامنے پیش کردیا گیا۔ شاہ زمان اکوڑہ کے

---

[1] :- G.P.TATE.

مقام پر تھا کہ مختار الدولہ نے کشمیر سے میاں خان بلوچ کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کر دیا۔ شاہ نے اسے معافی دے دی۔ اس کے بعد شاہ زمان اٹک کے قلعہ کے استحکامات کا معائنہ کرنے کے بعد جنوری ۱۷۹۶ء میں پشاور پہنچا۔ یہاں سے اس نے کابل کی طرف مراجعت کی۔[1]

۱۷۹۶ء کے موسم خزاں میں شاہ زمان نے ہندوستان پر دوبارہ فوج کشی کی۔ وہ پشاور سے ہوتے ہوئے اٹک کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کر کے جہلم پہنچا۔ یہاں اس نے مختار الدولہ شیر محمد خان بامے زئی کو جو قندھار کے درانی قبائل سے ایک بڑی فوج اکٹھی کر کے لے آیا تھا۔ اپنے ہراول دستے کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ یکم جنوری ۱۷۹۷ء کو وہ لاہور میں بلا مزاحمت داخل ہو گیا۔ سکھ سرداروں کے ساتھ جن میں لاہور کے سردار لہنا سنگھ۔ امرتسر کے سردار گلاب سنگھ وزیر آباد کے سردار رنجیت سنگھ اور گجرات کے سردار صاحب سنگھ زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ اس کا سلوک بڑا مصالحانہ تھا۔ شاہ زمان کو ابھی لاہور میں ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اسے اپنے بھائی شہزادہ محمود کی ہرات میں بغاوت کی اطلاع ملی اور اسے مجبوراً ۔ ۳۰ جنوری ۱۷۹۷ء کو واپس کابل کی طرف کوچ کرنا پڑا۔ وہ پشاور سے ہوتے ہوئے مارچ ۱۷۹۷ء میں کابل پہنچا اور ہرات پر چڑھائی کرنے کے لئے تیاری شروع کر دی۔[2]

اس موقعہ پر شاہ زمان نے خان محمود خان کے نام ایک فرمان

۱؎ :- G. P. TATE

۲؎ :- ABID.

بھیج کر اس سے خواہش کی کہ وہ بھی اپنا لشکر لے کر اس کی مدد پر کابل پہنچ جائے. خان میر محمود خان اور اخوند ملا فتح محمد اپنے قبائلی سرداروں کو لے کر اپنے بلوچ لشکر کے ساتھ شاہ زمان کی مدد پہ کابل پہنچے. اس نے شہزادہ قیصر کو اپنے ہراول دستے کا سپہ سالار بنا دیا۔ احمد خان نورزئی شاہ پسند خان اسحاق زئی اور کچھ دوسرے درانی سردار اس کے صلاح کار اور مشیر بن کر اس کے ساتھ ہو گئے. شاہ زمان نے جہان داد خان اور خان میر محمود خان کو بلوچ بے قاعدہ سوار دستوں کے ساتھ ہرات کے ارد گرد کے علاقے کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنی فوج کا بڑا حصہ لے کر ۸ر ستمبر ۱۷۹۶ء کو ہرات کی طرف روانہ ہو گیا جہاں داد خان اور میر محمود خان نے ادبہ کے مقام پر شہزادہ محمود کے تین سو سواروں کو جو اس کی حمایت میں نکلے تھے گرفتار کر کے ادبہ کے علاقے پر قبضہ کر لیا شہزادہ محمود اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور اس نے ایک اضطراری کیفیت کے تحت شہزادہ قیصر کے ہراول دستے کا مقابلہ کرنے کی غرض سے ہرات کے قلعہ سے باہر نکل کر مورچے سنبھال لئے لیکن شاہ زمان کے وزیر وفادار خان کے ورغلانے پر اس کے اپنے پیروکاروں نے شاہ زمان کے طرفدار بن کر قلعہ کے دروازے اس پر بند کر دیئے اور قلعہ کی دیواروں سے اس پر گولیاں چلائیں. شہزادہ محمود نے انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنے توپخانے کی مدد سے قلعہ پر گولے برسائے لیکن اس پر قبضہ کرنے میں ناکام ہو گیا. آخر کار شہزادہ قیصر کی آمد کے خوف سے وہ اپنے بھائی فیروز الدین اور اپنے بیٹے کامران

کو ساتھ لے کر ہرات سے بھاگ نکلا۔ شاہ زمان نے شہزادہ قیصر کو ہرات کا والی مقرر کر دیا اور زمان خان بامے زئی کو اس کا معاون اور مشیر مقرر کر کے ہرات میں چھوڑ دیا۔ وہ کچھ عرصہ ہرات میں قیام کرنے کے بعد قندھار کی طرف لوٹ آیا۔ خان میر محمود خان اور اخوند ملا فتح محمد اپنے قبائلی سرداروں اور اپنے بلوچ لشکر کے ساتھ قندھار ہی سے شاہ سے رخصت ہو کر قلات کی طرف روانہ ہو گئے۔ شاہ زمان نے کابل کی طرف مراجعت کی دسمبر ۱۷۹۷ء کے اوائل میں وہ کابل پہنچا[1]

جنوری ۱۷۹۸ء میں شاہ زمان دوبارہ پشاور کے راستے سفر کرتے ہوئے پنجاب میں داخل ہو گیا۔ اس موقعہ پر سکھ پنجاب کی سرحدی پہاڑیوں کی طرف بھاگ نکلے تھے۔ اس نے مزید کوئی کارروائی نہ کی اور سردار احمد خان بارک زئی کو بدستور لاہور کی صوبیداری پر بحال رکھا اور واپس کابل چلا آیا۔ اس کی غیر حاضری میں شہزادہ محمود نے دوبارہ ہرات پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اسے کائنات کے عرب حکمران امیر علی کی حمایت بھی حاصل تھی جس نے اس کو فراہ کا قبضہ بھی دلایا تھا لیکن شہزادہ قیصر اور زمان خان بامے زئی نے کچھ جعلی خطوط لکھ کر اس کے حمایتیوں کے نام روانہ کر دیئے جو جان بوجھ کر پکڑوائے گئے تھے جس کے نتیجے میں وہ فراہ کو چھوڑ کر کبوتر خانہ کی طرف بھاگ نکلا۔[2]

۱ـ G. P. TATE

۲ـ ABID.

اکتوبر ۱۷۹۸ء میں شاہ زمان دوبارہ پشاور سے ہوتے ہوئے بلا مزاحمت پنجاب میں داخل ہوگیا اور لاہور جا پہنچا۔ اب کی بار بھی اس کا رویہ سکھ سرداروں کے ساتھ مصالحانہ تھا۔ اس نے اس موقعہ پر محسوس کیا کہ سکھوں کی حمایت حاصل کئے بغیر وہ پنجاب پر اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس نے سردار رنجیت سنگھ کو لاہور کا صوبیدار مقرر کر دیا۔ اس تقرری سے سکھوں کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہوگئی۔ جنوری ۱۷۹۹ء میں وہ پشاور پہنچا اور یہاں سے کابل کی طرف مراجعت کی۔ کابل میں وارد ہونے کے بعد اس نے قندھار کی طرف کوچ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ ایران فتح علی خان خراسان کی بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر نیشاپور اور سبزوار کے والیوں کے خلاف فوجی کارروائیوں میں مصروف تھا اور اس سے خراسان پر شاہ افغانستان کی بالادستی کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔[۱]

اس اثناء میں شاہ زمان کے خود سر وزیر وفادار خان کی بدسلوکی اور غرور کی وجہ سے جس کو شاہ زمان کی طبیعت پر بے حد قابو حاصل تھا۔ درانی سردار اس سے بدظن ہوگئے اس پر طرہ یہ کہ وفادار خان نے جو مختارالدولہ شیر محمد خان بامے زئی کا حریف تھا۔ اس کی ہتک کر کے درانی سرداروں کو اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ دوسری طرف ہندوستان پر شاہ زمان کے بار بار حملوں سے جس کی ترغیب اسے ہندی مسلمان امراء اور شہزادگان کی طرف سے ملتی رہتی تھی۔ ہندوستان میں ہر سال شاہ زمان کے حملہ کی

۱:- G. P. TATE.

خبر سنتے ہی ہندوستان کے غیر مسلم باشندوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا تھا۔ اور ان میں بے چینی پیدا ہو جاتی تھی۔ اسی بنا پر انگریز شاہ زمان کے ہندوستان پر بار بار کے حملوں کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جن کا مقصد اسلام اور ہندی مسلمانوں کو کافروں کے دست برد سے نجات دلانا تھا اور یہ ہندی مسلمان ہی تھے کہ جنہیں اپنی نجات ہندوستان پر شاہ افغانستان کی بالادستی اور تسلط ہی میں مضمر نظر آتی تھی۔[1]

انگریزوں نے اپنے ایک گماشتہ بمبئی کے ایک تاجر مہدی علی خان کے توسط سے جو شاہ ایران کا شناسا تھا۔ شاہ ایران سے رابطہ قائم کر کے اسے ہرات پر فوج کشی کرنے کی ترغیب دی جس کے لئے شاہ زمان کے بھائی شہزادہ محمود کو آسانی سے آلۂ کار بنایا جا سکتا تھا تاکہ ہندوستان کو شاہ افغانستان کے بار بار کے حملوں سے نجات حاصل ہو سکے۔[2]

۱۸۰۰ء میں جبکہ شاہ زمان قندھار میں موجود تھا۔ شاہ زمان اور اس کے وزیر وفادار خان کے خلاف ایک زبردست سازش کا انکشاف ہوا جس میں اکثر ممتاز درانی سردار ملوث تھے۔ شاہ زمان نے ان سب کو قلعہ کے اندر بلا کر ایک ایک کر کے قتل کر دیا۔ اور اس سازش میں ملوث دوسرے لوگوں کی تلاش شروع کر دی۔ پائندہ خان (سرفراز خان) جو اس سازش کے سرغنوں میں سے تھا کے بیٹے فتح خان بارک زئی نے گرفتاری اور

---

[1] :- G. P. TATE

[2] :- ABID.

قتل کے خوف سے اپنے دوسرے بھائیوں اور قبیلہ کے خاندانوں کے ساتھ قندہار سے بھاگ کر نادعلی کے قلعہ میں پناہ لی اور خود ترشز جاکر شہزادہ محمود کے ساتھ شامل ہو گیا جہاں وہ کچھ عرصے سے قیام پذیر تھا اور اسے شاہ ایران کی سرپرستی حاصل تھی۔ [1]

سنہ ۱۸۰۰ء کے اواخر میں شاہ شجاع نے شاہ زمان کو پنجاب میں سکھوں کی روز افزوں باغیانہ سرگرمیوں کے متعلق اطلاع دی اور وہ فوراً اپنی فوج لے کر پشاور اور پنجاب کی طرف روانہ ہو گیا۔ فتح خان بارک زئی نے شاہ زمان کی روانگی کی خبر سنتے ہی شہزادہ محمود کو قندہار پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی۔ وہ دونوں سیستان کے راستے قندہار کی طرف روانہ ہو گئے۔ فتح خان بارک زئی نگرشس کے مقام پر علیحدہ ہو کر بلند کی طرف چلا گیا تاکہ وہ وہاں سے اپنے قبیلہ کے افراد کو جمع کر کے لائے۔ اس موقعہ پر گرشک کا قلعہ خالی تھا۔ شہزادہ محمود نے اس پر قبضہ کر لیا اور یہ باغیوں کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ شاہنواز خان بارک زئی نے قندھار سے شہزادہ محمود کو قندہار اور کابل کے درمیان برف پگھلنے سے پیشتر قندہار پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تاکہ راستہ بند ہونے کی وجہ سے قندہار کے والی مہر علی خان اسحاق زئی کو کابل سے کوئی کمک نہ پہنچ سکے۔ [2]

مہر علی خان اسحاق زئی پانچ ہزار پیادہ اور گھوڑ سوار افراد پر مشتمل

لہ ۱ - G. P. TATE

لہ ۲ - ABID.

ایک فوج لے کر شہزادہ محمود کے مقابلے پر قندھار سے باہر نکل آیا لیکن گشک نخود کے جنوب میں باغ ہرمز کے مقام پر شکست کھائی اور قندھار کی طرف بھاگ کر قلعہ بند ہو گیا لیکن فتح خان بارک زئی کسی طرح قلعہ کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا اور مہر علی خان اسحاق زئی پشاور کی طرف بھاگ نکلا۔[ش]

شاہ زمان ہندوستان پر فوج کشی کا منصوبہ ملتوی کر کے پشاور سے قندھار کی طرف چل پڑا۔ اور غزنی سے ایک ہزار گھوڑ سوار افراد پر مشتمل ایک فوج سردار احمد خان نور زئی کی قیادت میں اپنے بھائی کے مقابلے پر روانہ کر دی۔ دونوں فریقوں کے درمیان قلات غزنی اور مکر کے درمیان ایک شدید جنگ ہوئی۔ نور زئی سردار نے وفادار خان کی بد سلوکی سے ناراض ہو کر اس نازک موقعہ پر شاہ زمان کا ساتھ چھوڑ دیا اور شاہ زمان کی فوج نے شکست کھائی۔[۹]

شاہ زمان نے کابل پہنچ کر اپنے خزانے اور زر و جواہرات جلال آباد کی طرف منتقل کر دیئے اور اپنے بھائی شجاع کو پشاور سے اپنی مدد پر بلایا۔ کابل کے باشندے کابل شہزادہ محمود کے حوالے کر کے اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ شجاع الملک خیبر کے قبائل اور یوسف زئیوں سے ایک بڑی فوج منظم کر کے اپنے بھائی کی مدد کو آیا لیکن جلال آباد سے پچپن کلومیٹر کے فاصلے پر آشیان کے مقام پر شاہ زمان کی فوج نے شکست کھائی۔ شاہ زمان اور وفادار خان اپنی فوج سے کٹ کر عاشق شنواری کے

ش :: G.P. TATE   ۹ :۔ ABID.

قلعہ میں جا پہنچے۔ عاشق نے ان کو گرفتار کر کے اس کی اطلاع شہزادہ محمود کو دے دی۔ شہزادہ محمود نے ان کی گرفتاری کے لئے فتح خان بارکزئی کے بھائی کو ایک سو گھوڑ سواروں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ وہ شاہ زمان اور وفادار خان کو گرفتار کر کے شہزادہ محمود کے پاس لے آیا۔ شہزادہ محمود نے اپنے بھائی شہزادہ ہمایوں کے انتقام میں شاہ زمان کی آنکھوں میں گرم سلائی پھروا کر اسے اندھا کر دیا۔ فتح خان بارک زئی نے وفادار خان اور اس کے بھائی کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ ۱۸۰۰ء میں پیش آیا۔ شاہ زمان کی عمر اس وقت ستیس سال تھی اور وہ کافی عرصہ زندہ رہا۔[۱]

محمود نے ۲۵ جولائی ۱۸۰۰ء کو شاہ محمود کے لقب سے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس نے شہزادہ قیصر کو معزول کر کے اپنے بھائی فیروزالدین کو ہرات کا والی مقرر کر دیا فتح خان بارک زئی اس کا وزیر بنا۔[۲]

ان واقعات سے کچھ عرصہ پیشتر شاہ زمان کے دور اقتدار میں کچھ تاجروں نے شاہ افغانستان سے شکایت کی کہ مینگل اور بزنجو قبیلوں کے افراد اپنے اپنے علاقوں میں تجارتی کاروانوں سے بہت زیادہ بدرگہ وصول کرتے ہیں جو ان کی استطاعت سے زیادہ ہے۔ شاہ زمان نے ان شکایات کو رفع کرنے کی خاطر اپنے دو نمائندوں نوروز خان اور گل محمد کو خان میر محمود خان کے پاس روانہ کر دیا۔ اور خواہش کی کہ وہ اس قسم کے بیجا مطالبات کرنے والے افراد کے خلاف ضروری کارروائی کرے۔ خان میر محمود خان

---

[۱]: G. P. TATE [۲]: G. P. TATE.

اخوند ملا فتح محمد اپنے بھائی میر مصطفےٰ خان ۔ کچھ سرداروں اور شاہ زمان کے فرستادہ نمائندوں کو اپنے ساتھ لے کر خضدار پہنچا ۔ اس نے مینگلوں اور بزنجوں کو اپنے روبرو طلب کر لیا اور ان کو تجارتی کاروانوں سے اس قسم کے مطالبات کرنے سے منع کیا ۔ مینگلوں نے فوراً خان کے حکم کی تعمیل کی لیکن بزنجو قبیلہ کے لوگ اس کے لئے تیار نہ ہوئے اور لڑائی کی غرض سے اپنے دشوار گذار پہاڑوں پر جا کر مورچے سنبھال لئے ۔ اخوند ملا فتح محمد نے میر مصطفےٰ خان کو اپنے ساتھ لے کر بزنجوں کے ٹھکانوں پر حملہ کر دیا ۔ اس لڑائی کے دوران سردار ملا محمد رئیسانی کا آمنا سامنا سردار فقیر محمد بزنجو سے ہوا اور سردار فقیر محمد بزنجو اپنے کوئی پچاس پیروکاروں کے ساتھ اس کے ہاتھ سے ہلاک ہو گیا ۔ اس نے سردار فقیر محمد بزنجو کے بیٹے میر کہیرا خان کو گرفتار کر کے خان کے سامنے پیش کر دیا بزنجو تجارتی کاروانوں سے بیس روپے سے لے کر پچیس روپے تک فی بار کی شرح سے بدرگہ وصول کرتے تھے ۔ یہ تنازعہ کچھ عرصہ قائم رہا چونکہ اس تنازعہ میں بزنجو قبیلہ کے سردار کے علاوہ کئی دوسرے لوگ ہلاک اور زخمی ہو گئے تھے ۔ لہٰذا خان محمود خان نے بزنجوں کو اپنے علاقے میں تجارتی کاروانوں سے چار روپے فی بار کی شرح سے بدرگہ وصول کرنے کی اجازت دے دی اور میر کہیرا خان کو بزنجو قبیلہ کا سردار تسلیم کر لیا ۔ [۱]

---

[۱] ۱۰۔ اخوند ملا محمد صدیق ۔ نیز گزٹیر آف قلات سٹیٹ

۱۸۱۰ء میں شاہ زمان کا بھائی شجاع الملک افغانستان کا تخت دوبارہ حاصل کرنے کی خاطر پشاور سے ایک بڑی فوج لے کر جلال آباد کی طرف روانہ ہوا لیکن اسی آشپان کے میدان میں شکست کھائی اس شکست سے وہ پشاور سے بھی محروم ہوگیا اور غلزئیوں کے علاقے میں جاکر پناہ لی[1]

شاہ محمود کو اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد غلزئیوں کی ایک ہمہ گیر بغاوت کا سامنا کرنا پڑا جو افغانستان پر اپنی بالادستی قائم کرنے کے لئے اس موقعہ کو غنیمت خیال کر کے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے وہ درانیوں کے تسلط سے آزاد ہوکر ایک خود مختار غلزئی ریاست قائم کرنے کے خواہشمند تھے انہوں نے عبدالرحمان خان ہوتکی کو اپنا بادشاہ اور شہاب الدین کو اس کا وزیر بنا دیا۔ لیکن غلزئیوں میں ضبط و ربط کا فقدان تھا۔ وہ اپنے ناقص ہتھیاروں سے درانیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے جن کو اپنے توپخانہ کی مدد حاصل تھی۔ اور ان کی فوج منظم اور تربیت یافتہ تھی۔ درانیوں کے مقابلے میں غلزئیوں کی تعداد بھی کم تھی۔ درانیوں نے دو تین معرکوں میں شکست دے کر ان کی طاقت توڑ دی۔ شاہ محمود کا زیادہ وقت غلزئیوں کی بغاوت فرو کرنے میں گزرا[2]

اس اثناء میں شجاع الملک شال پہنچا اور سردیوں کا موسم اسی وادی میں گذار۔ انہی ایام میں اس نے قندھار پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرنے

۱:۔ G.P. TATE.   ۲:۔ G. P. TATE.

کی کوشش کی لیکن ناکام ہوا۔ اس کے بعد اس نے ڈیرہ جات کی سرحد کے نزدیک وادی بوری میں جا کر قیام کیا۔ جہاں شہزادہ قیصر اور مدد خان اسحاق زئی اس سے جا کر مل گئے۔ کچھ مدت کے بعد اس نے زرمات کے علاقے میں جا کر غلزیوں کی حمایت حاصل کی اور وہ ان سے ایک فوج منظم کرنے لگا۔ ؎

اس دوران کابل میں ایک خطرناک حادثہ رونما ہوا۔ شیعہ فرقہ کے ایک بدمعاش نے سنی فرقہ کے ایک لڑکے کو اغوا کر لیا جس کی وجہ سے کابل کے سنی اور شیعہ فرقوں کے درمیان زبردست فساد برپا ہو گیا۔ اور ۴ اور ۵ جولائی ۱۸۰۳ء کو دونوں فرقوں نے ہتھیار اٹھا کر کشت و خون کا بازار گرم کر دیا۔ سنیوں کو اس موقعہ پر کابل کے مضافات سے زبردست مدد حاصل ہو رہی تھی۔ اس سے شیعوں کے استیصال اور نیست و نابود ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس موقعہ پر وزیر فتح خان ہزاروں کے علاقوں میں جا کر مالیہ وصول کرنے میں مصروف تھا اور کابل میں موجود نہ تھا۔ شاہ محمود نے شیعوں کو بچانے کی خاطر اس معاملہ میں مداخلت کی اس پر سنی فرقہ کے لوگ سخت برافروختہ ہو گئے۔ انہوں نے شجاع کو زرمات کے علاقہ سے الیتمور آنے کی دعوت دی اور ان کا ایک وفد اسے الیتمور سے ۱۳ جولائی ۱۸۰۳ء کو کابل لے آیا۔ شاہ محمود نے بالاحصار کے قلعہ میں داخل ہو کر اس کے دروازے اپنے اوپر بند کئے۔ فتح خان وزیر نے اسے کمک

؎ :- G.P.TATE .

پہنچانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا محمود نے ہتھیار ڈال دیے۔ اسے گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ شاہ زمان کے بیٹے شہزادہ قیصر نے چھ ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج کی مدد سے قندہار پر قبضہ کر لیا۔ محمود کا بیٹا شہزادہ کامران فراہ کی طرف اور وزیر فتح خان ژدب میں توبہ کی طرف بھاگ نکلا جو شال کے شمال میں واقع ہے[1]

شجاع الملک شاہ شجاع کا لقب اختیار کر کے افغانستان پر حکومت کرنے لگا۔ اکرم خان اس کا وزیر بنا۔ شاہ شجاع نے پہلا یہ کام کیا کہ عاشق شنواری کو گرفتار کر کے کابل میں توپ سے اڑا دیا۔ اور اس سے کوہ نور اور فرخاج بھی واپس لے لئے جو اس نے شاہ زمان سے چھین لیے تھے[2]

شاہ شجاع قندہار میں شہزادہ قیصر (جس نے فتح خان کی انگیخت پر اس کے خلاف بغاوت کی تھی) کی بغاوت کو فرو کرنے کے بعد سنہ ۱۲۲۱ ہجری (۷-۱۸۰۶ء) میں سندھ میں وارد ہوا۔ ایک بہت بڑی فوج اس کے ہم رکاب تھی۔ اس نے شکارپور میں شاہی باغ کے مقام پر تین مہینے تک قیام کیا۔ افغانستان میں بدنظمی کے سبب سندھ کے ٹالپر حکمرانوں نے کئی سال سے خراج ادا نہیں کیا تھا۔ شاہ شجاع نے ان سے بیس لاکھ روپے وصول کر لئے[3] اس موقعہ پر خان میر محمود خان نے بھی جو گنجابہ میں قیام پذیر تھا اخوند ملا فتح محمد اپنے بھائی میر مصطفےٰ خان اور اپنے بعض سرداروں

---

[1] :- G. P. TATE

[2] :- G. P. TATE

[3] :- تحفۃ الکرام۔

کی معیت میں شکارپور میں حاضر ہوکر باریابی حاصل کر لی اور کچھ دن شاہ کے پاس شکارپور میں قیام کیا۔ شاہ نے خان میر محمود خان اخوند ملا فتح محمد اور سرداروں کو انعام واکرام سے نوازا اور ان کو عزت سے رخصت کر دیا۔ وہ خود پشاور سے ہوتے ہوئے کابل چلا گیا اور گرمیوں کا موسم کابل میں گزارا۔[۱]

شاہ شجاع کو اس دوران چین نصیب نہیں ہو سکا۔ اسے متواتر فتح خان، شہزادہ قیصر اور شہزادہ کامران کی بغاوتوں کا سامنا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ شہزادہ محمود بھی جو کابل میں قید تھا بالاحصار کے قلعہ سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور فراہ میں جا کر شہزادہ کامران اور فتح خان بارکزئی کے ساتھ شامل ہوگیا۔ جنہوں نے مارچ ۱۸۰۹ء میں قندھار پر قبضہ کرنے کے بعد شاہ شجاع کے ہاتھ سے شکست کھائی تھی اور فراہ کی طرف پسپا ہوئے تھے۔[۲]

۱۸۰۹ء کے اواخر میں شاہ شجاع پشاور سے دوبارہ سندھ میں وارد ہوا جہاں میر محمود خان بھی اس موقعہ پر اخوند ملا فتح محمد میر مصطفےٰ خان اور اپنے سرداروں کی معیت میں شاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور باریابی حاصل کی۔ شاہ شجاع نے شکارپور میں اپنے قیام کے دوران سندھ کے[۳] امیر حکمرانوں سے بیس لاکھ روپے حاصل کر لئے اور ڈیرہ جات کے راستے واپس پشاور چلا گیا اور اس نے اس موقعہ پر بھی خان میر محمود خان اس کے وزیر اور

۱؎ اخوند ملا محمد صدیق۔

۲؎، ۳؎ G. P. TATE

سرداروں کو انعام و اکرام سے نوازا اور انہیں عزت کے ساتھ رخصت کیا۔[1]

اس اثناء میں جبکہ خان میر محمود خان شاہ شجاع کے قیام سندھ کے دوران سندھ میں قیام پذیر تھا۔ علی شیر کھیپر بگٹی نے کچھی میں ڈاکہ ڈال کر اسے لوٹا اور بہت سے مویشی ہانک کر زبردستی اپنے ڈیرہ کی طرف لے گیا۔ سندھ سے واپسی کے بعد خان میر محمود خان نے اپنے چھوٹے بھائی میر مصطفےٰ خان کو ایک لشکر دے کر اسے بگٹی راہزنوں کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے روانہ کیا۔ میر مصطفےٰ خان نے شنگک کے ڈیرہ پر حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کیا اور لوٹ کا تمام سامان اور مال مویشی چھین کر بگٹی قبیلہ کے کئی افراد کو تہ تیغ کیا۔ اس کارروائی کی وجہ سے علی شیر بگٹی پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا اور اس نے سردار ملا محمد رئیسانی کے پاس جا کر پناہ لی۔ میر مصطفےٰ خان اسے قتل کرنا چاہتا تھا لیکن سردار ملا محمد رئیسانی کی سفارش پر اسے قتل کرنے کی بجائے گرفتار کر کے گنجابہ میں خان محمود خان کے سامنے پیش کر دیا اس نے خان سے معافی مانگ لی اور سردار ملا محمد رئیسانی کی سفارش پر خان نے اس کی تقصیرات سے درگذر کر کے اسے معاف کر دیا اور خلعت دے کر اسے اپنے ڈیرہ کی طرف جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد کوہستان سلیمان کے بلوچوں نے کچھی میں کبھی ڈاکہ ڈالنے کی جرأت نہ کی اور تائب ہو گئے۔[2]

---

[1] ا۔ اخوند ملا محمد صدیق

[2] ا۔ اخوند ملا محمد صدیق

۱۸۰۹ء کے وسط میں شہزادہ محمود نے قندھار پر قبضہ کرنے کے بعد کابل کی طرف پیش قدمی کر کے شیعہ فرقہ کے رہنماؤں کی مدد سے کابل پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس موقع پر شاہ شجاع پشاور میں بدستور قیام پذیر تھا اس نے فوراً ایک فوج منظم کر کے پشاور کی طرف کوچ کیا۔ شاہ شجاع کو افغانستان میں مقبولیت حاصل نہ تھی۔ شیعہ فرقہ کے علاوہ سنی فرقہ کے لوگ اس کے خلاف تھے۔ کابل میں سنی فرقہ کے پیشوا میر واعظ ہی نے شہزادہ محمود کو بالا حصار کے قلعہ سے فرار ہونے میں مدد دی تھی۔ کابل سے شہزادہ محمود بھی اپنی فوج لے کر پشاور پر چڑھائی کرنے کی غرض سے روانہ ہوگیا۔ نملہ کے مقام پر شاہ شجاع اور شہزادہ محمود کی فوجوں میں ایک شدید جنگ ہوئی۔ شاہ شجاع کی فوج نے شہزادہ محمود اور فتح خان کے ہاتھ سے زبردست شکست کھائی اور اس کا وزیر اکرم خان لڑائی کے دوران ہلاک ہوگیا۔ اس فتح کے بعد شہزادہ محمود افغانستان کا بادشاہ بنا اور اس نے شاہ محمود کا لقب اختیار کر لیا۔ شجاع الملک نے راولپنڈی میں جاکر پناہ لی۔ اس کے بعد اس نے لدھیانہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔[1]

سنہ ۱۲۲۴ ہجری (۱۸۰۹-۱۰ء) میں میر مصطفےٰ خان نے اپنی بہن بی بی زینب اور چند دوسرے معتبرین کی انگیخت پر احمد زئی خاندان کے پیشوا میاں روح اللہ کو جو حاجی میاں عبدالرحیم بابی کا بیٹا تھا حج کی رات

---

[1] ۱- G. P. TATE

گنجابہ میں بلاوجہ ادریگنا شہید کر دیا۔[1]

خان میر محمود خان نے اسی دوران بی بی زینب کی سفارش پر اس کے بھائی میر مصطفےٰ خان کو کچھی کا حاکم مقرر کر دیا۔ ۱۸۸۱ء کے موسم خزاں میں میر مصطفےٰ خان اس کی بہن بی بی زینب اور اس کا بھائی محمد رحیم گنجابہ گئے اور میر مصطفےٰ خان نے کچھی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میر مصطفےٰ خان اپنے بھائی میر محمود خان کی نسبت اعلیٰ قابلیت کا مالک تھا۔ اس نے کچھی میں نظم و نسق قائم کر کے چوروں اور ڈاکوؤں کا خاتمہ کر دیا۔ جنہوں نے آئے دن ڈاکہ ڈال کر کچھی کے باشندوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا اور یہ شر پسند عناصر دن دھاڑے لوٹ مار کا بازار گرم کر کے عام لوگوں میں خوف و ہراس کا باعث تھے۔ درہ بولان کا راستہ خصوصیت کے ساتھ اس قسم کی سرگرمیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ سراوان کے قبائل کا یہ دستور تھا کہ وہ موسم خزاں میں اپنے مویشیوں اور بھیڑ بکریوں کو لے کر درہ بولان کے راستے کچھی جا کر سردیوں کا موسم کچھی میں گزارتے تھے اور موسم بہار میں اسی راستے سے ان کی واپسی کا سفر شروع ہو جاتا تھا۔ ان چوروں اور ڈاکوؤں کی وجہ سے درہ بولان میں چند خاندانوں یا افراد کے لئے سفر کرنا ایک ناممکن بات تھی اور سینکڑوں خاندان مسلح ہو کر اس راستے پر سفر کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود درہ بولان کا راستہ عام لوگوں اور تجارتی کاروانوں کے لئے غیر محفوظ تھا۔ میر مصطفےٰ خان

---

[1] اخوند ملا محمد صدیق۔

نے کچھی کے نظم ونسق کو کچھ اس انداز سے مستحکم کر لیا کہ سارے علاقے میں چوروں اور ڈاکوؤں کا نام ونشان باقی نہ رہا۔ درہ بولان کی امن وامان کے زمرے میں یہ کیفیت تھی کہ "وہ قلات کا بازار معلوم ہوتا تھا"۔ کچھی میں امن وامان کی یہ کیفیت ہو گئی کہ شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے تھے۔ عام لوگوں کے ساتھ میر مصطفےٰ خان کا سلوک بڑا ہمدردانہ تھا جس کی وجہ سے تجارت اور زراعت میں خاطر خواہ ترقی ہوئی اور عام لوگوں کو خوشحالی نصیب ہوئی۔ اسی دوران اس نے کاکڑستان پر حملہ کر کے اس کو تاخت وتاراج کرنے کے بعد ہرنائی کے قلعہ کو بھی مسمار کر دیا اور کئی لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھ لے آیا۔[۵۸]

میر مصطفےٰ خان سندھ پر حملہ کر کے کورو (کراچی) کا ضلع سندھ کے تالپر حکمرانوں سے واپس لینا چاہتا تھا۔ جنہوں نے تیمور شاہ بادشاہ افغانستان کی منظوری سے اس ضلع پر قبضہ کر لیا تھا۔ خان میر نصیر خان اس زمانہ میں بیمار تھا۔ اسی سال تیمور شاہ نے بھی وفات پائی اور دوسرے سال خان نصیر خان بھی فوت ہو گئے۔ میر محمود خان اپنی صغیر سنی اور میر بہرام خان کی بغاوت کی وجہ سے اس ضلع کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے کوئی کارروائی نہ کر سکا۔ کورو ضلع کی اہمیت اس وجہ سے تھی کہ نہ صرف یہ ایک بندرگاہ تھی بلکہ یہاں کی وسیع زرخیز اراضیات کی آبپاشی کنوؤں سے کی جاتی تھی اور ان چاہی اراضیات سے حکومت کو کافی آمدنی ہوتی

۵۸۔ اخوند ملا محمد صدیق

تھی۔ سندھ کے تالپر حکمران اس حملہ کی تیاریوں کی خبر سن کر بڑے پریشان تھے۔ کیونکہ کورود کراچی اضلع کی کئی سال کی آمدنی دینی پڑتی تھی لیکن میر مصطفیٰ خان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس اولوالعزم نوجوان شہزادہ کے ساتھ عمر نے وفا نہ کی۔ وہ ایک دن کوٹرو سے مولوی کے علاقے کی طرف شکار کے لئے گیا ہوا تھا۔ جو گندادہ کے علاقے میں واقع ہے۔ اسی دن اس کا بھائی محمد رحیم اس سے لڑنے کے ارادے سے ایک لشکر لے کر شکار گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس موقعہ پر داروغہ مہر علی بھی میر مصطفیٰ خان کے ساتھ تھا۔ جب میر محمد رحیم اور اس کے دوسرے ساتھی دور سے نمودار ہو گئے تو میر مصطفیٰ خان نے داروغہ مہر علی کو ان گھوڑ سواروں کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ان کے پاس روانہ کر دیا۔ انہوں نے مہر علی کے پہنچتے ہی اسے قتل کر دیا۔ میر محمد رحیم کے پاس تیس نفر تھے اور میر مصطفیٰ خان فقط چھ سات افراد کے ساتھ شکار کے لئے گیا ہوا تھا۔ نزدیک پہنچتے ہی میر محمد رحیم خان نے اس پر گولی چلا دی اور وہ زخمی ہو گیا۔ لیکن زخمی ہونے کے باوجود اس نے تلوار نکال کر میر محمد رحیم کے سر پر ایک ضرب لگائی۔ لیکن یہ ضرب اس کے سر پر پوری طرح نہ پڑی اور اسے معمولی سا زخمی کیا۔ اس نے دوسرا وار بھی کیا۔ لیکن اس میں سکت باقی نہ رہی تھی اور میر محمد رحیم نے اس کے وار کو ہاتھ سے روک لیا اور اس کے بعد اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔[۱]

---

[۱]- GOURNEY TO KALAT CHARLES MASSON.

میر محمد رحیم سندھ کی طرف بھاگ گیا اور اس کے بعد داجل کے علاقے میں جاکر داجل کے نواب حیدر کو داجل سے نکال باہر کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد اسے کچھ لوگوں کی طرف سے خطوط موصول ہوئے۔ جن کی وجہ سے اسے امداد کی توقع پیدا ہو گئی اور وہ داجل سے چل کر کوہستان کی طرف آیا اور کچھی میں اس مقام پر ٹھہرا جہاں دریائے مولہ کا پانی مختلف نہروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس کی آمد کی اطلاع جونہی کہ اس کے بھائی میر احمد یار اس کے بیٹے میر سرفراز اور اس کی بہن بی بی زینب کو ملی تو وہ فوراً نو سو افراد پر مشتمل ایک لشکر لے کر اس کے مقابلہ پر گئے۔ میر محمد رحیم کے پاس فقط تیس افراد تھے۔ میر محمد رحیم خان اور اس کے ساتھی بڑی بہادری سے لڑے اور لڑائی کے دوران سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ روایت ہے کہ میر مصطفےٰ خان نے اپنی وفات سے تھوڑا عرصہ پیشتر بہاولپور کے حکمران سعادت خان کے ساتھ مل کر یہ منصوبہ بنایا تھا کہ دونوں ایک ساتھ سندھ پہ حملہ کر کے اسے آپس میں نصف نصف تقسیم کر لیں گے۔ وہ اسی منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ میر محمد رحیم نے اسے ہلاک کر دیا۔[1]

ان دنوں میر محمود خان کی طبیعت ناساز تھی لیکن وہ مجبوراً کچھی کے معاملات طے کرنے کے لئے کچھی گیا اور اس کے بعد واپس قلات چلا آیا۔ اسی اثناء میں بی بی زینب، میر احمد یار اور میر سرفراز خان دو لاکھ روپے

ف ۱۔ CHARLES MASSON.

اپنے ساتھ لے کر شاہ محمود اور فتح خان وزیر سے ملاقات کرنے کی غرض سے قندھار چلے گئے اور خان میر محمود خان کے خلاف شاہ افغانستان کے دربار میں سازش شروع کر دی۔ انہوں نے افغان امراء میں روپے تقسیم کر کے ان کو اپنا طرفدار بنانے کی کوشش کی۔ اس موقعہ پر شاہ محمود اور وزیر فتح خان کی جانب سے خان کو ایک فرمان موصول ہوا جس میں اسے تاکید کی گئی تھی کہ سراوان جھالاوان اور بلوچوں کا ایک لشکر تیار کر کے کچھی میں ان کا انتظار کرے کہ وہ عنقریب سندھ چلے آئیں گے[1]

میر محمود خان نے اس اثناء میں اپنے بیٹے میر محراب خان کو جو ابھی نوجوان تھا۔ ملا عبدالرحمن اور کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ شاہ محمود اور وزیر فتح خان کے پاس قندھار روانہ کر دیا تاکہ میر احمد یار خان اور بی بی زینب نے جو غلط فہمیاں شاہ محمود کے دربار میں پھیلائی تھیں ان کا تدارک کر کے ان غلط فہمیوں کو دور کرے۔ میر محراب خان کو اپنے مقصد میں پوری کامیابی ہوئی[2]

اسی دوران خان میر محمود خان سراوان جھالاوان اور کچھی سے ایک بڑا لشکر جمع کر کے کچھی میں شاہ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ ۱۸۱۱ء میں شاہ محمود اور وزیر فتح خان ایک بڑی فوج لے کر سندھ میں وارد ہوئے تاکہ وہ سندھ پر اپنی بالادستی کا مظاہرہ کر سکیں۔ سندھ میں کچھ دن قیام

---

[1] :۔ اخوند ملا محمد صدیق

[2] :۔ ایضاً

کرنے کے بعد وہ کچھی پہنچے. خان نے کچھی میں ان کا شاندار استقبال کیا اس کے بعد شاہ محمود اور وزیر فتح خان ڈیرہ جات اور ملتان کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس سفر کے دوران خان میر محمود خان بھی اپنے وزیر اعتمادیوں اور اپنے سرداروں میر محراب خان اور اپنے لشکر کے ساتھ ان کا ہمرکاب تھا۔ دین پورہ کے مقام پر شاہ نے ان کو انعام واکرام دے کر عزت کے ساتھ رخصت کر دیا۔[۱]

میر محمود خان اپنی آخری عمر میں بیمار رہا کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ دو تین سال تک خود گنجابہ میں مقیم رہا اور اس کا بیٹا میر محراب خان قلات میں قیام کرتا تھا۔ جب میر محمود خان کی بیماری بڑھ گئی تو اس نے اخوند ملا فتح محمد کو قلات روانہ کر کے اسے گنجابہ میں بلایا کیونکہ اب اسے زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں رہا تھا۔[۲]

اسی اثناء میں سردار محمد خان شاہوانی اور خزکوں کے درمیان سیوی میں کسی بات پر لڑائی ہو گئی۔ شاہوانیوں کے لشکر نے ہزیمت کھائی اور وہ سیوی سے کچھی کی طرف پسپا ہو گئے۔ اس شکست سے خان کو بڑا رنج ہوا۔ اس نے اخوند ملا فتح محمد اور میر محراب خان کو حکم دیا کہ وہ بھاگ سے سراوان کا لشکر جمع کر کے خزکوں سے شاہوانیوں کا بدلہ لیں۔ اخوند ملا فتح محمد اور میر محراب خان بھاگ جا کر لشکر جمع کرنے

---

[۱] اخوند ملا محمد صدیق

[۲] ایضاً

میں مصروف ہو گئے۔ سردار سمندر خان بارو زئی بھی خان کا طرفدار تھا اسی دوران خان کی بیماری بڑھ گئی۔ اس نے اخوند ملا محمد صدیق کو بھاگ روانہ کر کے اخوند ملا فتح محمد اور میر محراب خان کو فوراً اپنے پاس بلایا اسی موقعہ پر منصور خان درانی شکارپور سے قندھار جا رہا تھا۔ اخوند ملا فتح محمد نے اس کو بلا کر حاضر کر دیا۔ خان میر محمود خان نے ۱۲۳۲ھ ہجری (۱۸۱۶ء) میں گنجابہ میں وفات پائی۔[1]

خان میر محمود خان اگرچہ کمزور طبیعت کا مالک تھا۔ اس کے باوجود وہ ہر وقت عیش و عشرت میں مبتلا رہتا تھا۔ اس کے وقت کا بیشتر حصہ عورتوں کی صحبت میں گزرتا تھا۔ لیکن مردم آزاری کو اس نے کبھی بھی اپنا شیوہ نہیں بنایا اور زندگی بھر اس کے ہاتھ سے کسی شخص کو جانی و مالی نقصان نہیں پہنچا۔[2]

---

[1] :- اخوند ملا محمد صدیق

[2] :- ایضاً

پچیسواں باب

خان میر محراب خان ثانی

خان میر محمود خان کی وفات کے بعد قبائلی سرداروں اور معتبرین نے محرم الحرام ۱۲۳۰ھ ہجری (۱۸۱۶ء) میں اس کے بیٹے میر محراب خان کو گنجابہ ہی میں مسند پر بٹھا دیا۔ اس نے ایک ایسے وقت پر عنان حکومت سنبھالی جبکہ میر محمود خان کی کمزوریوں کی وجہ سے ملک کا نظم ونسق بڑی حد تک درہم برہم ہوگیا تھا۔ کاردر (کراچی بندر) کے ضلع کے علاوہ مکران کے مغربی علاقے بمپور، دیزک اور کسرقند وغیرہ ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ خاران، مکران اور لسبیلہ میں خان کا اقتدار برائے نام رہ گیا تھا لیکن میر محراب خان کی اپنی ذات بھی کمزوریوں سے مبرا نہ تھی۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ نظام حکومت کے مروجہ دستور غیر قلمبند سے انحراف کرکے ایک مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے حکومت کا کاروبار چلانا چاہتا تھا۔ اس کے اس رویہ کی وجہ سے رفتہ رفتہ سراوان اور جھالاوان کے قبائلی سردار، سرداران مکران، سردار خاران اور جام لسبیلہ اس سے بدظن ہو گئے اور وہ حکومت کے ساتھ عدم تعاون کرنے سے گریز کرنے لگے۔

خان میر محراب خان نے اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں ملک کے نظم و نسق کو درست کرنے میں پوری سرگرمی دکھائی اور اس کی گرفت مکران، خاران اور لسبیلہ پر مستحکم ہو گئی لیکن چھ مہینے کے اندر اندر جبکہ وہ بدستور گنجابہ میں قیام پذیر تھا۔ اسے میر مصطفےٰ خان کے چھوٹے بھائی میر احمد یار خان کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا جس کو میر جعفر خان اور اس کے بیٹے میر احمد خان مگسی کی حمایت حاصل تھی۔ اور وہ اس کو راتوں رات گھوڑے پر بٹھا کر اپنے ساتھ جھل لے گئے۔ مگسیوں کی اس حرکت سے خان کو بڑی تشویش لاحق ہو گئی۔ اس موقعہ پر سردار میر قادر بخش زرک زئی۔ سردار میر ولی محمد مینگل اور ملک دینار شاہی زئی کے سوا سراوان اور جھالاوان سے کوئی اور نامور شخص موجود نہ تھا۔ خان میر محراب خان نے میر عیسیٰ خان کو سردار میر قادر بخش زرک زئی کے پاس گاجان روانہ کر دیا۔ پہلے تو اس نے خان کے پاس آنے سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن اخوند ملا فتح محمد کے کہنے سننے پر وہ بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ ان دونوں نے سردار خان زند۔ بہرام خان بلیدی اور قلاتی دیناری کو اپنے ساتھ شامل کر کے ایک لشکر اکٹھا کر لیا اور خان کی مدد پر گنجابہ پہنچ گئے خان ان سب کو اپنے ساتھ لے کر جھل کے صدر مقام پنجک میں وارد ہوا۔ مگسیوں کو خان کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔ بلوچی رسم کے مطابق اخوند ملا فتح محمد میر احمد یار خان کے پاس جا کر اسے خان کے پاس لے آیا اور خان نے اس کو معاف کر دیا۔[1]

---

[1] اخوند ملا محمد صدیق

خان میر محمود خان کے عہدِ حکومت میں ایک غیر معروف خاندان نے جو تاریخ میں خاندان آغا علی کے نام سے مشہور ہوا خان کے دربار میں کسی قدر اثر و رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ اس زمانہ میں اس خاندان کو اس بنا پر اہمیت حاصل ہو گئی کہ سراوان اور جھالاوان کے دو متقدر سرداران اعلیٰ سردار میر مہراللہ خان رئیسانی اور سردار میر قادر بخش زرک زئی نے اس خاندان کے ساتھ شادی ناطہ کے تعلقات استوار کر لئے تھے اور چونکہ یہ دونوں سردار ملا عبدالرحمٰن ابنِ آغا علی کے داماد تھے اس خاندان کو اخوند زئی خاندان کے ساتھ ذاتی عداوت تھی۔

ایک طرف وزارت کو اپنے فرائض منصبی بجالانے میں دقت پیش آ رہی تھی اور خان محراب خان ایک مطلق العنان فرمانروا کے جذبہ کے تحت اخوند ملا فتح محمد کو وہ اختیارات استعمال کرنے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہ تھا جو اسے نظامِ حکومت کے مسلمہ دستور کے تحت اس کے عہدے کی مناسبت سے حاصل تھے تو دوسری طرف ملک کا نظم و نسق قبائلی اور علاقائی سرداروں کے عدم تعاون کی وجہ سے بری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ اس اثناء میں ایک نہایت ناخوشگوار حادثہ پیش آیا۔ جو بڑے دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ خاندان آغا علی زئی اور خاندان اخوند زئی کے درمیان جو عداوت چلی آتی تھی اس نے اس موقعہ پر شدت اختیار کر لی۔ سردار قادر بخش زرکزئی نے اپنے خسر ملا عبدالرحمٰن اور اس کے بیٹے ملا عبدالقادر کی انگیخت

پر اخوند ملا فتح محمد کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ملا عبدالقادر نے اس کو یقین دلایا تھا کہ اس معاملہ میں انہیں خان محراب خان کی حمایت حاصل ہے۔ ان دنوں اخوند ملا فتح محمد کی طبیعت ناساز تھی اور اس کے لئے بیمار پرسی کے لئے آنے جانے والوں کا ہجوم رہتا تھا جس کی وجہ سے سردار قادر بخش کو اپنے منصوبہ پر عمل کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ اس نے دفورِ جذبات میں اخوند کے فرزند ملا مبارک کو قتل کر دیا۔ اس قتل کے لئے کوئی وجہ جواز موجود نہ تھی۔ اس قتل سے خان میر محراب خان بہت زیادہ برافروختہ ہوگیا۔ بدقسمتی سے اس ارتکاب قتل کے بعد سردار میر قادر بخش اپنی جاگیر عماجان جانے کی بجائے جو گنجابہ سے نزدیک واقع ہے۔ بدستور گنجابہ میں خان میر محمود خان کی بیوہ بی بی لعل بی بی کے ہاں ٹھہرا رہا جس کے ساتھ وہ قرابت داری کا رشتہ رکھتا تھا خان پہلے دن عذر خواہی کی غرض سے اخوند ملا فتح محمد کے مکان پر گیا اور اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اسے بہت تسلی دی دوسرے ہی دن اس نے سردار قادر بخش کو گرفتار کر کے ملا مبارک کے قتل کے عوض میں قتل کر دیا۔ یہ بھی ایک المناک حادثہ تھا جس کے بڑے ہی دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ جھالاوان کے لوگ پہلے ہی خان سے بدظن تھے۔ خان محراب خان کی اس کارروائی سے وہ خان سے اور زیادہ ناراض ہو گئے۔ یہ واقعات رمضان المبارک ۱۲۳۲ھ ہجری (۱۸۱۷ء) میں پیش آئے۔[1]

---

[1] :۔ اخوند ملا محمد صدیق

اس اثناء میں افغانستان میں اہم واقعات رونما ہوئے شہزادہ فیروز الدین والی ہرات کے متعلق شبہ کیا جارہا تھا کہ وہ اپنی خود مختاری کی فکر میں ہے۔ ۱۸۱۶ء کے وسط میں شاہ محمود، شہزادہ کامران اور وزیر فتح خان کابل سے قندھار پہنچے۔ وزیر فتح خان اس کے بھائی دوست محمد خان پردل خان اور کہندل خان یہاں سے فوج لے کر ہرات کی طرف روانہ ہوگئے۔ وزیر فتح خان بظاہر شاہ محمود کے مفادات کو آگے بڑھانے میں بڑا کوشاں رہتا تھا لیکن درپردہ وہ اپنی طاقت کو مستحکم کرنے میں مصروف تھا اس نے اپنے بھائیوں کو جن کی تعداد بہت زیادہ تھی مختلف صوبجات کا والی مقرر کردیا تھا۔ اس کے اس رویہ سے شاہ محمود بھی مطمئن نہیں تھا اور اس کا بیٹا کامران خصوصیت کے ساتھ وزیر فتح خان کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو حسد کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس سے خوفزدہ رہتا تھا۔[1]

اس موقعہ پر اگرچہ شاہ ایران کے فرزند مرزا حسین علی کی قیادت میں ہرات پر ایرانی فوج کا حملہ متوقع تھا لیکن شہزادہ فیروز الدین نے وزیر فتح خان کی افغان فوج کو ہرات کے قلعہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ لیکن وزیر فتح خان کسی طرح سے قلعہ کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا اور قلعہ پر قبضہ کرنے کے بعد شہزادہ فیروز الدین کے خزانوں کی تلاش میں کچھ اتنی زیادہ مستعدی

۱؎ G.P. TATE

سے کام لیا کر شہزادہ فیروز الدین کے حرم کی حرمت کو بھی پامال کر کے شہزادی رقیہ بیگم کے ساتھ بھی بدسلوکی سے پیش آیا جو شہزادہ فیروز الدین کی بہو اور شاہ محمود کی بیٹی تھی۔ اس موقعہ پر وزیر فتح خان کا بھائی دوست محمد خان ہرات کے قلعہ سے حاصل کردہ خزانوں کی تقسیم پر اپنے بھائی فتح خان سے ناراض ہو کر اپنے بڑے بھائی سردار عظیم خان کے پاس چلا گیا جو کشمیر کا والی تھا۔[۱]

۱۸۱۷ء کے اواخر میں ایرانی فوج ہرات پر حملہ کرنے کی غرض سے مشہد سے روانہ ہو گئی۔ وزیر فتح خان اپنے بھائیوں سردار پردل خان اور سردار کہندل خان کی مدد سے

ایرانی فوج کا مقابلہ کرنے کی غرض سے ہرات سے آگے بڑھا۔ ایرانی فوج نے شکست کھائی اور ان کی یہ مہم بری طرح ناکام ہو گئی۔[۲]

اسی اثناء میں شہزادہ کامران اور شاہ محمود بھی ہرات پہنچے اور باغ زاغان میں فروکش ہوئے۔ انہوں نے رقیہ خانم کے معاملہ کو بہانہ بنا کر وزیر فتح خان کو اپنے پاس بلایا اور اس کی آنکھوں میں گرم سلائی پھروا کر اسے اندھا کر دیا۔ جونہی وزیر فتح خان کی گرفتاری کی خبر پھیلی۔ اس کے بھائی سردار پردل خان اور سردار کہندل خان بارکزئیوں کو اپنے ساتھ لے کر قندہار کی طرف روانہ ہوئے۔ وزیر فتح خان کے بھائی سردار

---

[۱]۔ G.P.TATE.　　[۲]۔ G.P.TATE.

عظیم خان کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے اپنے بھائی سردار دوست محمد خان کو فوج دے کر کابل کی طرف روانہ کر دیا۔ اس کے بعد خود پشاور پہنچا وہ شجاع الملک کو افغانستان میں برسر اقتدار لانا چاہتا تھا۔ اور اس کی اطلاع اس نے شجاع الملک کو بھی دے دی جو لدھیانہ میں قیام پذیر تھا لیکن پشاور میں اسے شاہ زمان کے چھوٹے بیٹے شہزادہ ایوب کی ذات میں ایک کٹھ پتلی مل جس کو وہ اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے آسانی کے ساتھ آلہ کار بنا سکتا تھا۔ ۱۸۱۸ء کے اوائل میں سردار دوست محمد خان نے کابل پر قبضہ کر لیا اور کابل کا والی شہزادہ جہانگیر نے قندہار کی طرف بھاگ کر اپنے باپ شہزادہ کامران کے ہاں پناہ لی۔ سردار عظیم خان شہزادہ ایوب کو ساتھ لے کر فوراً کابل پہنچا اور شہزادہ ایوب کو تخت نشین کر کے وہ خود اس کا وزیر بنا۔ اسی دوران شجاع الملک بھی سردار رنجیت سنگھ سے بچ بچا کر کابل پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن بارک زئی برادران نے اس سے لاتعلقی کا اظہار کر کے اسے دوبارہ ہندوستان کی طرف بھگا دیا[ے]

اسی دوران شاہ محمود اور شہزادہ کامران ایک زبردست فوج لے کر قندہار سے کابل کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں سردار دوست محمد خان ان کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ چار آسیا کے مقام پر دونوں فریقوں کے درمیان ایک جزوی لڑائی بھی ہوئی جس میں شہزادہ کامران کا پلہ بھاری رہا۔ لیکن بعض جعلی خطوط کی بنا پر شاہ محمود اور شہزادہ کامران

ے G. P. TATE.

اپنی لشکر گاہ میں غداروں کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے راتوں رات بھاگ نکلے اور ان کی یہ مہم بری طرح ناکام ہوئی۔ قندہار سے ان کی غیر حاضری کے بعد سردار پر دل خان نے قندہار پر قبضہ کر لیا۔ قلات غلزئی سے شاہ محمود اور شہزادہ کامران نے ہرات کی راہ لی جہاں وہ ایک عرصہ دراز تک برسر اقتدار تھے۔[۱]

میر احمد یار خان نے کچھ سیمابی طبیعت پائی تھی اس نے خان میر محراب خان کے خلاف اپنی پہلی بغاوت کے دوران مگسیوں میں مبلغ دس ہزار روپے تقسیم کر دیئے تھے تاکہ ان کی حمایت حاصل کر سکے خان میر محراب خان نے اس کو مطمئن رکھنے کے لئے اسے اتنی ہی رقم دے کر قلات میں قیام کرنے کی اجازت دے دی۔ اس نے دوسری دفعہ سیوی کے علاقے میں تلی جاکر دوبارہ قسمت آزمائی کی لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی اور خان کو اسے مزید دو ہزار روپے دینے پڑے تیسری بار داجل کی طرف بھاگ کر اس نے اس علاقے کو تاخت و تاراج کر دیا۔ لیکن خان نے اسے معاف کر دیا۔ چوتھی بار وہ سیوی کی طرف بھاگ نکلا اور خرشکوں کے علاوہ بعض سراوان کے قبائلیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور خان نے بڑی مشکل سے اس بغاوت کو بھی فرو کر دیا۔ اسے اس کی خطاؤں سے درگزر کرنا پڑا۔[۲] اس کے بعد میر احمد یار خان اور میر مصطفیٰ خان

---

[۱]:- G.P. TATE

[۲]:- CHARLES. MASSON.

کے بیٹے میر سرفراز خان سانگان میں مقیم ہو گئے۔ خان میر محراب خان ان سے بدستور خطرہ محسوس کرتا تھا۔ اس نے ملا عبدالرحمٰن اور اس کے بیٹے ملا عبدالقادر کو سانگان بھیج کر میر احمدیار خان اور میر سرفراز خان کو قلات آنے کی دعوت دی۔ ملا عبدالرحمٰن اور ملا عبدالقادر نے قرآن مجید پر حلف اٹھا کر ان کو یقین دلایا کہ خان میر محراب خان ان کو کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس یقین دہانی کے بعد وہ دونوں قلات چلے آئے اور کچھ عرصہ یہاں قلات میں قیام پذیر رہے۔ قلات میں ان کے قیام کو کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ خان نے ان کو گرفتار کر کے ان کے قتل کا حکم دے دیا اور ملا عبدالقادر نے اپنے ہاتھ سے میر احمدیار خان پر تلوار چلا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس واقعہ کے تھوڑا عرصہ بعد خود ملا عبدالرحمٰن اور ملا عبدالقادر کی باری آئی۔ خان میر محراب خان نے ان کو بھی گرفتار کر کے اپنے ہاتھ سے ان کا سر قلم کر دیا[1] ان پے در پے ارتکاب قتل سے عوام اور خواص کی نظروں میں خان کا وقار بعید مجروح ہو گیا اور ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ یہ واقعات جولائی اور اگست ۱۸۱۸ء میں پیش آئے۔

۱۸۱۹ء میں شجاع الملک لودھیانہ سے سندھ میں وارد ہوا اس نے سندھ میں اپنے قیام کے دوران سندھ کے ٹالپر حکمرانوں کے ساتھ ایک معاہدہ کر کے پانچ ہزار گھوڑ سواروں اور کچھ پیادوں پر مشتمل ایک فوج

---

[1] اخوند ملا محمد صدیق۔

تیار کر لی۔ اس کے پاس دس عدد توپیں بھی تھیں۔ وہ تمام سال شکارپور میں مقیم رہ کر اپنی فوج کو تربیت دینے میں مصروف رہا اور اس کی فوج ہر روز جنگی مشقیں کیا کرتی تھی وہ اپنے فوجی اخراجات کے لئے سندھ کے متمول لوگوں سے زبردستی روپے حاصل کیا کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے سندھ کے باشندے اس کی کارروائیوں سے سخت تنگ تھے۔ اس کے خلاف عیاشی کی شکایات بھی عام تھیں۔ سندھ کے تالپر حکمران بھی اس کے ہاتھوں تنگ تھے اور اس سے نجات حاصل کرنے کی تدبیریں سوچا کرتے تھے۔ انہوں نے شاہ ایوب اور سردار عظیم خان کو اپنے وکیلوں کے توسط سے سندھ آنے کی دعوت دی تاکہ ان کی مدد سے شجاع الملک کو سندھ سے باہر نکالا جا سکے اور ایک خطیر رقم شاہی فوج کے سفر کے اخراجات کے لئے بھی دینے کا وعدہ کیا۔ [۱]

سنہ ۱۸۲۰ء کے موسم سرما کے اختتام پر شاہ ایوب اور سردار عظیم خان کابل سے قندھار چلے آئے اور یہاں سے سندھ کی طرف روانہ ہو گئے انہوں نے خان میر محراب خان کے نام ایک فرمان بھیج کر خواہش کی کہ وہ بھی شاہ افغانستان کی آمد کے موقعہ پر اپنا لشکر اکٹھا کر کے کچھی میں ان کا انتظار کرے۔ خان میر محراب خان ان دنوں گنجابہ میں حسب معمول سردیاں گزارنے کی غرض سے قیام پذیر تھا۔ اس نے اخوند ملا فتح محمد کو شاہ افغانستان کا استقبال کرنے کی غرض سے ڈھاڈر روانہ کر دیا اور خود

---

[۱] تازہ نوائے معارک۔ منشی عطا محمد شکارپوری

بھاگ کے مقام پر شاہ افغانستان کا استقبال کیا۔ یہاں سے شکارپور تک وہ اپنے سرداروں اور لشکر کے ساتھ شاہ ایوب اور سردار عظیم خان کا ہمرکاب رہا۔ شکارپور پہنچنے کے بعد شاہ ایوب نے خان میر محراب خان اور اس کے سرداروں کو انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیا اور وہ گنجابہ چلے آئے۔[1]

شاہ ایوب اور سردار عظیم خان اپنے ساتھ تیس ہزار گھوڑ سواروں پر مشتمل ایک فوج لائے تھے۔ شجاع الملک کی مختصر فوج ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اس نے سندھ کو خیرباد کہہ کر لودھیانہ کی طرف مراجعت کی۔ ایک مہینہ قیام کے بعد شاہ ایوب اور سردار عظیم خان اپنی فوج لے کر کچھی کے علاقے میں وارد ہوئے اور یہاں سے قندھار کی طرف روانہ ہو گئے۔ خان محراب خان نے اخوند ملا فتح محمد کو ان کے ساتھ کر دیا اور وہ ڈھاڈر تک ان کے ہمرکاب تھا اس موقع پر شاہ افغانستان نے سندھ کے ٹالپر حکمرانوں سے دس لاکھ روپے وصول کئے۔[2]

سردار عظیم خان نے شجاع الملک سے نجات حاصل کرنے کے بعد اپنی توجہ پشاور اور سکھوں کی طرف مبذول کی اور اپنے ساتھ فوج لے کر پشاور کی طرف بڑھا۔ ۱۳ر مارچ ۱۸۲۱ء کو سردار رنجیت سنگھ نے جو ان دنوں پنجاب کا خود مختار حکمران تھا۔ دریائے سندھ عبور کر کے ڈیرہ

---

[1] اخوند ملا محمد صدیق

[2] ایضاً

بھی دن بارک زئی سردار کو ایک گھمسان کی لڑائی میں نوشیرہ کے مقام
پر شکست فاش دی۔ اس نے پشاور کو لوٹا اور خیبر تک کے علاقے کو
روند ڈالا۔ سردار عظیم خان اس شکست کے بعد کابل کی طرف لوٹا۔ لیکن
راستہ ہی میں اس کی وفات ہو گئی۔ [۵۱]

اخوند ملا فتح محمد خان محراب خان کے مطلق العنان رویہ سے متفق
نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ خان وزارت کے مشوروں کو یکسر نظر انداز
کر کے ملک کے نظم و نسق کو درہم برہم کرے اور ان اختیارات سے
بلا وجہ تجاوز کرے جو نظام حکومت کے دستور کے تحت اسے حاصل
تھے۔ اسی بنا پر خان محراب خان اخوند کے رویے کو ناپسندیدگی کی نگاہ
سے دیکھا کرتا تھا۔ دوسری طرف اس زمانہ میں ایک غیر ملکی شخص ملا داؤد
محمد غلزئی جو افغانستان کا ایک غیر معروف باشندہ تھا۔ خان کا منظورِ
نظر بن گیا اور خان نے اخوند ملا فتح محمد کو برطرف کر کے اس کی بجائے ملا
داؤد محمد کو وزارت کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ خان کا یہ قدم نظام حکومت
کے مروجہ دستور کے اصولوں کے منافی اور ان سے صریحاً انحراف کے
مترادف تھا۔ سراوان اور جھالاوان کے قبائلی سردار ملا داؤد محمد کی وزارت
کے عہدے پر تقرری کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان
سرداروں میں سردار مہر اللہ خان رئیسانی اس کا بڑا سخت مخالف تھا اور
اس کی تقرری کو نظام حکومت کے بنیادی اصولوں کے منافی خیال کرتا

---

[۵۱] :- G. P. TATE

تھا۔ انہی ایام میں مکران کے گچکی سرداروں نے مکران میں بغاوت کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ خان مکران کے حالات کو درست کرنے کی خاطر مکران کی طرف ایک لشکر کی قیادت کرنے کا خواہشمند تھا۔ لیکن جھالاوان اور سروان کے قبائلی سردار اس کے ساتھ تعاون کرنے سے عمداً گریز کرتے تھے اس عدم تعاون کی وجہ ملا داد محمد کی وزارت کے عہدے پر تقرری تھی۔[۱]

خان محراب خان سردیوں کا موسم کچھی میں گزارنے کے بعد ۱۸۲۲ء کے موسم بہار میں گنجابہ سے درہ مولہ کے راستے خضدار پہنچا اس نے خود خضدار میں قیام کیا۔ اور داروغہ گل محمد کو مستونگ کی طرف روانہ کر دیا تاکہ وہ سراوان کے قبائل سے ایک لشکر جمع کر کے اپنے ساتھ لائے لیکن سردار مہراللہ خان رئیسانی اور سردار محمد خان شاہوانی نے سراوان کے دوسرے سرداروں اور معتبرین کو اپنا ہم خیال بنا کر اور متفق کر کے مکران کی مہم کے لئے لشکر مہیا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جب خان محراب خان کو سراوان کے قبائلی سرداروں کے اس رویہ کی اطلاع ملی تو وہ خضدار سے قلات پہنچا اور اس نے اخوند ملا فتح محمد کو مستونگ روانہ کر دیا۔ تاکہ وہ سراوان کے قبائلی سرداروں کے ساتھ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ان کو لشکر مہیا کرنے پر راضی کرے۔ اخوند کو کسی قدر کامیابی حاصل ہوئی اور وہ سراوان کے قبائلی سرداروں کو اکٹھا کر کے ان کو اپنے ساتھ قلات لے آیا۔ لیکن

---

[۱] :- اخوند محمد صدیق

ملا داؤد محمد کے رویہ کی وجہ سے وہ اور زیادہ غیر مطمئن اور ناراض ہوگئے[1]

۱۸۳۲ء کے موسم خزاں میں سردیاں گزارنے کی غرض سے جب سراوان کے یہ قبائلی سردار اور معتبرین کچھی پہنچے تو انہوں نے وڈیرہ سردار خان رند اور میر بہرام خان بلیدی کو بھی اپنے ساتھ شامل کر کے کچھی میں شورش برپا کر دی اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی علی شیر کسپر مگٹی بھی اپنے لشکر کے ساتھ پہاڑوں سے اترا اور تجارتی کاروانوں کو لوٹ کر ہر طرف خوف و ہراس پھیلا دیا اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے خان محراب خان نے شاغاسی نور محمد کو جھالاوان روانہ کیا۔ تاکہ وہ جھالاوان سے ایک لشکر جمع کر کے خضدار میں اس کا انتظار کرے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ خود بھی خضدار پہنچا اور یہاں سے جھالاوان کے لشکر کے ساتھ کوچ کر کے درہ مولہ کے راستے سفر کرتے ہوئے کشتہ کے مقام پر ٹھہرا۔ اسی مقام پر سردار احمد خان مگسی اور غلام نبی منیری بھی جھل اور کچھی سے آن پہنچے اور باریابی حاصل کر کے خان کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ ان دونوں رہنماؤں نے سراوان کے قبائلیوں کے ساتھ شامل ہو کر شورش برپا کرنے سے عمداً گریز کیا تھا اور اس قسم کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے حق میں نہ تھے۔ اس کے بعد خان اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ گنجابہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ کچھی میں گاڈی کے قصبہ کو جلانے اور تاخت و تاراج کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جہاں قبائلیوں نے جمع آوری کی تھی۔ جب خان میر محراب خان کوڑد کے مقام پر پہنچا

---

[1] :- اخوند ملا محمد صدیق

توسراوان کے قبائلیوں کو خان کے لشکر کے ساتھ مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی. قبائلی سرداروں نے سیدہ بی بی نور خاتون سے استدعا کی کہ وہ مداخلت کرکے خان کو ان کے خلاف مزید کارروائی کرنے سے باز رکھے. سیدہ بی بی نور خاتون قرآن مجید لے کر خان کے پاس گئی اور اسے قرآنِ مجید کا واسطہ دے کر کارروائی کرنے سے باز رہنے کی تلقین کی. خان نے سیدہ بی بی نور خاتون کی مداخلت کی وجہ سے سراوان کے سرداروں کی خطاؤں سے درگزر کرکے ان کو معاف کر دیا اور قبائلیوں کے سرکردوں سردار مہراللہ خان رئیسانی سردار محمد خان شاہوانی وڈیرہ سردار خان رند اور میر بہرام خان بلیدی کو یرغمال بناکر اپنے ساتھ گنجابہ لے گیا. جہاں وہ ان کے ساتھ عزت اور خوش اخلاقی سے پیش آیا. اس موقعہ پر ان کو ان کے مرتبہ کے مطابق توشہ خانہ کے مد سے حسبِ دستور روز اور جیرو (نقد وجنس) ملاکرتا تھا. ان قبائلی سرداروں کو رخصت کرنے کے بعد خان جھالاوان کے لشکر کو اپنے ساتھ لے کر بھاگ میں وارد ہوا. یہاں سے اس نے ملا داؤد محمد اور اخوند ملا فتح محمد کو علی شیر گبٹی کے ڈیرے کی طرف جو کوہ سلیمان کے پہاڑوں میں واقع تھا روانہ کر دیا تاکہ وہ جھالاوان کے لشکر کی مدد سے گبٹیوں کو قرار واقعی سزا دے کر علی شیر گبٹی اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرکے اپنے ساتھ لائیں. ملا داؤد محمد اور اخوند ملا فتح محمد نے جھالاوان کے لشکر کو لے کر کوہ سلیمان کے پہاڑوں کا رخ کیا اور وہاں علی شیر گبٹی کے ڈیرے پر حملہ کرکے گبٹیوں کو قرار واقعی سزا دی اور علی شیر گبٹی کو اس کے چند ساتھیوں سمیت گرفتار کرکے اپنے

ساتھ گنجابہ لے آئے اور خان کے سامنے پیش کر دیا۔ ملا شیر گچکی اور اس کے ساتھیوں نے اپنی خطاؤں پر ندامت کا اظہار کیا اور خان کی اطاعت قبول کرلی۔ خان ان کی خطاؤں سے درگذر کر کے ان کے ساتھ بھی عزت سے پیش آیا۔ اس کے بعد ان کو بھی عزت سے رخصت کر دیا تاکہ وہ اپنے گھروں کو جا کر امن سے رہیں۔ [۱]

ملا داؤد محمد نے افغانستان کی مستبدانہ فضا میں پرورش پائی تھی وہ بلوچستان کے مسلمہ رواج اور دستور حکومت کے روایتی بنیادی اصولوں اور وزارت کے بنیادی فرائض سے قطعاً ناواقف تھا اس کو اس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ وزارت کا فرض اوّلین خان اس کے سرداروں اور عام قبائل کے درمیان خوشگوار تعلقات پیدا کرنا تھا تاکہ حکومت کا کاروبار خوش اسلوبی سے چل سکے۔ وہ استبداد اور جبر کے بل بوتے پر حکومت کا کاروبار چلانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک سخت گیر اور مستبدانہ رویہ اختیار کرنے سے وہ بے چینی دور ہو سکتی ہے جو خان کے مطلق العنان رویہ سے پیدا ہو گئی تھی۔

سردار میر مہراللہ خان رئیسانی ملا داؤد محمد کا سب سے بڑا مخالف تھا اور وہ اس بڑی رکاوٹ کو اپنے سامنے سے ہٹانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ ملا داؤد محمد کے رویہ اور وزارت کے عہدے پر اس کی تقرری کی وجہ سے جو شورشیں برپا ہو گئیں تھیں۔ وہ ان کی ذمہ داری بھی سردار میر

---

[۱] اخوند ملا محمد صدیق۔

مہراللہ پر ڈالتا تھا۔ اس شخص کو خان میر محراب خان کی طبیعت پر اس قدر قابو حاصل تھا کہ اس نے خان کو سردار میر مہر اللہ خان سے بہت زیادہ بدظن کر دیا۔ خان نے ۱۸۲۳ء کے موسم گرما میں ملا داؤد محمد کی ایماء پر اور اس کی انگیخت پر قلات میں سردار میر مہر اللہ خان کو طلب کر کے قتل کر دیا۔[1] بلوچستان کی تاریخ میں یہ ایک بڑا المیہ اور ایک خطرناک حادثہ تھا جو ملا داؤد محمد کی سازش سے رونما ہوا۔ اس واقعہ سے ملک کے طول و عرض میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ عام لوگوں کا اعتماد خان سے اٹھ گیا۔ جھالاوان کے قبائل سردار قادر بخش زرکزئی کے قتل کی وجہ سے پہلے ہی سے ناراض تھے اب اس نئے المیہ کی وجہ سے سراوان کے قبائل بھی خان سے بہت زیادہ بدظن اور ناراض ہو گئے اور ہر طرف خوف و ہراس پھیل گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سراوان کے سرداروں اور معتبرین کا ایک وفد جس میں سردار مہر اللہ خان کے فرزندان سردارزادگان میر اسد اللہ خان و میر عبدالکریم رئیسانی، سردار محمد خان شاہوانی، سید محمد شریف تریچی اور میر مصری خان شاہی زئی مینگل شامل تھے شنگ گئے اور وہاں سے سردار شیر دل خان والی قندہار کے پاس ایک عرضداشت بھیج کر میر محراب خان اور ملا داؤد محمد کے رویہ کے خلاف سخت شکایت کی۔ سردار شیر دل خان نے اس وفد کی عرضداشت کا بغور مطالعہ کر کے اپنا ایک قاصد شنگ روانہ کیا اور اس کے توسط سے وفد کے ارکان کو قندہار آنے کی دعوت دی لیکن یہ لوگ اس کے

---

[1] اخوند ملا محمد صدیق

قاصد کے ساتھ قندہار نہ جا سکے اور بدستور دفنگ میں مقیم رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد سردار شیر دل خان خود شنگ چلا آیا اور وفد کے ارکان میں سے سردارزادہ میر اسد خان رئیسانی، سردار میر محمد خان شاہوانی اور سید محمد شریف تیرکچی کو اپنے ساتھ قندہار لے گیا اور سردارزادہ میر عبدالکریم رئیسانی اور میر مصری خان شاہی زئی مینگل کو تسلی دے کر واپس وطن روانہ کر دیا۔[سلے]

سردار عظیم خان بارک زئی ایک وسیع جاگیر کا مالک تھا۔ ۱۸۲۱؁ء میں لٹ بند کے مقام پر پشاور سے کابل کی طرف آتے ہوئے اس کی وفات ہوگئی اس کی وفات سے اس کے بھائیوں اور بھتیجوں میں اس کی جاگیر کی تقسیم پر زبردست تنازعہ ہوگیا اور اس تنازعہ نے دو سال سے زیادہ عرصہ تک طول کھینچا اور آخر کار بارک زئی برادران نے بیرونی حملوں کے تدارک کے لئے سردار عظیم خان کی جائداد کو سردار شیر دل خان اور سردار پر دل خان کے حوالے کر کے افغانستان کی مملکت کو غیر مساوی انداز میں آپس میں تقسیم کر لیا۔ ولایت قندہار کا انتظام سردار شیر دل اور سردار پر دل خان کے سپرد ہوا۔ سکر، لوگر اور ولایت کابل کا نصف حصہ سلطان محمد خان اور یار محمد خان کے حصہ میں آئے۔ کابل کی ولایت کا بقایا نصف حصہ بشمول کوہستان، کوہ دامان سردار دوست محمد خان کے حوالے کیا گیا عبدالجبار خان کو غلزئیوں کا علاقہ ملا۔ غزنی کی ولایت یار محمد خان کو دی گئی۔ لیکن دو سال کے اندر اندر سردار دوست محمد خان نے کابل کی تمام

سلے:۔ اخوند محمد صدیق

ولایت کے علاوہ غلزئیوں کے علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ اس کشمکش کے دوران شاہ ایوب کی اپنی بھی کوئی افادیت اور حیثیت باقی نہ رہی اور وہ چپکے سے تاج و تخت چھوڑ کر لاہور چلا گیا، جہاں وہ سردار رنجیت سنگھ کے وظیفہ پر گذارہ کرتا تھا۔ اس کشمکش کی وجہ سے سردار شیر دل خان والی قندہار کو بلوچستان کے معاملات کی طرف توجہ مبذول کرنے کی فرصت نہ تھی اس کے باوجود اس نے بلوچستان سے آئے ہوئے وفد کو تسلی دی کہ وہ بلوچستان کی طرف ایک فوجی مہم کی رہنمائی کرتے ہوئے ان کی جائز شکایات کا ازالہ کرکے رہے گا۔[۵]

قندہار میں سرداروں کی موجودگی سے جو صورت حال پیدا ہوگئی تھی وہ خان میر محراب خان کے لیئے باعث تشویش تھی اس نے اخوند ملا فتح محمد کو صلاح مشورہ کے لیئے اپنے پاس بلایا اور سردار شیر دل خان کی متوقع فوجی مہم کے تدارک کے لیئے تجویزیں طلب کیں۔ اخوند ذاتی طور پر بلوچ افغان روایتی دوستی کے پیش نظر سردار شیر دل خان کے ساتھ جنگ کر لینے کے حق میں نہیں تھا لیکن اس متوقع حملے کے تدارک کے لئے اور کوئی چارہ کار بھی اسے نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے خان کو یہ مشورہ دیا کہ وہ (اخوند) شاہ غاشی نور محمد کو اپنے ساتھ لے کر مستونگ چلا جائے اور وہاں کے مقامی قبائل کے علاوہ نوشکی کے ذگرینگلوں سے ایک لشکر جمع کر کے مستونگ میں سردار شیر دل خان کی آمد کا انتظار کرے۔ چنانچہ شاغاسی نور محمد

۵: C. P. TATE.

کو اپنے ساتھ لے کر مستونگ پہنچا اور یہاں کے مقامی قبائل کے علاوہ نوشکی کے ذگر مینگلوں سے بھی بڑی تعداد میں ایک لشکر جمع کر کے مستونگ میں سردار شیردل خان کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ سردار شیردل خان حسب توقع دس ہزار گھوڑ سواروں پر مشتمل ایک مسلح فوج لے کر جس کے ساتھ توپیں بھی تھیں۔ بلوچستان کی طرف روانہ ہو کر راستہ میں قلعہ حاجی آباد میں فروکش ہوا لیکن قندہار سے روانہ ہوتے وقت وہ تپ معرکہ کے مرض میں مبتلا ہو گیا اور یہاں پہنچ کر اس کے مرض نے شدت اختیار کر لی اور اسے مجبوراً قندہار کی طرف لوٹنا پڑا جہاں کچھ عرصہ کے بعد اسی مرض سے اس کی وفات واقع ہو گئی اور اس کی جگہ اس کا بھائی سردار پردل خان قندہار کا والی بنا۔[1]

سردار پردل خان والی قندہار نے اخوند زادہ غیاث کو خان کے پاس قلات روانہ کر کے خواہش ظاہر کی کہ وہ اخوند ملا فتح محمد جیسے معتمد شخص کو قندہار روانہ کر دے تاکہ وہ سردار میر اسد خان رئیسانی، سردار محمد خان شاہوانی اور سید محمد شریف کو کسی طرح تسلی دے کر قلات لے آئے جو بدستور کابل میں مقیم تھے اس کی مرضی تھی کہ کچھ ایسا راستہ تلاش کیا جائے کہ جس کی بنا پر سرداروں کی شکایات کا ازالہ ہو سکے اور وہ مطمئن ہو کر بلوچستان آنے پر راضی ہو جائیں اور یہ ایک ایسا فریضہ ہے کہ اخوند ملا فتح کے علاوہ کوئی دوسرا شخص سرانجام نہیں دے سکتا ہے اور ان سرداروں کو اخوند ہی پر کلی اعتماد ہے ــــــ اخوند ملا فتح محمد قندہار جا کر سرداروں کو مطمئن کر کے

---

[1] اخوند ملا محمد صدیق

منانے اور ان کو وطن واپس لانے پر راضی ہوگیا. لیکن اس کے ساتھ ساتھ
اس نے خان سے استدعا کی کہ اس کو اپنے فرزند اخوند ملا محمد صدیق کو بھی
قندہار لے جانے کی اجازت دی جائے۔ ملا داؤد محمد درحقیقت اخوند ملا فتح
محمد کے قندہار جانے پر خوش نہیں تھا وہ جانتا تھا کہ اخوند ملا فتح محمد نے
کامیابی حاصل کرلی اور وہ سرداروں کو واپس قندہار سے لاکر خان کے ساتھ
مفاہمت کرانے میں کامیاب ہوگیا تو یہ صورتحال اس کے اپنے لئے خوش
آئند ثابت نہ ہوگی اور وہ اپنے آپ کو خرپا در گل محسوس کرے گا. وہ خان
میر محراب خان کی موجودگی میں اخوند ملا محمد صدیق کے قندہار جانے پر معترض
ہوا اور بڑی شدت سے اس کی مخالفت کی. اخوند ملا فتح محمد نے بھی اس
کے اس معاندانہ رویہ کی وجہ سے قندہار جانے سے انکار کردیا. اخوند ملا
فتح محمد کو ملا داؤد محمد کے اندازِ گفتگو سے نہ صرف مایوسی ہوئی بلکہ اس پر
خوف کی سی کیفیت طاری ہوگئی کیونکہ سردار مہر اللہ خان کے قتل کا واقعہ
ابھی ذہنوں سے محو نہیں ہوا تھا. اخوند نے اس خیال کے پیش نظر کہ ملا
داؤد محمد سازش کر کے اس کو یا اس کے فرزند اخوند ملا محمد صدیق کو کوئی
نقصان نہ پہنچا دے قلات چھوڑ کر جھالاوان جانے کا فیصلہ کیا. اس خبر کے
سنتے ہی بعض دوسرے زعما بھی جن میں میر کرم خان و میر محبوب خان ایلتاززئی
جام علی خان جھالاوان کے بعض سردار اور معتبرین مثلاً سردار رشید خان زرکزئی
سردار میر بوہیر خان موسیانی میر عیسٰی خان و میر یار محمد شاہی زئی مینگل وغیرہ
اخوند ملا فتح محمد کے گرد جمع ہوکر اس کے ہمنوا بن گئے اور جھالاوان جانے

کا فیصلہ کیا۔ خان میر محراب خان نے اپنی والدہ کو ان کے پاس بھیج کر ان کو جھالاوان جانے سے روکنے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی ملا داؤد محمد کے خلاف عام لوگوں کے جذبات اس قدر بھڑکے ہوئے تھے کہ اخوند نے اس خدشہ کے پیش نظر کہ خان کے پاس قلات میں اس کے دو حریف میر شاہنواز خان اور میر فتح خان موجود تھے۔ قلات میں ان زعما کی موجودگی کو مناسب خیال نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ہو سکتا تھا کہ یہ زعما و فورِ جذبات سے متاثر ہو کر خان کے خلاف میر شاہنواز خان اور میر فتح خان کو کھڑا کر کے اس کی پشت پناہی کریں اور اس سے اخوند کے نام پر دھبہ لگ جائے۔ یہ ایک ایسا موقعہ تھا کہ خان کا کوئی طرفدار قلات میں موجود نہ تھا۔ اسی بناء پر اخوند متذکرہ بالا زعما کو لے کر جھالاوان کی طرف روانہ ہو گیا اور جب یہ لوگ خضدار پہنچے اور ان کی آمد کی خبر سب کو ہو گئی تو بعض قبائلیوں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں خضدار کے بازار کو لوٹا خان کے عمال حکومت نظم و نسق کے درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے اس قدر بے لبس تھے کہ وہ دکانداروں کی دکانوں کو اس لوٹ مار سے بچا بھی نہ سکے۔[1] یہ واقعات ۱۸۳۴ء میں پیش آئے۔

آخر مجبور ہو کر خان میر محراب خان نے ملا داؤد محمد کو قندھار روانہ کر دیا تاکہ وہ سردار پردل خان سے مل کر ایسا کوئی راستہ نکالے کہ جس کی بنا پر وہ سردار جو قندھار میں قیام پذیر تھے۔ وطن واپس آجائیں اور سردار

---

[1] :۔ اخوند ملا محمد صدیق۔

پرول خان کو بلوچستان کے معاملات میں مداخلت کرنے کا موقعہ نہ ملے قندہار میں ملا داؤد محمد کو ایک سال سے زیادہ عرصہ لگا لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہاں اس کو کتنی کامیابی ہوئی البتہ اتنا معلوم ہے کہ ۱۸۲۵ء کے موسم گرما کے اوائل میں جب ملا داؤد محمد واپس آیا تو اسی موقعہ پر سردار زادہ میر اسد خان اور اس کے رفقاء سردار محمد خان شاہوانی اور سید محمد شریف تیریکی بھی واپس آ گئے تھے۔ ۵

اسی اثناء میں خان میر محراب خان نے اپنی اہلیہ کو جو جام علی خان کی بیٹی تھی جھالاوان روانہ کر دیا تاکہ وہ اخوند ملا فتح محمد کو راضی کر کے اپنے ساتھ واپس قلات لے آئے۔ بی بی صاحبہ نے اخوند ملا فتح محمد کو یقین دلایا کہ اب خان میر محراب خان ملا داؤد محمد کو اپنے پاس نہیں رکھے گا اور اخوند کو وزارت کے عہدے پر بحال کر دے گا۔ اس موقعہ پر سراوان کے قبائلیوں نے کچھی میں شورش برپا کر دی تھی اور انہوں نے بھاگ شہر کا محاصرہ کر کے عام رعایا پر دست تطاول دراز کر دیا تھا۔ اخوند ملا فتح محمد اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ان باغیانہ سرگرمیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے کچھی کی طرف روانہ ہو گیا اور اس کے فرزند ملا محمد صدیق، میر کرم خان اور میر یعقوب خان ایتازئی، جام علی خان، سردار میر رشید خان زہری، میر عیسیٰ خان شاہی زئی مینگل اور میر یار محمد مینگل بی بی صاحبہ کے ساتھ قلات روانہ ہو گئے اور خان میر محراب خان سے باریابی حاصل کر

---

۵ :- CHARLES MASSON.

لی۔ خان نے ان کو انعام واکرام سے نوازنے کے بعد کچھی روانہ کر دیا۔ تاکہ کچھی میں باغیوں نے جو شورش برپا کی تھی اس کا خاتمہ ہو سکے۔[1]

جام علی خان واپس بیلہ چلا گیا اور یہ لوگ جب کچھی پہنچے تو ان کی آمد سے پیشتر کچھی میں اخوند ملا فتح محمد نے امن قائم کر دیا تھا۔ اخوند ملا فتح محمد کے عین موقعہ پر بھاگ میں آنے کی وجہ سے باغیوں پر خاطر خواہ اثر پڑا۔ اور اس کی مداخلت پر باغیوں نے بھاگ شہر کا محاصرہ اٹھا لیا۔ اخوند نے ایک عرصہ تک بھاگ میں باغیوں کو عام رعایا کی فصلوں کو لوٹنے سے باز رکھا اور کچھی میں پوری طرح امن وامان قائم ہو گیا۔ اخوند نے اپنے حریف خاندان کے ایک فرد ملا محمد حسین کو جو ملا عبد الرحمان آغا علی زئی کا بیٹا تھا بھاگ کا نائب مقرر کر دیا۔ خان کو یہ تقرری بیحد ناگوار گذری وہ اس کو اس عہدے سے ہٹانا چاہتا تھا لیکن اخوند نے خان کے پاس ایک عرضداشت بھیج کر گزارش کی کہ اس شخص کا باپ اور بھائی قتل ہو گئے اور اس کا گھر تباہ ہو گیا اور اس کے زخموں کا مرہم یہی تقرری ہو سکتی تھی جس پر میں نے عمل کیا ہے خان نے اخوند کا لحاظ کر کے اس کو بھاگ کی بجائے ڈھاڈر کا نائب مقرر کر دیا۔[2]

کچھ عرصہ کچھی میں قیام کرنے کے بعد اخوند ملا فتح محمد اور اخوند ملا محمد صدیق قلات جانے کے ارادے سے درہ مولہ کے راستے الخیر

---

[1] :۔ اخوند ملا محمد صدیق

[2] :۔ ایضاً

پہنچے۔ یہاں ان کو ملا داؤد محمد کے قندہار سے واپس قلات آنے کی اطلاع
ملی۔ اخوند ملا محمد صدیق اور ملا داؤد محمد کے درمیان جو عداوت چلی آتی تھی
اس کے پیشِ نظر ملا محمد صدیق نے قلات کی بجائے باغبانہ جانے کا فیصلہ کیا
اس کے بعد ان کو اچانک خبر ملی کہ خان میر محراب خان قلات سے سوراب
کی طرف بڑھ رہا ہے اور وہ ان پر شب خون مارنے کا ارادہ رکھتا ہے
اس خبر سے ان دونوں کو بڑی حیرت اور مایوسی ہوئی۔ غالباً خان ان پر
حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن سردار میر اسد خان رئیسانی کے سختی سے
منع کرنے پر جو ابھی نیا نیا قندہار سے واپس آیا تھا۔ اور جس کے ساتھ
خان کی نئی نئی مفاہمت ہوئی تھی۔ خان نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا۔ وہ
ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر سوراب پہنچا اور یہاں سے قلات تک یہ
دونوں اس کے ہمرکاب تھے۔ قلات میں خان دونوں کے ساتھ بڑی
مہربانی سے پیش آیا اور انہیں انعام و اکرام سے نوازا۔[1]

۱۸۳۵ء میں سردار رحم دل خان سیوی سے شال کی طرف بڑھا
اس کے ساتھ ایک مختصر سی فوج اور کچھ توپیں تھیں اس نے شال کے
قلعہ سے شال کے کوتوال ملک دینار شاہی زئی مینگل کو دھوکہ سے نکال باہر
کر کے شال کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اس موقعہ پر سردار کہندل خان نے اپنے
بھائی سردار مہردل خان کے ساتھ سردار رحم دل خان کے لئے مزید کمک
روانہ کر دی اور قندھار کی فوج نے مستونگ کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے

---

[1] اخوند ملا محمد صدیق

اس علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ خان میر محراب خان نے سردار میر محمد خان شاہوانی میر ابراہیم خان، میر قطب خان رئیسانی اور میر جان محمد مینگل کو سردار رحم دل خان کے پاس مستونگ روانہ کر دیا جنہوں نے ملا داؤد محمد کے خلاف شکایت کی۔ آخر کار دونوں حکومتوں کے درمیان مفاہمت ہو گئی اور قندہار کے سرداروں نے خان کے تمام علاقے دوبارہ خالی کر دیئے۔ [1]

خان محراب خان کے عہد حکومت میں جزا و سزا کا ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ جھل کے مگسیوں اور کچھی کے رند قبیلہ کے لوگوں کے درمیان ایک عرصہ سے عداوت چلی آتی تھی۔ مگسیوں کے مقابلہ میں رندوں کی تعداد بہت زیادہ تھی انہوں نے سات ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر جمع کر کے مگسیوں کو کلیتاً نیست و نابود کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگسی دو ہزار افراد سے زیادہ میدان جنگ میں لانے کے ناقابل تھے۔ دونوں فریقوں کے درمیان مصالحت کی بڑی کوشش کی گئی۔ علاقہ کے سید اور خواتین نے ان کے بیچ میں پڑ کر رندوں کو اپنا ارادہ ترک کرنے کی تلقین کی اور برخیر کر رندوں کی منت و سماجت کی مگر وہ باز نہ آئے۔ دونوں فریق خوب مسلح ہو کر ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور ان کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی۔ مگسیوں نے رندوں کے ہجوم پر یک بارگی اور ایک ساتھ گولیاں چلائیں جس کی وجہ سے رندوں کی صفوں میں بھگدڑ مچ گئی اور اس کے بعد یکبارگی تلواریں میان سے نکال کر رندوں پر پل پڑے اور

---

[1] : CHARLES MASSON.

کچھ اس بے جگری سے لڑے کہ رندوں کے چھکے چھوٹ گئے اس پر طرہ یہ کہ اسی میدان میں آبپاشی کی نہروں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ رندان نہروں میں بھی بری طرح پھنس گئے اور ان میں سے دو ہزار افراد آن کی آن میں میدانِ جنگ میں کام آئے۔ لیکن مگسیوں کا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ خان نے اس موقعہ پر مگسیوں کے سردار میر احمد خان کے لیئے خلعت روانہ کی۔ اس سے رندوں کو اس قدر زیادہ خفت ہوئی کہ وہ سب کے سب سندھ کی طرف نقل مکانی کر کے چلے گئے جہاں سندھ کے تالپر حکمرانوں نے ان کے گزارے کے لیئے انہیں کچھ اراضیات بھی دیں۔ اگرچہ کچھ عرصہ کے بعد ان کو واپس بلایا گیا لیکن ان کی طاقت دوبارہ بحال نہ ہو سکی۔ یہ واقعہ ۱۸۳۰ء میں پیش آیا۔[۱]

اسی زمانہ میں ہڑند اور داجل (ڈیرہ جات) کے علاقے خان کے ہاتھ سے نکل گئے ایک عرصہ سے سید محمد شریف بریچی ان علاقوں کا حاکم چلا آتا تھا۔ پنجاب کے خود مختار حکمران رنجیت سنگھ نے ان علاقوں پر بلا مزاحمت قبضہ کر لیا اور سید محمد شریف نے ایک معمولی رقم لے کر یہ علاقے خالصہ سردار کے گماشتوں کے حوالے کر دیئے، اور خان میر محراب خان اپنے ملک کے اندرونی خلفشار کی وجہ سے کوئی کارروائی کرنے کی حیثیت میں نہ تھا ان علاقوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے کوئی کارروائی نہ کی گئی۔[۲]

---

[۱] :- MASSON. [۲] :- MASSON.

کچھ عرصہ سے مینگل اور بزنجو قبیلہ کے لوگ تجارتی کاروانوں کو تنگ کیا کرتے تھے اور ان سے مقررہ شرح سے کئی گنا زیادہ فی بار بدرکہ وصول کرنے لگے تھے ان کے ان مطالبوں سے تجارت کو بڑا نقصان پہنچ رہا تھا۔ دوسری طرف سردار رستم خان محمد حسنی اور خاران کے سردار مہیم خان نوشیروانی نے بھی خان کی اطاعت سے منہ موڑ لیا تھا۔ مکران میں بھی گچکی سرداروں نے باغیانہ سرگرمیاں شروع کی تھیں۔ ۱۸۳۱ء میں خان محراب خان ملا داؤد محمد کو اپنے ساتھ لے کر خضدار پہنچا یہاں سے اس نے بزنجو اور مینگل قبیلوں کے خلاف کارروائی کر کے ان کو تجارتی کاروانوں سے مقررہ شرح سے زیادہ بدرکہ وصول کرنے سے منع کر دیا۔ سردار رستم خان محمد حسنی نے بھی خان کی اطاعت قبول کر لی اس کے بعد خان کے بھائی میر اعظم خان اور ملا داؤد محمد کی سرکردگی میں خان کے لشکر نے گورجک کا رخ کر کے سردار میر مہیم خان نوشیروانی کو گورجک کے قلعہ میں محصور کر لیا۔ اس قلعہ کا محاصرہ ابھی جاری تھا کہ قلعہ کے اندر جلانے کی لکڑی ختم ہو گئی جس کے بغیر محصورین کا گذارہ مشکل ہو گیا۔ انہوں نے اس شرط پر اطاعت قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی کہ محاصرین ان کو باہر سے جلانے کی لکڑی فراہم کر دیں۔ محاصرین نے اس شرط پر جلانے کی لکڑی محصورین کو مہیا کر دی کہ وہ دوسرے دن فاتحین کو قلعہ کے اندر پر تکلف ضیافت دیں گے۔ لیکن محصورین نے لکڑی حاصل کرنے کے بعد ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ محاصرین نے قلعہ کا محاصرہ اور زیادہ سخت کر دیا اور محصورین کی حالت دوبارہ خراب ہو گئی۔ اس اثنا

میں سردار مہیم خان نے اپنا ایک ہرکارہ قندہار بھیج کر قندہار کے سرداروں کی توجہ خان کی کارروائیوں کی طرف مبذول کی۔ سردار کہندل خان کی مداخلت کی وجہ سے میر اعظم خان نے گورجک کے قلعہ کا محاصرہ اٹھا لیا۔ اس کے بعد میر اعظم خان اور ملا داؤد محمد اپنا لشکر لے کر کچھ میں وارد ہو گئے۔ لیکن ان کو کچھ کے مگسی سرداروں کے خلاف کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی اور وہ واپس قلات چلے آئے۔ [1]

۱۸۳۳ء میں شجاع الملک نے بارک زئی بھائیوں کے اقتدار پر ایک کاری ضرب لگانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے ان تیاریوں کے لئے لودھیانہ کو اپنا مرکز بنایا۔ وہ ۱۷ فروری ۱۸۳۳ء کو لودھیانہ سے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے پنجاب کے حکمران سردار رنجیت سنگھ کے ساتھ اپنے دوستانہ تعلقات استوار کر لئے۔ سردار رنجیت سنگھ نے اسے مبلغ ایک لاکھ روپے بطور تحفہ دے دیئے۔ سندھ کے تالپر حکمرانوں نے اسے مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جب شجاع الملک سندھ میں داخل ہو گیا تو سندھ کے حکمران اپنے وعدہ سے منحرف ہو گئے۔ شجاع الملک نے جو شکار پور میں قیام پذیر تھا فوج بھیج کر بھکر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ جو دریائے سندھ کے اندر ایک نہایت خوبصورت جزیرہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ ۹ جنوری ۱۸۳۴ء کو اس کی فوج نے سندھ کے تالپر حکمرانوں کی فوج کو روہڑی کے قریب زبردست شکست دی۔ اس موقعہ پر اس کی فوج کا سپہ سالار سمندر خان کاکڑ تھا جو

لے 1. MASSON - JOURNEY TO KALAT.

اس سے پیشتر میر مصطفےٰ خان کی فوج میں جمعدار کے عہدے پر مامور رہ چکا تھا۔ سندھ کے حکمرانوں نے اسے مبلغ پانچ لاکھ روپے ادا کر دیئے اور اس سے بارک زئی بھائیوں کے خلاف اس کی تیاریوں کو اور زیادہ تقویت ملی۔ اس کی فوج میں زیادہ تر روہیلہ اور دوسرے ہندوستانی تھے جن کی تعداد چھ ہزار افراد کے لگ بھگ تھی اور ان کی قیادت کیمپ بیل کے ہاتھ میں تھی جو سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا۔ یہ شخص اس سے پیشتر ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے بعد سکھ فوج میں ملازم رہ چکا تھا اس نے شجاع الملک کی فوج یورپین طرز پر تربیت دے کر خوب منظم کر لی تھی اور وہ پوری طرح تربیت یافتہ تھی۔ [1]

اسی اثنا میں میر احمد یار خان کے بیٹے میر شاہنواز خان اور میر فتح خان قلات کے قلعہ سے بھاگ نکلے اور کچھی میں جا کر باغیانہ سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اسی موقعہ پر اخوند ملا محمد صدیق اور میر محمد حسن رئیسانی سندھ میں وارد ہوئے۔ جہاں شجاع الملک بدستور قیام پذیر تھا سندھ سے واپسی پر راستہ میں انہیں میر شاہنواز اور میر فتح خان ملے۔ جنہوں نے ان کو اپنا ہمنوا اور طرفدار بنانے کی کوشش کی لیکن ان دونوں نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ [2]

شجاع الملک جب اپنی فوج لے کر ولایت قندہار کی حدود

---

[1]: G.P. TATE. HISTORY OF AFGHANISTAN.

[2]: اخوند ملا محمد صدیق

میں داخل ہوا تو بارک زئیوں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور قندھار میں قلعہ بند ہو گئے اور سردار دوست محمد خان سے امداد طلب کی۔ سردار دوست محمد خان اپنے بھائیوں کے ساتھ اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ان کی مدد پر کمربستہ ہو گیا۔ دو مہینے کے محاصرہ کے بعد شجاع الملک نے قندھار کے قلعہ پر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا حملہ ناکام ہو گیا اور اس کے بہترین سپاہی اور منصبدار میدان جنگ میں کام آئے اس موقعہ پر سردار دوست محمد خان بھی قندھار کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ ان سب کی مشترکہ فوج نے شجاع الملک کی فوج پر حملہ کر دیا اور دونوں فریقوں کے درمیان دو دن تک لڑائی جاری رہی۔ شجاع الملک کا پلہ بھاری نظر آتا تھا۔ شجاع الملک کی فوج کامیابی سے دوچار ہونے والی تھی کہ اس کے سپہ سالار کیمپ بیل کی ایک توپ پھٹ گئی اور اس سے نہ صرف کیمپ بیل خود زخمی ہو گیا بلکہ اس کے کئی سپاہی بھی مارے گئے۔ اس توپ کے پھٹ جانے کی وجہ سے بارود خانہ کو بھی آگ لگ گئی اور اس کے سپاہی منتشر ہو گئے[1]۔ یہ واقعہ ۲ جون ۱۸۳۴ء کو پیش آیا۔ شجاع الملک سیستان میں لاش کی طرف بھاگ نکلا اور وہاں سے ایک بنجر علاقے سے ہو کر قلات پہنچا۔ خان میر محراب خان نے اس کی بڑی خاطر مدارات کی اور اسے قلات کے قلعہ کے اندر جگہ دے کر اس کی حفاظت کا پورا پورا انتظام کیا۔ اس موقعہ پر سردار رحم دل خان نے دو ہزار گھوڑ سواروں کے

لہ۔ C.P. TATE. HISTORY OF AFGHANISTAN.

ساتھ بڑی تیزی سے اس کا تعاقب کیا۔ منشی عطا محمد شکارپوری کا بیان ہے کہ اس نے بلوچستان کی مین سرحد تک اس کا تعاقب کیا۔ مرزا احمد ملی کا بیان ہے کہ وہ منگوچر تک جو قلات سے فقط تیس کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ شجاع الملک کے تعاقب میں آیا۔ خان میر محراب خان نے داروغہ گل محمد کو سردار رحم دل خان کے پاس بھیج کر اسے مزید قلات کی طرف پیش قدمی کرنے سے منع کر دیا اور کہا کہ شجاع الملک نے اس کے ہاں پناہ لی ہوئی ہے اور وہ اس کا مہمان ہے۔ بلوچی ننگ کے مطابق وہ ہر قیمت پر اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ سردار رحم دل خان کی طرف سے شجاع الملک کی گرفتاری کے لئے اس قسم کی کارروائی ان دوستانہ روابط کے منافی ہو گی جو دونوں حکومتوں کے درمیان ایک عرصہ دراز سے قائم چلے آتے ہیں۔ اس کے بعد سردار رحم دل خان واپس قندھار چلا گیا۔ خان نے دو تین مہینہ کے بعد شجاع الملک کو عزت سے رخصت کر دیا اور سندھ تک میر عیسیٰ خان مینگل کو اس کے ساتھ کر دیا تاکہ وہ خیریت کے ساتھ اسے سندھ کی سرحد تک پہنچا دے۔[1] شجاع الملک سندھ میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد جیسلمیر کے راستے لودھیانہ چلا گیا۔[1]

۱۸۳۴ء کے موسم خزاں میں میر شاہنواز خان اور میر فتح خان نے کچھی میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ سراوان سے کچھ قبائلیوں کو اپنے ساتھ لے کر وہ پہلے ڈھاڈر پہنچے اور وہاں کے نائب باران کو موت کے گھاٹ

---

[1] :- اخوند ملا محمد صدیق

آمادا اس کے بعد انہوں نے اپنے لشکر کو ساتھ لے کر بھاگ کا رخ کیا۔ بھاگ کا نائب ملا محمد حسن بھی باغیوں کے ساتھ مل گیا۔ خان محراب خان نے اپنے بھائی میر اعظم خان کو باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا وہ مگسی قبیلے کے سردار میر احمد خان کی مدد سے مگسیوں کا ایک لشکر اکٹھا کر کے ان کے مقابلے پر بھاگ پہنچا۔ دونوں فریقوں کے درمیان میر مصطفٰے خان کے مزار کے نزدیک ایک گھمسان کی جنگ ہوئی جس کے دوران ملا محمد حسن میدانِ جنگ میں کام آیا۔ میر شاہنواز خان اور میر فتح خان کے لشکر نے بری طرح شکست کھائی۔ میر شاہنواز خان قندہار کی طرف اور میر فتح خان سندھ کی طرف بھاگ گیا۔[۱]

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد سردار میر رشید خان زرک زئی نے خان کی اطاعت سے منہ موڑ لیا۔ میر محراب خان اس کی سرگرمیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے ایک لشکر لے کر جھالاوان پہنچا۔ سردار رشید خان کے لشکر نے انجیرہ اور زہری کے درمیان ایک پہاڑی درے میں مورچے سنبھال لئے۔ دونوں فریقوں کے درمیان گولیاں چلیں لیکن بعض خیر خواہوں کی مداخلت کی وجہ سے مزید خون خرابے تک نوبت نہ آئی۔ سردار رشید خان نے خان کی اطاعت قبول کر لی اور خان نے اسے معاف کر دیا۔[۲]

ملا داؤد محمد کا ستارہ اقبال بدستور عروج پر تھا اور خان میر محراب خان اس کو بدستور وزارت کے عہدے پر مامور رکھنے پر بضد تھا ملا داؤد

---

[۱] اخوند ملا محمد صدیق۔ [۲] اخوند ملا محمد صدیق

محمد کو ابتدا ہی سے کوئی مقبولیت حاصل نہ تھی لیکن اس کی مخالفت بھی زوروں پر تھی جب قبائلی سرداروں اور دوسرے متقدر افراد کو بہت زیادہ مایوسی ہوئی تو انہوں نے ملا داؤد محمد کو وزارت کے عہدے سے زبردستی ہٹانے کا فیصلہ کیا اور اخوند ملا محمد صدیق کو جو ملا داؤد محمد کا بڑا سخت مخالف تھا اپنا رہنما بنایا ۱۸۳۵ء کے موسم گرما میں جبکہ خان میر محراب خان قلات کے قلعہ کے باہر چشمہ قلات کے نزدیک ایک باغ میں خیمہ زن تھا۔ ملا محمد صدیق کے حامیوں نے جن میں کئی متقدر اور صاحب رسوخ افراد شامل تھے خان کے خیمہ کا رخ کیا اور اس کی ذات کے لئے خطرہ کا موجب بن گئے انہوں نے اپنی بندوقوں کا رخ خان کے خیمہ کی طرف پھیر دیا۔ داؤد محمد کی مخالفت اور اسی کی بنا پر خان سے ناراضگی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ خان کے اکثر ملازمین در پردہ باغیوں کے ساتھ مل گئے تھے اس موقعہ پر بابی تاجر اور شہر کے دوسرے شرفا بیچ میں پڑے اور دونوں فریقوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کی اور باغیوں کو آگے بڑھنے اور کوئی کارروائی کرنے سے باز رکھا اسی دوران داروغہ گل محمد نے موقعہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے قلعہ کے دروازے کھول دیئے اور خان بحفاظت تمام قلعہ کے اندر داخل ہو گیا۔ داروغہ گل محمد نے باغیوں پر قلعہ اور اس کی دیواروں سے گولیاں چلائیں اور وہ زہری کی طرف نکل کھڑے ہوئے جہاں ان کے درمیان ان بن پیدا ہو گئی اور وہ منتشر ہو گئے۔ اس موقعہ پر میر ولی محمد مینگل ہی وہ واحد معزز شخص تھا جو خان کے ساتھ رہا، حتیٰ کہ جام علی خان بھی جو اس موقعہ پر موجود

تھا۔ باغیوں کے ساتھ مل گیا۔ میسن کا بیان ہے کہ اخوند ملا محمد صدیق کے حامی خان میر محراب خان کو معزول کر کے اس کو خان بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ بہر نوع اس واقعہ کے بعد اخوند ملا محمد صدیق قندہار کی طرف بھاگ نکلا جہاں سردار کہندل خان نے اس سے کہا کہ اگر وہ ایک ملا ہے تو اس کو ایک جنگجو بلوچ کی وضع قطع اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ غالباً سردار کہندل خان کو یہ معلوم نہ تھا کہ بلوچستان میں اس زمانہ میں پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ شخص کے لئے ملا کا لقب استعمال کیا جاتا تھا۔ ؎

خان محراب خان کے دل پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا اور داروغہ گل محمد نے بھی ملا داؤد محمد کے غلط رویہ کی طرف اس کی توجہ مبذول کرائی۔ خان نے اس کے بعد ملا داؤد محمد کے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ شروع کر دیا اور اس کی بجائے ملا محمد حسن کے ساتھ گرم جوشی کا مظاہرہ کرنے لگا اور بتدریج نظر عنایت اسی کی طرف پھیر دی اور اب یہ دونوں ایک دوسرے کے حریف بن گئے اور دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے درپے ہو گئے۔ ابتدا میں تو ملا محمد حسن نے خان کی خوشامد تک اپنی بات محدود رکھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اس کو ملا داؤد محمد کے خلاف خان کی ذہنی کیفیت کا علم ہو گیا تو اس نے اس کی دغابازی کے خلاف کھلم کھلا باتیں کرنی شروع کر دیں اور آخر کار جرأت پاکر ملا داؤد محمد کا خاتمہ کرنے کی پیش کش کر دی۔ دوسری طرف ملا داؤد محمد کو بھی ملا محمد حسن کی دشمنی کا پورا پورا خطرہ محسوس ہوا اور اس نے

؎ CHARLES MASSON.

خان کے سامنے تجویز پیش کر دی کہ ملا محمد حسن کا قتل خان کے مفاد کے لئے بڑا ضروری ہے لیکن ابھی خان نے کوئی فیصلہ ہی نہیں کیا تھا کہ ملا داؤد محمد نے اپنی قسمت کا فیصلہ خود کر لیا۔ اس نے اپنی جان کے خوف سے سردار رحمدل خان اور سردار کہندل خان والی قندھار کے نام ایک عرضداشت بھیج کر خان کے خلاف شکایتوں کا ایک طومار باندھ دیا۔ اور ان کو بلوچستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ بدقسمتی سے یہ خط و کتابت پکڑی گئی اور ملا داؤد محمد کا راز فاش ہو گیا۔ اس کے باوجود خان نے ملا داؤد محمد سے کہا کہ وہ دوسرے ہی دن ملا محمد حسن کا کام تمام کر سکتا ہے۔ اسی طرح اس نے ملا محمد حسن کی بھی حوصلہ افزائی کر کے اسے ملا داؤد محمد کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ دوسرے دن خان نے دوبارہ داؤد محمد کی یقین دہانی کرائی کہ وہ اس کے منصوبہ کے ساتھ پوری طرح متفق ہے۔ ملا داؤد محمد بھی بعد دوپہر بڑا مطمئن ہو کر خان کے دربار میں آیا تاکہ وہ اپنے شکار کا پیچھا کر لے دربار برخاست ہونے کے بعد یہ دونوں خان کے پاس ٹھہرے۔ ملا داؤد محمد عصر کی نماز کے لئے اٹھ کر وضو کرنے لگا۔ ملا محمد حسن اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اس کے پیچھے گیا اور اس کی گردن پر تلوار سے ایک کاری ضرب لگائی۔ ملا داؤد محمد پیچھے مڑ کر دریافت کرنے لگا کہ معاملہ کیا ہے؟ جبکہ تلوار کے ایک دوسرے وار سے ملا محمد حسن نے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد خان نے اس خدمت کے صلے میں ملا محمد حسن کو وزارت کے عہدے پر فائز کر دیا اخوند ملا محمد صدیق کو ملا داؤد محمد کے

قتل کے بعد قندھار سے قلات آنے کا حوصلہ ہو گیا۔ ساؤدے کا بیان
ہے کہ داؤد محمد سے خان محراب خان کا تعلق خصوصی توجہ کا محتاج ہے
کیونکہ خان موصوف کے دورِ حکومت کی مشکلات کو عموماً ملا داؤد محمد سے
ہی منسوب کیا جاتا ہے وہ معمولی حیثیت کا ایک غلزئی افغان تھا۔ خان
نے اس کو ملک کے مروجہ دستور اور قبائل کی مرضی کے برخلاف وزارت
کے عہدے پر فائز کیا۔ اس دستور کے تحت اس عہدے پر میر قنبر کے
زمانہ ہی سے دہوار خاندان کے افراد موروثی طور پر فائز چلے آتے تھے
جونہی اس شخص کو اعتماد میں لیا گیا اس نے ہر اس شخص کو قتل کروانے کا
راستہ اختیار کیا جس کے اثر و رسوخ سے اس کو خطرہ لاحق تھا۔ چارلس
میسن کا بیان ہے کہ داؤد محمد کے دماغ سے خطرے کے احساس کو
دور کرنے کی خاطر جب بھی موقعہ فراہم ہوا یکے بعد دیگرے ان گنت
معتمد اور صاحب رسوخ سردار اور دوسرے زعما اس کے وہم کی قربانگاہ
پر بھینٹ چڑھا دیئے گئے۔ ان فوری ارتکاب قتل کا فوری نتیجہ خان کے اقتدار
اور وقار کو ہر بار زبردست دھچکہ لگنے کی صورت میں نمودار ہوا۔ میسن کا
بیان ہے کہ ملا داؤد محمد نے میر شاہنواز خان اور میر فتح خان کو بھی قتل کروانے
کی تجویز خان محراب خان کے سامنے رکھی تھی۔ لیکن خان میر محراب خان نے
اس کی بات نہ مانی اور ان کو باعزت طریقے سے قید میں رکھا۔ غالباً ملا داؤد
محمد کے قتل کا واقعہ ۱۸۳۶ء یا اس کے بعد رونما ہوا۔[له]

له:- CHARLES MASSON.

ملا داد محمد کے قتل کے بعد بھی ملک میں امن وامان کی صورتحال میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہ ہوئی بلکہ اس کے برعکس بعض لوگوں نے اس واقعہ کو اپنی باغیانہ سرگرمیوں کے لئے ایک اور بہانہ بنایا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ خان میر محراب خان کے ہاتھ سے یکے بعد دیگرے کئی مقتدر اور صاحب رسوخ افراد قتل ہوئے جس کا اثر ملک کے نظم و نسق پر پڑا۔ اکثر قبائلی سردار اور دوسرے معتبرین خان سے بہت زیادہ بدظن تھے اور خان کے دربار میں حاضر ہونے سے عمداً گریز کرتے تھے۔

خان میر محراب خان کے عہدِ حکومت کا سب سے اہم واقعہ افغانستان کی پہلی جنگ تھی جس میں بلوچستان کو بلاوجہ ملوث ہونا پڑا۔ مارچ ۱۸۳۶ء میں لارڈ آک لینڈ، لارڈ ولیم بنٹنک کی جگہ ہندوستان کا گورنر جنرل بنا۔ اس موقعہ پر سردار دوست محمد خان امیر کابل نے اس کی تقرری پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے خوش آمدید کا پیغام دیا۔ لارڈ آک لینڈ نے اپنے جوابی پیغام میں امیر کابل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس بات کا اعادہ کیا کہ برطانوی حکومت دوسرے آزاد ممالک کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کے اصول کی سختی سے پابند ہے۔ لیکن اس کے باوجود ستمبر ۱۸۳۷ء میں سر الیگزنڈر برنس کو امیر دوست محمد خان کے پاس کابل روانہ کیا گیا۔ بظاہر اس نے یہ سفر تجارتی مقاصد کے لئے اختیار کیا تھا لیکن درحقیقت اس کا یہ سفر سیاسی نوعیت کا تھا۔ اس سفر کے دوران ڈاکٹر لارڈ اور لیفٹیننٹ رابرٹ لیچ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ کابل سے لیچ کو تجارتی مشن پر قندھار روانہ

کر دیا گیا لیکن اندرونی طور پر اسے سیاسی معلومات حاصل کرنے کی غرض سے قندھار بھیجا گیا تھا

اسی دوران ایک روسی وفد کا ونٹ سیمی نوچ کی قیادت میں ایران کے دارالحکومت تہران میں موجود تھا جس میں کرنل بلرم برگ اور کیپٹن وٹکے وچ بھی شامل تھے۔ روسی وفد کا یہ موخرالذکر رکن ایک قابل زبان دان اور ایک نہایت سرگرم منصبدار تھا۔ اس نے اپنے آپ کو افغانستان میں پوری طرح مصروف رکھا ہوا تھا۔ اس موقعہ پر کابل میں اس کی آمد سے اور زیادہ پیچیدگی پیدا ہوگئی۔ وہ اپنے آپ کو روس کا سفیر ظاہر کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ قندھار کے بارک زئی سرداروں کے تعلقات ایرانی حکومت کے ساتھ مستحکم بنیادوں پر استوار ہوں۔ اس موقعہ پر امیر کابل سردار دوست محمد خان نے برطانوی وفد کے ارکان کے ساتھ گفتگو کے دوران صاف طور پر اس بات کا اظہار کیا کہ اس نے برطانوی حکومت کی حمایت سے مایوس ہو کر روسیوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کر دی ہے سر الیگزنڈر برنس امیر دوست محمد خان کے تعلقات انگریزوں کے ساتھ وابستہ کر کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے خلاف اس کے ہاتھ مضبوط کرنے کا بڑا خواہشمند تھا۔ اس نے قندھار کے بارک زئی سرداروں کو ایرانی حکومت کے ساتھ تعلقات استوار کرنے سے باز رکھنے کی خاطر اپنے اختیار اور ہدایات سے بھی تجاوز کر کے ان سے کچھ اس قسم کے وعدے بھی کئے جو برطانوی حکومت کے لئے قابل قبول نہ تھے۔ برطانوی حکومت نے اگست ۱۸۳۸ء میں

اس کی کارکردگی پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اسے واپس بلا لیا۔ انگریز اپنی پسند کے ایک افغان شہزادے کو افغانستان میں برسرِ اقتدار لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے اس موقعہ پر شجاع الملک کو بزورِ شمشیر کابل کے تخت پر بٹھانے کا فیصلہ کیا۔ یکم اکتوبر ۱۸۳۸ء کو گورنر جنرل ہندوستان کی طرف سے افغانستان پر فوج کشی کرنے کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔[۱]

۱۰ دسمبر ۱۸۳۸ء کو انڈس کی فوج فیروزپور سے روانہ ہو کر ۲۴ جنوری ۱۸۳۹ء کو دریائے سندھ کے کنارے روہڑی پہنچ گئی۔ بنگال انجینئرز کے کیپٹن تھامسن نے دریائے سندھ پر پل باندھ دیا اور ۴ فروری کو فوج دریائے سندھ کو عبور کر کے اس کے دائیں کنارے پر خیمہ زن ہو گئی شجاع الملک نے روہڑی سے گیارہ کلومیٹر اوپر کی جانب سے دریا کو عبور کیا۔ اس کی فوج کو جو چھ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ اس کے اسبابِ باربرداری اور سواری کے جانوروں سمیت دریا عبور کرنے میں ایک ہفتہ لگا۔ اس اثناء میں بمبئی کی فوج سمندری راستے سے دریائے سندھ کے دہانے وکر کے مقام پر پہنچ گئی تھی اور وہ سر جان کین کی قیادت میں بنگال کی فوج کے ساتھ مل جانے کی غرض سے بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔[۲]

ابتداء میں خان میر محراب خان اور انگریزوں کے تعلقات میں تلخی یا بدگمانی کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ ۱۸۳۸ء میں سر الیگزنڈر برنس جب دریائے سندھ کو

۱:- G. P. TATE ۲:- G.P TATE

عبور کر کے کابل کی طرف جا رہا تھا تو اس نے خان میر محراب خان کے نوجوان فرزند شہزادہ میر محمد حسن کیلئے تحفے تحائف بھی بھیجے تھے اور اسے خیر سگالی کا پیغام دیا تھا جو گنداوہ میں قیام پذیر تھا۔ شہزادہ میر محمد حسن نے اس پیغام کا خاطر خواہ جواب دیتے ہوئے بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ جب سر الیگزنڈر برنس کو امیر دوست محمد خان امیر کابل کے دربار سے واپس بلا لیا گیا تو اس نے اس موقعہ پر رابرٹ لیچ کو جو قندھار میں قیام پذیر تھا ہدایت کر دی کہ وہ شکار پور پہنچ کر اپنی خدمات کرنل پاٹنجر کے سپرد کر دیں جو ان دنوں سندھ میں گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا۔ رابرٹ لیچ ان ہدایات کی پیروی کرتے ہوئے قندھار سے شال پہنچا اور یہاں سے خان کی دعوت پر قلات کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔ قلات پہنچنے پر خان کے دربار میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ خان اور لیچ کے درمیان تحفے تحائف کا بھی تبادلہ ہوا لیکن اس کے قیام کے دوران لیچ کی بعض باتوں سے خان کی طبیعت کسی قدر مکدر ہو گئی۔ اس مرحلہ پر انگریزوں کی جانب سے شجاع الملک کو افغانستان کی بادشاہت پر بحال کرنے کا فیصلہ پوری طرح ظاہر ہو چکا تھا لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ خان اور رابرٹ لیچ کے درمیان کیا گفتگو ہوئی اور خان کے ساتھ معاملات طے کرنے میں اسے کہاں تک اختیارات حاصل تھے خیال ہے کہ اس نے اپنی طرف سے بڑی کوشش کر کے موقعہ کو ہاتھ سے جانے کی غلطی تو نہ کی ہوگی۔ لیکن اس کا نتیجہ خان کی اس رائے کے نتیجہ میں جو اس نے لیچ کے متعلق قائم کی تھی مشکل ہی سے اطمینان بخش ہو سکتا تھا

اس ناکامی کے بعد رابرٹ لیچ قلات چھوڑ کر شکارپور چلا گیا۔ جہاں ابھی میں سر الیگزنڈر برنس بھی لارڈ آک لینڈ کی مرضی کے مطابق اس سے جا کر ملا۔ تاکہ وہ شمالی سندھ میں خیرپور کے حکمرانوں کے ساتھ ایک معاہدہ طے کرنے کے علاوہ فوج کے لئے اشیائے خوراک اور دوسری ضروریات کا اہتمام کرے جو عنقریب وہاں پہنچنے والی تھی ان امور سے فارغ ہونے کے بعد سر الیگزنڈر برنس سندھ کی سرحد پر بنزل کوٹ کے گھاٹ کی طرف چلا گیا جہاں اس نے انگریزی فوج کا استقبال کیا۔ اس موقعہ پر انگریزی فوج کے سربراہ سر ہنری فین کے ساتھ اس کی ملاقات کے دوران چارلس میسن کو اس سے ملنے کا موقعہ ملا۔ دونوں زعما کے درمیان جن امور پر گفتگو ہوئی اس میں بلوچستان کے معاملات بھی زیر بحث آئے۔ سر الیگزنڈر برنس نے چارلس میسن کے سامنے اعتراف کر لیا کہ رابرٹ لیچ نے قلات میں اپنے قیام کے دوران سارے کام غلط کئے۔ قلات کے معاملات کو خوش اسلوبی سے سلجھانے کے لئے چارلس میسن نے اپنی خدمات پیش کیں لیکن اس کا اسے کوئی موقعہ نہ دیا گیا انگریزی فوج جب شکارپور پہنچی تو اس کے لئے شکارپور میں پہلے ہی سے ہر قسم کی سہولتیں فراہم کر دی گئی تھیں۔ [۱]

انگریزوں کی خواہش تھی کہ ان کی فوج افغانستان کی طرف کوچ کرتی ہوئی بلوچستان کے علاقے سے کسی مزاحمت اور رکاوٹ کے بغیر ہو کر گزرے اور اس معاملہ میں وہ خان میر محراب خان کا تعاون حاصل کرنے

۱:- CHARLES MASSON

کو بڑا ضروری خیال کرتے تھے لیکن بلوچستان میں نظم و نسق کی حالت کے
پیش نظر ان کا بلوچستان کے علاقہ خصوصاً درہ بولان کے دشوار گذار راستہ
سے صحیح سلامت گزرنا ایک بڑا دشوار مسئلہ تھا۔ اس نازک موقعہ پر خان کے
دربار میں جو لوگ موجود تھے ان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بظاہر ملا محمد حسن
اخوند ملا محمد صدیق اور سید محمد شریف ترکی کا شمار خان کے معتمدین میں ہوتا تھا
لیکن درپردہ یہ سب لوگ اس کے مخالف تھے۔ خان نے ملا محمد حسن کو
ایک معمولی عہدے سے ترقی دیکر ایک اہم عہدے پر فائز کردیا تھا لیکن
اس میں ذاتی خواہشات اور جذبات سے بالاتر ہو کر ایک باوقار اور حقیقت
پسندانہ خارجہ پالیسی اختیار کرنے کی صلاحیت موجود نہ تھی کہ جس کی بنا پر انگریزوں
کو شکایت کا موقعہ نہ ملتا۔ خان نے ملا محمد حسن کے بھائی اور باپ کو قتل کر کے
اس کے خاندان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا تھا اور یہ کدورت ملا محمد حسن
کے دل سے آسانی کے ساتھ محو نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کسی صورت میں بھی
خان کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سے پیشتر
آخوند زئی خاندان کے افراد موروثی طور پر وزارت کے عہدے پر فائز
چلے آتے تھے۔ خان محراب خان نے اخوند ملا محمد صدیق کے باپ اخوند
ملا فتح محمد کو وزارت کے عہدے سے برطرف کر کے اس کی بجائے ملا
داؤد محمد کو اس عہدے پر فائز کردیا تھا۔ ملا داؤد محمد کے قتل کے بعد بھی
اس خاندان کے افراد کی اس عہدے پر دوبارہ فائز ہونے کی نوبت نہ آئی
اسی بنا پر اخوند ملا محمد صدیق بھی دل و جان سے خان کا طرفدار نہیں تھا لیکن

محمد شریف اس سے پیشتر سکھوں کے ساتھ سازش کر کے ہرند داجل کا علاقہ پنجاب کے حکمران رنجیت سنگھ کے ہاتھ ایک معمولی رقم پر فروخت کر چکا تھا وہ طبعاً ایک سازشی قسم کا انسان تھا اور اس کے دل میں ریاکاری اور دغابازی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا. بظاہر تو یہ سب لوگ اپنے آپ کو خان کا خیر خواہ ظاہر کرتے تھے. لیکن ان کی سرگرمیاں منفی انداز کی تھیں اور وہ سب کے سب خان کو انگریزوں کے ساتھ الجھانے کے درپے تھے. انگریزوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کر کے ان کی فوج کو بلوچستان کے علاقے سے بخیریت گزارنے میں خان کو اپنے ان معتمدین میں سے کسی کی حمایت حاصل نہ تھی اور وہ تن تنہا اس اہم فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا تھا اور نہ وزارت کی صحیح رہنمائی اور تعاون کے بغیر وہ انگریزوں کے ساتھ درپیش معاملات کو تن تنہا خوش اسلوبی سے طے کر سکتا تھا وہ جس قسم کی مشکلات سے دوچار ہو رہا تھا انہیں اس کے معتمدین ہی پیدا کر رہے تھے [1]

ملا داؤد محمد کی زندگی میں جب کہ اس کا اقتدار عروج پر تھا غلزئی برادران نے درہ بولان کے ایک بنگلزئی خاندان میں شادی ناطوں کے تعلقات قائم کر لئے تھے اور انہوں نے بنگلزئی قبیلہ کے علاوہ درہ بولان کے دوسرے قبیلوں میں بھی بڑا اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا. ملا داؤد محمد کے بھائی غلام جان اور خان جان

لے ۱ - CHARLES MASSON.

بدستور اسی علاقے میں موجود تھے۔ انگریزوں نے نہ صرف ملا محمد حسن اور سید نور شریف کی خدمات خریدلی تھیں بلکہ انہوں نے ملا داد محمد کے بھائیوں کو بھی اپنے اعتماد میں لے لیا تھا۔ اس موقعہ پر ملاداد محمد غلزئی کے بھائی غلام جان اور خان جان نے بھی انگریزوں کو غلط اطلاعات فراہم کرکے انہیں خان کے خلاف اکسانے میں بڑا کردار ادا کیا۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ جو لوگ خان سے غداری کے مرتکب ہو رہے تھے، انگریزوں نے انہی لوگوں کو اپنا معتمد بنا لیا تھا اور اس طرح معاملات کی تہہ تک پہنچنے کا دروازہ بھی انہوں نے اپنے اوپر بند کر لیا۔ انگریز منصبدار اپنی سادہ دلی کی وجہ سے اپنے ان معتمدین کی چالوں سے ناواقف تھے ان کا خیال تھا کہ وہ ان لوگوں کی خدمات خرید کر خان کے ساتھ اپنے معاملات آسانی کے ساتھ طے کر لیں گے۔ اس موقعہ پر ان اہم امور کو سرانجام دینے اور بگڑے ہوئے حالات کو سلجھانے پر جو بڑے بڑے انگریز منصبدار مامور تھے ان میں بھی سیاسی بصیرت کی زبردست کمی تھی انہوں نے جن لوگوں کی خدمات خرید کر ان کو اپنا معتمد تصور کر لیا تھا انہی لوگوں نے ان کو اندھیرے میں رکھا اور انہیں بری طرح دھوکہ دیا۔[۱]

خان محراب خان نہ صرف انگریزوں کی فوج کو بلوچستان کے علاقہ سے گذر جانے کی اجازت دینے پر تیار تھا۔ بلکہ اس کی خواہش تھی کہ انگریزوں کی فوج کسی رکاوٹ اور مزاحمت کے بغیر اس کے علاقے سے گذر جائے۔

۱:۔ CHARLES MASSON.

اسی مقصد کے پیش نظر اس نے اپنے بھائی میر محمد اعظم خان کو گھوڑ سواروں کے ایک مختصر دستہ کے ساتھ کچھی روانہ کر دیا تاکہ وہ کوٹرو میں قیام کر کے اس بات کا خیال رکھے کہ کچھی کے علاقہ سے گزرتے وقت انگریزوں کی فوج کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ اور مشکلات پیدا نہ ہونے پائیں۔ اس نے کچھی کے باشندوں کے نام ایک تحریری فرمان بھی صادر کر کے ان کو تاکید کی کہ وہ انگریزی فوج کے سپاہیوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں اور ان کے ساتھ الجھنے سے گریز کریں اگر ان میں سے کسی کو فوج کے کسی فرد سے تکلیف پہنچے تو وہ برا منانے کی بجائے اپنی شکایات فوج کے جرنیل تک پہنچا دیں۔ اس قسم کا فرمان جاری کر کے خان نے بڑی نیک نیتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ۵

میر محمد اعظم خان کو کوٹرو میں اپنے قیام کے دوران اپنی ذاتی ضروریات کیلئے رقم کی ضرورت پڑی اس نے ایک مقامی ہندو دکاندار سے مبلغ چھ سو روپے کا مطالبہ کیا۔ ہندو دکاندار نے رقم دینے سے انکار کر دیا۔ میر محمد اعظم خان نے طیش میں آ کر ہندو دکاندار کے مال تجارت کو ضبط کر لیا جس میں اس کے غلہ کا گودام بھی شامل تھا۔ ہندو دکاندار نے یہ بہانہ بنایا کہ یہ غلہ انگریزی فوج کی ضرورت کے لئے خریدا گیا ہے اور ہندو دکانداروں نے جوابی کارروائی کے طور پر ہڑتال کر کے اپنی دکانیں بند کر دیں اور کاروبار کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے دن مفاہمت کی صورت نکالی گئی۔ میر محمد اعظم خان کو ہندو دکانداروں کی طرف

۵: CHARLES MASSON.

سے مبلغ چار سو روپے ملے۔ ہندو دکانداروں نے ہڑتال ختم کرکے اپنی دکانیں کھول دیں اور فوراً ہی کاروبار شروع کر دیا۔ اس واقعہ سے افواہیں پھیل گئیں اور کوئٹہ میں موجود انگریزوں کے گماشتوں نے اس واقعہ کو شکارپور جاکر مبالغہ آمیز انداز میں انگریز افسروں کے سامنے پیش کیا۔ بعد میں سر الیگزنڈر برنس نے خان کو ایک ایسا مکتوب لکھا کہ اس کے اپنے الفاظ میں اس خط سے اس کے ہوش ٹھکانے لگ جائیں گے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کے اپنے ہوش ٹھکانے نہ تھے۔ اسی دوران شجاع الملک نے بھی شکارپور سے ایک مکتوب خان کے نام روانہ کرکے اسے یاد دلایا کہ میر شاہنواز خان اس کی لشکرگاہ میں موجود ہے اور وہ اسے آسانی کے ساتھ خان کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ خان میر محراب خان کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے بروقت اپنے بھائی کے نام ایک تہدید آمیز خط لکھوا کر اسے سخت ڈانٹ پلائی اور اسے سختی کے ساتھ اس قسم کی حرکتوں کا اعادہ کرنے سے روکا۔ سر الیگزنڈر برنس اور شاہ شجاع کی جانب سے جب مکاتیب اس کو ملے تو ان سے اس کو کسی قدر پریشانی لاحق ہو گئی اور ان غلط فہمیوں کو جو انگریز افسروں کے دل میں اس کے خلاف پیدا ہو گئی تھیں دور کرنے کی خاطر اسے برطانوی حکومت کے وزیر و سفیر کے پاس ایک وفد روانہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بدقسمتی سے اس نازک موقعہ پر خان کے پاس قابلِ اعتماد آدمیوں کا فقدان تھا۔ اس اہم فریضہ کو سرانجام دینے کے لئے یوں تو کئی خواہشمند لوگ موجود تھے لیکن ملا محمد حسن نے اپنے عہدے کی بنا پر

ان سب پر فوقیت حاصل کر لی۔ اس نے سید محمد شریف تیرکی کو بھی اپنے ساتھ لیا۔ خان نے ان دونوں کے مشن کی کوئی مخالفت نہ کی حالانکہ اس کو خوب معلوم تھا کہ یہ دونوں گرگان باران دیدہ اس کے مفادات کو نقصان پہنچائیں گے۔ یہاں پہلی بار اس کی شخصیت کا کمزور پہلو کھل کر سامنے آیا۔ اس ناعاقبت اندیشی اور لاپرواہی کی وجہ یہ تھی کہ شکارپور میں انگریز افسروں کے ہاں میر شاہنواز خان کی جس شاندار انداز میں استقبال اور پذیرائی ہوئی، شجاع الملک نے جس طریق پر اپنے کیمپ میں میر شاہنواز خان کی موجودگی کا احساس دلایا، سر الیگزنڈر برنس نے جن الفاظ میں اسے مرعوب کرنے کی کوشش کی اور رابرٹ لیچ کے متعلق جو اس نے رائے قائم کر لی تھی ان سب امور سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ چاہے وہ کتنی ہی مخلصانہ کوشش کرے۔ انگریز افسر اپنی کوتاہ اندیشی سے اس کے رویہ سے ہرگز مطمئن نہ ہوں گے۔ اور تباہی اس کا مقدر ہو چکی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ جو لوگ بھی اس کے زوال کے خواہشمند تھے یہی کچھ اس سے کہا کرتے تھے اور اس پر اصرار بھی کرتے تھے اس موقعہ پر جب کہ یہ وفد اپنا کام شروع کرنے لگا تھا۔ خان نے اپنی طرف سے بڑی کوشش کی کہ انگریزوں کو شکایات کا موقعہ نہ ملے اور اس موقعہ پر کچھی کے عوام و خواص کے نام اس نے جو ہدایات جاری کی تھیں اس سے اس کے اس جذبہ کی عکاسی ہوتی ہے۔ [۱]

---

[۱] CHARLES MASSON.

اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ برطانوی حکومت کے وزیر و سفیر کے ساتھ ملا محمد حسن اور اس کے رفیق کار سید محمد شریف کی ملاقات شکار پور میں ہوئی یا بھاگ میں لیکن اس کے نتائج بلا مبالغہ بڑے غیر معمولی تھے۔ خان کی تباہی کو یقینی بنانے کے لئے ضروری تھا کہ ملا محمد حسن برطانوی حکومت کے وزیر و سفیر کو دھوکہ اور فریب میں مبتلا رکھے۔ یہی کچھ اس نے خان میر محراب خان کے ساتھ کیا اور اسے بھی دھوکہ اور فریب میں مبتلا رکھا اور اسے اس معاملہ میں پوری پوری کامیابی حاصل ہو گئی اس نے اپنے آقا کے مفادات کی وکالت کرنے کی بجائے اسے شر انگیز سازشوں اور برے ارادوں کا ملزم ٹھہرایا اور بدقسمتی یہ ہوئی کہ برطانوی حکومت کے اس وزیر و سفیر نے بھی ان الزامات کو درست سمجھ کر من و عن قبول کر لیا۔ ایک ہی سانس میں اس نے برطانوی حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کا گن گایا اور برطانوی حکومت کے اس نمائندہ اعلےٰ نے بھی اس کی ان باتوں پر پوری طرح اعتبار کر لیا۔ انڈس فوج سے متعلق اس ممتاز انگریز منصبدار نے ایک دستاویز پر بھی اپنی مہر ثبت کر کے اس سب سے بڑے غدار کو اس کی خدمات اور خیر سگالی کی سند بطور صلہ بھی عطا کر دی۔ یہ بات اپنی جگہ حیرت انگیز ہے کہ ایک عام با اصول شخصیت نے کیونکر ایک ایسے غدار شخص کی گذارشات پر کان دھر کر انہیں درست تسلیم کرنے کی غلطی کی جو اپنے اس آقا کے مفادات کو نقصان پہنچا رہا تھا جس کا وہ ملازم تھا اور جس کے مفادات کی وکالت کا بیڑا اس نے اٹھایا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ اس معاملہ کو خفیہ بھی نہ رکھا گیا جس کی

وجہ سے خان کے خدشات کو اور زیادہ تقویت ملی۔ [۱]

اس موقعہ پر برطانوی حکومت کا یہ نمائندہ اعلٰی خان کی تباہی یا اس کی معزولی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اس نے ملا محمد حسن کو واپس قلات روانہ کرکے اسے تاکید کی کہ وہ خان کے ساتھ اپنا اثر ورسوخ استعمال کرکے اسے ایسی کارروائیوں سے باز رکھے جو اس کے لئے تباہ کن ثابت ہوسکتی تھیں۔ ملا محمد حسن اپنی کامیابیوں پر خوشیاں مناتے ہوئے رخصت ہوگیا اور برطانوی حکومت کا یہ سادہ لوح نمائندہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگیا کہ اس نے خان میر محراب خان کے وزیر کو اپنا طرفدار بنا کر ایک بڑا سیاسی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ [۲]

قلات پہنچنے پر ملا محمد حسن نے خان کو یقین دلایا کہ انگریز ایک بے ایمان قوم ہے اور اس قوم سے اچھائی اور نیکی کی امید رکھنا عبث ہے اور انگریز افسروں کا ارادہ اسے گرفتار کرکے کلکتہ بھجوانے کا ہے۔ انگریز افسروں نے مجھے اپنی سحر انگیز گفتگو اور زر کے لالچ سے اپنا طرفدار بنانے کی بڑی کوشش کی تھی لیکن خدا واحد شاہد ہے کہ میں اپنے ولی نعمت سے روگردانی کرنے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتا۔ انگریز کچھ زیادہ طاقتور نہیں ہیں بلکہ کمزور ہیں اور ان کی فوج کی تعداد بھی کم ہے۔ اس لئے ان سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے اپنا یہ منصوبہ صرف انہی باتوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ برطانوی حکومت کے وزیر و سفیر کو بھی اطلاع دی کہ خان میر محراب

---

[۱]۔ [۲]۔ CHARLES MASSON

خان کو راہِ راست پر لانے کی بڑی کوشش کی گئی لیکن وہ بدستور اپنی ضد پر قائم ہے اور نت نئی سازشوں کے منصوبے بنا کر ان کو عملی جامہ پہنانے کی کارروائیوں میں مصروف ہے۔ اس نے قلات ہی میں بیٹھ کر کچھ ایسے عمل کئے کہ انگریزوں نے حقیقت حال کا تجزیہ کئے بغیر اس کی باتوں پر کلیتاً اعتبار کر لیا۔[1]

ملا محمد حسن کے پاس اس کے عہدے کی بنا پر اس قسم کے سفید کاغذ بڑی تعداد میں پڑے رہتے تھے جن پر خان میر محراب خان کی مہر ثبت ہوتی تھی تاکہ حسب ضرورت خان کی طرف سے فرامین جاری کرنے کے لئے ان کو استعمال کیا جا سکے۔ اس سے پیشتر خانان قلات کے کسی وزیر نے بھی اس قسم کے مہر شدہ خالی کاغذات سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ملا محمد حسن نے خان کی تباہی کو یقینی بنا کر اسے انگریزوں کے ساتھ الجھانے کی خاطر اس کی لاعلمی میں خفیہ طور پر خان کی طرف سے اس قسم کے فرامین جاری کر دیئے جن میں ان علاقوں کے مقتدر اور صاحبِ رسوخ افراد کو جہاں سے انگریزوں کی فوج کے گزرنے کا امکان تھا ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنی پوری طاقت استعمال کر کے انگریزوں کی فوج کا راستہ روک کر اس کو نقصان پہنچائیں اور مزاحمت کر کے ان کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کریں۔ بعد میں اس قسم کے فرامین انگریزوں کے ہاتھ لگے یا جان بوجھ کر پکڑوائے گئے۔ انگریزوں نے ان فرامین کی اصلیت معلوم کئے بغیر ہی

---

[1] :- CHARLES MASSON.

یہ فرض کر لیا کہ ان کو خان کی مرضی سے جاری کیا گیا ہے۔ ؎۱

خان کی مرضی انگریزوں کی فوج کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کی ہرگز نہ تھی۔ اس کے برعکس اس کی خواہش تھی کہ انگریزوں کی فوج بلوچستان کے علاقہ سے صحیح سلامت گذرے تاکہ اس معاملہ میں اس کو جو ذہنی پریشانی لاحق تھی وہ دور ہو جائے۔ اس موقعہ پر جبکہ انگریزوں کی فوج افغانستان کی طرف روانہ ہونے والی تھی قندھار کے بارک زئی سرداروں نے خان میر محراب خان کو روایتی بلوچ افغان دوستی کا واسطہ دلا کر اس پر زور ڈالا کہ وہ مزاحمت کر کے انگریزوں کی فوج کو درّہ بولان سے گزرنے نہ دے سردار میر آزاد خان نوشیروانی سردار خاران تو یہاں تک مزاحمت کے لئے تیار تھا کہ اس نے اپنی رضاکارانہ خدمات پیش کر دیں اور خان سے کہا کہ انگریزوں کی فوج کے خلاف مزاحمت کرنے کے لئے جو سنگر جگہ جگہ درّہ بولان میں قائم کئے جائیں گے وہ ان کے لئے اسلحہ اور نفری بڑی تعداد میں مہیا کرے گا۔ لیکن خان میر محراب خان اس قسم کی کارروائیوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا وہ انگریزوں کی فوج کے خلاف مزاحمت کر کے اپنے آپ کو افغانستان کے تخت کے دعویداروں کے تنازعہ میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس سے ان قدیم روایات کی نفی ہوتی تھی جن کے تحت بلوچستان اور افغانستان کی حکومتیں ایک دوسرے کے اندرونی تنازعات میں عدم مداخلت کے اصول پر ایک عرصہ دراز سے

؎۱۔ CHARLES MASSON.

کار بند چلی آتی تھیں۔[1]

انگریز افسروں کی ایک خواہش یہ تھی کہ ان کی فوج کا ایک حصہ (بمبئی ڈویژن) درہ مولا کے راستے کوچ کرتے ہوئے قلات کے راستے شال پہنچے۔ انہوں نے خان میر محراب خان کے نام ایک درخواست بھیج کر اس کی اجازت طلب کی۔ اگرچہ کوئی بھی حکمران کسی دوسری فوج کو اپنے دارالحکومت کی طرف بڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتا، اس کے باوجود خان نے انگریزوں کی فوج کے ایک حصے کو درہ مولا کے راستے سفر کرتے ہوئے شال کی طرف جانے کی اجازت دے دی لیکن بعد میں انگریزوں نے خود بخود اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا۔[2]

انگریزی فوج شکار پور سے جھل اور ڈھاڈر کے راستے شال کی طرف روانہ ہوئی۔ درہ بولان میں بعض قبائلیوں نے جو زیادہ تر شکلزئی، کرد اور کاکڑ قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے انگریزی فوج پر ہر جگہ حملہ کر کے ان کے مال و اسباب کو لوٹا اور بار برداری کے جانوروں کو رات کے وقت کھول کر لے گئے۔ درہ بولان کو عبور کرتے وقت انگریزی فوج کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان کا معمولی پیمانے پر جانی اور مالی نقصان بھی ہوا۔ آخر کار انگریزی فوج درہ بولان سے گزرتے ہوئے شال کوٹ پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ درہ بولان کے سفر کے دوران انگریزی فوج کو جن مشکلات سے گزرنا پڑا اس میں دراصل ملا داد محمد غلزئی کے بھائیوں غلام جان اور خان جان کا ہاتھ کام کر رہا تھا

---

[1] ، [2] CHARLES MASSON.

لیکن ان دونوں نے انگریز افسروں کو بڑی چالاکی سے یہ باور کرایا کہ انگریزوں کی فوج پر قبائلیوں کی طرف سے یہ حملے خان میر محراب خان کی ایما سے ہوئے۔ انگریز افسروں کو یہی دونوں بھائی اطلاعات فراہم کرتے تھے انہوں نے خان کو قبائلیوں کی ان کارروائیوں میں ملوث کرنے کی غرض سے عمل جراحی کے کچھ اوزار اور چاقو وغیرہ بھی مرداد راسپلنجی کے قبائلیوں سے خرید کر ثبوت کے طور پر ان کو پیش کر دیئے جو درہ بولان میں انگریزوں کی فوج پر حملوں کے دوران چرا لیئے گئے تھے اور انگریز افسروں نے ان اوزاروں کو خان کے خلاف ایک قوی ثبوت تسلیم کر لیا۔ لیکن اس موقعہ پر در پردہ غلزئی بھائیوں نے جو اہم کردار ادا کیا اس کا انہیں علم نہ ہو سکا۔[1]

درہ بولان میں قبائلیوں نے جو لوٹ مار مچائی اس کی ذمہ داری خان میر محراب خان پر ڈال دی گئی لیکن اس کے باوجود انگریز خان سے انتقام لینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اس موقعہ پر خان کا تعاون حاصل کر کے اسے اپنے دوستوں کی فہرست میں شامل کرنے کے لیئے ایک اور کوشش کی گئی۔ سر الیگزنڈر برنس جس کو قلات میں سفارت کے فرائض سر انجام دینے پر مامور کیا گیا تھا، خان کے ساتھ مفاہمت کر کے اس کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے شال سے قلات پہنچا لیکن وہ اور برطانوی حکومت کا سفیر و وزیر قلات کے حالات سے اس قدر بے خبر تھے کہ اس نے سید محمد شریف تیرکچی کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ باور کیا جاتا ہے کہ سر الیگزنڈر برنس

---

[1] - CHARLES MASSON.

نے خان میر محراب خان کو شکارپور اور کوئٹہ کا درمیانی راستہ کھلا رکھنے کی غرض سے مبلغ ڈیڑھ لاکھ روپے کی پیش کش بھی کی۔ اسی مقصد کے لئے ایک معاہدہ طے کر کے اس پر دونوں فریقوں نے اپنے دستخط اور مہریں ثبت کر دیں اور اب خان کے لئے صرف ایک ہی فرض باقی رہ گیا کہ وہ سر الیگزنڈر برلس کے ہمراہ شال جا کر شجاع الملک اور برطانوی حکومت کے سفیر و وزیر سے ملاقات کر کے ان کو اپنی حمایت کا یقین دلائے لیکن خان بعض اہم وجوہات کی بنا پر شال جانے کے حق میں نہیں تھا چارلس میسن کا بیان ہے کہ شجاع الملک کے متعلق خان اچھی رائے نہیں رکھتا تھا اس لئے وہ اس سے ملاقات کرنے کو سخت ناپسند کرتا تھا لیکن اس کی دو دوسری وجوہات بھی تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ شجاع الملک کے ساتھ ملاقات کر کے اپنے آپ کو افغانستان کے تخت کے دعویداروں کے تنازعہ میں ملوث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دونوں حکومتیں ایک عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کے اصول پر سختی سے پابند چلی آتی تھیں۔ اور ایسا کرنے سے قدیم افغان بلوچ دوستی کو نقصان پہنچنے کا امکان تھا جو ایک عرصہ دراز سے دونوں ممالک کے حکمرانوں کے درمیان چلی آتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس سے پیشتر شجاع الملک بارک زئی سرداروں کے ہاتھ سے شکست کھا چکا تھا اور اس دفعہ بھی اس کی کامیابی کے امکانات کچھ زیادہ روشن نہیں تھے۔ اس کے علاوہ محراب خان کو افغانوں کے مزاج اور ان کے مذہبی احساسات کا

پورا پورا علم تھا وہ جانتا تھا کہ شجاع الملک کو افغانستان میں کوئی پائیدار کامیابی حاصل نہ ہوگی کیونکہ اہل افغانستان جو بڑے کٹر مذہبی جذبات رکھتے تھے ایک ایسے شخص کو جو انگریزوں کی امداد و اعانت سے برسر اقتدار آنا چاہتا تھا کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتے تھے البتہ خان میر محراب خان برطانوی حکومت کے سفیر و وزیر کے ساتھ ملاقات کرنے کا مخالف نہیں تھا۔ ملا محمد حسن اور سید محمد شریف دونوں نے بڑی کوشش کی کہ خان میر محراب خان اور سر الیگزنڈر برنس کے درمیان کوئی معاہدہ طے نہ ہونے پائے لیکن ان کو کامیابی نہ ہوئی لیکن خان کو کوئٹہ جانے سے باز رکھنے کے لئے انہوں نے اپنی کوششیں بدستور جاری رکھیں اور انہوں نے اس کو باور کرانے کی کوشش کی کہ اگر اس نے شال کا سفر اختیار کیا تو اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔[۱]

برطانوی حکومت کا سفیر و وزیر جونہی شال پہنچا۔ ملا محمد حسن اور اس کے دوسرے ہمراز رفقاء اس کے حضور میں حاضر ہوئے۔ اس موقعہ پر انگریز افسروں کی طرف سے اس نکتہ پر زور دیا جا رہا تھا کہ خان میر محراب خان کو ضرور شال آنا چاہیئے۔ ملا محمد حسن اور اس کے ہم خیال ساتھیوں نے انگریز افسروں کے سامنے اس بات کا وعدہ کر لیا کہ وہ خان کو شال آنے کے لئے آمادہ کریں گے لیکن اس کے برعکس ملا محمد حسن نے خان کو شال جانے سے سختی سے منع کر دیا اور اس سے کہا کہ اگر شال میں اسے کوئی حادثہ پیش آیا

---

[۱] - CHARLES MASSON.

تو اس کی ذمہ داری اس کی اپنی ذات پر ہو گی اور ملا محمد حسن کو بعد میں مورد الزام نہیں ٹھہرایا جائے گا کہ اس نے اپنے فرائض میں کوتاہی کی اور اس نے خان کو اس قسم کا حادثہ پیش آنے کے بارے میں خبردار نہ کیا۔ ؎

سر الیگزنڈر برنس اس مقصد سے قلات آیا تھا کہ وہ لازمی طور پر خان کو شال جانے کے لئے آمادہ کرے گا۔ اور اس معاملہ میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر اس نے خان کو اس کی آمدورفت کے اخراجات کے لئے مبلغ بیس ہزار روپے بھی دے دیئے اور اس کی اتنی خوشامد کی کہ وہ بالآخر شال جانے پر راضی ہو گیا۔ خان کی مرضی تھی کہ وہ اپنے رتبہ کی مناسبت سے اپنے ساتھ پانچسو گھوڑ سواروں پر مشتمل ایک دستہ لے کر شال جائے گا۔ لیکن سر الیگزنڈر برنس نے صرف بیس گھوڑ سواروں کی تجویز پیش کر دی جو کسی طرح بھی مناسب نہیں تھی۔ اس سادہ لوح انگریز کی اس تجویز سے ملا محمد حسن اور اس کے ساتھیوں کو ایک زریں موقعہ ہاتھ آیا اور انہوں نے خان سے کہہ دیا کہ اب تو الیگزنڈر برنس کی اس تجویز سے صاف طور پر واضح ہے کہ خان کے بارے میں انگریزوں کی نیت خراب ہے اور سر الیگزنڈر برنس کا ارادہ ہی یہ ہے کہ وہ اسے دھوکہ سے شال لے جا کر گرفتار کرے اور اس کے بعد اسے کلکتہ بھجوا دے۔ ملا محمد حسن اور اس کے ساتھیوں کی مخالفت کے باوجود خان محراب خان نے شال جانے کی تیاریوں کے زمرے میں اپنے خیمے شہر سے باہر لگا دیئے۔ سر الیگزنڈر برنس کو اس

؎ ۔ CHARLES MASSON.

بات کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد شال جاکر اپنی غیر معمولی کامیابی کی اطلاع اپنے انگریز افسروں کو پہنچاکر ان کی داد حاصل کرے۔ وہ بڑی عجلت میں خود شال کی طرف روانہ ہوگیا اور اپنے منشی موہن لال کو قلات میں چھوڑ دیا تاکہ وہ خان کو لے کر شال پہنچا دے۔ خان کو اس کی عجلت کے ساتھ قلات چھوڑ کر شال جانے پر حیرانی ہوئی اور اس نے برملا کہا کہ سر الیگزنڈر برنس نے (اپنے خیال میں اپنے دانت پیس کر اور اس پر اپنی ترچھی نگاہیں ڈال کر) اسے چکمہ دیا اور اب وہ اپنے منشی کو اپنے پیچھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس کا ذکر بھی اس نے ہتک آمیز انداز میں کیا۔ موہن لال نے اپنے سرپرست کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر خان سے کہا کہ وہ گورنر جنرل ہندوستان لارڈ آک لینڈ کے ساتھ براہ راست اثر و رسوخ رکھتا ہے اور وہ اسی اثر و رسوخ کے بل بوتے پر ایک خوبصورت لونڈی خریدنے کا بھی خواہشمند تھا۔ اس کی یہ باتیں خان کی طبیعت پر ناگوار گزریں۔ خان اس کے بعد شال جانے کے بارے میں تذبذب میں مبتلا ہوگیا۔ خیال ہے کہ اسے اس بات کا وہم تھا کہ شال میں کہیں اس کے ساتھ واقعی کوئی حادثہ پیش نہ آئے لیکن اس تذبذب کی اصل وجہ یہ تھی کہ خان موہن لال کی قیادت میں بیس گھوڑ سواروں کے ساتھ شال جانے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکتا تھا۔[۱]

سر الیگزنڈر برنس نے اپنے قلات کے قیام کے دوران خان میر

۱۔ CHARLES MASSON.

محراب خان کے ساتھ جو معاہدہ طے کیا وہ اس کی خواہشات کے عین مطابق تھا اور خان کے ساتھ اس معاہدہ کی شرطیں طے کرتے ہوئے اسے کسی قسم کی کوئی دقت بھی پیش نہ آئی۔ البتہ خان نے اس موقعہ پر یہ شرط بھی پیش کی کہ اگر اس کا بھرپور تعاون حاصل کرنا مقصود ہے تو کراچی کی بندرگاہ اس کے حوالے کی جائے جو کسی زمانہ میں بلوچستان میں شامل تھی اور سندھ کے ٹالپر حکمرانوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ سر الیگزنڈر برنس کو خان کی یہ شرط پسند نہ آئی اور خان نے بھی اس پر اصرار نہ کیا جس کی وجہ سے یہ معاہدہ بڑی آسانی سے طے ہو گیا۔ لیکن ملا محمد حسن اور سید محمد شریف کو یہ معاہدہ پسند نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس معاہدہ سے خان کے اقتدار کو تقویت مل گئی تھی اور اس سے ملا محمد حسن اور سید محمد شریف کا وہ منصوبہ خاک میں مل گیا تھا جس پر عملدرآمد کر کے وہ خان میر محراب خان کو انگریزوں کے ساتھ الجھا کر اس کی تباہی کا سامان فراہم کرنے کے بڑے خواہشمند تھے۔ سر الیگزنڈر کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ ان دونوں کو اپنا معتمد خیال کرتا تھا۔[۱]

جب سر الیگزنڈر برنس قلات سے شال کی طرف روانہ ہو گیا تو سید محمد شریف کو بھی اس نے اپنے ساتھ لے لیا۔ سید محمد شریف نے متذکرہ بالا معاہدہ کے اثرات کو زائل کرنے کی غرض سے ایک نہایت جرات مندانہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سفر کے دوران راستہ ہی میں سر الیگزنڈر

۱۔ CHARLES MASSON.

کو خبردار کیا کہ مکار اور دغا باز محراب خان اس معاہدہ سے روگردان اور پشیمان ہے۔ اس نے اس کا راستہ روکنے کی غرض سے چند غنڈے مقرر کئے ہوئے ہیں اور امکان ہے کہ یہ لوگ سفر کے دوران ان پر حملہ آور ہوں گے اور ان کا مال و اسباب لوٹ کر لے جائیں گے۔ اس سادہ لوح فرنگی نے اس کی باتوں پر پوری طرح یقین کر لیا اور اپنی پونجی جس میں معاہدے کے مسودے کے علاوہ مبلغ دو ہزار روپے بھی شامل تھے۔ سید مذکور کے حوالے کر دی تاکہ وہ ان کو حفاظت سے چھپا کر رکھ لے۔ معاہدے کے مسودے اور نقدی جو ایک تھیلے میں رکھے گئے تھے ایک اونٹ کی پشت پر احتیاط سے باندھ دیئے گئے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ سر الیگزنڈر برنس کا راستہ روک کر اس پر حملہ کر کے اس کے مال و اسباب کو معاہدہ کے مسودہ اور نقدی سمیت لوٹ کر لے جانے کا منصوبہ محمد شریف نے خود ہی بنا لیا تھا اور یہ چور اور ڈاکو اس کی اپنی جماعت ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ خان میر محراب خان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سر الیگزنڈر کو سفر کے دوران راستہ ہی میں اس قسم کا حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ جب سر الیگزنڈر برنس اور محمد شریف اپنے رفقا اور سواری اور باربرداری کے جانوروں سمیت شمالی حدود میں داخل ہو گئے تو سید محمد شریف کی پیش گوئی کے مطابق چند چوروں اور ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کر دیا اور سر الیگزنڈر برنس کے کچھ اونٹوں کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ جن میں وہ اونٹ

لے :۔ CHARLES MASSON.

بھی شامل تھا جس کی پشت پر معاہدہ کے مسودہ اور نقدی کا تھیلا بھی رکھا گیا تھا اس حادثہ کے دوران سر الیگزنڈر برنس کے کچھ آدمی بھی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ سید محمد شریف کا یہ منصوبہ پوری طرح کامیاب ہوگیا۔ سید مذکور کو فرنگیوں کے مزاج کا پورا تجربہ حاصل تھا اور اسے معلوم تھا کہ فرنگی کسی سازش کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں اس نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس حادثہ کی ذمہ داری خان میر محراب خان پر ڈال دی اور اپنی اس بدکرداری اور جرم کو چھپالیا۔ انگریزوں نے اس واقعہ کی تحقیقات کرنے کی تکلیف گوارا نہ کی اور سر الیگزنڈر برنس جب شال پہنچا تو اس نے اس معاہدہ کے خلاف احتجاج کیا۔ جس کا مسودہ سفر کے دوران اس سے چھین لیا گیا تھا خان میر محراب خان کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے فوری طور پر شال کے نائب ملا رحیم داد کو قلات بلایا۔ جس کے علاقہ میں یہ حادثہ پیش آیا تھا اور اس واقعہ کے بارے میں اس سے دریافت کیا، ملا رحیم داد نے خان کو بتلایا کہ اس حادثہ کا منصوبہ خود سید محمد شریف نے تیار کیا تھا اور مبینہ چوروں کی اس ٹولی میں اس کا بھتیجا اور باغبان دونوں شامل تھے جن کو یہ کام سرانجام دینے کے لئے سید مذکور نے مبلغ چودہ سو روپے بھی دیئے تھے۔ خان میر محراب خان نے اس معاملہ میں سید مذکور کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ سید محمد شریف کی خدمات انگریزوں نے خرید لی تھیں، وہ ان کا اپنا آدمی تھا، اور یہ معاملہ بھی انگریزوں ہی سے تعلق رکھتا تھا لیکن وہ اس سے بےخبر تھا کہ انگریز سید محمد شریف کے فریب میں مبتلا

ہو کر اس جرم کا مجرم اس کی ذات کو ٹھہرا رہے ہیں۔ یہ بات بجائے خود حیرت انگیز تھی کہ لارڈ آک لینڈ نے نہایت اہم امور پر اس قسم کے انگریز افسروں کو مامور کر دیا تھا جو فکر کی گہرائی اور سیاسی بصیرت سے قطعاً محروم تھے اور جن کو سید محمد شریف جیسا ریاکار اور دغاباز شخص فریب میں مبتلا کر کے آسانی سے دھوکہ دے سکتا تھا۔ بعد میں سر الیگزنڈر برنس نے خان کے خلاف اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خان میر محراب خان نے اس کے قیام قلات کے دوران کراچی کی بندرگاہ کا مطالبہ کیا تھا۔ غالباً اس کو یاد نہیں رہا تھا کہ سردار دوست محمد خان امیر کابل نے بھی اس کے قیام کابل کے دوران اسی قسم کا ایک مطالبہ پشاور کے بارے میں بھی کیا تھا اور سر الیگزنڈر برنس نے اس کی باتیں بڑے غور سے سنی تھیں اور اس موقعہ پر اسے برہم ہونے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔[۱]

ان ایام میں خان میر محراب خان بدستور قلات کے قلعہ سے باہر قیام پذیر تھا اور وہ اپنے سفرِ شال کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے نہیں پایا تھا جس کی وجہ سے شال کی طرف اس کی روانگی میں تاخیر ہو گئی اس موقعہ پر سر الیگزنڈر برنس کی جانب سے اسے ایک خط ملا جس میں خان کو اطلاع دی گئی تھی کہ شجاع الملک شال کوٹ سے قندھار کی طرف روانہ ہو چکا ہے اور اب وہ شال کی طرف آنے کی تکلیف گوارا نہ کرے۔ اس

---

۱ :۔ CHARLES MASSON.

خط کی وجہ سے خان کو اس تذبذب سے نجات حاصل ہو گئی. جس میں وہ انگریز افسروں کے نامناسب اور غیر معقول رویہ کی وجہ سے مبتلا ہو گیا تھا.[1]

اپریل ۱۸۳۹ء میں انگریزوں اور شجاع الملک کی مشترکہ فوج قندہار کی طرف روانہ ہو گئی. جب بارک زئی سرداروں کو معلوم ہو گیا کہ انگریزوں کی فوج بڑی سرعت کے ساتھ قندہار کی طرف بڑھ رہی ہے تو وہ ایران کی طرف بھاگ نکلے. انگریزوں نے قندہار پر قبضہ کر لیا. ۸ مئی ۱۸۳۹ء کو ایک تقریب میں قندہار ہی میں شجاع الملک کی بادشاہت کا اعلان کر کے اسے تخت پر بٹھا دیا گیا. درانی سرداروں اور قندہار کے باشندوں کا رویہ وہ نہیں تھا. جس کی توقع انگریز کر رہے تھے. قندہار پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے غزنی پر چڑھائی کرنے کا فیصلہ کیا. غزنی پر قبضہ کرنے کے بعد وہ کابل کی طرف بڑھنے کا ارادہ رکھتے تھے. انگریزوں کی فوج کی قیادت سر جان کین کے سپرد تھی اور شاہ شجاع بھی اس کے ہمراہ تھا. امیر دوست محمد نے ایک طویل محاصرہ کے خیال سے غزنی کے قلعہ میں خوراک کی ایک بڑی مقدار جمع کر کے اس کی حفاظت کے لئے وہاں فوج بٹھا دی جس کی قیادت اس کے بیٹے غلام حیدر خان کے سپرد تھی. امیر دوست محمد انگریزوں کی فوج کو کافی عرصہ رو کے رکھنے کا خواہشمند تھا تاکہ اسے غلزئی قبائل سے کثیر تعداد میں لشکر جمع کرنے

۱- CHARLES MASSON.

کا موقعہ ملے اور وہ اپنے بیٹے اکبر خان اور اس کی فوج کو درہ خیبر کے علاقہ سے بلا سکے۔[1]

اگرچہ غزنی کے قلعہ کے استحکامات بڑے مستحکم تھے اور غلام حیدر خان نے قلعہ کے تمام دروازوں کو خاک ریز کر کے پوری طرح مسدود کر دیا تھا۔ فقط کابل کی طرف کھلنے والے دروازے کو خاک ریز کر کے مسدود نہیں کیا گیا تھا تاکہ غزنی کا رابطہ کابل سے قائم رہ سکے۔ لیکن انگریزوں کے پاس خوراک کی کمی تھی اور وہ اپنا بھاری اسلحہ پیچھے چھوڑ آئے تھے ان حالات میں وہ ایک طویل محاصرہ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ۲۳ جولائی کو علی الصبح انگریزی فوج کی ایک جماعت نے کپتان پیٹ لیفٹیننٹ میک لیوڈ اور سر ڈورنڈ کی قیادت میں کابل کی جانب کھلنے والے دروازے کو منہدم کر دیا ــــ انگریزوں کی فوج غزنی کے قلعہ میں داخل ہو گئی اور غلام حیدر خان کو گرفتار کر لیا۔ خوراک کی ایک بڑی مقدار انگریزوں کے ہاتھ لگی۔ انگریزوں کی اس کامیابی سے امیر دوست محمد خان کے تمام منصوبے درہم برہم ہو گئے۔ درانی سرداروں کو جو ابھی تک لاتعلق تھے شاہ شجاع کی طرف مجبوراً جھکنا پڑا۔ امیر دوست محمد خان کابل سے دو منزل آگے بڑھ کر مورچے سنبھالے ہوئے تھا۔ لیکن سقوط غزنی اور اپنے بیٹے کی گرفتاری کی خبر سن کر اس نے انگریزوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے ارادے کو ترک کر دیا اور اپنے خاندان کے افراد کو بلخ روانہ کر دیا۔ اس موقعہ پر اکبر خان بھی

---

[1] G.P. TATE

سر کلاڈ ویڈ کی فوج کے مقابلے کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا تھا وہ بھی اپنے باپ سے جا کر مل گیا اور امیر کی پسپائی کو پردہ دے کر بڑی پامردی سے اس کی حفاظت کی۔ ویڈ کی سکھ فوج اور مقامی لیویز میں شہزادہ تیمور بھی شامل تھا۔[۱]

شاہ شجاع کا کابل کی طرف روانہ ہونا شان و شوکت کا مظہر تھا راستہ میں آس پاس کے گاؤں کے لوگ ہر طرف سے امنڈ آئے تھے تاکہ وہ اس نظارے کی کیفیت دیکھ سکیں۔ غالباً وہ شاہ شجاع کی بجائے سفید فام فرنگیوں کو دیکھنے کی خاطر جمع ہو گئے تھے جن کے ساتھ انہیں کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ۷ اگست کو شاہ شجاع کابل میں بڑے شاہانہ اور فاتحانہ انداز میں داخل ہوا۔ برطانوی حکومت کے وزیر و سفیر کے علاوہ سر جان کین اور فوج کے دوسرے ممتاز عہدیدار اس کے ہمرکاب تھے۔ بالاحصار کی طرف جانے والے راستہ کے دونوں طرف کابل کے باشندے بڑی تعداد میں جمع ہو گئے تھے اور وہ مکانوں کی چھتوں اور دیواروں سے بڑی حیرت کے ساتھ اس غیر معمولی جلوس کا نظارہ کر رہے تھے۔ شاہ شجاع کو پورے تیس سال کے بعد بالاحصار کے قلعہ میں داخل ہو کر قیام کرنے کا موقعہ ملا تھا۔[۲]

برطانوی حکومت کے سفیر و وزیر نے قندھار کی طرف انگریزی فوج کی روانگی کے موقعہ پر کیپٹن بین کو شال میں بھیجا کر سیاسی امور کی نگرانی اس کے سپرد کر دی تھی۔ خان میر محراب خان نے اپنے کچھ آدمی اس کے پاس شال بھیج

---

[۱] [۲] G. P. TATE.

کر اس سے رابطہ پیدا کرنے کی ایک آخری کوشش کی لیکن کیپٹن بین نے ان کے ساتھ ملاقات کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز افسروں نے اپنی طرف سے خان میر محراب خان کو پوری طرح مجرم گردان کر اس کو قرار واقعی سزا دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔[1]

خان میر محراب خان کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس نے سر الیگزنڈر برنس کے ساتھ جو معاہدہ طے کیا تھا وہ انگریزوں کی طرف سے کالعدم قرار دیا گیا تھا۔ اس نے ملا محمد حسن کو حکم دیا کہ وہ قندہار جا کر اس کی طرف سے شاہ شجاع کو اس کی کامیابی پر مبارک بادی کا تحریری پیغام پہنچا دیں اور شاہ شجاع کے علاوہ انگریز افسروں کو اس کی طرف سے تحفے تحائف بھی پیش کریں۔ ملا محمد حسن شال تک گیا اور کیپٹن بین سے ملاقات کر کے اس کے ذہن کو آلودہ کرنے کی کوشش کی اور اس کے بعد خان کو لکھا کہ انگریز افغانستان میں شکست سے دوچار ہو گئے ہیں۔ اور وہ عنقریب پناہ گزینوں کی حیثیت سے بلوچستان لوٹ آئیں گے۔ وہ قندھار جانے کے لیئے تیار ہے لیکن کچھ انتظار کرنا ضروری ہے تاکہ بعد میں اسے غلط کاری اور اپنے فرائض سے لاپرواہی کرنے کا ملزم نہ ٹھہرایا جائے۔ ملا محمد حسن نے غزنی کے سقوط اور کابل پر شاہ شجاع کے قبضے تک قندہار کی طرف روانگی میں تاخیر کر کے خان کی حکم عدولی کی اور خان نے ملا محمد حسن کے اس رویہ سے تنگ آکر اسی مقصد سے شال کے نائب ملا رحیم داد کو قندہار کا سفر اختیار کرنے کا حکم دیا اور

---

[1] :- CHARLES MASSON.

ہدایت کر دی کہ وہ وہاں سے کابل جا کر اس کی طرف سے شاہ شجاع کو خطوط اور بہت سے تحفے تحائف پیش کر دے۔ لیکن ملا رحیم داد نے بھی بہانے بنا لیئے اور کابل جانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اسی دوران بعض جرائم پیشہ افراد شال میں متعین انگریزی فوج کے اونٹوں کو زبردستی کھینچ کرلے گئے اور ان کو سیستان لے جا کر فروخت کر دیا۔[1]

کچھ وقت گزرنے کے بعد انگریزوں کی ایک بریگیڈ فوج میجر جنرل ویشارٹ کی قیادت میں کابل سے واپسی کے دوران شال پہنچ گئی اور انگریزوں کو بلوچستان کے حکمران خان میر محراب خان سے اس کی غداری اور جرائم کی پاداش میں انتقام لینے کا موقعہ فراہم ہو گیا۔ اس موقعہ پر بھی ملا محمد حسن انگریزوں کے کیمپ میں موجود تھا اور وہ اپنی پرانی چالوں کو بروئے کار لانے میں مصروف تھا۔ اسے اس میں کامیابی بھی حاصل ہو گئی کیونکہ انگریز اس قماش کے لوگوں کی باتوں کو پرکھے بغیر سچ ماننے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اس نے شال میں موجود پولٹیکل افسر کو یقین دلایا کہ اس نے خان میر محراب خان کو انگریزوں کے ساتھ اپنا غلط رویہ تبدیل کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ دوسری طرف اس نے خان کو لکھا کہ وہ کسی بھی صورت میں شال نہ آئے ورنہ اسے قید کر کے کلکتہ بھجوا دیا جائے گا۔[2]

---

[1] :- CHARLES MASSON.

[2] :- ABID.

ان حالات سے ایک غیر معمولی ثبوت فراہم ہو جاتا ہے کہ خان میر محراب خان کو کس حد تک اندھیرے میں رکھا گیا تھا کہ اسے اس بات کا وہم و گمان تک نہ تھا کہ اسے ان جرائم کے لئے انتقام کا نشانہ بنا یا جائے گا جن کا ارتکاب اس نے کبھی کیا ہی نہ تھا۔ انگریزوں کے قلات پر حملہ کا علم اسے اس وقت ہوا۔ جب انگریزوں کی فوج شال سے قلات کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس آخری وقت پر وہ اپنے دفاع کی طرف اپنی توجہ مبذول کر کے جنگ کی تیاری میں مصروف ہو گیا اور اپنے ہرکارے چاروں طرف روانہ کر کے اپنے قبائل سے امداد طلب کی۔[۱]

اس سے پیشتر جب خان اور اس کے قبائلی سرداروں کے درمیان اختلافات پیدا ہو جایا کرتے تھے تو وزارت کا فرض تھا کہ وہ اس قسم کے اختلافات کو ختم کر کے خان اور اس کے سرداروں کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرے۔ مگر ملا محمد حسن کو اس قسم کے فرائض سرانجام دینے سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور نہ ایسا کرنے کی اس میں صلاحیت موجود تھی۔ اس نازک موقع پر جبکہ دارالحکومت کو انگریزوں سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ملک میں اتحاد و اتفاق کا زبردست فقدان تھا۔ خان نے قلات کے دفاع کے لئے جو اپیل کی بہت کم لوگوں نے اس کا جواب دیا۔ جب انگریزوں کی فوج قریب پہنچ رہی تھی تو اس نے اخوند ملا محمد صدیق کو انگریزوں کی فوج میں شامل پولٹیکل افسر سے بات چیت کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ اس کی روانگی

---

[۱] - CHARLES MASSON.

کے وقت خان نے برملا کہا کہ اخوند ملا محمد صدیق ایک دغا باز شخص ہے اور وہ اس سے دغا کر کے رہے گا۔ اس کی رائے بچ نکلی اور اخوند مذکور نے اس سے دغا کی۔ اس دغابازی کے صلہ میں اس نے قلات کے ہندو دکانداروں کے نام انگریز پولیٹیکل افسر سے ڈرافٹ بھی حاصل کئے خان میر محراب خان کے اس نمائندے اور پولیٹیکل افسر کے درمیان ملاقات منگوچر کے مقام پر ہوئی۔ اخوند نے انگریزوں سے وعدہ لیا کہ انگریزوں کی فوج ۱۴ نومبر ۱۸۳۹ء کی صبح سے پیشتر قلات میں وارد نہ ہوگی۔ غالباً اخوند کا مقصد یہ تھا کہ قلات سے خان کو بھاگ جانے کا وقت میسر آسکے اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ خان کو ایسا کرنے کی ترغیب دینا چاہتا تھا لیکن انگریز در پردہ اس وعدے پر کاربند رہنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے اور وہ خان کو بچ نکلنے کا موقعہ فراہم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ انگریزوں کی فوج ۵ نومبر ۱۸۳۹ء کو علی الصبح قلات پہنچ گئی۔ انگریزوں نے پس شہر کی طرف سے پہاڑی ٹیلوں پر فوراً اپنی توپیں نصب کردیں اور قلعہ پر گولہ باری شروع کردی۔ انگریزوں کی فوج ۱۲۶۱ افراد پر مشتمل تھی اور ان کے ساتھ چھ توپیں تھیں جن کو چھکڑوں پر لاد کر قلات پہنچایا گیا تھا۔ قلات کے استحکامات اس قدر کمزور تھے کہ حملہ میں تاخیر کرنے کی ضرورت نہ تھی انگریزی فوج کا ایک دستہ پس شہر کی جانب سے قلعہ کی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہوگیا اور توپوں کی گولہ باری سے قلعہ کی شمالی دیوار میں شگاف پڑ گئے اور وہ مسمار ہوگئی۔ قلعہ کے لوگوں کی اکثریت کا تعلق قلات شہر اور اسکے مضافات

سے تھا۔ ابھی قلعہ پر حملہ شروع ہی ہوا تھا کہ ان کا ایک بڑا حصہ قلعہ کی دیوار پھاند کر بھاگ نکلا۔ قلعہ کی شمالی دیوار منہدم ہو جانے کی وجہ سے انگریزی فوج کو قلعہ کے اندر داخل ہونے کا راستہ مل گیا۔ اس کے بعد انہوں نے قلعہ کے دروازے بھی اڑا دیئے اور لڑائی شروع ہو گئی خان میر محراب خان اور اس کے مٹھی بھر ہم وطنوں نے جو اعانت وطن میں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہانے پر تیار تھے بڑی بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ صبح سے دوپہر تک جنگ جاری رہی بالآخر خان میر محراب خان نے کوئی چار سو افراد کے ساتھ دادِ شجاعت دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ دو ہزار افراد کے لگ بھگ انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ یہ رمضان شریف کا مہینہ اور جمعہ کا دن تھا۔ انگریزوں کی فوج کی طرف سے اکیس افراد قتل اور ایک سو کے قریب شدید زخمی ہوئے معمولی زخمی ہونے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ انگریزوں کے ہتھیار زیادہ مہلک تھے اور بلوچ تلواروں اور دیسی بندوقوں سے توپ و تفنگ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لئے ان کا نقصان زیادہ ہوا۔ ؎

اس موقعہ پر سرکردہ افراد میں سے جن لوگوں نے اعانتِ وطن میں انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ ان میں سردار ولی محمد مینگل، میر تاج محمد مینگل، میر عبدالکریم رئیسانی، ارباب نور محمد دہوار، سردار داد کریم شاہوانی، سردار شہباز خان بجارانی قلاتی لہڑی زمان

؎ :- CHARLES MASSON.

خان پندرانی شاہ غاسی نور محمد، داروغہ فاضل محمد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ غدایانِ وطن دیوان بچہ رام، دیوان کھیم چند اور دیوان اسرداس نے بھی اس موقعہ پر اپنے خون کی قربانی دی۔ اس موقعہ پر جن لوگوں کو شہادت نصیب نہ ہوئی ان میں ملا محمد حسن نائب رحیم داد، اخوند ملا محمد صدیق، سید محمد شریف، نائب عبدالعزیز اور محمد خان رستم زئی شامل تھے جو میری کی بالائی منزل میں ایک کوٹھڑی میں چھپے ہوئے پائے گئے اور انہوں نے انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ [1]

سقوط قلات کے وقت ملا محمد حسن کے دوغلہ رویہ کے پیشِ نظر گمان کیا جاتا تھا کہ وہ قلات کی مسند کے حصول کا خواہشمند تھا۔ لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ دستاویزات کی تلاش کے دوران اس کے سرہانے کے نیچے سے اس قسم کے خطوط انگریز افسروں کے ہاتھ لگے جو اس نے خان میر محراب خان کو لکھے تھے۔ ان خطوط سے اس کی دغابازی کا راز انگریزوں پر فاش ہوگیا۔ انگریزوں نے اسے گرفتار کر کے ملا رحیم داد سمیت سندھ میں بھکر کے قلعہ میں قید کر دیا۔ کیپٹن بین نے برہم ہو کر اسے سخت لعنت ملامت کی جس کا مطلب یہ تھا کہ خان میر محراب خان کی بیگناہی انگریزوں پر پوری طرح واضح ہوگئی تھی۔ [2]

۱۸۴۰ء میں چارلس میسن قلات آیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ

ف ۱۔ CHARLES MASSON.

ف ۲۔ ABID.

ان دنوں میں اس نے قلات کو بڑا خوشحال شہر پایا تھا لیکن سقوط قلات
کے فوراً بعد جب وہ قلات میں وارد ہوا تو یہاں جنگ کی تباہی کے
اثرات نمایاں تھے۔ قلات کے باشندے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس
جنگ کا ذکر کرتے ہوئے اسے مشیت خداوندی قرار دیتے تھے اور وہ
خود تسلیم و رضا کی ہو بہو تصویر تھے۔ قلات پر انگریزوں کے حملہ کی خبر سنتے
ہی شہر قلات کے شرفا کی اکثریت نے اپنی مستورات کو اپنے ہاتھ سے
تہ تیغ کر دیا تاکہ انگریز فوجی ان کی بے حرمتی نہ کریں اور خود لڑائی میں شامل
ہو گئے۔ ان میں سے کئی لوگ شہادت حاصل نہ کر سکے اور بچ گئے لیکن ان
کے گھروں کی پرانی رونق اور گہما گہمی ایک المناک اور شدید افسردگی اور
وحشت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ بڑے صابر و شاکر
نظر آتے تھے۔[1]

خان میر محراب خان نے قلات پر انگریزوں کے مبینہ حملے کی
اطلاع پاتے ہی سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اپنے بھائی میر اعظم خان
کو حکم دیا کہ وہ قلات چھوڑ کر کسی محفوظ مقام کی طرف چلا جائے جب حملہ
شروع ہوا تو خان کے حرم کو بھی ان کی کنیزوں سمیت قلعہ سے باہر نکال
دیا گیا اور ان میں سے کچھ پیدل روانہ ہو گئیں۔ خان نے حملہ سے کچھ دن ہی
پیشتر اپنے بیٹے میر محمد حسن کو داروغہ گل محمد سمیت نوشکی کی طرف روانہ کر دیا
تاکہ وہ قلات کے دفاع کے لئے وہاں سے ایک لشکر جمع کر کے اپنے

---

[1] CHARLES MASSON.

ساتھ لائیں لیکن ان کی آمد میں تاخیر ہوگئی۔ جب انگریزوں کی فوج قلعہ کے اندر داخل ہوگئی اور کسی قسم کی امید باقی نہ رہی تو خان نے اپنے بیٹے کے لئے بطور تحفہ ایک رائفل اپنے ایک معتمد شخص کے حوالے کی۔ جس کے اوپر اس کے آباؤ اجداد میں سے تیئس افراد کے اسمائے گرامی سنہری حروف میں کندہ تھے تاکہ وہ اسے ایک علامتی نشانی کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھے اور وہ یہ بندوق ہے کہ جہاں کہیں بھی جائے تو اس بندوق کے بل بوتے پر لوگ اسے شناخت کر سکیں۔ اس بندوق کے ساتھ اس نے اپنے بیٹے کے نام ایک تحریر بھی لکھی۔ جس میں اس کو مندرجہ ذیل تین نصیحتیں کی گئیں تھیں۔

۱۔ وہ انگریزوں کے سامنے حتی المقدور ہتھیار ڈالنے سے گریز کرے۔

۲۔ وہ قبائل کے مزاج کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس وقت تک ان پر اعتماد نہ کرے جب تک کہ وہ انگریزوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے میں پہل نہ کریں۔

۳۔ وہ تمباکو نوشی سے قطعاً پرہیز کرے کہ جس کا لازمی نتیجہ شراب نوشی ہوتا ہے اور جو اس کے چچا میر اعظم خان کی طرح اسے بھی ناکارہ بنا دے گی۔ لے

خان کے ذاتی مال واسباب پر بھی انگریزوں نے قبضہ کر لیا جو پہلے سے کہیں منتقل کرنے کی غرض سے جمع کر کے تیار کر لیا گیا تھا۔ خان اپنے

لے:- CHARLES MASSON

ہیروں جواہرات کے لئے بھی شہرت رکھتا تھا لیکن بروقت یہ دستیاب
نہ ہو سکے۔ انگریز افسروں نے ان کے متعلق تحقیقات شروع کر دی۔ کچھ
دنوں کے بعد ان کو خفیہ طور پر اطلاع ملی کہ یہ جواہرات ملا محمد حسن کے
قبضہ میں ہیں اور خان نے ہی اس کو یہ جواہرات سپرد کر دیئے تھے۔ ملا
محمد حسن کے گھر کی تلاشی لی گئی اور یہ جواہرات اس کے گھر سے برآمد ہو گئے
اس سے انگریزوں کو بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ غالباً ملا محمد حسن نے ان جواہرات
کو اپنے لئے محفوظ کر لیا تھا۔ ان جواہرات کو سمندری راستہ سے بمبئی روانہ
کر دیا گیا لیکن وہ راستہ ہی میں گم کر دیئے گئے۔ خان کے خزانہ میں سے
جو قیمتی پتھر دستیاب ہوئے وہ غیر تراشیدہ تھے اور ان میں نقص موجود تھا
وہ فقط ساٹھ ہزار روپے میں فروخت کر دیئے گئے۔ خان کے خزانے
میں مبلغ بیس ہزار روپے کی رقم بھی ملی جو سر الیگزنڈر برنس نے اپنے
قیام کے دوران اس کے حوالے کی تھی۔[1]

ملا محمد حسن کے گھر سے ایک غیر معمولی انکشاف بھی ہوا جس سے
نہ صرف اس کی دغا بازی پر روشنی پڑتی تھی بلکہ اس کا وہ طریقہ کار بھی
ظاہر ہو گیا کہ جس کے بل بوتے پر وہ خان کی تباہی کا سامان فراہم کیا کرتا
تھا۔ اس کے گھر سے سفید کاغذات کے کوئی ایک سو ورق بھی ملے جن
پر خان کی مہر ثبت تھی۔ ان پر کوئی تحریر نہیں لکھی گئی تھی وہ استعمال کے لئے
تیار تھے اور ان پر حسب منشا اپنی صوابدید کے مطابق تحریر لکھ کر ان کو

۱۔ CHARLES MASSON.

جاری کیا جا سکتا تھا۔ ان کاغذات سے اس بات کا ثبوت مہیا ہو گیا کہ وہ محمد حسن ان مہر شدہ کاغذات پر خان کی طرف سے اس کی لاعلمی میں فرامین جاری کر کے قبائل کو انگریزوں کے خلاف اشتعال دے کر ان کو انگریزوں کی فوج پر حملہ کرنے کی ترغیب دلایا کرتا تھا۔[۱]

انگریزوں پر اپنے معتمدین کی دغا بازی پوری طرح واضح ہو گئی تھی اور ان پر یہ بھی انکشاف ہو گیا تھا کہ خان میر محراب خان کو انہوں نے بیگناہ شہید کر کے ایک زبردست جرم کا ارتکاب کیا تھا لیکن اس کے باوجود بلوچستان کے متعلق ان کی نیت صاف نہ تھی۔ ان کے ساتھ اس معاملہ میں جو دغا بازی ہوئی تھی اس میں ان کی اپنی بیوقوفی بھی شامل تھی۔ لارڈ آک لینڈ کے اس نامعقول ٹولے نے اپنی نالائقی کو چھپانے کی خاطر اس بے انصافی کو خان میر محراب خان کے فرزند کے ساتھ بھی جاری رکھا، جسے انہوں نے خان کے ساتھ روا رکھا تھا۔ انہوں نے میر محمد حسن کے حق کو قطعی نظر انداز کر کے میر شاہنواز خان کو قلات کی مسند پر بٹھا دیا اور اس کے لئے یہ جواز پیدا کیا کہ وہ میر محبت خان کا پوتا ہونے کی وجہ سے بلوچستان کا جائز حکمران ہونے کا مستحق تھا۔ حالانکہ میر محبت خان کو تقریباً ایک صدی پیشتر حکمران بننے کے بعد معزول کر دیا گیا تھا۔ گویا خان میر نصیر خان اول سے لے کر میر محراب خان تک جتنے حکمران ہو گزرے تھے وہ سب کے سب ناجائز تھے۔ انگریزوں کا یہ قدم نہ صرف

---

[۱] CHARLES MASSON.

مضحکہ خیز بلکہ نامعقولیت پر مبنی تھا۔[۱]

انگریزوں نے دوسرا اہم قدم یہ اٹھایا کہ انہوں نے بلوچستان کے حصے بخرے کر ڈالے۔ انہوں نے سراوان کا صوبہ، شال کی نیابت اور دوسرے اضلاع سمیت اور کچھی کا صوبہ اس کے اضلاع سمیت امیر کابل کے مقبوضات میں شامل کر دیئے۔ سردار محمد خان شاہوانی کو مبلغ دو سو روپے سالانہ کے مشاہرے پر شاہ شجاع الملک کی طرف سے سراوان کا نائب مقرر کر دیا گیا جو کیپٹن بین کی نگرانی میں اپنے فرائض سرانجام دیا کرتا تھا۔ کچھی کے صوبے کا نائب سید محمد شریف ترکی کو مقرر کر دیا گیا جو مسٹر راس بیل کی ماتحتی میں شاہ شجاع الملک کی طرف سے اپنے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ شال کی نیابت کا انتظام سردار محمد خان ابن سردار سمندر خان پوپلزئی کے سپرد ہوا جو کیپٹن بین اور اس کی فوج کا ہیڈ کوارٹر بھی تھا۔[۲]

بلوچستان کے حصے بخرے کرنے سے انگریزوں کا مقصد یہ تھا کہ بلوچوں کی قومی یکجہتی ختم ہو جائے وہ انگریزوں کے خلاف کوئی مزاحمت نہ کر سکیں اور امیر کابل کی آمدنی میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو سکے[۳]

انگریزوں کا مقرر کردہ نیا خان وراثت کے اصول سے پوری طرح واقف تھا۔ اس نے مسٹر راس بیل سے مبلغ بیس ہزار روپے شکارپور

۱:۔ CHARLES MASSON.

۲:۔ ABID

۳:۔ ABID

میں بطور قرض حاصل کیئے تھے اس رقم کی ادائیگی کا پروانہ لسبیلہ کے محکمہ کسٹم کے نام جاری کر کے اس نے خان میر نصیر خان کے اس فرمان کو منسوخ کر دیا جس کی بنا پر خان موصوف لسبیلہ کی آمدنی میں اپنے نصف حصہ سے دستبردار ہو گیا تھا۔ اگرچہ بعد میں اس پروانہ کو ناپسند کر کے رد کر دیا گیا لیکن خان کا یہ قدم لارڈ آک لینڈ اور اس کے مشیروں کے اصول وراثت کے تصور کے عین مطابق تھا۔ جس کے تحت قلات کی مسند پر اس کے دعویٰ کو درست تسلیم کر لیا گیا تھا۔[۱]

انگریزوں نے افغانستان اور بلوچستان دونوں میں سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ انہوں نے سابقہ حکمرانوں کے مخالفین کو اپنا دوست بنا لیا اور انہی لوگوں نے ان سے دغابازی کی۔[۲]

لارڈ آک لینڈ نے افغانستان اور بلوچستان میں اپنے جس ٹولے کو اہم سیاسی امور سپرد کر دیے تھے ان کی کوتاہ اندیشی اور نالائقی کی وجہ سے افغانستان میں امیر دوست محمد خان کو اپنے اقتدار سے محروم ہونا پڑا اور بلوچستان میں خان میر محراب خان کو اپنے اقتدار کے ساتھ ساتھ اپنی جان کی قربانی بھی دینی پڑی لیکن بعد میں اس ٹولے کے ناعاقبت اندیشانہ کارروائیوں کی وجہ سے انگریزوں کی پوری فوج کو اس کے اعلیٰ منصبداروں سمیت ایک ایسی تباہی کا سامنا کرنا پڑا جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔[۳]

---

۱ 1- CHARLES MASSON.

۲ 1- G.P. TATE

۳ 1- ABID.

چھبیسواں باب

خان میر نصیر خان ثانی

شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل کو جو خان میر محراب خان کی منشاء کے مطابق ایک لشکر جمع کرنے کی غرض سے نوشکی گئے ہوئے تھے نوشکی میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ وہ نوشکی کے ذگر مینگل اور دوسرے قبیلوں سے ایک لشکر جمع کر کے ایک ایسے موقعہ پر قلات سے چند کلومیٹر کے فاصلہ پر کوہنگ کے مقام پر پہنچے جبکہ انگریزوں کی فوج نے جنرل ویلشائر کی قیادت میں قلات پر قبضہ کر لیا تھا۔ خان میر محراب خان اور دوسرے ممتاز سرداروں اور معتبرین کی شہادت کی خبر سن کر انہیں ایک بڑا دھچکا لگا۔ داروغہ گل محمد اور شہزادہ میر محمد حسن قلات پر حملہ کرنے کے لئے بڑے مضطرب تھے۔ لیکن مینگل قبیلے کے تجربہ کار اور دور اندیش معتبرین قلات پر حملہ کر کے اپنی طاقت کو ضائع کرنے کے حق میں نہ تھے۔ وہ لوگ شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل محمد کو اپنے ساتھ لے کر واپس نوشکی چلے گئے۔ داروغہ گل محمد اور شہزادہ میر محمد حسن نے اپنے لواحقین کے ساتھ نوشکی سے خاران کی طرف مراجعت کی جہاں سردار میر آزاد خان نوشیروانی نے ان کو اپنے ہاں پناہ دے کر ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر

اٹھا نہ رکھی۔ کچھ دنوں کے بعد سردار میر ملّہ خان گچکی نے ان کو پنجگور آنے کی دعوت دی اور انہوں نے پنجگور جا کر سردار میر ملّہ خان گچکی کے ہاں قیام کیا

میر شاہنواز خان کو قلات کی مسند پر بٹھانے کے بعد انگریز افسروں کو قلات میں ایک پولیٹیکل افسر کی تقرری کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہوں نے کیپٹن بین کے معاون لیفٹیننٹ لوڈے کو اس عہدے پر مامور کر کے اسے قلات میں بٹھا دیا۔ نئے خان نے سب سے پہلے اپنی توجہ شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل محمد کی طرف مبذول کی اور لوڈے کو جو عام لوگوں میں لب دین کے نام سے مشہور تھا اپنے ساتھ لے کر پنجگور کی طرف روانہ ہوا تاکہ وہ شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل محمد کو پنجگور سے نکال باہر کر کے یا انہیں گرفتار کر کے ان سے نجات حاصل کرے۔ اس کا منصوبہ بڑا معقول تھا اور شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل محمد کی گرفتاری خارج از امکان نہ تھی۔ لیکن باغبانہ کے میر کمال خان ایتازئی نے جس کا شمار میر شاہنواز خان کے حامیوں میں ہوتا تھا۔ نئے خان کے عزائم کی اطلاع سردار میر آزاد خان نوشیروانی کے توسط سے پنجگور میں شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل محمد کو پہنچا دی۔ میر کمال خان کی اس بروقت اطلاع سے میر شاہنواز خان کا یہ منصوبہ ناکام ہو گیا اور نئے خان کی پنجگور میں آمد سے پیشتر شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل محمد اپنے لواحقین کو ساتھ لے کر خاران کی طرف منتقل ہو گئے اور وہاں سے دوبارہ نوشکی جا کر سردار میر فاضل خان

ذگر مینگل کے ہاں جاکر پناہ لی۔[1] میر شاہنواز خان اور لوڈے کے سپاہیوں نے پنجگور میں قیامت برپا کر دی اور اہالیانِ پنجگور کو لوٹ کر بہت زیادہ مال غنیمت حاصل کیا اور وہاں کے قبائل کے ساتھ نہایت ہتک آمیز اور ناشائستہ سلوک کیا۔ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد میر شاہنواز خان نے باغبانہ کی راہ لی اور وہاں اس نے میر کمال خان ایتاززئی کی ایک بہن سے نکاح کیا۔ لوڈے پنجگور سے سیدھا قلات پہنچا اور وہاں سے مڑ کر باغبانہ میں وارد ہوا۔ وہ اپنے ساتھ اس معاہدے کا مسودہ بھی لایا اور میر شاہنواز خان کے حوالے کر دیا جو انگریزوں اور میر شاہنواز خان کے درمیان طے پایا تھا اور اب اس کی توثیق گورنر جنرل نے کر دی تھی لیکن اس معاہدہ میں سے وہ شق حذف کر دی گئی تھی جس کی رو سے برطانوی حکومت میر شاہنواز خان کو قلات کی مسند پر بٹھانے کے بعد اس کے اقتدار کو قائم رکھنے کی پابند تھی۔[2]

لوڈے باغبانہ سے دوبارہ قلات پہنچا جہاں اس کو معلوم ہوا کہ شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل محمد نوشکی میں ذگر مینگلوں کے ہاں قیام پذیر ہیں۔ وہ میر شاہنواز خان کے بھائی میر فتح خان کو اپنے ساتھ لے کر ایک مختصر فوج کے ساتھ نوشکی کی طرف روانہ ہوا تاکہ وہ شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل محمد کو نوشکی سے بھی نکال باہر کر سکے۔ شہزادہ میر محمد حسن

---

[1] ۔ CHARLES MASSON.

[2] ۔ ABID.

اور داروغہ گل محمد کو لوڈے اور میر فتح خان کی نوشکی کی طرف روانگی کی اطلاع پہلے ہی سے مل گئی تھی اور وہ ان کی آمد سے پیشتر ہی نوشکی سے خاران کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور لوڈے کا یہ منصوبہ بھی ناکام ہو گیا۔ لوڈے اور میر فتح خان نے نوشکی کے مینگلوں اور دوسرے قبائل کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو اس سے پیشتر میر شاہنواز خان اور لوڈے نے اہالیان پنجگور کے ساتھ روا رکھا تھا۔ وہ سردار میر فاضل خان جیگل کو بھی پکڑ کر اپنے ساتھ قلات لے آئے۔ اسی دوران میر شاہنواز خان نے باغیانہ سے ساسولی قبیلہ کے صدر مقام توتک پر حملہ کرکے ساسولیوں کو اپنی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد وہ قلات پہنچا۔ [1]

کیپٹن بین نے اس سے پیشتر لوڈے کی ان کارروائیوں پر اپنی مسرت کا اظہار کیا تھا لیکن جب ان کارروائیوں کی اطلاع برطانوی حکومت کے وزیر اور سفیر کو ملی تو اس نے لوڈے کی ان کارروائیوں کی بڑی مذمت کی جس کی وجہ سے کیپٹن بین کو بھی ان کارروائیوں کی مذمت کرنی پڑی اور اس نے لوڈے کو آئندہ کے لئے اس قسم کی کارروائیوں میں حصہ لے کر بلوچستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے سے سختی سے منع کر دیا۔ گمان ہے کہ لوڈے سردار امیر آزاد خان نوشیروانی کو سزا دینے کی غرض سے خاران کی طرف فوج کشی کرنے کا

---

[1] CHARLES MASSON.

ارادہ رکھتا تھا جہاں شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل محمد نے پناہ لی ہوئی تھی. لیکن برطانوی حکومت کے وزیر و سفیر کی اپنی کارروائیوں پر اظہار ناراضگی کے بعد اس نے خاران پر فوج کشی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔[۱]

میر شاہنواز کو بلوچ قبائل میں کوئی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی. اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں وہ سنجیدگی اور خودداری مفقود تھی جس کی توقع عام لوگ اپنے خان سے رکھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے جس طریق پر بلوچستان کے حصے بخرے کر کے بعض علاقوں کو امیر کابل کے زیر انتظام دے دیا تھا. میر شاہنواز نے اس کو رد کرنے کی بجائے انگریزوں کی اس کارروائی کو خوشی سے قبول کر لیا تھا اور وہ انگریزوں کی مدد کے بغیر اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا تھا. مزید برآں انگریزوں نے جن حالات میں قلات پر بلا وجہ حملہ کر کے خان میر محراب خان کو شہید کر دیا تھا. اس سے عام لوگ بڑے رنجیدہ خاطر تھے اور وہ ایک ایسے شخص کو اپنا خان تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے جس کو انگریزوں نے قبائل کی مرضی اور منشا کے برعکس اپنے ہی طور پر قلات کی مسند پر بٹھا دیا تھا۔[۲]

انگریزوں کے پولیٹیکل افسر لوڈے کے مستبدانہ رویہ سے قلات کے باشندے بڑے تنگ تھے. اس نے دو خونخوار کتے بھی رکھے ہوئے تھے اور جب وہ کسی شخص پر ناراض ہو جاتا تھا تو وہ اپنے کتے اس پر

---

[۱] :- [۲] :- CHARLES MASSON.

چھوڑ دیا کرتا تھا. قلات کے باشندے اس کی ان حرکتوں سے بڑے خوفزدہ رہتے تھے۔ اسی اثنا میں اس کے ہاتھ سے ایک اندوہناک حادثہ رونما ہوا. ان دنوں وہ اپنے لئے ایک مکان تعمیر کرنے میں مصروف تھا وہ قلات کے ایک غریب باشندے یحییٰ دہوار کو بیگار میں پکڑ کر اس سے اپنے مکان کی تعمیر میں کام لیا کرتا تھا اور کسی وجہ سے اس شخص پر ناراض ہو کر اس پر اپنے خونخوار کتے چھوڑ دیئے. کتوں نے اس شخص کو بری طرح گھائل کر دیا اور کچھ لوگوں نے اس کو بڑی تشویشناک حالت میں اس کے گھر پہنچا دیا. دو تین دن کے اندر اندر اس کی وفات ہو گئی. اس واقعہ سے قلات شہر میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی اور لوگ دبی زبان میں اور کبھی کبھی برملا طور پر لوڈے کی اس حرکت پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے لگے لیکن اس واقعہ کی خبر ملک کے کونے کونے میں آگ کی طرح پھیل گئی اور ہر جگہ لوگوں نے انتقام لینے کا تہیہ کر لیا اور ہر جگہ اس واقعہ کا شدید ردعمل ہوا. اس واقعہ کا پس منظر یہ تھا کہ لوڈے یحییٰ دہوار سے بلا معاوضہ مفت کام لینا چاہتا تھا لیکن یہ شخص خان کے علاوہ خان کے کسی افسر کے لئے مفت کام کرنے کا اپنے آپ کو پابند خیال نہیں کرتا تھا. لوڈے کو یہاں کے دستور کا کچھ زیادہ علم نہیں تھا اور اس شخص کے رویے کو حکم عدولی پر محمول کر کے اس پر ناراض ہو گیا اور یہی واقعہ فوری طور پر انگریزوں کے خلاف بغاوت کا باعث بنا۔[1]

---

[1] CHARLES MASSON

انگریزوں کے خلاف بغاوت کے آثار سب سے پہلے سراوان میں نمودار ہوئے۔ سردار میر محمد خان شاہوانی نے ملک دینار محمد شئی سردار جان محمد بنگلزئی اور سردار محمد خان لہڑی کو اپنے ساتھ متفق کر کے شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل محمد کو خاران سے جو کوہ کلگ کے دامن میں ایک سرسبز اور شاداب مقام پر قیام پذیر تھے۔ سراوان آنے کی دعوت دی لیکن شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل محمد نے اس کے جواب میں لکھا کہ سراوان کے سردار جب انگریزوں کے خلاف کھلم کھلا علم بغاوت بلند کریں گے تو وہ اس وقت سراوان میں وارد ہو سکیں گے۔ ۱؎

اتفاق کی بات ہے کہ ان دنوں قلات کے پولیٹیکل افسر لیفٹیننٹ لوڈے کی حفاظت کے لئے شاہ شجاع کے کوئی ساٹھ ہندوستانی سپاہی قلات میں متعین تھے۔ لیفٹیننٹ لوڈے نے کیپٹن بین کی ہدایت کے مطابق ان میں سے پچیس سپاہیوں کو واپس شال روانہ کر دیا۔ اس کے منشی غلام محمد کو بھی مستونگ میں ایک ضروری کام در پیش تھا۔ وہ بھی ان سپاہیوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ جب یہ لوگ مستونگ پہنچے تو یہاں فضا مکدر تھی۔ سراوان کے کچھ قبائلیوں نے سردار محمد خان شاہوانی کی ایما پر ان افغان سپاہیوں پر حملہ کر کے ان سب کو منشی غلام محمد سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت کی یہ ابتدا تھی جو مستونگ سے شروع ہوئی۔ ۲؎

۱؎:- CHARLES MASSON

۲؎:- ABID.

اس واقعہ کی خبر جب قلات پہنچی تو میر شاہنواز خان نے فوراً قلات کے اردگرد کے گاؤں اور قبائل سے ایک لشکر اکٹھا کرنے کا اہتمام کیا اس نے اپنی والدہ اور بھائی میر فتح خان کو زہری روانہ کر دیا تاکہ وہ زہری کے علاقہ سے ایک لشکر جمع کر کے قلات پہنچانے کا اہتمام کریں۔ اس نے اپنے چند قاصد میر کمال خان ایلتاززئی اور جھالاوان کے بعض دوسرے سرداروں کے پاس روانہ کر کے ان سے امداد طلب کی ؎

اسی اثنا میں شہزادہ محمد حسن اور سردار میر آزاد خان پچاس شتر سواروں کے ساتھ خاران سے نیمرغ اور اس کے بعد منگوچر کے علاقے میں داخل ہوئے اور وہ قلات کی طرف بڑھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کی آمد کی خبر سے میر شاہنواز خان کو بڑی پریشانی ہوئی اور اس نے صبح دن چڑھے قلعہ کے اندر سے چھوٹے اور بڑے آتشیں ہتھیاروں سے گولیاں چلائیں تاکہ عام لوگوں کو قلات پر حملہ کے خطرے کا احساس دلایا جا سکے۔ اس نے پیش بندی کے طور پر قلعہ کے محافظین کو تیار رہنے کا حکم دے دیا لیکن شام تک قلات پر حملہ کے کوئی آثار نمودار نہ ہوئے۔ اس کے باوجود رات بھر آتشیں اسلحہ کا استعمال برابر جاری رہا۔ کیونکہ میر شاہنواز خان کو اسی رات قلعہ کے اندر اور باہر بغاوت برپا ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا ؎ سراوان کے قبائلی سرداروں نے مستونگ میں جمع آوری کر کے

؎۱۔ CHARLES MASSON.

؎۲۔ ABID.

شال پر حملہ کرنے کی تیاری کر لی تھی اور وہ بضد تھے کہ اس موقعہ پر مستونگ میں شہزادہ میر محمد حسن کی موجودگی ضروری ہے۔ ان قبائلی سرداروں کے اصرار پر شہزادہ میر محمد حسن قلات کی بجائے منگوچر سے مستونگ چلا گیا۔ ان سرداروں کا خیال تھا کہ قلات پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرنا ان کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ اور وہ شال کو زیادہ اہمیت دیتے تھے جس کی حفاظت کا انتظام بڑا ناقص تھا۔ اور اس سے پیشتر شال کے قلعہ کی حفاظت کے لئے جو سپاہی متعین تھے انہیں برطانوی حکومت کے سفیر و وزیر کے حکم سے وہاں سے ہٹا کر افغانستان بھیجا گیا تھا۔ میر شاہنواز خان کے سر سے یہ بلا ٹل گئی اور قبائلیوں کا لشکر شہزادہ میر محمد حسن داروغہ گل محمد اور سردار میر آزاد خان کو اپنے ساتھ لے کر شال کی طرف روانہ ہوگیا[1]۔

انہی دنوں کیپٹن بین نے کاکڑ قبیلہ کے سرکردوں کے ساتھ رابطہ قائم کر کے انہیں اپنا اتحادی بنا لیا تھا اور وہ مری قبیلہ کا قلع قمع کرنے کے لئے ان سے کام لینا چاہتا تھا۔ سراوان کے سرداروں نے بھی کاکڑ قبیلہ کے سرکردوں کے ساتھ رابطہ قائم کر کے انہیں شال کے قلعہ پر ایک مشترکہ حملہ کی پیش کش کی۔ کاکڑ قبیلہ کے لوگوں کا خیال تھا کہ شال کے قلعہ میں انگریزوں نے ایک بڑا خزانہ جمع کر رکھا ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ شال کے قلعہ پر قبضہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ مالِ غنیمت حاصل کرنے کی خاطر وہ مریوں کی بجائے انگریزوں کا قلع قمع کرنے پر

---

[1] :- CHARLES MASSON.

قتل گئے. انہوں نے بلوچوں کے لشکر کے شال پہنچنے سے پیشتر ہی رات کے وقت شال کے قلعہ پر حملہ کر دیا. لیکن ان کا حملہ ناکام بنا دیا گیا۔[۱]

اس واقعہ کی اطلاع فوراً افغانستان پہنچا دی گئی. لیفٹیننٹ لیچ نے جو قندھار کا پولیٹیکل ایجنٹ تھا. اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے. لیفٹیننٹ ٹراورس انگریزوں کے چند فوجی دستوں کے ساتھ بڑی تیزی سے سفر کرتے ہوئے شال پہنچا اور شال کے قلعہ کی فوج کی مدد کر کے کاکڑوں کے لشکر کے درمیان کود پڑا.

اسی دوران سراوان کے قبائلی لشکر نے بھی شال پہنچ کر شال کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور مختلف سمتوں سے قلعہ پہ حملے شروع کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں. قندھار کے پولٹیکل ایجنٹ لیفٹیننٹ لیچ نے بھی اپنی کارروائیاں جاری کر رکھی تھیں. اس نے صالو خاں اچکزئی کو اپنے پاس بلا کر اسے مبلغ بیس ہزار روپے دے دیئے اور اسے ہدایت کی کہ وہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ گھوڑ سوار اپنے ساتھ لے کر شال پہنچ جائے اور شال کے قلعہ کو قبائلیوں کے دست برد سے بچا لے۔[۲]

صالو خاں اچکزئی کوئی چھ سو گھوڑ سوار شال کے قلعہ کے محافظین کی مدد پر لے آیا اور محاصرین کی صفوں کو چیرتا ہوا. کیپٹن بین تک پہنچ گیا اس کشمکش میں اس کے کوئی دس بارہ گھوڑ سوار قبائلیوں کے ہاتھوں

---

[۱] CHARLES MASSON.

[۲] ABID.

مارے گئے اور کچھ زخمی ہوئے۔ سراوان کے لشکر نے شال کے قلعہ کا محاصرہ بدستور جاری رکھا لیکن مختلف قبیلوں کے لشکر کے درمیان اس بات پر شدید اختلاف پیدا ہو گیا کہ کس قبیلہ کے لشکر کو قلعہ کے کس حصہ پر حملہ کرنا چاہیئے۔ اس اختلاف کے نتیجہ میں وڈیرہ میر جان محمد بنگلزئی نے جس کے لشکر کی تعداد سب سے زیادہ تھی میدان چھوڑ دیا اور اس کے بعد دوسرے قبائلی گروہ بھی میدان چھوڑ کر مستونگ کی طرف پسپا ہو گئے جہاں داروغہ گل محمد نے ان کو دوبارہ جمع کر کے منظم کرنا شروع کیا۔ سراوانی لشکر کی اس پسپائی سے میر شاہنواز خان کو یہ خوش فہمی ہوئی کہ شال سے ناکام لوٹنے کے بعد اب سراوانی قبائل قلات پر حملہ کرنے کی جرات نہ کر سکیں گے۔ لیکن اس کا یہ خیال خام تھا۔[۱]

میر شاہنواز خان نے جھالاوان کے قبائلی سرکردوں سے امداد کی جو اپیل کی تھی بہت کم لوگوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا۔ سب سے پہلے قلات کی مضافاتی بستیوں سے ایک لشکر اس کی مدد کو پہنچا۔ میر فتح خان اور اس کی والدہ زہری سے واپس چلی آئیں۔ ان کے بعد سردار میر بوہیر خان موسیانی اور سردار میر رشید خان زرک زئی کا فرزند قلات پہنچے آخر میں میر کمال خان ایتازئی میر عیسیٰ خان مینگل کے بیٹے میر خان محمد مینگل کی ہمراہی میں قلات پہنچا اور اس کے علاوہ کچھ دوسرے سرکردہ بھی اپنے مختصر لشکر کے ساتھ قلات میں وارد ہوئے۔[۲]

---

[۱] [۲] :- CHARLES MASSON.

اگرچہ قلات کے قلعہ کی حفاظت کے لئے نفری کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن میر شاہنواز خان نے جن لوگوں کو اپنی امداد پر جمع کیا تھا۔ ان پر پوری طرح بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سردار میر بوہیر خان کی وفاداری مشتبہ تھی۔ میر کمال خان ایلتاززئی پر بھی مشکل سے اعتماد کیا جا سکتا تھا اس کے باوجود میر شاہنواز خان نے خلعت اور انعام واکرام دے کر ان لوگوں کو اپنا طرفدار بنانے کی کوشش کی۔ یہ لوگ لیفٹیننٹ لوڈے کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ میر کمال خان ایلتاززئی کو زیادہ تر اپنی جاگیر سے دلچسپی تھی جو کچھی میں واقعہ تھی۔ سردار میر بوہیر خان کے بھی اسی قسم کے مفادات تھے جن کی حفاظت کی خاطر وہ قلات چلا آیا تھا۔ اس کی جائداد واقع کچھی کو ضبط کرنے کے بعد حال ہی میں واگذار کر دیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے سازشوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ وہ لیفٹیننٹ لوڈے کو بیچ سے نکال کر میر شاہنواز خان اور میر محمد حسن کے مفادات کو باہم مربوط کرنے کے حق میں تھے لیکن میر شاہنواز خان انگریزوں کا دامن چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔[1]

اس نازک موقعہ پر میر شاہنواز خان نے سونمیانی بندر کے کسٹم کی نصف آمدنی انگریزوں کے سپرد کر دی۔ میر کمال خان جام لسبیلہ کے خاندان کے ساتھ رشتہ داری کا تعلق رکھتا تھا اور اسے لسبیلہ کے معاملات سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ میر شاہنواز خان کی اس حرکت سے

---

[1] - CHARLES MASSON.

بڑا برافروختہ ہوا۔ وہ اپنے پیروکاروں کو لے کر شہر سے باہر نکلا اور باغبانہ چلے جانے کی دھمکی دی۔ میر شاہنواز کا سارا دارومدار اسی ایک شخص کی حمایت پر تھا۔ لوڈے نے مجبور ہو کر اس سے تحریری وعدہ کیا کہ میر شاہنواز خان کا یہ حکم فوری طور پر منسوخ کر دیا جائیگا۔ اس موقعہ پر میر کمال خان کو کچھی سے اطلاع ملی کہ اس کی جائداد واقع کوٹڑہ ضبط کر لی گئی ہے۔ میر کمال خان کو ناراضگی کا ایک موقعہ فراہم ہو گیا۔ لوڈے نے دوبارہ مجبور ہو کر اسے یقین دلایا کہ اسکی جائداد واقع کوٹڑہ فوراً واگذار کر دی جائیگی۔ وہ بڑی مشکل سے راضی ہوا۔[ا]

سراوانی قبائل کا لشکر مستونگ سے قلات کی طرف روانہ ہوا۔ شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل محمد کے علاوہ سردار میر آزاد خان نوشیروانی بھی اپنے شتر سواروں کے ساتھ ان کے ہمراہ تھا۔ ان کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ تھی۔ سب سے پہلے ان کا ہراول دستہ قلات کے سامنے نمودار ہوا اور وہ اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے۔ قلعہ کے سپاہیوں نے ان پر گولی چلائی۔ اس کے بعد سراوانی لشکر کا بڑا حصہ شہر کے قریب پہنچا۔ ان لوگوں نے اپنے گھوڑوں اور اونٹوں سے اترتے ہی قلعہ کے قریب واقع مکانات کی آڑ لی اور قلعہ پر حملہ کر دیا۔ ظہر کی نماز تک ان کا حملہ برابر جاری رہا۔ دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں۔ جس کے نتیجہ میں دو تین آدمی ہلاک ہو گئے۔[۲]

ا :- CHARLES MASSON.

۲ :- ABID.

رات کے وقت سراوانی لشکر نے قلعہ پر دوبارہ اپنا حملہ شروع کیا۔ یہ حملہ دوسرے دن بھی جاری رہا۔ انہوں نے زیادہ تر قلعہ کی مشرقی دیوار کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا۔ مشرقی دیوار کی حفاظت پر میر کمال خان کا لشکر متعین تھا۔ انہوں نے جوابی کارروائی کے طور پر سراوانی لشکر پر گولیاں چلائیں۔ سراوانی لشکر نے قلعہ کے دروازوں پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کی اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ سیڑھیوں کی مدد سے قلعہ کی دیواروں کو پار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور اس مقصد کے لئے سیڑھیاں تیار کرنے میں مصروف تھے۔ تیسری رات کو بھی انہوں نے قلعہ پر اپنے حملے جاری رکھے اور قلعہ کی دیوار پر گولیوں کی بوچھاڑ کی۔ میر شاہنواز کے حامیوں نے ان پر قلعہ کے اندر سے گولیاں چلائیں۔ اس موقعہ پر شہزادہ میر محمد حسن اور سردار میر آزاد خان نوشیروانی قلعہ کے قریب ایک باغ میں فروکش تھے۔ ایک گولی شہزادہ محمد حسن کے خیمہ میں لگی، اور ایک دوسری گولی سے سردار میر آزاد خان کا گھوڑا زخمی ہو گیا۔ ان حادثات کے بعد وہ باغ سے بابی کے مضافاتی مکانات میں منتقل ہو گئے۔[ك]

قلعہ کے محافظین کو امید تھی کہ حملہ آور کسی بھی رات کو موقعہ ملنے پر قلعہ کی دیوار عبور کرنے کی کوشش کریں گے اس قسم کی کارروائی کے تدارک کی غرض سے انہوں نے راتوں کو قلعہ کی دیواروں کے قریب مختلف مقامات پر مشعلیں جلائے رکھنے کا اہتمام کیا تھا۔ چوتھی رات کو

ك ۱۔ CHARLES MASSON.

سحری کے وقت جبکہ قلعہ کے اندر مشعلوں کی روشنی مدھم پڑ گئی تھی اور قلعہ کے محافظوں پر نیند کا غلبہ ہو گیا تھا۔ سراوانی لشکر کے کوئی پچاس ساٹھ افراد خفیہ طور پر شہر میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے گولیاں چلا کر قلعہ کی مغربی دیوار پر ایک شدید حملہ کر دیا اور سیڑھیوں کی مدد سے قلعہ کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لئے جو سیڑھیاں تیار کی گئی تھیں ان کی لمبائی کم تھی اور وہ قلعہ کی دیوار کی چوٹی تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ قلعہ کی اس دیوار کے محافظین نے جو جتک قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حملہ آوروں کی مدد کرنی چاہی ان میں سے کچھ لوگوں نے اپنی پگڑیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ کر حملہ آوروں کو قلعہ کی دیوار پر چڑھنے میں مدد دی اور ان کے باقی ساتھیوں نے بغیر گولی کے ان پر بندوقیں چلائیں تاکہ حملہ آوروں میں سے کوئی زخمی نہ ہونے پائے اور وہ آسانی سے قلعہ کی دیوار پار کر سکیں۔[1]

اس موقعہ پر لیفٹیننٹ لوڈے کے ساتھ مشہور انگریز سیاح چارلس میسن بھی قلعہ میں موجود تھا۔ یہ دونوں اپنے سپاہیوں کو لے کر واردات کے موقعہ پر پہنچ گئے۔ ان سپاہیوں نے فوراً قلعہ کی دیوار پر چڑھنے والوں اور ان کے مددگاروں پر گولیاں چلا کر ان میں سے پندرہ افراد کو موقعہ پر ہلاک کر دیا۔ میر جلال خان کے بیٹے نے جو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ قلعہ کی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا تھا اپنے آپ کو قلعہ کے اندر گرا دیا۔[2]

---

[1]، [2] CHARLES MASSON.

اس موقعہ پر میر شاہنواز خان اپنے چند محافظوں کے ساتھ خطرے کے مقام کی طرف جا رہا تھا کہ راستہ میں اس کی مڈھ بھیڑ میر جلال خان کے بیٹے اور اس کے ساتھیوں سے ہوئی۔ انہوں نے میر شاہنواز خان پر حملہ کر کے اس کے دو تین آدمیوں کو ہلاک کر دیا۔ اس کشمکش کے دوران ان کا ایک آدمی بھی میر شاہنواز خان کے ہاتھ سے ہلاک ہو گیا۔ میر شاہنواز خان اپنے جائے قیام کی طرف پسپا ہو گیا اور میر جلال خان کے بیٹے، اور اس کے ساتھیوں نے میر کمال خان تک اپنے آپ کو پہنچا دیا اور اس کی پناہ حاصل کر لی۔[1]

اس موقعہ پر قلعہ کی دیوار پر چڑھتے ہوئے جو لوگ ہلاک ہوئے، وہ لانگو قبیلہ کے چشم و چراغ تھے۔ جب شہزادہ میر محمد حسن مستونگ جاتے ہوئے منگوچر سے گزرا تھا تو لانگو قبیلہ کے ان سرکردوں نے مالیہ کا وہ تمام غلہ اس کے حوالے کر دیا تھا جو انہوں نے میر شاہنواز خان کے لئے جمع کیا تھا۔ اور اس کے بعد جب سراوانی قبائل کا لشکر قلات کی طرف کوچ کر رہا تھا تو لانگو قبیلہ کے افراد بھی سینکڑوں کی تعداد میں اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔[2]

اس موقعہ پر میر شاہنواز خان سے ایک غلطی سرزد ہوئی جو زہریوں کی ناراضگی کا باعث بنی۔ اس نے سردار میر بوہیر خان سے کھلم کھلا وعدہ کیا کہ وہ اس کو جھالاوان کا سردار تسلیم کرے گا۔ اس سے پیشتر سردار رشید

---

1 :- CHARLE. S MASSON

2 :- ABID .

خان زرک زئی زمانہ قدیم سے جھالاوان کا سردار اعلیٰ چلا آتا تھا۔ سردار رشید خان کے بیٹے نے ناراض ہو کر داروغہ گل محمد کو قلعہ پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ وہ حملہ آوروں پر قلعہ کا دروازہ کھول دے گا۔ لیکن داروغہ گل محمد نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا کیونکہ اس کو اعتبار نہیں تھا کہ واقعی زہری قبیلہ کے لوگ قلعہ کا دروازہ کھول دیں گے۔ اس نے سردار میر رشید خان کے بیٹے کے اس پیغام کو ایک قسم کا فریب تصور کیا۔[۱]

حملہ آوروں کی طرف سے قلعہ کی دیوار پار کرنے کا عمل اگرچہ ناکام ہو گیا تھا۔ لیکن قلعہ کے اندر خوف و ہراس کی سی کیفیت پائی جاتی تھی اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ جنگ قبیلہ کے کچھ لوگ قلعہ کے سپاہیوں کے ہاتھ سے اس وقت ہلاک ہو گئے جبکہ وہ حملہ آوروں کو قلعہ کی دیوار پر چڑھنے میں مدد دے رہے تھے اور میر شاہنواز خان جنگ قبیلہ کے ان افراد پر بھی ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا جنہوں نے بغیر گولی کے حملہ آوروں پر بندوقیں چلائی تھیں۔[۲]

سب سے پہلے میر کمال خان ایلتازئی نے مزید مزاحمت کرنے سے انکار کر دیا۔ میر شاہنواز خان نے دن بھر اسے قلعہ کا دفاع کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے نہیں مانا۔ غالباً میر جلال خان کے بیٹے سے ملنے کے بعد اس کی نیت بدل گئی۔ آخر کار مجبور ہو کر میر شاہنواز

۱:- CHARLES MASSON.

۲:- ABID.

خان نے صلح کی شرطیں طے کرنے کے لئے میر کمال خان ہی کو اپنا ایلچی بنا کر شہزادہ میر محمد حسن، داروغہ گل محمد اور سراوان کے سرداروں کے کیمپ میں روانہ کیا۔ دونوں فریقوں کے درمیان ایک اقرار نامہ طے پایا جس کے تحت میر شاہنواز خان قلات کے تخت سے شہزادہ میر محمد حسن کے حق میں دست بردار ہوگیا اور میر شاہنواز خان اور میر فتح خان کو قلات کا قلعہ خالی کر کے باغبانہ چلے جانے کی اجازت دے دی گئی اور باغبانہ کے علاوہ خضدار اور زیدی کا علاقہ انہیں جاگیر میں دے دیا گیا۔ [۱]

میر شاہنواز خان بہ نفس نفیس شہزادہ میر محمد حسن کے پاس جاکر اسے جلوس کی شکل میں قلعہ کے اندر لے آیا، جہاں سرداروں نے اس کو قلات کی مسند پر بٹھا کر اسے نصیر خان ثانی کا لقب دیا۔ میر شاہنواز خان اور میر فتح خان اپنے خاندان کے اراکین اور لواحقین کے ساتھ جھالاوان کی طرف منتقل ہو گئے۔ سراوانی قبائل کے لشکر نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ لیفٹیننٹ لوڈے اور چارلس میسن دونوں گرفتار ہو گئے۔ [۲]

اس سے پیشتر جبکہ سراوان کے سردار شہزادہ میر محمد حسن اور داروغہ گل محمد کو مستونگ میں بلوا کر قلات پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ کیپٹن بین نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر قبائلی سرداروں اور شہزادہ میر محمد حسن اپنی طرف سے امیر کابل شاہ شجاع کے نام ایک عرضداشت

۱:- CHARLES MASSON.

۲:- ABID.

روانہ کر کے اس کو اپنی وفاداری کا یقین دلائیں تو برطانوی حکومت شہزادہ میر محمد حسن کو اس کے والد میر محراب خان کا جانشین تسلیم کرنے پر غور کر سکتی ہے لیکن سرداروں نے اس کی بات اس بنا پر رد کر دی کہ شاہ شجاع نے خان میر محراب خان کے ساتھ برا سلوک کیا تھا اور وہ شاہ افغانستان نہیں تھا بلکہ انگریز ہی صحیح معنوں میں افغانستان کے حکمران تھے اور شاہ شجاع کی بادشاہت ایک قسم کا مذاق تھا۔ قلات کے محاصرہ کے دوران کیپٹن بین کے پاس شال میں فوج اس قدر کم تھی کہ وہ قلات کے قلعہ کے محافظین کے لیئے کوئی امداد روانہ نہیں کر سکتا تھا۔ شکار پور میں بھی فوج کی کمی تھی اور سیوی کے خرشک انگریزوں کے خلاف آمادۂ جنگ تھے۔ شکار پور سے بھی کسی قسم کے امداد کرنے کی امید نہ تھی کیونکہ شکار پور کے انگریز خود ہی اپنی حفاظت پر قادر نہ تھے۔ [۱]

آخری وقت میں کیپٹن بین کے پاس شال میں افغانستان کی طرف سے مناسب تعداد میں ایک فوج پہنچ گئی۔ اس نے لیفٹیننٹ ہیمر سلے کی قیادت میں پندرہ یا سولہ سو افراد پر مشتمل ایک فوج مستونگ پر چڑھائی کرنے کے لیئے روانہ کی جس میں پیادہ اور گھوڑ سوار کے علاوہ توپخانہ بھی شامل تھا۔ چشمہ مولی کے نزدیک دو سو افراد پر مشتمل قبائلیوں کے ایک گروہ سے ان کی مڈھ بھیڑ ہو گئی جن کو انہوں نے تتر بتر کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے پڑنگ آباد کے نزدیک اپنا کیمپ قائم کر کے مستونگ کے باشندوں

ل ۱- CHARLES MASSON.

کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ قلات پر سراوانی قبائل کا قبضہ ہو گیا ہے اور دونوں فریقوں کے درمیان صلح ہو گئی ہے تو لیفٹیننٹ ہمرسلے کو مزید کوئی کارروائی کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور اس نے اپنی فوج کو لے کر شال کی راہ لی۔[1]

قلات پر انگریزوں کے حملہ کے عین موقعہ پر میر محمد اعظم خان خان میر محراب خان کی ہدایت پر بیلہ چلا گیا تھا جہاں وہ بڑی عسرت سے زندگی گزار رہا تھا۔ شہزادہ محمد حسن کی مسندنشینی کی اطلاع پاکر وہ دوبارہ قلات پہنچ گیا۔ اس موقعہ پر جبکہ داروغہ گل محمد سراوانی قبائل کو قلات پر حملہ کرنے کی نیت سے منظم کر رہا تھا۔ شہزادہ میر محمد حسن کی والدہ بی بی گنجانی کچھی میں تھی۔ وہ خفیہ طور پر کچھی سے مستونگ پہنچی اور جب سراوانی لشکر قلات پہنچ گیا تو وہ بھی ان کے ساتھ قلات چلی آئی۔ وہ ایک قابل خاتون تھی اور عام طور پر اس کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔[2]

کیپٹن بین میں بھی معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی اور وہ تدبر سے عاری تھا۔ شہزادہ میر محمد حسن جواب نصیر خان ثانی تھا۔ داروغہ گل محمد اور سراوان کے چیدہ سرداروں نے مل کر کیپٹن بین سے رابطہ پیدا کر کے انگریزوں سے صلح کی کوشش کی لیکن کیپٹن بین نے کچھ ایسی ذلت آمیز شرائط پیش کیں جو ایک غیور قوم کے سرکردوں کے سامنے

لہ :۔ CHARLES MASSON.

لہ ۲ :۔ ABID.

قابلِ قبول نہ تھیں۔ صلح کے لئے اس نے مندرجہ ذیل شرائط پیش کیں:

۱۔ قلات انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے۔

۲۔ خان میر نصیر خان قندہار جا کر شاہ شجاع الملک کو اپنی اطاعت گزاری اور وفاداری کا یقین دلائے۔

۳۔ فی الوقت وہ علاقے جو بلوچستان سے الگ کر کے امیر کابل کے ماتحت کر دیئے گئے ہیں۔ بدستور اس کے ماتحت رہیں گے[1]

خان میر نصیر خان ثانی، داروغہ گل محمد اور سراوانی سرداروں نے سراوانی لشکر کے ساتھ مستونگ کی طرف کوچ کیا۔ لیفٹیننٹ لوڈے اور چارلس میسن کو بھی اپنے ساتھ مستونگ لائے۔ آخری کوشش کے طور پر چارلس میسن کو شال جانے کی اجازت دے دی تاکہ وہ کیپٹن بین کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کر کے اس کو ایک آبرومندانہ صلح کے لئے آمادہ کرے لیکن کیپٹن بین نے اس پر جاسوسی کا الزام لگا کر اس کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔[2]

اس اثناء میں راس بیل نے ملا محمد حسن اور ملا رحیم داد کو جو سندھ میں بکھر کے قلعہ میں قید تھے رہا کر دیا اور وہ قلات چلے آئے۔[3]

آخر مایوس ہو کر خان میر نصیر خان ثانی داروغہ گل محمد اور سراوانی سردار اپنا لشکر لے کر شال پر حملہ کی غرض سے اغبرگ کے راستے شال

---

[1] CHARLES MASSON.

[2]-[3] ABID.

کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب کیپٹن بین کو سراوانی لشکر کی مستونگ سے شال کی طرف روانگی کا علم ہوگیا تو اس نے مناسب تعداد میں ایک فوج ان کے مقابلے کے لئے اغبرگ کی طرف روانہ کر دی۔ سراوانی لشکر نے انگریزوں کی اس فوج کو اغبرگ میں ایک عبرتناک شکست دی۔ لیفٹیننٹ ہمرسلے اس موقعہ پر بھی انگریزوں کی فوج کا قائد تھا۔ اس شکست کے نتیجہ میں لیفٹیننٹ ہمرسلے اپنے بچے کھچے سپاہیوں کو لے کر شال کی طرف بھاگ نکلا۔ ان لوگوں نے اس تیزی کے ساتھ اپنے گھوڑے شال کی طرف دوڑائے کہ شال پہنچتے ہی کئی گھوڑے مر گئے [1]

خان میر نصیر خان، داروغہ گل محمد اور سراوان کے سردار اغبرگ میں لیفٹیننٹ ہمرسلے کی فوج کو شکست دینے کے بعد شال پر حملہ کا ارادہ ترک کر کے اپنے لشکر کے ساتھ ڈھاڈر کی طرف روانہ ہوئے اور ڈھاڈر کے نزدیک پہنچ کر کومبی کی پہاڑیوں میں مورچے سنبھال لئے۔ ڈھاڈر کے نزدیک انگریزوں کی فوج نے اپنی لشکر گاہ قائم کی ہوئی تھی۔ انگریزوں کو جب قبائلیوں کے ٹھکانے کی اطلاع ملی تو ان کی فوج نے قبائلیوں پر ہلہ بول دیا۔ اس لڑائی میں قبائلیوں کو شکست ہوئی اور وہ منتشر ہو گئے۔ اس موقعہ پر لیفٹیننٹ لوڈے بھی ان کے ساتھ تھا۔ اور قاسم لہڑی کو اس کی نگرانی پر مقرر کیا گیا تھا۔ جب قبائلیوں کا لشکر منتشر ہوگیا تو قاسم لوڈے کو موت کے گھاٹ اتار کر خود بھاگ نکلا۔ [2]

---

[1] - CHARLES MASSN. [2] - ABID.

قلات سے روانگی کے وقت خان میر نصیر خان ثانی اپنے چچا میر محمد اعظم خان کو اپنا جانشین مقرر کر کے قلات میں چھوڑ گیا تھا۔ اسی اثناء میں انگریزوں کی ایک فوج جنرل ناٹ کی قیادت میں قلات پر چڑھائی کی خاطر شال سے قلات کی طرف روانہ ہوئی جب یہ فوج مستونگ پہنچی تو میر اعظم خان کو اس کی اطلاع ملی اور وہ قلات چھوڑ کر زہری کی طرف بھاگ نکلا۔ انگریزوں کی فوج نے کسی مزاحمت کے بغیر قلات پر قبضہ کر لیا۔ اس موقعہ پر خان میر نصیر خان ثانی داروغہ گل محمد اور سراوان کے سردار ڈھاڈر سے کچھی کی طرف منتقل ہو گئے تھے۔ جنرل ناٹ کو قلات ہی میں انگریزی فوج اور قبائلیوں کے درمیان ڈھاڈر کے نزدیک تصادم کی اطلاع ملی جس کے دوران لیفٹیننٹ لوڈے قاسم لہڑی کے ہاتھ سے قتل ہوا تھا۔[ھ] یہ تمام واقعات ۱۸۴۰ء کے دوران پیش آئے۔

راس بیل نے کرنل ایل آر سیٹی کو اکتوبر ۱۸۴۰ء میں قلات کا پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا تاکہ وہ بلوچستان کے معاملات کو اپنے تجربوں کی روشنی میں سلجھا کر وہاں امن قائم کرے۔ یہ غیر معمولی قابلیت کا ایک تجربہ کار افسر تھا۔ لیکن بلوچستان کے سرکردوں اور انگریزوں کے درمیان شبہات کا یہ حال تھا کہ جنوری ۱۸۴۱ء سے لے کر جولائی ۱۸۴۱ء تک کوشش کر کے کرنل سیٹی نے بمشکل خان نصیر خان کو شال جا کر انگریز افسروں سے ملنے پر راضی کیا۔ دونوں فریقوں کے درمیان اکتوبر ۱۸۴۱ء میں ایک معاہدہ طے

ھ :- CHARLES . MASSON .

پایا جس کی شرائط کے تحت برطانوی حکومت نے شہزادہ محمد حسن کو میر نصیر خان ثانی کے لقب سے خان میر محراب خان شہید کا جانشین تسلیم کرلیا۔ خان نے وعدہ کیا کہ وہ انگریزوں کی مرضی اور منشا کے بغیر کسی بیرونی ملک کے ساتھ تعلقات قائم نہیں کرے گا۔ انگریزوں نے جو علاقے بلوچستان سے الگ کرکے امیر کابل کے ماتحت کر دیئے تھے وہ دوبارہ خان میر نصیر خان کے حوالے کر دیئے۔ اس معاہدہ کے بعد بلوچستان میں مکمل امن قائم ہوگیا۔[1]

اس موقعہ پر انگریزوں اور خان کے درمیان جو صلح وصفائی ہوئی اس میں سردار میر عیسیٰ خان مینگل نے ایک اہم کردار ادا کیا۔[2]

انگریزوں کے خلاف اکتوبر ۱۸۳۹ء میں ہی خیبریوں نے بغاوت کی جو شاہ شجاع کے طرفدار خیال کئے جاتے تھے۔ دوسرے ہی مہینہ میں لارڈ کین کو ہندوستان کی طرف کوچ کرتے ہوئے درہ خیبر میں زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۸۴۰ء کے موسم بہار میں غلزئیوں نے شاہ شجاع کی حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ لیکن قندھار سے ایک فوج بھیج کر اس بغاوت کو فرو کر دیا گیا۔ امیر دوست محمد نے مجبور ہوکر انگریزوں کے پاس لودھیانہ میں پناہ لی اور نواب جبار خان نے بھی جولائی ۱۸۴۰ء میں شاہ شجاع کی اطاعت قبول کرلی اور اس کے بعد امیر دوست محمد کو

---

[1] :- CHARLES MASSON.

[2] :- ABID.

کلکتہ منتقل کر دیا گیا۔ لیکن افغانستان میں شاہ شجاع کے اقتدار کے خلاف جو تحریک شروع ہو گئی تھی وہ روز بروز بڑھ رہی تھی لے

اسی اثنا میں سردار دوست محمد خان کا فرزند اکبر خاں بخارا سے بھاگ نکلا اور کابل پہنچ کر تحریک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی۔ انگریزوں کے خلاف بڑی تیزی سے منافرت پھیلنے لگی جس کو ملاؤں نے اور زیادہ ہوا دی۔ کوہستان کے باشندے بغاوت پر اتر آئے اور کابل میں داخل ہو گئے۔ لے

۲ر نومبر ۱۸۴۱ء کو کابل میں بغاوت نے ایک ہمہ گیر شکل اختیار کر لی۔ باغیوں نے الیگزنڈر برنس کو قتل کر کے انگریزوں کے خزانے کو لوٹا اور کیمپ بیل کو جو شاہ کی ہندوستانی فوج کو لے کر ان کے مقابلہ پر آیا تھا کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ باغیوں نے اسے زبردست شکست دے کر سخت نقصان پہنچایا۔ ۲۳ر دسمبر ۱۸۴۱ء کو انہوں نے برطانوی حکومت کے وزیر و سفیر کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ۶ر جنوری ۱۸۴۲ء کو انگریزی فوج نے پسپا ہو کر جلال آباد کی طرف کوچ کرنا شروع کر دیا لیکن افغانوں نے ان پر حملے شروع کر دیے۔ راستہ میں برف پڑی ہوئی تھی اور انگریزوں کو واپسی میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر انگریزوں کی تمام فوج افغانوں کے پے در پے حملوں اور سردی

لے ۱۔ CHARLES MASSON.

لے ۱۔ ABID.

کی وجہ سے تباہ ہو گئی اور فقط ڈاکٹر برائیڈن بچ کر جلال آباد پہنچا اور انگریزوں کی فوج کی تباہی کی خبر جلال آباد پہنچائی اس موقعہ پر افغانوں کے ہاتھ سے انگریزوں کو نہ صرف جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا بلکہ ان کی عزت و ناموس بھی خاک میں ملی اور وہ صفحہ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔ لہ

افغانستان میں انگریزوں کی شکست کے باوجود خان میر نصیر خان ثانی نے اس معاہدے کی پوری پوری پابندی کی جو اس کے اور انگریزوں کے درمیان طے پا گیا تھا اور ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں کو شکایت کا موقعہ نہ دیا۔ لہ

ابتداء میں خان میر نصیر خان ثانی کو کچھ مشکلات درپیش آئیں اور قبائلی سردار اس سے بدظن رہنے لگے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اخوند زئیوں کی وزارت کو بحال کرنے کی بجائے ملا محمد حسن ہی کو وزارت کے عہدے پر دوبارہ فائز کر دیا۔ اس نے کرائے کی ایک مختصر فوج بھی رکھی تھی اور اس میں زیادہ تر افغانوں کو بھرتی کر لیا تھا۔ سرداروں کا مطالبہ تھا کہ وزارت پر اس خاندان کے افراد میں سے کسی مناسب شخص کو وزارت کے عہدے پر فائز کیا جائے جو ملک کے مروجہ دستور کے تحت موروثی طور پر اس عہدے پر فائز چلے آتے تھے اور کرائے کی

لہ :- CHARLES MASSON.

لہ :- ABID.

جو فوج رکھی گئی ہے وہ بھی ملک کے مروجہ دستور کے خلاف ہے اس کو بھی توڑ دیا جائے لیکن خان میر نصیر خان ثانی ان مطالبات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا اس کے باوجود اس نے اپنے قبائلی سرداروں کو تھوڑے عرصہ کے اندر اندر اپنے اعتماد میں لے کر مطمئن کر دیا اور ان کو وہ تمام اختیارات دے دیئے جو ان کو دستور کے تحت حاصل تھے۔ اس نے اپنے اختیارات سے کبھی بھی تجاوز نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے اندر نظم و نسق کی حالت بہتر ہو گئی۔ زراعت تجارت اور صنعت و حرفت میں خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ؔ[1]

ملا محمد حسن خان گڑھ جا کر جیکب کے ساتھ ملاقات کرنے کے لئے بڑا بیتاب رہتا تھا۔ انگریز افسر اس سے سخت بدظن تھے وہ غالباً چاہتا تھا کہ انگریز افسروں کے پاس جا کر اپنی صفائی پیش کرے اور اپنے مفادات کو آگے بڑھائے۔ اس نے سب سے پہلے اپنے بھائی محمد امین کو خان گڑھ روانہ کر دیا تاکہ وہ سندھ کے پولیٹیکل افسر جیکب کے ساتھ اس کی ملاقات کا انتظام کرے۔ اس کے بعد مارچ ۱۸۵۱ء میں بذاتِ خود خان گڑھ جا کر دو ہفتہ تک وہاں قیام کیا اور جیکب کے ساتھ کئی بار ملاقاتیں کیں۔ تھوڑے عرصہ کے بعد وہ دوبارہ خان گڑھ گیا اور جیکب کے ساتھ ملاقات کی۔ ان ملاقاتوں کی غرض و غایت کسی کو معلوم نہ ہو سکی۔ لیکن یہ دوسری ملاقات فوری طور پر اس کے زوال کا باعث

---

[1] CHARLES MASSON.

بنی۔ جیکب نے خان کو اطلاع دی کہ اس کا وزیر اس کی جگہ خان بننے کا آرزومند ہے اور اس معاملے میں انگریزوں سے مدد حاصل کرنے کا خواہشمند ہے۔ معلوم نہیں یہ الزام کہاں تک درست تھا اور ملا محمد حسن کو جیکب کے ساتھ جاکر کئی ملاقاتیں کرنے کی آخر ضرورت کیا تھی۔ جیکب کے ساتھ ان بار بار کی ملاقاتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس سے اس قسم کی کوئی احمقانہ حرکت ضرور سرزد ہوئی تھی جو سندھ کے پولٹیکل افسر کو پسند نہ آئی اور اس نے اس پر غداری کا الزام لگا کر اس سے خان کو آگاہ کر دیا۔ خان کو اس عجیب وغریب انکشاف سے حیرت اور رنج ہوا۔ اس نے ملا محمد حسن کو واپس قلات آنے پر فوراً گرفتار کر کے قید خانہ میں ڈال دیا۔ اس کے بھائی محمد امین کا بھی یہی حشر ہوا۔ ملا محمد حسن نے ۱۸۵۰ء میں قید خانہ میں وفات پائی۔

خان میر نصیر خان ثانی ایک نہایت دلیر متحمل مزاج انصاف پسند، دوراندیش اور نیک طینت انسان تھا۔ اس کے والد نے اس کو اچھی تعلیم اور اعلیٰ تربیت دلوائی تھی۔

خان موصوف ایک عرصہ سے مثانہ کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ اس زمانہ میں عمل جراحی سے اس مرض کے علاج کا کچھ انتظام ضرور تھا لیکن ذاتی وجوہات کی بنا پر وہ علاج کرانے پر راضی نہ ہوا۔ کچھی سے قلات کی طرف سفر کے دوران راستہ میں اس کی تکلیف بڑھ گئی اور مثانہ میں

درد شدت سے شروع ہوا۔ قلات پہنچنے سے پیشتر ہی اس کی وفات ہوگئی۔ اس کی وفات ۱۰۵۰ھ میں ہوئی۔ اگر وہ طبعی عمر تک زندہ رہتا تو یقینی بات ہے کہ بلوچستان کی تاریخ ہی بدل جاتی۔ اس کی وفات سے ملک کی سیاست میں جو خلا پیدا ہوگیا، وہ بعد میں پر نہ ہو سکا۔

ستائیسواں باب
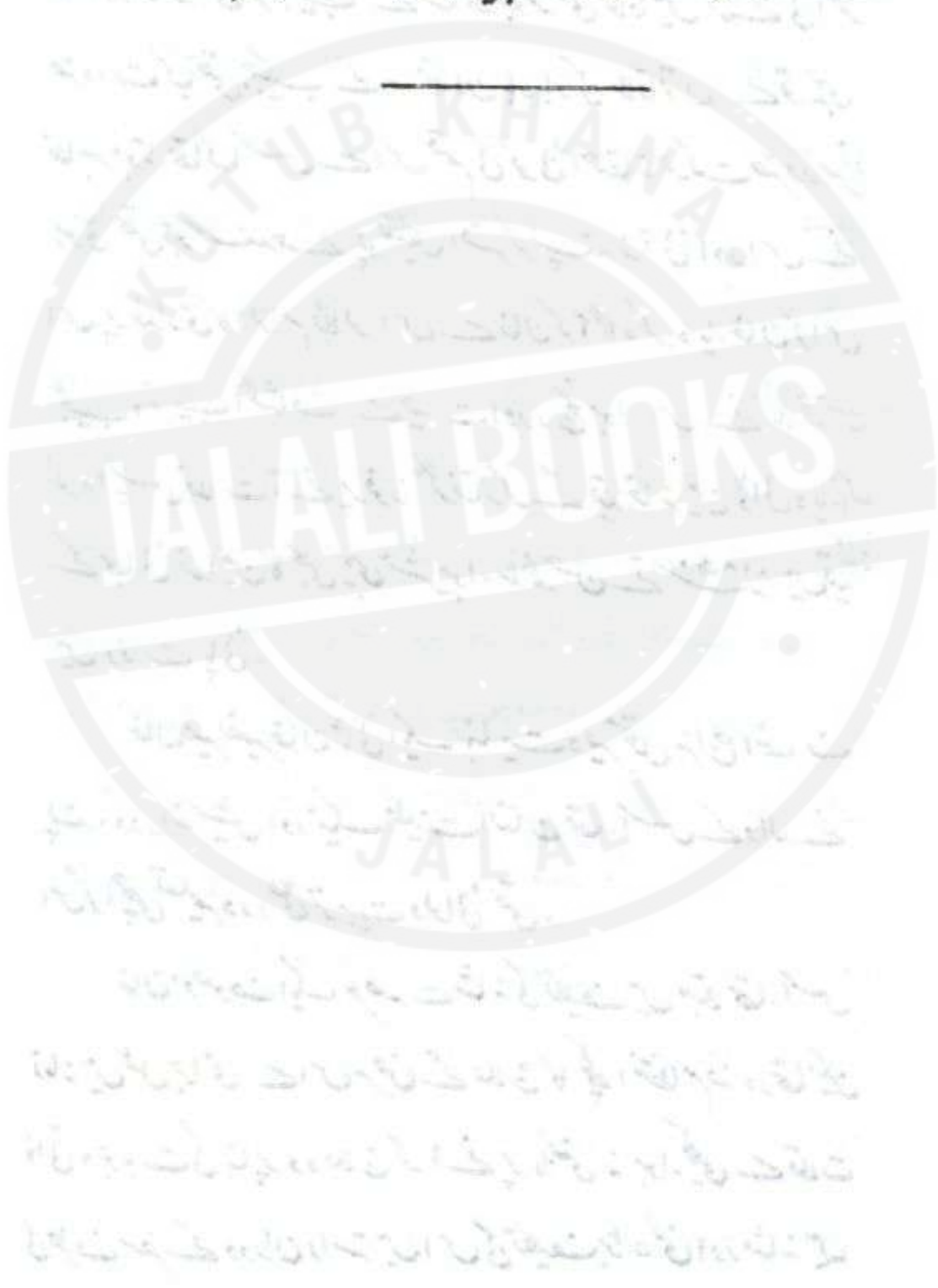
خان میر خداداد خان

قبائلی سرداروں نے خان میر خداداد خان کو ۱۸۵۷ء میں قلات کی مسند پر بٹھا دیا۔ اس وقت اس کی عمر فقط اٹھارہ سال کی تھی اس کی پرورش ابتدا ہی سے حرم کی چار دیواری میں ہوئی تھی۔ اس کو انتظامی امور اور سیاسی معاملات کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس میں وہ دور اندیشی صبر و تحمل اور وسیع النظری مفقود تھی جو اس کے بڑے بھائی خان میر نصیر خان کے حصے میں آئی تھی۔ وہ مشتعل ہونے پر کچھ اس انداز سے انتہا پسندانہ قدم اٹھاتا تھا کہ اس کے اس رویہ سے معاشرے کے تمام طبقے خوف زدہ اور غیر مطمئن رہتے تھے۔ وہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا تھا اور دوسرے لوگ بھی اس پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ ان کمزوریوں کے باوجود وہ ایک اولوالعزم شخصیت کا مالک تھا اسے مویشی رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے نہایت اعلیٰ پایہ کے گھوڑے اونٹ اور اچھی نسل کی بھیڑ بکریوں کے ریوڑ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے وقت کا ایک بڑا حصہ ان مویشیوں کے ملاحظہ میں گزرتا تھا۔ اس کے باوجود

سیاسی اور انتظامی امور کی طرف بھی اس کی توجہ مبذول رہتی تھی۔
روایت ہے کہ سردیوں کے موسم میں جبکہ اونٹ مست ہوا کرتے ہیں وہ اپنے گلہ شتراں کے سب سے بڑے مست اونٹ کو اپنے نزدیک رکھوا کر اس کی آواز سے محظوظ ہوا کرتا تھا۔ لیکن ملک کے ان شیر صفت انسانوں کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا تھا جو نظام حکومت اور ملک کے ستون تسلیم کئے جاتے تھے اور جن کی حمایت حاصل کرنا انتظام حکومت کو خوش اسلوبی سے چلانے کے لئے بیحد ضروری تھا۔ اس کے نزدیک زیادہ تر معمولی درجہ کے لوگوں کو رسائی حاصل تھی اور وہ اس سے وہی بات کہتے تھے جس سے وہ خوش ہوتا تھا اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو ملک کا مطلق العنان فرماں روا تصور کرتا تھا اور نظام حکومت کے روایتی مروجہ دستور کی اسے پرواز تھی۔ جس کے تحت انتظامی امور اور سیاسی معاملات میں قبائلی سرداروں کی رائے کو اہمیت حاصل تھی۔ اس نے قلات میں ایک باقاعدہ فوج بھی رکھی ہوئی تھی۔ جس میں اکثر و بیشتر غیر ملکی افغان بھرتی کئے گئے تھے اور اس باقاعدہ فوج پر قبائلی سرداروں کو بڑا سخت اعتراض تھا۔

خان میر خداداد خان کو سب سے زیادہ داروغہ گل محمد کی حمایت حاصل تھی۔ اس نے داروغہ گل محمد ہی کو وزارت کے عہدے پر فائز کر دیا تھا۔ ابتدا میں جو لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے ان میں داروغہ گل محمد

شاغاسی ولی محمد، ملا محمد خان وکیل، داروغہ محمد علی، ملا محمد حسین اور دیوان گنگارام کے نام قابلِ ذکر ہیں لیکن اس کی طبیعت پر زیادہ تر داروغہ خاندان کے افراد حاوی ہو گئے تھے۔ اس خاندان کے اراکین کی خان سے وفاداری مسلم تھی اور وہ خان کے احکامات کی تعمیل کو اپنا فرض اولین خیال کرتے تھے۔ قوم اور وطن سے ان کی وفاداری شک وشبہ سے بالاتر تھی لیکن یہ لوگ زیادہ دور اندیش واقع نہیں ہوئے تھے اور خان کے احکامات کی تعمیل میں کچھ اس حد تک مبالغہ سے کام لیتے تھے کہ بعض اوقات ان کا اثر خطرناک صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اس کے برعکس اخوند زیوں کے دورِ وزارت میں اگر خان کسی اضطراری کیفیت کے تحت کوئی حکم جاری کرتا تھا تو اس کی اس وقت تعمیل کی جاتی تھی جب وزارت کو یقین ہو جاتا تھا کہ اس کے اثرات خطرناک ثابت نہ ہوں گے وہ اس قسم کے احکامات کو روک کر خان کو اس کے خطرناک اثرات سے آگاہ کرتے تھے اور اکثر حالات میں خان اپنے اس قسم کے احکامات کو منسوخ کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

خان خداداد خان نے جو مطلق العنان پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس کے اثرات اس کے عہد حکومت کے شروع ہی سے نمودار ہونے لگے سب سے پہلے خان خداداد خان اور جام میر خان کے درمیان میر کمال خان ایمتاززئی کی جائیداد کے اوپر تنازعہ شروع ہوا جو باغیانہ میں واقع تھی اور یہ جائیداد جنت آشیان خان نصیر خان اول کے زمانہ

سے نواب کے قبضہ و اختیار میں دے دی گئی تھی اس معاملہ میں سردار نورالدین مینگل اس کا طرفدار تھا۔ خان نے اپنے دورِ حکومت میں اس جائیداد کو کئی بار ضبط کیا اور پھر کئی بار واگزار کر دیا۔ خان کے اس رویہ سے یہ تنازعہ ملک کی سیاست میں روز رسنے والا ایک ناسور بن گیا جو کبھی ٹھیک ہونے میں نہ آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد خان خداداد خان اور سردار تاج محمد زرک زئی کے درمیان خاندانی امور اور رشتہ ناطوں کے معاملوں میں ناراضگی پیدا ہو گئی اور اس تنازعہ نے بھی شدت اختیار کر لی۔ خان کا رشتہ قبل ازیں سردار تاج محمد کی بیٹی سے ہوا تھا ابھی اس کا نکاح بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے سردار تاج محمد کی بہن سے نکاح کر لیا جو خان نصیر خان کی بیوہ تھی۔ سردار تاج محمد اس معاملہ میں خان سے بے حد ناراض ہو گیا۔

سردار ملا محمد رئیسانی اور سردار تاج محمد زرکزئی کے خاندان آغا علی زئی کے ساتھ رشتہ داری کے دیرینہ تعلقات تھے۔ یہ دونوں سردار ملا محمد حسن کے بھائی محمد امین کو قید سے رہا کرانا چاہتے تھے جو خان نصیر خان ثانی کے زمانہ سے غداری کے الزام میں قید چلا آتا تھا خان نے سراوان اور جھالاوان کے چوٹی کے ان دو سرداروں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ سردار تاج محمد پہلے ہی سے رنجیدہ تھا اب سردار ملا محمد رئیسانی بھی اس سے سخت ناراض اور مایوس ہو گیا۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں سراوان اور جھالاوان کے قبائلی سردار اور جام میر خان سردار لسبیلہ

میر نصیر خان ثانی کی وفات کی عذر خواہی و فاتحہ اور نئے خان کی دستار بندی و مسند نشینی کی مبارکباد پیش کرنے کی غرض سے قلات گئے ہوئے تھے۔ سردار مراد خان موسیانی کے ورغلانے پر خان خدا داد خان نے سرداروں کے کیمپ پر حملہ کر دیا قبائلی سردار اور جام میر خان اپنا کیمپ چھوڑ کر جھالاوان کی طرف چل دیئے اور وہاں اپنے ساتھ سردار میر آزاد خان سردار خاران کو بھی شامل کر کے شورش برپا کر دی شاہ غاسی ولی محمد کو خان نے ان کی سرکوبی کے لئے جھالاوان روانہ کیا اس کی حکمت عملی اور مداخلت سے فساد کی آگ کسی قدر ٹھنڈی پڑ گئی اس معاملے کے تھوڑے عرصہ بعد قبائلی سرداروں نے خان خدا داد خان اور دارو غہ گل محمد کے خلاف بار دیگر شورش برپا کر دی۔ انہوں نے اس موقع پر خان کے پاس ایک وفد روانہ کیا اور تحریری صورت میں مندرجہ ذیل مطالبات اس کے سامنے پیش کئے۔

۱۔ نظام حکومت کے دستور کو بحال کر کے انتظام حکومت اس کے بنیادی اصولوں کے مطابق چلایا جائے۔

۲۔ خان نے جو باقاعدہ فوج رکھی ہوئی ہے وہ نظام حکومت کے دستور کے خلاف ہے اس کو توڑ دیا جائے۔

۳۔ ملک کے دستور کے مطابق قبائلی سردار سول اور فوجی معاملات میں مداخلت کرنے کا حق رکھتے ہیں ان معاملات میں ان کے ساتھ مشورہ کر کے ان کی رائے کو فوقیت دی جائے۔

۷۔ وزارت کے عہدے پر اس شخص کو مقرر کیا جائے جس کو قبائلی سرداروں کی حمایت و تائید حاصل ہو۔ داروغہ گل محمد اور دیوان گنگا رام کو ان کے عہدوں سے علیحدہ کر دیا جائے۔

خان خداداد خان نے ان مطالبات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس بات کا سختی کے ساتھ اعادہ کیا کہ وہ ملک کا مطلق العنان حکمران ہے اور وہ کسی بھی معاملہ میں قبائلی اور علاقائی سرداروں کے مشورے کا پابند نہیں ہے۔

داروغہ گل محمد کے متعلق سرداروں کا خیال تھا کہ خان نے جو مستبدانہ اور مطلق العنان پالیسی اختیار کی ہوئی ہے اس میں داروغہ گل محمد کا ہاتھ ہے اور دیوان گنگا رام کو علیحدہ کرنے کا مطالبہ اس بنا پر کیا گیا تھا کہ وہ ملا محمد امین کی رہائی کا سخت مخالف تھا۔ ان مطالبات کو منوانے کے سلسلے میں خان خداداد خان اور سرداروں کے درمیان جنگ کا زبردست خطرہ پیدا ہو گیا اور قریب تھا کہ ان کا فیصلہ بات چیت کی بجائے میدانِ جنگ میں ہو لیکن انگریز پولیٹکل افسر مسٹر مکالے کی مداخلت کی وجہ سے کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ نومبر ۱۸۵۷ء میں میجر گرین نے جو پولیٹکل آفیسر کے عہدے پر مقرر ہو کر گنداواہ آیا تھا۔ خان اور سرداروں کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کر کے اختلافات کی اصل وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی اور اپنی رپورٹ اپنے افسرانِ بالا کے پاس بھجوا دی۔ جنوری ۱۸۵۸ء میں خان خداداد خان نے خان گڑھ جس کا نام اب

جیکب آباد ہو گیا تھا کا سفر اختیار کیا اور وہاں مسٹر جیکب اور مسٹر فریئر سے طویل ملاقاتیں کیں ان ملاقاتوں کے فوراً بعد ان سرداروں کے کچھ مطالبات تسلیم کر لئے اس نے دارو غہ گل محمد کو وزارت کے عہدے سے الگ کر دیا اور اس کی بجائے شاہ غاسی ولی محمد کو وزارت کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اس نے دیوان گنگا رام کو بھی اس کے عہدے سے الگ کر کے ملک بدر کر دیا جو ایک عرصے سے اپنا فرض منصبی خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہا تھا۔ ملا محمد امین کو بھی جیل خانہ سے رہائی حاصل ہو گئی

شاہ غاسی ولی محمد کی ذات میں انتظام حکومت چلانے کی صلاحیت موجود تھی اور وہ اس میں خوب مہارت رکھتا تھا اس کو قبائلی سرداروں کی حمایت بھی حاصل ہو گئی لیکن خان خداداد خان کی طبیعت پر قابو حاصل کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی اس موقعہ پر خان کے خلاف ایک طرف میر شاہنواز خان کے بیٹے میر فتح خان نے بغاوت کر دی اور دوسری طرف مریوں نے شورش برپا کر کے کچھی میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ ان شورشوں کی وجہ سے تجارتی کاروانوں کی آمد و رفت میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔ ان شورشوں کو خان اور انگریزوں کی مشترکہ کوششوں سے فوجی کارروائیاں کر کے فوراً دبا دیا گیا۔ ۱۸۵۶ء میں مکران کے مغربی علاقوں کے سرداروں کی سرکوبی کی طرف خان نے خصوصی توجہ مبذول کی اور شاہ غاسی ولی محمد نے ان کے خلاف ایک مہم کی رہنمائی کر کے ان کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایک عرصے سے یہ علاقہ پوری

طرح حکومت کے قابو میں نہیں تھا

۱۸۶۳ء میں خان اور سردار تاج محمد زرک زئی کے درمیان اسی خانگی رشتوں کی وجہ سے مخاصمت بار دگر شروع ہوگئی اور دوسرے قبائلی اور علاقائی سردار بھی خان کی مستبدانہ اور مطلق العنان پالیسی سے سخت نالاں تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خان اور اس کے سرداروں کے درمیان تعلقات ایک بار پھر خراب ہوگئے اور سرداروں نے خان کی بجائے اس کے چچازاد بھائی میر شیر دل خان کو خان بنانے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ مارچ ۱۸۶۳ء میں جبکہ خان اور اس کے تقریباً تمام سردار جو زیادہ تر سراوان اور جھالاوان سے تعلق رکھتے تھے۔ گنداواہ میں موجود تھے کہ میر شیر دل خان نے اچانک حملہ کرکے خان خداداد خان کو بری طرح زخمی کردیا۔ اس کے بعد گاجان اور سنی میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد وہ مستونگ چلا آیا اور یہاں سید علی محمد مستونگی کو اپنا وزیر مقرر کردیا اس کے بعد قلات پر چڑھائی کرکے قلات کی میری پر قبضہ کرلیا۔ خان خداداد خان اس عرصہ میں ادھر ادھر پھرتا رہا اس کے زخموں کے مندمل ہونے میں بہت وقت لگا۔

خان خداداد خان کے زخم ٹھیک ہونے کے بعد اس نے سراوان اور جھالاوان کا دورہ کیا اور قبائلی سرداروں کو منت سماجت کرکے اپنا طرفدار بنانے کی کوشش کی اس نے ان فوجی افسروں کو بھی اپنا طرفدار بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جن کی سازش سے وہ اقتدار سے محروم

ہو گیا تھا۔ میر شیر دل خان جسمانی لحاظ سے ایک مضبوط شخص تھا لیکن اس میں حکومت کرنے کی صلاحیت نہیں تھی اور سرداروں کا دل بہت جلد اس سے کھٹا ہو گیا۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہی متقدر رہنماؤں نے جنہوں نے خان خداداد خان کو تخت سے محروم کر کے میر شیر دل خان کو اقتدار سے ہم کنار کر دیا تھا۔ اب ۱۸۶۴ء میں دوبارہ پلٹا کھا کر میر شیر دل خان کو کمانیر شیر دل خان یوسف زئی کے ہاتھوں سے قتل کروا کر خان خداداد خان کو ایک بار پھر اقتدار کی کرسی پر بٹھا دیا۔ خان خداداد نے قبائلی سرداروں کے روبرو اپنی گزشتہ حرکتوں پر پشیمانی کا بڑے زور شور سے اظہار کیا تھا اور خیال تھا کہ گزشتہ واقعات سے اسے بہت کچھ سبق حاصل ہو گیا ہوگا۔ لیکن خان کی طبیعت میں جبر و استبداد کا جو میلان تھا اس میں کمی کی بجائے اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی اور عنانِ حکومت سنبھالنے کے ساتھ ہی وہ انہی قبائلی سرداروں کے ساتھ دست و گریباں ہونے لگا۔ جن کی امداد و اعانت سے اسے دوبارہ حکومت حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔

خان خداداد خان نے ۱۸۶۳ء میں میر کمال خان ایلتازئی کی جائیداد واقعہ باغبانہ کو دوبارہ ضبط کر لیا جو جام موصوف کے قبضہ میں تھی اس معاملہ میں جب جام میر خان اور سردار مینگل نے مزاحمت کی اور برسرِ پیکار ہوئے تو شاہ غاسی ولی محمد نے ان کو باغبانہ سے گرفتار کیا اور اپنے ساتھ قلات لے آیا۔ خان نے ان کو جیل خانہ میں

ڈال دیا۔ ۱۸۶۵ء میں شاہ غاسی ولی محمد نے خان کے حکم پر خاران پر لشکر کشی کر کے سردار میر آزاد خان کو جس نے خان کی مستبدانہ پالیسی کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت سے منہ موڑ لیا تھا دوبارہ اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان واقعات کے کچھ ہی عرصہ بعد خان نے سردار ملا محمد رئیسانی اور سردار تاج محمد زرک زئی کو گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا جو خان کے رویہ سے تنگ آکر اس کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں اور سازشوں میں مصروف تھے سردار ملا محمد رئیسانی قندھار کی طرف بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن ۱۸۶۶ء میں سردار تاج محمد گرفتار ہو گیا اور خان نے اس کو جیل خانہ میں ڈال دیا۔ ۱۸۶۷ء میں جیل خانہ ہی میں اس نے وفات پائی۔ ان دنوں یہ بات مشہور تھی کہ خان نے اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سردار محمد خان لہڑی باغی ہو گیا اور اس نے سردار اللہ ڈنہ کرد کو اپنے ساتھ ملا لیا لیکن جلد ہی خان کے ہاتھ سے مارا گیا اسی دوران کانک کے رستم زئی قبیلہ کے لوگوں نے بغاوت کر دی اور نائب عبدالعزیز نے خان کے حکم سے کانک پر فوج کشی کی اس لڑائی میں میر حبیب خان اور میر رادت خان رستم زئی مارے گئے۔ ۱۸۶۷ء میں سردار میر آزاد خان نوشیروانی نے خان سے ناراض ہو کر سیستان میں پناہ لی اور میر بلوچ خان نوشیروانی نے سوراب پر حملہ کر کے اس علاقہ کو تاخت و تاراج کیا۔

خان خداداد خان نے ۱۸۶۶ء میں سردار تاج محمد زرک زئی کو

گرفتار کرنے کے بعد جام میر خان اور سردار نور الدین کو رہا کر کے میر کمال خان ایلتاززئی کی جائداد واقعہ باغبانہ کو واگزار کر دیا تھا لیکن ۱۸۶۶ء کے اواخر میں جام میر خان اور خان کے درمیان اس جائیداد پر دوبارہ تنازعہ شروع ہوا. اب کی بار سردار نور الدین اور سردار بلوچ خان نوشیروانی دونوں جام کے طرفدار تھے. خان نے ان تینوں کے خلاف باغبانہ پر فوج کشی کی لیکن مجبور ہو کر یہ جائیداد دوبارہ واگزار کر دی.

فروری ۱۸۶۹ء میں انگریزی حکومت کی طرف سے کیپٹن ہیریسن قلات میں پولیٹکل آفیسر مقرر ہو کر آیا. اس موقعہ پر قبائلی اور علاقائی سرداروں نے مل کر اس کے پاس خان کی سخت شکایت کی اور اپنے گزشتہ مطالبات کا اعادہ کیا جس میں دستور حکومت کی بحالی کے علاوہ دوبارہ فوج توڑ دینے پر زور دیا گیا تھا. مئی ۱۸۶۹ء میں سراوان اور جھالاوان کے قبائلی سرداروں اور جام میر خان نے ایک بڑا لشکر لے کر قلات پر چڑھائی کی. لیکن کیپٹن ہیریسن کی موجودگی اور مداخلت کی وجہ سے کوئی لڑائی نہ ہوئی. اکتوبر ۱۸۶۹ء میں جام میر خان نے خان کے خلاف بغاوت کا دوبارہ اعلان کر دیا. سردار نور الدین مینگل بھی اس بغاوت میں اس کے ساتھ تھا. لیکن شاہ غاسی ولی محمد نے جھالاوان میں ان کو شکست دے کر منتشر کر دیا. اسی سال مریوں نے بھی کچھی میں لوٹ مار کی. ان کے لوٹ مار سے تجارتی کاروانوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا. خان نے ان نقصانات کو پورا کرنے کے لئے

تاجروں کو ایک بڑی رقم بطور معاوضہ ادا کی۔

۱۷۸۱ء میں خان نے اپنے آپ کو ایک اور تنازعہ میں زہری کے زرک زئی قبیلہ کے ساتھ ملوث کر لیا۔ سردار تاج محمد کے بعد سرداری کا مستحق اس کا بڑا بیٹا میر گوہر خان تھا لیکن خان کی خواہش تھی کہ وہ اپنے خورد سال بیٹے میر مصطفےٰ خان کو جو سردار تاج محمد کی لڑکی کے بطن سے تھا۔ زہری قبیلہ کا سردار مقرر کر دے یہ نظام حکومت کے دستور کے اصولوں کے خلاف تھا۔ زہری قبیلہ میں اس کا شدید ردعمل ہوا اور بغاوت کی کیفیت پیدا ہو گئی لیکن ۱۷۸۳ء میں میر مصطفےٰ خان کی موت واقعہ ہوئی اور یہ تنازعہ خود بخود رفع ہو گیا۔

۱۷۸۱ء کے موسم بہار میں خان درہ بولان کے راستہ ڈھاڈر سے مستونگ میں وارد ہوا، یہاں اس نے کافی عرصہ قیام کیا اس نے اس موقعہ پر اپنے قیام کے دوران سید علی محمد پر الزام لگایا کہ اس نے میر شیر دل خان کے دور حکومت میں اپنی وزارت کے دوران سرکاری خزانہ سے مبلغ آٹھ ہزار روپے خورد برد کئے تھے سید موصوف سے اس نے اس رقم کا زبردستی سے مطالبہ کیا۔ سید علی محمد نے اپنی جائیداد غیر منقولہ واقعہ مستونگ اور خانگی زیورات فروخت کر کے یہ رقم ادا کر دی اور ناراض ہو کر راتوں رات کابل چلا گیا اس سے خان کے خلاف مستونگ میں شدید غم و غصہ کا اظہار ہوا۔ سید علی محمد بڑے ہی مقبول اور صاحب رسوخ بزرگ خیال کئے جاتے تھے اور روایت مشہور ہے کہ خان نے یہ رقم

دوبارہ اس کے پاس کابل میں پہنچا دی تھی لیکن وہ واپس نہیں آیا۔
خان کے قیام مستونگ کے دوران اس کے پاس سواری اور باربرداری کے جانوروں کا ایک بہت بڑا گلہ تھا۔ ان کے چارہ اور دانہ کا مسئلہ اہالیان مستونگ کے لئے وبالِ جان بن گیا۔ خان کے گلہ بان لوگوں کی اراضیات سے توس، جو اور گندم بلا امتیاز کاٹ کاٹ کرلے جاتے تھے اور جانوروں کی کثرت کی وجہ سے روزانہ بہت بڑی مقدار میں بھوسہ اور توس وغیرہ کی ضرورت پڑتی تھی۔ بعض لوگوں نے جو زیادہ تر متقدر خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اس معاملہ میں مزاحمت کی اور جب خان کو اس کا علم ہوا تو اس نے مزاحمت کرنے والوں کی جائیدادیں ضبط کرلیں۔ ان اقدامات سے خان کے خلاف مستونگ کی فضا سخت مکدر ہو گئی۔ اکتوبر ۱۸۷۱ء میں خان خداداد خان کی مستونگ سے روانگی اور قلات پہنچنے کے بعد سراوان میں اس کے خلاف بغاوت کا آغاز ہو گیا۔ قبائلی سردار مستونگ کی میری پر قبضہ کرنے کے بعد ایک بڑے لشکر کے ساتھ قلات پر چڑھائی کرنے کی غرض سے قلات کی طرف روانہ ہو گئے۔ قلات میں اطلاع پہنچنے پر شاہ غاسی ولی محمد فوج کا ایک دستہ لے کر بدرنگ کے مقام پر ان کے ساتھ نبرد آزما ہوا لیکن شکست کھائی اور منگوچر کی جانب لپا ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ شاہ غاسی نے منگوچر میں فوری طور پر اپنے دستے کو دوبارہ منظم کرکے اب کی بار مستونگ سے اور زیادہ قریب کھڈ کوچہ میں ان کے مقابلے پر آیا جہاں شاہ غاسی کی فوج اور قبائلی لشکر کے درمیان جو

لڑائی ہوئی اس میں شاہ خاسی نے شکست کھائی اور گرفتار ہوا لیکن توپ خانے کی حاضر دماغی سے یہ شکست فتح میں تبدیل ہو گئی اور شاہ خاسی کو قبائلیوں کے ہاتھ سے نجات ملی۔ اس لڑائی میں سردار جہانگیر خان لہڑی کے علاوہ کئی متعدد افراد میدانِ جنگ میں کام آئے۔ اس کے بعد قبائلیوں نے کچھی کا رُخ کیا اور کچھی میں ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ اس شورش نے اس قدر طوالت اختیار کر لی کہ خان کی حکومت کے لئے آخر کار زوال کا باعث بنی ۱۸۹۳ء میں جبکہ کچھی میں قبائلیوں کی شورش اپنے عروج پر تھی۔ جام میر خان کے لئے جام علی خان نے بیلہ میں بغاوت کر کے سردار نورالدین کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور یہ دونوں کسی مزاحمت کے بغیر بیلہ پر قابض ہو گئے۔ اسی اثناء میں سردار اللہ خان گچکی نے کیچ میں خان کے خلاف بغاوت کر کے کیچ پر قبضہ کر لیا۔ اور نائب کیچ دارو غہ عطا محمد کو کیچ کی میری خالی کر کے چلے جانے پر مجبور کر دیا اس کے بعد سردار نورالدین نے بیلہ پر قبضہ جمانے کے بعد خضدار کا محاصرہ کر لیا اور میر آزاد خان نوشیروانی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا ان ابتر حالات میں پے در پے بغاوتوں اور شورشوں کی وجہ سے انگریزوں کو بلوچستان کے اندرونی معاملات میں براہِ راست مداخلت کرنے کا موقع فراہم ہو گیا۔ سر میری ویدر نے جو سندھ کا کمشنر تھا۔ خان اور اس کے سرداروں کے درمیان اختلافات کو ختم کرنے کے لئے اچھی خدمات پیش کیں۔ اس معاملہ میں خان اس بات پر راضی ہو گیا کہ سر میری ویدر ایک

ثالث کی حیثیت سے ہر دو فریق کے درمیان کوئٹہ میں فیصلہ کرے اس موقعہ پر سرداروں کا نمائندہ سردار ملا محمد ریئسانی تھا۔ اور خان کی نمائندگی شاہ غاسی ولی محمد نے کی یہ گفتگو جیکب آباد میں ہوئی۔ سر میری ویدر نے ہر دو فریق کے نمائندوں شاہ غاسی ولی محمد اور سردار محمد ریئسانی کے نکتہ نظر کو معلوم کرنے کے بعد یہ طے کر دیا کہ سرداران حسب سابق فرماں بردار بن کر بدامنی اور شورشوں کا سلسلہ بند کر دیں اور خان اپنے سرداروں کو وہ تمام مراعات دے دے جو اس سے پہلے خانان ماسبق کے زمانہ میں ملک کے مروجہ دستور اور رواج کے مطابق ان کو حاصل تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خان سرداروں کو اپنے اعتماد میں لے کر ان کے مشورے سے انتظام حکومت کا کاروبار چلائے۔ خان کو اس بات سے چڑ تھی کہ قبائلی سردار حکومت کے کاروبار میں مداخلت کرنے یا مشورہ دینے کا اختیار رکھتے ہیں۔ خان کو سر میری ویدر کا یہ فیصلہ سخت ناپسند آیا۔ وہ انگریزوں سے اور زیادہ بدظن ہو گیا اور شاہ غاسی ولی محمد کی جان کے درپے ہوا۔ شاہ غاسی ولی محمد نے ملک چھوڑ کر جیکب آباد میں پناہ لی۔

ان دنوں کمانیر شیر خان، منشی صالح محمد اور منشی گل محمد ہی زیادہ تر خان کے منظور نظر تھے۔ کمانیر شیر خان کو شاہ غاسی ولی محمد سے ذاتی عداوت تھی۔ دونوں منشی اپنے ادنیٰ مرتبہ کی وجہ سے اس قابل ہی نہیں تھے کہ وہ ان نازک حالات میں کوئی مفید مشورہ دے سکیں۔ انگریزوں

کی مداخلت پر آخر کار خان نے شاہ غاسی ولی محمد کو دوبارہ وزارت عظمیٰ کے عہدے پر بحال کر دیا۔ انگریزوں نے شکر خان اور دونوں منشیوں کو گرفتار کر کے سندھ میں مقید کر دیا۔ انگریزی حکومت کو سندھ اور پنجاب کی سرحد پر قیام امن کے مسئلہ سے گہری دلچسپی تھی اور ان بدامنیوں سے جو بلوچستان میں ایک معمول کی بات بن گئی تھی۔ تجارتی کاروانوں کی آمدورفت میں رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی اور اس بدامنی کا اثر سندھ اور پنجاب پر بھی پڑ رہا تھا جہاں کبھی کبھار بلوچستان کے مری اور بگٹی قبیلوں کے لوگ سرحدی علاقوں میں لوٹ مار کرتے تھے۔

فروری ۱۸۵۴ء میں سر میری ویدر نے سکھر کے مقام پر خان کے ساتھ ملاقات کی اس موقعہ پر سردار ملا محمد رئیسانی اور چند دوسرے سرداروں کے علاوہ شاہ غاسی ولی محمد بھی موجود تھا لیکن خان کو اصل مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس ملاقات میں اس نے کما نیز شکر خان اور اپنے دونوں منشیوں کی رہائی پر زیادہ زور دیا۔ خان اور کمشنر سندھ کی یہ ملاقات ناکام ہو گئی۔ اس سے پیشتر انگریزوں کے سندھ سے متعلق افسروں کا خیال تھا کہ خان خدا داد خان کی امداد کر کے امیر عبدالرحمٰن کی طرح اس کے ہاتھ مضبوط کر دیئے جائیں تاکہ وہ شورش پسند عناصر کا قلع قمع کر کے ملک میں امن قائم کر سکے۔ اس مقصد کے لئے وہ خان کو مبلغ پچاس ہزار روپے سالانہ بطور امداد بھی دیا کرتے تھے تاکہ خان اس امداد سے فائدہ اٹھا کر سندھ اور پنجاب کے سرحدی علاقوں میں قیام امن کا بندوبست

کرے اس مقصد کے لئے انہوں نے خان کو باقاعدہ اسلحہ فراہم کرنے کا اہتمام بھی کر لیا تھا تاکہ وہ سرداروں کے مقابلہ میں اپنی پوزیشن مستحکم کرے اور سارے ملک پر اس کی گرفت مضبوط ہو جائے خان کو امیر عبدالرحمٰن کی طرح ایک مطلق العنان حیثیت دینے کی طرف یہ ابتدائی قدم تھا اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی خواہش میں وہ خان کی حیثیت کو مزید مستحکم اور مضبوط کرنے کے لئے مزید اقدامات کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ دوسری طرف پنجاب سے متعلق افسران اس منصوبے کی کامیابی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ خان کو چھوڑ کر قبائلی سرداروں سے براہِ راست تعلقات پیدا کر کے ہی قیامِ امن کا مقصد پورا ہو سکے گا۔ اس لحاظ سے جیکب آباد کی میٹنگ بہت اہمیت رکھتی تھی اور اسی کے اوپر انگریزوں کی نظروں میں خان کی آئندہ حیثیت کا دارومدار تھا لیکن خان نے یہ موقعہ ہاتھ سے کھو دیا اور قبائلی سرداروں کی حیثیت اور طاقت میں اضافہ ہو گیا۔ اب انگریز قبائلی سرداروں کے ساتھ براہِ راست تعلقات قائم کرنے کے حق میں ہو گئے اور خان سے متعلق اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کر کے اس کا رخ بدل دیا۔ یہ ایک اہم فیصلہ تھا۔ انگریزوں نے اس کے بعد اس منصوبے کو ترک کر دیا جس کے تحت وہ خان کو وافر تعداد میں حسبِ ضرورت اسلحہ دینے کے خواہشمند تھے اور اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر مبلغ پچاس ہزار روپے سالانہ کی وہ امداد بھی بند کر دی جو وہ اس سے پہلے خان کو دیا کرتے تھے انہوں نے اپنے

پولیٹیکل افسر کو بھی خان کے دربار سے واپس بلایا شاہ غاسی ولی محمد نے بھی اپنے عہدے سے استعفٰی دے کر جیکب آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ سراوان، جھالاوان، مکران، کچھی اور لسبیلہ میں کہیں بےچینی اضطراب اور کہیں شورشوں کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ ستمبر ۱۸۷۴ء میں خان خداداد خان نے داروغہ گل محمد کے بیٹے عطا محمد کو وزارت کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ ابھی اس عہدے پر کام کرتے ہوئے اس کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ لسبیلہ کے رہنے والے چند چوروں اور ڈاکوؤں نے سندھ کے سرحدی علاقہ میں ڈاکہ ڈالا۔ کمشنر سندھ کے دباؤ کے تحت خان نے داروغہ عطا محمد کو ان ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے بیلہ روانہ کیا اور ساتھ ہی اس کو ہدایت کر دی کہ وہ جام علی خان کو بھی گرفتار کر کے اپنے ساتھ قلات لے آئے۔ داروغہ عطا محمد جب بیلہ پہنچ گیا تو جام علی خان نے بڑی خیر سگالی کا مظاہرہ کر کے ڈاکوؤں کو سندھ پولیس افسروں کے حوالے کر دیا۔ اس بنا پر داروغہ عطا محمد نے جام علی خان کو گرفتار کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ لیکن جب وہ واپس قلات آیا تو خان اس معاملہ میں اس سے سخت ناراض ہوا اور اس کو وزارت کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ ۸ر دسمبر ۱۸۷۵ء کو سر رابرٹ سنڈیمن نے قلات کا دورہ کیا اور بلوچستان کے حالات پر خان خداداد خان کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کی۔ لیکن اس گفتگو کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ البتہ سنڈیمن پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی کہ قیام امن کے سلسلے میں خان کے

ساتھ رابطہ پیدا کرنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا اور نہ اس سے کوئی مدد مل سکے گی۔

جنوری ۱۸۷۶ء میں خان خداداد خان نے داروغہ عطا محمد کے توسط سے سردار نور الدین کو قلات آنے کی دعوت دی اور سردار نور الدین داروغہ عطا محمد کی یقین دہانی پر کہ خان اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ داروغہ کے ساتھ قلات چلا آیا اور داروغہ کے مکان میں ٹھہر گیا خان خداداد خان نے داروغہ عطا محمد کے مکان پر حملہ کرا کے سردار نور الدین کو اس بہانے سے قتل کرا دیا کہ وہ اور داروغہ مل کر خان کو قتل کرنے کی سازش میں ملوث تھے۔ بلوچستان کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی ایک بڑا المیہ ثابت ہوا۔ اس حادثہ کے نتیجہ میں ملک کے طول و عرض میں جو شورش اور بغاوتیں برپا ہوئیں ان پر قابو حاصل کرنا اب خان کے لئے ناممکن ہوگیا اور وہ پہلی بار قبائلی سرداروں اور دوسرے مقتدر افراد کے ساتھ کسی مصالحت پر آمادہ نظر آنے لگا۔ ۱۴ اپریل ۱۸۷۶ء کو رابرٹ سنڈیمن نے قلات کا سفر اختیار کیا۔ بلوچستان کے حالات بہت زیادہ خراب تھے اور امن و امان کی صورت حال نے سنگین صورت اختیار کر لی تھی اس نے خان سے طویل ملاقات کی اور اس کی توجہ اس لاقانونیت کی طرف مبذول کی جو انگریزوں کے لئے تشویش کا موجب بن رہی تھی اب خان کے لئے اپنے سرداروں کے ساتھ مصالحت کئے بغیر کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنی پالیسی

کی وجہ سے ان سرداروں کے ہاتھوں پوری طرح شکست کھائی تھی
رابرٹ سنڈیمن کا یہ دورہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا تھا کہ اس
نے خان خداداد خان کا اور اس کے قبائلی اور علاقائی سرداروں کے
درمیان مصالحت کے لئے زمین ہموار کر دی۔ سردار تو پہلے ہی سے مصالحت
کے لئے تیار بیٹھے تھے اب خان بھی ایک قطعی فیصلہ کے لئے تیار
ہوگیا۔ چنانچہ آخر کار ۱۳ر جولائی ۱۸۷۶ء کو مستونگ کے مقام پر خان
خداداد خاں اور قبائلی و علاقائی سرداروں کا ایک کنونشن بلایا گیا اس
کنونشن میں خان خداداد خان کے علاوہ تقریباً تمام سرداروں اور بعض
دیگر مقتدر افراد نے شرکت کی طویل بحث و مباحثہ کے بعد موٹے موٹے
اصول طے کر لئے گئے اور اس کے بعد ۸ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو جیکب آباد
کے مقام پر انگریزوں، خان قلات اور قبائلی سرداروں کے درمیان
ایک باقاعدہ معاہدہ ہوا۔ جس کی شرائط کے تحت انگریزوں کو خان اور
اس کے سرداروں کے درمیان ایک مستقل ثالث کی حیثیت حاصل ہو
گئی اور انگریزوں کو بلوچستان کے اندرونی معاملات میں دخل دینے
کا قانونی حق مل گیا اور ملک پر ان کا سیاسی تسلط پوری طرح قائم ہو
گیا۔ اس معاہدے کی شرائط کے تحت جس پر تمام فریقوں نے اپنی
مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ انگریز ہر چھوٹے اور بڑے معاملہ میں دخل
دینے کے پوری طرح اہل قرار پائے۔ یہ معاہدہ درحقیقت بلوچستان کو
انگریزوں کی غلامی میں دینے کا پٹہ تھا جس کو ملک کے تمام عمائدین

نے خوشی سے قبول کیا۔ خان خداداد کے آخری دور میں ملا فقیر محمد
خراسان زئی وزارت کے منصب پر فائز تھا۔ اس زمانہ میں خان کی
طبیعت پر ہر وقت قنوطیت طاری رہتی تھی اور خان کو آثار و شواہد
کی بنا پر وہم ہو گیا تھا کہ انگریز اس کو تخت سے ہٹا کر اس کی جگہ اس
کے بڑے فرزند میر محمود خان کو خان بنانا چاہتے ہیں۔ اس نے میر
اعظم خان کو جو میر محمود خان سے عمر میں چھوٹا تھا، اپنا جانشین
بنانے کا فیصلہ کیا لیکن قبل اس کے کہ وہ اس منصوبے پر عمل کرتا اس
نے انگریزوں کے اس اقدام کے لئے خود موقعہ فراہم کیا جس کے
متعلق اسے وہم تھا کہ وہ اس کو تخت سے ہٹا کر میر محمود خان کو اس
کا جانشین مقرر کر دیں گے۔ ۱۸۹۳ء میں مستوفی الممالک ملا فقیر محمد
نے اپنے بیٹے ملا غلام فاروق کو قلات ایجنسی میں ملازمت دلوائی اس
سے خان بڑا برافروختہ ہوا اس زمانہ میں خان موصوف بھاگ میں قیام
پذیر تھا۔ اور غلام فاروق بھی اپنے خاندان کے لوگوں سے ملنے کے
لئے رخصت لے کر بھاگ آیا ہوا تھا جو بھاگ ہی میں خان کے ساتھ
قیام پذیر تھے۔ خان نے اس خاندان کے تمام نرینہ افراد کو جن میں
غلام فاروق کے علاوہ اس کا معمر باپ نائب عبدالعزیز اور ایک ملازم
شیر دل بھی شامل تھا، موت کے گھاٹ اتار دیا، یہ لوگ قطعاً بے گناہ
تھے ان کے ہاتھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی تھی جو اس
قدر سنگین سزا کے مستوجب قرار پاتے، معلوم ہوتا ہے کہ اس آخری

دور میں قبائلی سردار اور دوسرے مقتدر لوگ خان کی دسترس
سے باہر تھے اور اب وہ اپنے ملازمین کو اپنا تختہ مشق بنانا چاہتا تھا
یہ حادثہ فوری طور پر خان کے زوال کا باعث بنا انگریزوں نے اس
کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا اور اس کے ساتھ اس کے
بیٹے میر اعظم جان کو بھی قید کر دیا۔ بلوچستان کی تاریخ کا یہ ایک زبردست
المیہ تھا۔

خان/مستوفی الممالک فقیر محمد اور اس کے اہل خاندان کا قتل کسی اضطراری
کیفیت کا نتیجہ نہیں تھا جو فوری طور پر رونما ہوا خان اور مستوفی الممالک کے
درمیان خدشات اور شبہات کچھ عرصہ پہلے ہی سے پیدا ہو گئے تھے
اس المناک حادثہ سے پیشتر فقیر محمد نے تین اقدامات کئے جن سے ان
خدشات اور شبہات کو تقویت پہنچتی ہے جو خان اور اس کے درمیان پیدا ہو
گئے تھے۔ سب سے پہلے اس نے اپنی سالم غیر منقولہ جائداد یعنی آب
واراضی واقع مستونگ کو اپنے ایک عزیز کے ہاتھ فروخت کر دیا۔
اور اس کے بعد اپنے گھریلو اثاثہ کو جو اعلےٰ درجہ کے قالینوں اور عمدہ
اونی دریوں اور تانبہ کے بے شمار قیمتی برتنوں پر مشتمل تھا۔ ملک سعادت
خان ترکچی کے ہاں منتقل کر دیا۔ جس کے ساتھ اس کے گھر سے
دوستانہ تعلقات تھے اور ملک سعادت خان علاقہ کا ایک بڑا صاحب
رسوخ شخص تھا۔ آخر میں اس نے اپنے بیٹے غلام فاروق کو جیکب آباد
میں قلات ایجنسی میں ملازمت دلوائی۔ غالباً یہ اقدامات اس نے اپنے

تحفظ کی خاطر کیے تھے تاکہ اول تو انگریزوں کی حمایت کی بنا پر خان کی طرف سے اسے کوئی گزند نہ پہنچ سکے۔ دوئم اسے خان کی طرف سے کوئی حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس کی جائداد ضبط نہ کی جا سکے اور یہ جائداد اس کے عزیزوں اور دوستوں کے توسط سے اس کے ورثا کے حوالے ہو سکے۔ غالباً خان موقعہ کی تلاش میں تھا۔ اور غلام فاروق کی انگریزوں کے ہاں بطور ملازم تقرری کو بہانہ بنا کر اس نے فقیر محمد کے خاندان کو ختم کرنے میں چابک دستی سے کام لیا۔ ادھر انگریز بھی اس کے رویہ سے غیر مطمئن تھے اور وہ بھی موقع کی تلاش میں تھے کہ خان کے اس اقدام سے ان کو ایک بہانہ مل گیا اور انہوں نے بھی خان کو گرفتار کر کے اسے قید کرنے میں چابک دستی سے کام لیا۔ لیکن افسوسناک بات یہ ہوئی کہ ملک میں انگریزوں کے اس اقدام کے خلاف فوری طور پر کوئی ردعمل نہ ہوا۔

خان کی ناکامی کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ اس کی مشرقی سرحد پر انگریز ایک مستحکم سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور وہ اپنے پیشرو خان میر نصیر خان ثانی کی طرح ان کے ساتھ نبھا کر کے ان کو مطمئن نہ کر سکا۔ خان کی اندرونی پالیسی کی وجہ سے اکثر قبائل خان سے ناراض رہا کرتے تھے اور آئے دن کی شورشوں سے ملک کا نظم ونسق درہم برہم ہو گیا تھا۔ اور اس کے اثرات انگریزوں کے سرحدی علاقوں پر پڑ رہے تھے اور خان کی پالیسی سے بیزاری کا

اظہار کرتے ہوئے قبائلی سردار بھی اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے انگریزوں کی طرف دیکھتے تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر خان کو حکومت کا کاروبار خوش اسلوبی سے چلانے میں ناکامی ہوئی اور یہی وجوہات اس کے زوال کا باعث بن گئیں۔ اس معاملہ میں خان کا موقف یہ تھا کہ نائب عبدالعزیز اور فقیر محمد اس کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جب دونوں خان کے روبرو پیش ہوئے تھے تو نائب عبدالعزیز کے بدن پر کپکپی طاری ہوگئی اور ایک بھرا ہوا پستول جو اس نے اپنی آستین میں چھپا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ سے زمین پر گر گیا تھا غالباً اسی مفروضہ کی بنا پر خان نے ایک انتہائی قدم اٹھایا تھا۔

اٹھائیسواں باب

طرزِ حکومت اور معاشرہ

ڈبلیو آر ہیوز نے چارلس مین کے حوالے سے اپنی کتاب دی کنٹری آف بلوچستان میں میروانیوں کے دستورِ حکومت پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

میر قنبر کے اقتدارِ اعلیٰ سنبھالنے پر قبیلوں نے فیصلہ کیا کہ اس کی حیثیت موروثی ہو۔ اس کے ساتھ دو مشیرانِ اعلیٰ بھی مقرر کیے گئے جن میں سے پہلا قبیلہ رئیسانی اور دوسرا قبیلہ زرک زئی سے تعلق رکھتا تھا۔ ان میں سے پہلا سراوان اور دوسرا جھالاوان کا سردارِ اعلیٰ قرار پایا۔ یہ طے ہوا کہ ہر وقت اور ہمیشہ کے لیے درباروں کے موقعہ پر سراوان کا سردار۔ خان کے دائیں طرف اور جھالاوان کا سردار خان کے بائیں طرف بیٹھا کرے گا عام دلچسپی کے تمام معاملات اور وہ امور جن کا تعلق قبیلوں کے مفاد اور خوشحالی سے ہو سب سے پہلے سردار سراوان کے سامنے پیش کیے جائیں جس کو اپنی رائے کا اظہار کرنے میں اولیت حاصل تھی۔ اس کے بعد یہ معاملات سردار جھالاوان کے سامنے رکھے جائیں۔ کوئی معاملہ ان سرداروں کی رائے

اور مشورہ کے بغیر طے نہیں ہونا چاہئے۔ جن کو اپنے قبیلوں میں زبردست اثر و رسوخ حاصل تھا اور ان کو حق حاصل تھا کہ جب بھی وہ مناسب خیال کریں تو حکومت سے اپنے تعاون کا ہاتھ کھینچ لیں۔ اس قسم کا دستور غالباً اس خیال سے وضع کیا گیا کہ خان اور قبیلوں میں پورا پورا اتحاد قائم رہے یا اس خیال سے کہ خان مطلق العنان حیثیت حاصل نہ کرے۔ اس دستور سے حکومت کا سربراہ قبائلی سرداروں کے تعاون اور ان کی عصبیت کا محتاج ہوگیا جو اکثر غیر مطمئن اور تخریب کار ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ خان کا ایک اور مشیر خصوصی یا وزیر دہوار یا تاجک آبادی سے چن لیا گیا تھا۔ اس کا مطلب رعیت کے اس طبقے کو نمائندگی دے کر مطمئن کرنا تھا۔ جس سے حکومت کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ حاصل ہوتا تھا۔"

میر حسن نے کسی قسم کے تشدد کی بجائے دہواروں کی دعوت پر اور ان کی اعانت، مرضی اور منشا سے قلات میں جو حکومت قائم کی اس کا دائرہ ابتدا میں صرف قلات اور اس کے مضافات تک محدود تھا۔ اس ابتدائی دور میں اس کا دستور خان اور دہواروں کی باہمی رضامندی سے اس طرح طے پایا کہ:۔

۱۔ قلات کی حکومت میروانی خاندان میں رہے گی اور اس کی حیثیت موروثی ہوگی۔

۲۔ حکومت کے دفاع کی ذمہ داری میروانیوں پر ہوگی۔

۳۔ حکومت کے اخراجات مالیہ اور دوسرے محاصل کی صورت میں

دہوار برداشت کریں گے۔

۴ ۔ وزارت کا عہدہ دہواروں میں رہے گا اور اس کی حیثیت موروثی ہوگی۔

۵ ۔ دہوار فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہوں گے۔

میر حسن سے لے کر میر احمد تک قلات کے اس ابتدائی دور کی تاریخ میں کوئی نصف درجن کے قریب شخصیتوں کا ذکر ملتا ہے۔ جو یکے بعد دیگرے قلات کی مسند پر متمکن تھے۔ لیکن ان سب کی حکومت کا دائرہ قلات کے شہر اور اس کے مضافات سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ سب حکمران مغلوں کے اتباع میں خان کے لقب سے ملقب تھے۔ میروانیوں میں میر احمد پہلا حکمران تھا جس نے اپنی حکومت کو وسعت دینے کی طرف بھرپور توجہ دی۔ میر عبداللہ خان نے بلوچستان کے طول و عرض اور اس سے باہر بھی اپنے دور اقتدار میں حملوں کا جو لامتناہی سلسلہ شروع کیا اس سے فتوحات کا ایک بڑا دروازہ کھل گیا۔ میر نصیر خان کی حکمت عملی اور فوجی طاقت کی وجہ سے حکومت کو اتنی وسعت حاصل ہوگئی کہ اس کا دائرہ ان تمام علاقوں تک پھیل گیا جہاں بلوچ کثیر تعداد میں آباد تھے۔ گویا میر احمد نے جو بیڑا اٹھایا تھا۔ میر نصیر خان اول نے اس کو پورا کر دیا۔

میروانیوں کو اپنی حکومت کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے ملک کے بعض مقتدر قبائل کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت پڑی تھی۔ اس بنا پر حکومت کے ابتدائی دستور میں ایک زبردست تبدیلی واقع ہوئی۔ حکومت

کی بنیاد نظام قوم داری پر رکھی گئی ۔ اس تبدیلی کی وجہ سے نظام حکومت میں قبائل کو بھرپور نمائندگی حاصل ہو گئی ۔حکومت میں قبائل کی نمائندگی ان کے موروثی سرکردے ہی کیا کرتے تھے جو عموماً سردار کہلاتے تھے قبائلی سرداروں کے علاوہ علاقائی سردار بھی نظام قوم داری کے رکن بن گئے ۔یہ سردار خاران لسبیلہ اور مکران کے صوبوں سے تعلق رکھتے تھے ان قبائلی اور علاقائی سرداروں کا فرض یہ تھا کہ وہ خان کو ضرورت پڑنے پر ایک معین تعداد میں لشکر مہیا کرنے کے پابند تھے ۔یہ لشکر قبائلی سردار اپنے اپنے قبیلوں اور علاقائی سردار اپنے اپنے علاقوں سے مہیا کرتے تھے ۔ان خدمات کے صلے میں ان کو خان کے دربار میں بعض مراعات کے علاوہ ان کے اپنے علاقے اور خصوصاً کچھی میں جاگیریں عطا کی گئیں تھیں جو عموماً قبائل کی مشترکہ ملکیت تصور کی جاتی تھیں جن سے یہ لشکر مہیا کئے جاتے تھے ۔یہ جاگیر مالیہ سے مستثنیٰ تھیں ۔قلات میں ان سرداروں کی موجودگی کے دوران ان کے قیام و طعام کے علاوہ جو خام راشن کی صورت میں دیا جاتا تھا ان کے گھوڑوں اور مہاریوں کے لئے چارہ اور دانہ کا انتظام خان کی طرف سے کیا جاتا تھا ۔دربار قلات میں توشہ خانہ اسی مقصد کے لئے قائم کیا گیا تھا ۔

اگرچہ علاقائی سردار فوجی خدمات سے مستثنیٰ نہیں تھے لیکن اس کا دارومدار زیادہ تر سراوان اور جھالاوان کے قبائلی سرداروں پر تھا ۔یہ لشکر تین دستوں پر مشتمل تھا ۔پہلا دستہ خان کا اپنا دستہ تھا ۔خان کے

اپنے قبیلہ میروانی اور اس کی شاخوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ اس کا سرکردہ بھی خود خان ہوتا تھا اور خان اپنی بالادستی اور اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے اس دستہ سے کام لیتا تھا۔

دوسرا دستہ سراوان کے قبائل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی کل نفری ۴۸۰۰ افراد پر مشتمل تھی اور اس کا سرکردہ سردار رئیسانی ہوا کرتا تھا۔ اس کی نفری ہر قبیلہ کی مردم شماری کے تناسب سے معین کی گئی تھی۔

تیسرا دستہ جھالاوان کے قبائل سے تعلق رکھتا تھا اس کی کل نفری ۵۲۰۰ افراد پر مشتمل تھی۔ اس کی نفری بھی ہر قبیلہ کی کل تعداد نفری کے تناسب سے تقسیم کی گئی تھی اس کا سرکردہ سردار زرک زئی ہوتا تھا۔

ان کے علاوہ ایک اور دستہ بھی تھا جو محافظ دستہ کہلاتا تھا اس کی کل نفری ۵۰ افراد پر مشتمل تھی۔ ہر فرد کے لئے ایک گھوڑا رکھنا لازمی تھا۔ یہ دستہ دہواروں سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی نفری تبدیل ہوتی رہتی تھی۔

دستہ خاص، دستہ سراوان اور دستہ جھالاوان کا بارہواں حصہ مستقل طور پر تعینات میں رکھا جاتا تھا اور اس کی نفری بھی تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ تمام دستوں کا یہ بارہواں حصہ دستہ سان کے نام سے موسوم تھا۔ دستہ محافظ دستہ سان کی خوراک اور ان کی سواری کے جانوروں کے چارہ اور دانہ کا انتظام خان کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ محافظ دستے

کے گھوڑوں کے لئے نال بھی سرکاری خرچ پر مہیا کئے جاتے تھے۔

باستثنائے ان اراضیات جو کچھی کے بلوچ قبائل کے سرداروں کو جاگیر کے طور پر دی گئی تھیں۔ کچھی کی تمام سیلابہ اراضیات مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم کی گئی تھیں۔

۱۔ پہلا حصہ ان اراضیات پر مشتمل تھا جو کچھی کی مقامی جٹ آبادی کی ملکیت تھیں۔ اور خان ان سے مالیہ وصول کرتا تھا۔

۲۔ دوسرا حصہ ان اراضیات پر مشتمل تھا جو خان کی سرکاری ملکیت شمار کی جاتی تھیں۔

۳۔ باقی دو حصوں کی اراضیات سراوان اور جھالاوان کے ان قبائل کو بطور جاگیر دی گئی تھیں جو خان کو اپنی مردم شماری کے تناسب سے لشکر مہیا کرتے تھے۔

انگریزوں نے اپنے مخصوص شاہی مفادات کے پیش نظر بلوچ نظام قوم داری کو بلوچ کانفیڈریسی کا نام دیا تھا۔ کنفیڈریسی کی بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کا کوئی رکن جب بھی چاہے تو وہ کنفیڈریسی سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔ انگریزوں کی منشا بھی یہی تھی کہ ملک کو کمزور کرنے کے لئے علیحدگی پسندی کے رجحانات کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دور اقتدار میں بلوچستان کو جو ایک جغرافیائی اکائی ہے نہ صرف مختلف قسم اور نوعیت کے انتظامی حصوں میں تقسیم کر دیا۔ بلکہ نظام قوم داری کے مستقل اراکین کے علاقوں کو بھی علیحدہ کر کے اپنے ماتحت مقامی ریاستوں

کی شکل دے دی. لیکن حقیقت یہ ہے کہ خان کی حکومت جس کی بنیاد نظام قوم داری پر رکھی ہوئی تھی. مختلف لسانی طبقوں پرمشتمل ایک مخلوط وحدانی حکومت تھی. دستور قوم داری کے تحت سربراہ حکومت یعنی خان کے اختیارات محدود تھے. حکومت کی سیاسی پالیسیوں پر قبائل کے موروثی نمائندے اثر انداز ہوتے تھے. ان قبائلی اور علاقائی سرداروں کی مجموعی طور پر حیثیت ایک سینیٹ یا ایوان بالا کی تھی. جس کے اراکین کے مشورے سے حکومت کا کاروبار چلایا جاتا تھا. باقاعدہ فوج رکھنے کی ضرورت اس وجہ سے نہیں تھی کہ ضرورت پڑنے پر لشکر مہیا کرنے کی ذمہ داری نظام قوم داری کے مستقل اراکین پر عائد ہوتی تھی. لیکن حکومت کی مالی پالیسیوں پر ان کو چنداں دخل حاصل نہیں تھا. اور انتظام حکومت میں بھی ان کو براہِ راست دخل حاصل نہیں تھا. انتظام حکومت کی ذمہ داری وزارت پر عائد ہوتی تھی دستور کے مطابق وزارت پر ایک دہوار خاندان کا فرد فائز رہتا تھا. اور اس کا عہدہ بھی سربراہ حکومت کی طرح موروثی تھا.

خان کے نظام حکومت میں قبائل کے علاوہ اہلِ زراعت اہل حرفہ اہلِ تجارت کو بھی نمائندگی حاصل تھی. ان طبقوں کے سرکردے جو ارباب ملک اور رئیس کہلاتے تھے ان طبقوں کی نمائندگی کرتے تھے افغان آبادی کی نمائندگی جس کا شمار اہلِ زراعت طبقہ میں ہوتا تھا. ارباب کاسی کرتا تھا. اہلِ تجارت طبقہ زیادہ تر اہلِ ہنود پر مشتمل تھا. اور ان کے موروثی نمائندوں کو بھی دوسرے طبقوں کی مانند خان کے دربار میں باقاعدہ

نشست حاصل تھی۔ لیکن قبائلی و علاقائی سرداروں اور موخر الذکر طبقوں کے نمائندوں کے درمیان بنیادی فرق یہ تھا کہ ان موخرالذکر طبقوں کے نمائندے حکومت کی مالی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ زراعت تجارت کو بڑی وقعت حاصل تھی۔ ان معاملات میں ان کے مشوروں کو جو زیادہ تر تجربہ پر مبنی ہوتے تھے۔ عموماً شرف قبولیت حاصل ہوتا تھا۔

ان طبقوں کے علاوہ ایک اور طبقہ بھی تھا جس کو نظام حکومت میں نمائندگی حاصل تھی۔ یہ طبقہ اہل سادات کا تھا۔ اس طبقہ کا سب سے بڑا فرض منصبی یہ تھا کہ اس کے مقتدر اراکین اختلافات کی صورت میں خان اور اس کے قبائلی سرداروں اور دوسرے مقتدر افراد کے درمیان دائمی طور پر مصالحت کنندہ کا کردار ادا کرتے تھے۔ عموماً مصالحت اور تصفیہ کی غرض سے اہم سیاسی امور میں فریقین کے درمیان گفتگو اسی طبقہ کے نمائندوں اور دوسرے معزز افراد کے توسط سے ہوتی تھی۔ اس طرح اس طبقے کے نمائندے ملک کے سیاسی اور سماجی معاملات میں ایک بڑا کردار ادا کرتے تھے۔ اس کردار کی بنا پر ان کو قبائل اور حکومت میں زبردست اثر ورسوخ حاصل تھا۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں بلوچ نظام قوم داری کی ترکیب حسب ذیل تھی۔

۱۔ خان حکومت کا سربراہ ہوتا تھا۔ اس کی حیثیت موروثی تھی۔ اس کے اختیارات لامحدود نہیں تھے۔

۲۔ قبائلی اور علاقائی سردار حکومت کی سیاسی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ ان کی حیثیت موروثی تھی۔ وہ نظام حکومت میں قبائل کی نمائندگی کرتے تھے۔ ملک کا دفاع خان اور سرداروں کی مشترک ذمہ داری تھی

۳۔ وزیر اعظم انتظامیہ کا سربراہ تھا۔ حکومت کے وہ تمام شعبے جن کا تعلق نظم و نسق، عدلیہ اور ریونیو وغیرہ سے تھا وزیر اعظم کے ماتحت ہوتے تھے۔ وزیر اعظم سربراہ نظام قوم داری یعنی خان کے سامنے جواب دہ تھا۔

۴۔ حکومت کی آمدنی کا انحصار اہل زراعت اہل حرفہ اور اہل تجارت طبقہ پر تھا۔

ملک میں جو انتظامی ڈھانچہ قائم کیا گیا تھا۔ اس کی مشینری کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں تھی۔ انتظامی لحاظ سے تمام ملک کئی نیابتوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ متعلقہ نیابت کا سب سے بڑا قصبہ اس کا ہیڈ کوارٹر ہوتا تھا۔ انتظامی اور مالیات کی سہولتوں کے پیش نظر ہر ایک نیابت کو کئی حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر ایک نیابت کا عملہ ایک نائب ایک جانشین، ایک داروغہ، چند پٹواریوں اور کئی چوہداروں پر مشتمل تھا۔ جن کو وزیر اعظم، خان کی منظوری سے مقرر کرتا تھا۔ نظم و نسق اور امن عامہ کا ذمہ دار افسر نائب ہوتا تھا۔ مالیات کا افسر جانشین تھا اور پٹواری اسی کے ماتحت تھے۔ داروغہ چوہداروں کا افسر تھا۔

قیامِ امن اور مالیہ کی وصولی کا کام انہی چوبداروں سے لیا جاتا تھا چونکہ سارے ملک میں شریعت محمدی کا نفاذ تھا۔ اسی لئے ہر ایک نیابت کے ہیڈکوارٹر میں ایک قاضی بھی متعین رہتا تھا جو عام لوگوں کے مقدمات کی سماعت کر کے ان پر شرعی قانون کے مطابق فیصلہ صادر کرتا تھا۔ قاضیوں کے فیصلہ کے خلاف اپیلوں کی سماعت وزیراعظم کرتا تھا۔ اور وزیراعظم کے فیصلوں کے خلاف اپیل براہِ راست خان کو کی جاتی تھی۔ فقط ان مقدمات کے قبائلی سرداروں کے توسط سے فیصلے کیے جاتے تھے۔ جن کی نوعیت قبائلی ہوتی تھی اور جن کا تعلق رسم و رواج سے ہوتا تھا۔ اس قسم کے مقدمات کی اپیلوں کی سماعت خود خان کیا کرتا تھا۔ خان کے دربار کا افسرِ اعلیٰ شاغاسی کہلاتا تھا۔ دربار کے تمام کاروبار اور اس کا اہتمام اسی سے متعلق ہوتے تھے۔ سراوان، جھالاوان کچھی اور مکران کے صوبہ جات مالیہ وہ خیال کئے جاتے تھے۔ جہاں انتظام حکومت کو خوش اسلوبی سے چلانے کی خاطر نیابتیں قائم کی گئی تھیں لیکن خاران اور لسبیلہ کے صوبہ جات کا انتظام براہِ راست علاقائی سرداروں کے ہاتھ میں تھا۔ خاران کی سالم آمدنی متعلقہ علاقائی سردار حاصل کرتا تھا۔ لیکن مکران اور لسبیلہ کی نصف آمدنی متعلقہ گچکی سردار اور جام لسبیلہ حاصل کرتے تھے اور نصف آمدنی خان کے خزانے میں چلی جاتی تھی۔

بلوچ، نظام قوم داری میں وزارت کا عہدہ بہت ہی اہم خیال

کیا جاتا تھا۔ انتظامیہ کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے انتظام حکومت کو خوش اسلوبی سے چلانا وزیر اعظم کی سب سے بڑی ذمہ داری تھی۔ مالیات کے افسر اعلیٰ ہونے کی وجہ سے اس کا عہدہ مستوفی الممالک کے نام سے بھی موسوم تھا۔ انتظامی امور کے علاوہ فوجی امور میں بھی اسے وسیع اختیارات حاصل تھے اور حکومت کی ساری مشینری اس کی مرضی پر چلتی تھی۔ اندرونی اور بیرونی مہمات میں وہ خان کے لشکر میں کماندار اعلیٰ کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ اندرونی شورشوں اور بغاوتوں کو فرو کرنے کے لئے خان کی طرف سے جو دستے بھیجے جاتے تھے وہ بھی اسی کی ماتحتی اور نگرانی میں باغیوں کے خلاف کارروائی کرتے تھے خوانین قلات کی تاریخ میں شاید ہی کوئی اندرونی یا بیرونی مہم ایسی ہو گی جس میں وزیر اعظم نے شرکت نہ کی ہو۔ بیرونی ممالک کے ساتھ تعلقات اسی کی وساطت سے قائم کئے جاتے تھے۔ بیرونی ممالک کے ساتھ گفتگو بھی اسی کی وساطت سے ہوتی تھی اور وہ ان تمام قسم کے معاملات میں دخل دینے کا اہل تھا جن کا تعلق ملک کے اندرونی اور بیرونی امور سے تھا۔ ملک کی داخلی اور خارجی پالیسیوں کو جن کے اوپر ملک کی ترقی، خوشحالی، سالمیت اور استحکام کا دارومدار تھا۔ صحیح بنیادوں پر مرتب کرکے حالات کے مطابق ان پالیسیوں پر نظر ثانی کرنا اس کی سب سے بڑی ذمہ داری تھی ان گوناگوں فرائض کی بنا پر اس کے اختیارات کا دائرہ بڑا وسیع ہوتا تھا۔ ان تمام فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے

اعلیٰ قابلیت، معاملہ فہمی، حکمت عملی، علمی استعداد اور دور اندیشی کی ضرورت تھی۔ ان ذمہ داریوں سے خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا ہر شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔

خوش قسمتی سے دہوار خاندان کے جو ممتاز افراد وزارت کے اس عہدے پر مامور تھے، ان میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو اس عہدے کے لئے ضروری ہو سکتی تھیں۔ اس خاندان کا تعلق دہواروں کے ملازئی طائفہ سے تھا۔ اس زمانہ میں ملا کی اصطلاح تعلیم یافتہ اشخاص کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ اس خاندان کے افراد اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ تھے۔

اسی بنا پر ان کا

طائفہ بھی ملازئی کے نام سے موسوم تھا۔ اس خاندان کے اراکین اخوند کے لقب سے ملقب تھے۔ اخوند کے اصطلاحی معنی استاد کے ہیں۔ اس خاندان کے افراد عالم و فاضل ہونے کے علاوہ اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کے مالک تھے اور بڑے ہی باوقار، شریف النفس، حلیم الطبع پرہیزگار اور عبادت گزار واقع ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے ملک میں ان کی بیحد عزت کی جاتی تھی اور اسی بنا پر اس خاندان کے معزز افراد جو بڑے اعلیٰ پایہ کے شارع بھی تھے۔ خان کے حرم میں بلا روک ٹوک جا کر بیگمات کو مذہبی تعلیم اور درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا کام بھی ان کے سپرد تھا۔ خورد سال خوانین کے سرپراہ اور اتالیق کا فرض بھی یہی معزز افراد سرانجام دیتے تھے۔ قلات شہر میں ان کا محلہ شیرز کے نام سے

موسوم تھا۔ اور اسی محلے کے نام ہی سے ان کی اصلیت پر روشنی پڑتی ہے۔

بلوچ نظام قوم داری میں قدیم ایرانی منصبداری کی ایک جھلک نظر آتی ہے جو ایران کے ہخامنشی، اشکانی اور ساسانی شہنشاہوں کے عہدِ حکومت میں ایک عرصہ دراز تک ایران میں رائج تھا۔ ایران کی حکومت ابتدا میں فارس کے صوبہ تک محدود تھی اور بمرورِ زمانہ رفتہ رفتہ اسے اس حد تک تدریج وسعت حاصل ہو گئی کہ وہ دریائے نیل سے لے کر دریائے سندھ اور اس سے بھی پار کے علاقوں تک ایشیا کے ایک بڑے حصے پر پھیل گئی۔ خوانین کے قائم کردہ نظام حکومت کو ایران قدیم کے بھاری بھرکم اور پیچیدہ نظامِ حکومت سے مشابہت دینا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ لیکن اس کے باوجود بلوچستان میں جو نظام حکومت صدیوں تک قائم تھا اس میں ایرانی نظام منصبداری کی بہت سی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ مثلاً ایرانی حکومت کی گورنری صوبوں، باجگذار ریاستوں اور شاہاں ماتحت پر مشتمل ایک وفاق تھی۔ گورنری صوبوں پر شہنشاہ کی جانب سے مقرر کردہ گورنر حکومت کرتے تھے۔ ان صوبوں کی مالیہ آمدنی مرکزی حکومت کے خزانے میں چلی جاتی تھی لیکن باجگذار ریاستوں اور شاہاں ماتحت میں سے بعض ایسے تھے جن کی آمدنی کا نصف حصہ ماتحت حکمران خود لیتے تھے اور بقایا نصف حصہ شہنشاہ کو ادا کر دیا جاتا تھا اور بعض ایسے تھے جن کے موروثی حکمران کسانوں سے جو مالیہ

وصول کرتے تھے وہ سارے کا سارا خود ہی لے لیتے تھے اور ان موخرالذکر ریاستوں سے مرکزی حکومت کو کچھ بھی ادا نہیں کیا جاتا تھا ان باجگذار ریاستوں اور شاہان ماتحت کا فرض منصبی یہ تھا کہ وہ جنگ کی صورت میں شہنشاہ کو فوجی خدمت سرانجام دینے کے لئے ایک معین تعداد میں لشکر اور سپاہی مہیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ایران قدیم میں سات ممتاز خاندان یا قبیلے تھے۔ یہ خاندان جن میں ایک خاندان خود شہنشاہ کا تھا ملک میں برتر ین رتبہ رکھتے تھے۔ ان میں تین خاندان تو بہت مقتدر خیال کئے جاتے تھے ایک سورین دوسرا قارین، اور تیسرا اسپہبد کا خاندان۔ ان سات خاندانوں کا تعلق ملک کے مختلف حصوں سے تھا۔ ان خاندانوں کے مقتدر افراد کو ملک کے مختلف حصوں میں جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ جو مالیہ سے مستثنیٰ تھیں۔ اعلیٰ فوجی اور انتظامی عہدے انہی خاندانوں کے مقتدر افراد کے لئے وقف تھے۔ انہی خاندانوں کے سرکردہ افراد حکومت کی سیاسی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ اگر شہنشاہ اعلیٰ قابلیت کا مالک تھا تو وہ ان امرا کو قابو میں رکھ سکتا تھا۔ اگر وہ کمزور تھا تو یہ امرا اپنی تخریب کارانہ سرگرمیوں کی وجہ سے خود شہنشاہ کے لئے خطرہ کا موجب بنتے تھے۔ ان خاندانوں میں سے خاندان سورین کے افراد شہنشاہ کے سر پر اس کی تاج پوشی کے موقعہ پر تاج رکھنے کا حق رکھتے تھے۔

ایران قدیم کے نظام حکومت کا ڈھانچہ ایک عظیم اور پیچیدہ ڈھانچہ تھا۔ خوانین قلات کے نظام حکومت کا مقابلہ اس سے تو نہیں ہو سکتا

لیکن دونوں میں ان کی اصل اور ارتقاء کی بنا پر یکساں قسم کی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ ایران کی مانند قلات بھی ابتداء میں صرف ایک محدود علاقہ تک محدود تھا۔ ایران کے شہنشاہوں کی مانند خوانین قلات نے بھی اپنی حکومت کو رفتہ رفتہ بتدریج وسعت دی۔ ایران کے گورنری صوبوں، شاہان ماتحت اور باجگذار مقامی موروثی حکمرانوں کی طرح سراوان جھالاوان اور کچھی کے صوبوں کی ساری کی ساری آمدنی خوانین قلات کے خزانے میں چلی جاتی تھی۔ لیکن خاران، مکران اور لسبیلہ کی صورتحال ان کی آمدنیوں کے معاملے میں کچھ مختلف تھی۔ خاران کی سالم آمدنی متعلقہ علاقائی سردار ہی لے لیتا تھا۔ اور اس کا کوئی حصہ خان کو ادا نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس مکران اور لسبیلہ کی آمدنی کا نصف حصہ متعلقہ علاقائی سردار لے لیتے تھے اور نصف حصہ خان کے خزانے میں منتقل کیا جاتا تھا۔

ایران کے سات ممتاز خاندانوں کی مانند بلوچستان میں بھی چند ممتاز اور مقتدر خاندان تھے ان میں سے ایک خاندان خود خان کا تھا ان خاندانوں کا تعلق بھی ملک کے مختلف حصوں سے تھا۔ ان ممتاز خاندانوں کو ملک کے مختلف حصوں میں جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ جو مالیہ سے مستثنیٰ تھیں اور ان خاندانوں کا سب سے اہم فرض یہ تھا کہ وہ ضرورت پڑنے پر خان کو ایک معین تعداد میں لشکر مہیا کرتے تھے اور حکومت کی سیاسی پالیسیوں پر یہی لوگ اثر انداز ہوتے تھے۔ انہی ممتاز خاندانوں میں سے

ایک کو خان کی مسند نشینی کے موقعہ پر خان کے سر پر دستار رکھنے کا حق حاصل تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اگر خان نصیر خان اول اور نصیر خان ثانی کی مانند اعلیٰ قابلیت کا مالک تھا۔ تو ان خاندانوں کے افراد قابو میں رہتے تھے اور اگر خان کمزور اور غیر دانشمند تھا تو یہ لوگ تخریب کارانہ سرگرمیوں کے مرتکب ہوتے تھے۔

ایران قدیم میں مرکزی حکومت کا نظم و نسق وزیر اعظم کے ماتحت ہوتا تھا جو ہزار بد کہلاتا تھا۔ اس کا عہدہ موروثی تھا اور اہل زراعت طبقہ سے چن لیا جاتا تھا اور وہ ملک کے داخلی خارجی اور فوجی امور میں بڑے وسیع اختیارات رکھتا تھا اور شاہی افواج کا کماندار اعلیٰ بھی تھا۔ خوانین قلات کے عہد میں وزارت کی کیفیت بھی یہی تھی۔ وزیر اعظم وسیع اختیارات کا مالک تھا اور اہل زراعت طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔

ایران بعہد ساسانیاں کا مصنف کرسٹن ایرانِ قدیم میں اہل زراعت طبقہ کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ایران قدیم کے نظامِ حکومت کی مشین میں کسان بمنزلہ لیسے پہیوں کے تھے جن کے بغیر اس کا چلنا دشوار تھا اگرچہ بڑے بڑے تاریخی واقعات میں وہ کہیں نظر نہیں آتے تھے تاہم حکومت کے نظام کی عمارت میں وہ ایسی مستحکم بنیاد کی حیثیت رکھتے تھے جس کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ ان کسانوں کی طاقت ان کے موروثی مقامی

اختیارات میں مرکوز تھی۔ کدخدایان، دہقانان دریش سفیدان
اس طبقہ زراعت میں بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے تھے۔
فی الحقیقت بلوچ نظام قوم داری میں بھی طبقہ اہلِ زراعت کی
افادیت کی یہی کیفیت تھی۔ اسی وجہ سے اہلِ زراعت کی خوشحالی اور
تحفظ خان کی حکومت کی مالی پالیسیوں کا بنیادی مقصد تھا۔ یہ حقیقت بجائے
خود درست ہے کہ خان کی حکومت کو بعض قبائل کے تعاون اور اشتراکِ
عمل سے وسعت اور سیاسی استحکام حاصل ہوا لیکن اہلِ زراعت طبقہ نے
اس کے مالی استحکام میں ایک بڑا کردار ادا کیا۔ حکومت کی آمدنی
کا ایک بڑا حصہ اسی اہلِ زراعت طبقہ سے حاصل ہوتا تھا۔ نظام قوم داری
کی پوری تاریخ میں ایسا موقعہ نہیں آیا کہ آمدنی کے معاملے میں حکومت
کو کوئی پریشانی لاحق ہوئی تھی۔

ایران قدیم کے نظام منصبداری اور مابعد کے عہد کے بلوچ
نظام قوم داری میں جو مشابہت پائی جاتی تھی، اس کی وجہ غالباً یہ تھی
کہ دونوں عہد کے ایرانی اور بلوچی معاشرے میں بھی کوئی بڑا فرق موجود
نہیں تھا۔ اس زمانہ میں اہلِ ایران کے معاشرے کی سب سے بڑی
خصوصیت نظام خانوادگی تھی۔ ابتدا میں بلحاظ ارضی اس کی تقسیم حسب
ذیل تھی۔

۱۔ نمان (خاندان) ۲۔ زنتو (قبیلہ) دہیو (ولایت) لیکن
بمرورِ زمانہ اس میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی اور اس کی صورت یہ ہوگئی۔

۱۔ نمان (خاندان۔ ۲۔ ولیس (دہ) ۳۔ زنتو (قبیلہ) ۴۔ وہیو (ولایت) یہ تقسیم ایرانی نظامِ خانوادگی میں حکام چارگانہ کے نام سے موسوم تھی۔ جس کا مطلب تھا:۔

۱۔ حاکم خانہ ۲۔ حاکم دہ ۔ ۳۔ حاکم قبیلہ ۔ ۴۔ حاکم ولایت
اس ایرانی نظام خانوادگی کے مقابلے میں بلوچ معاشرے کی کیفیت کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ ابتداء میں غالباً ایرانی نظام خانوادگی کی مانند اس کی صورت یہ تھی۔

۱۔ متن (خاندان) ۲۔ قوم (قبیلہ) ۳۔ استمان (عوام) لیکن بلوچستان میں حکومت کے قیام کی وجہ سے بلوچ معاشرے میں اہلِ زراعت طبقہ کا پیوند لگ گیا اور اس کی یہ صورت ہو گئی۔

۱۔ متن (خاندان) ۲۔ ڈیہہ (دہ) ۳۔ قوم (قبیلہ) ۴۔ استمان (عوام) اور یہ نظامِ خانوادگی ایرانی نظام خانوادگی کے حکام چارگانہ سے ایک بڑی حد تک مطابق تھا۔ جس کے تحت حاکم متن۔ حاکم دہ۔ حاکم قوم اور حاکم استمان کا تصور موجود تھا۔ اور ایک منظم حکومت کے قیام کے بعد حاکم استمان نے حاکم ملک کی حیثیت اختیار کر لی۔

اوستائے جدید میں ایرانی سوسائٹی کے تین طبقوں کا ذکر ملتا ہے جو اس کی نہایت ترقی یافتہ شکل تھی۔

۱۔ علمائے مذہب (آذروان) ۲۔ سپاہی (اذا ایشتر) ۳۔ اہلِ زراعت (واستریوشوئنت) اور فقط یاسنا میں ایک چوتھے

طبقہ کا ذکر ملتا ہے یعنی اہلِ حرفہ (ہوئتی) جو درحقیقت اہلِ زراعت ہی کا جزو تھا۔ بلوچ معاشرے کی ترقی یافتہ صورت میں علماء نے مذہب کا تصور مفقود ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے کا بلوچ معاشرہ ایک سیکولر معاشرہ تھا۔ لیکن معاشرے کی اس سیکولر حیثیت کے باوجود اہل سادات کا طبقہ اس کے نعم البدل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جو سوسائٹی میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اسی طرح سپاہی کے لئے لشکر اہل زراعت کے لئے دہقان اور اہلِ حرفہ کے لئے کاریگر بلوچ معاشرے کے بعینہٖ وہی طبقے تھے۔ جن کا ذکر ایرانی سوسائٹی کے اجزا کے زمرے میں اوستائے جدید اور یاسا میں ملتا ہے۔ اس معاشرے میں دہواسے مراد بھی اہل زراعت طبقہ تھا۔

ایران کے معاشی اور اقتصادی حالات میں بمرور زمانہ تبدیلی واقع ہوئی۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے ایرانی سوسائٹی میں اور طبقے نمودار ہو گئے۔ ساسانی عہد کے ایک کتبہ سے ذیل طبقوں کا ذکر ملتا ہے:۔

شہرداران۔ واسپہران وزرگان و آزادگان اس مابعد کے بلوچ سوسائٹی میں بعینہٖ اسی طرز کے طبقے نمودار ہو گئے تھے۔ چنانچہ خوانین قلات کی بعض دستاویزات میں بعینہٖ اس قسم کے طبقوں کا ذکر ملتا ہے۔

شہزادگان ۔ سرداران ۔ معتبرین و معززین

قدیم ایرانی زبان میں شہرداران کا لفظ شاہی خاندان کے افراد کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ واسپہران میں امرا اور منصب دار شامل تھے۔ طبقہ سوئم وچہارم میں متوسط طبقے کے امراء اور شرفا شامل تھے جو زیادہ تر زراعت، حرفت اور تجارت کے پیشوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بلوچ معاشرے کے وسطی دور میں بھی بعینہٖ یہی طبقے نمودار ہوگئے تھے۔ شہرداران اور سرداران کے الفاظ میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے اسی طرح تمن بلوچی زبان میں شان کا نعم البدل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایران قدیم اور بلوچ نظام قوم داری کے دور کے معاشرے میں ایک حد تک جو مشابہت پائی جاتی تھی۔ اس قسم کی مشابہت کا دونوں عہد کے نظام ہائے حکومت میں پایا جانا کچھ زیادہ تعجب انگیز اور بعید از قیاس نہیں ہے۔ درحقیقت کسی ملک کا نظام حکومت اس ملک کے معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

زراعت

بلوچ نظام قوم داری کے دوران زراعت کو زبردست اہمیت حاصل تھی کیونکہ حکومت کی آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ زراعت ہی سے مالیہ کی صورت میں حاصل ہوتا تھا۔ بلوچستان میں عموماً تین قسم کی اراضیات پائی جاتی تھیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ سرکاری اراضیات

یہ آبی اور سیلابہ دونوں قسم کی اراضیات پر مشتمل تھیں جو سرکار کی ملکیت تصور کی جاتی تھیں۔ تقریباً ہر ایک کاریز اور چشمہ جات میں ایک شبانہ بمع اراضی سرکار کے لئے مخصوص تھی۔ ان کی پیداوار سواری اور باربرداری یعنی گھوڑوں، گدھوں اور اونٹوں کے گلوں کے دانہ اور چارہ کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ بیرونی اور داخلی مہمات کے لئے ان جانوروں کے گلے رکھنا انتظامی اعتبار سے بڑا ضروری تھا۔

۲۔ جاگیریں

یہ اراضیات جو آبی اور سیلابہ اراضیات پر مشتمل ہوتی تھیں ملک کے صاحبِ رسوخ اور مقتدر افراد کو جن میں زیادہ تر قبائلی سردار اور ان کے لواحقین شامل تھے، جنگی خدمات کے عوض سرکار کی طرف سے عطا کی گئی تھیں۔ اس قسم کی اراضیات جو انعامی اراضیات کے نام سے موسوم تھیں مالیہ سے مستثنیٰ ہوتی تھیں اور ان کی سالم پیداوار (حقِ مالکانہ) جاگیردار اور اس کے لواحقین حاصل کرتے تھے۔ ان کا رقبہ کچھ زیادہ وسیع نہیں تھا۔ فقط کچھی کی سیلابہ اراضیات میں جاگیرداروں کے وسیع رقبے تھے جو بیرونی مہمات میں شامل ہونے والے قبائل کی مشترکہ ملکیت تھیں اور یہ صورتِ حال بدستور موجود ہے۔

۳ - زمینداریاں

سرکاری اور انعامی اراضیات کے علاوہ باقی تمام اراضیات جو آبی اور سیلابہ اراضیات پر مشتمل تھیں۔ ان کا شمار زمینداریوں میں ہوتا تھا اس قسم کی آبی اور سیلابہ اراضیات مقامی زمینداروں کی ملکیت تصور ہوتی تھیں۔ آبی اراضیات سے عموماً کل پیداوار کا چھٹا حصہ اور خشکابہ اراضیات سے کل پیداوار کا دسواں حصہ بطور مالیہ وصول کئے جاتا تھا اور یہ اراضیات مالیہ دہ کہلاتی تھیں۔ فقط مکران میں کل پیداوار کا دسواں حصہ بطور عشر وصول کیا جاتا تھا۔ ساحل مکران کی مچھلی کی پیداوار پر اس کا دسواں حصہ وصول کر کے نیلام کی صورت میں فروخت کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بعض چشمہ جات اور کاریزات سے جو گندم اور نقدی کی ایک مخصوص مقدار بطور جمع لبت سالانہ وصول کی جاتی تھی جو رزی کلنگ کے نام سے موسوم تھی۔ سب سے اہم پیداوار جو گندم، جوار، مکئی، پالیزات (تربوز خربوز) کی تھی۔ آبی اراضیات میں ریحان کی کاشت بھی ہوتی تھی جو چمڑہ رنگنے کے کام آتا تھا۔ جانوروں کے چارہ کے لئے عموماً لوسن کا شت کی جاتی تھی۔ مختلف علاقوں میں ان کی آب و ہوا کی مناسبت سے مختلف قسم کے باغات بھی تھے جن میں توت، سیب، خربانی، م، ناشپاتی، انگور، آم، آلوچہ، انار، انجیر کے باغات اور نخلستان شامل تھے۔

صنعت و حرفت

اس سے پیشتر کے زمانہ میں بلوچستان میں کوئی بڑی صنعت نہیں تھی
اکثر بڑے بڑے قصبات میں مسگری کی صنعت بڑی اہمیت رکھتی
تھی۔ تانبہ، اور کانسی کے مختلف، اور ان گنت قسم کے برتن بڑے
پیمانے پر بنائے اور فروخت کئے جاتے تھے۔ زرگری بھی ایک
اہم پیشہ تھا۔ اسی طرح قفش دوزی اور چپلوں کی صنعت بھی اہمیت
رکھتی تھی۔ گھریلو دستکاریوں کے زمرے میں قالین بافی، نمدے
اونی دریوں، چمڑے کی صنعت اور چمڑے پر چکن کاری وغیرہ بڑی
اہمیت رکھتی تھیں۔ بعض علاقوں مثلاً کچھی اور مکران میں سوتی اور
اونی پارچہ بافی کا بھی رواج تھا۔

تجارت

بلوچستان کی تجارت زمانہ قدیم سے داخلی اور خارجی دونوں
نوعیت کی تھی۔ آمد و رفت کے وسائل کچھ اس قسم کے تھے کہ
ایک طرف ایران افغانستان اور وسط ایشیا کے ساتھ اور دوسری
طرف ہندوستان کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم تھے۔ نیز تجارت
کے معاملہ میں بری اور بحری دونوں وسائل استعمال کئے جاتے تھے
وسط ایشیا افغانستان اور ایران سے گھوڑے، خچر، گدھے، اونٹ،
قالین، اونی دریاں، پوستین، ریشم، اسلحہ، لنگیاں، کلاہ، قند و نباط
بلور کے برتن، فانوس، چینی کے برتن اور خشک میوہ جات درآمدات
کے اہم جزو تھے جبکہ سندھ، پنجاب اور ہندوستان کے بعض

دیگر صوبہ جات کو بھی اون، خشک میوہ جات، دوائی کے طور پر استعمال ہونے والی جڑی بوٹیاں اور گھوڑے برآمد کیئے جاتے تھے اور ان کے بدلے میں ہندوستان سے چاول، دھات، کپڑا، تیل اور دالیں درآمد کی جاتی تھیں۔ تجارت کلیتاً بابی افغانوں اور ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ مال تجارت کی نقل وحرکت کے لیئے اونٹ اور گدھے استعمال کیئے جاتے تھے اور ان تاجروں کے لین دین کا دائرہ وسط ایشیا تک پھیلا ہوا تھا۔ تجارتی کاروان پنجاب کے لیئے درہ گومل اور سندھ کے لیئے ہرنائی۔ بولان اور مولا کا راستہ اختیار کرتے تھے ایک دوسرا راستہ قلات اور بیلہ سے ہوکر سونمیانی تک نکل جاتا تھا۔ اور بحری نوعیت کے تجارتی مال کی نقل وحرکت کے لیئے عموماً تجارتی کاروان یہی راستہ اختیار کرتے تھے خصوصاً گھوڑے سونمیانی کی بندرگاہ سے کشتیوں کے ذریعہ بمبئی اور کراچی وغیرہ کی بندرگاہوں میں بھیجے جاتے تھے اور یہ گھوڑے ہندوستانی راجواڑوں میں اچھی قیمت پر فروخت ہوتے تھے اور مقامی راجے مہاراجے ان گھوڑوں کو اپنے اپنے رسالے کے لیئے خریدتے تھے۔ پسنی گوادر اور اورماڑہ کی بندرگاہیں بھی تجارت کے مرکز تھے ان بندرگاہوں سے زیادہ تر خشک مچھلی سیلون اور ہانگ کانگ کے لئے کشتیوں کے ذریعے بھیجی جاتی تھی۔ جبکہ انہی بندرگاہوں سے مزری، چٹائیاں اور کھجور بمبئی اور کراچی کے لیئے برآمد کی جاتی تھیں نیز ان بندرگاہوں سے

مزری اور چٹائیاں کشتیوں کے ذریعے خلیج فارس عربیہ اور افریقہ کے مشرقی ساحل تک برآمد کی جاتی تھیں ۔ نیز بری راستوں سے بھی مزری اور چٹائیاں ہندوستانی صوبوں میں برآمد کی جاتی تھیں ۔ اندرونِ ملک تقریباً تمام بڑے قصبات جن میں گنداوہ فتح پور ۔ نوشکی بھاگ، پنجگور اور تربت شامل تھے۔ کاروانی راستوں پر واقع ہونے کی وجہ سے تجارت کے مرکز تھے۔ خیال ہے کہ سالم تجارت کوئی ڈھائی کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی۔

دفتری زبان

بلوچ نظام قبیلداری کے دوران بلوچستان کی دفتری زبان فارسی تھی اور ساری خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی اور فرامین بھی فارسی زبان میں جاری کیے جاتے تھے جن پر خان کی مہر ثبت ہوتی تھی۔

ادبیات

بلوچستان کا دامن کسی زمانہ میں بھی علماء فضلا اور شعراء سے خالی نہیں رہا ہے. یہاں سینکڑوں شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے فارسی زبان میں طبع آزمائی کی. لیکن بیشتر کے دیوان امتدادِ زمانہ کی وجہ سے تلف ہو گئے. ذیل میں چیدہ چیدہ شعراء کے حالات اور ان کی شاعری کے نمونے قلمبند کیے جاتے ہیں. (بحوالہ انعام الحق کوثر. بلوچستان میں فارسی شاعری)

رابعہ خضداری

رابعہ خضداری کا خاندان ابو مسلم کے زمانہ میں یہاں وارد ہوا. وہ کعب کی بیٹی تھی. اس کا لقب زین العرب تھا. وہ ایک قادر الکلام شاعرہ تھی اور شعر گوئی میں ید طولیٰ رکھتی تھی. اور رودکی کی ہمعصر تھی. روایت ہے کہ اس کو اپنے ایک غلام بکتاش سے عشق ہو گیا تھا. اس کے بھائی حارث نے بکتاش کو کنویں میں ڈال دیا اور رابعہ کو گرم حمام میں بند کر کے اس کی رگ کٹوا دی اور اسے بند نہ کرایا اور گرم حمام کے دروازے کو اینٹوں سے بند کر دیا. رابعہ نے ایک کاسہ میں اپنا خون لیا اور اپنی انگلی خون میں ڈبو کر اپنے اشعار دیوار پر لکھے

تاآنکہ خون ختم ہوگیا اور وہ فوت ہوگئی۔ اسے سپردِ خاک کیا گیا۔

مولانا عطار فرماتے ہیں ؎

نگہ کردند بر دیوار آن روز
نوشتہ بود این شعر جگر سوز

نگارا بی تو چشمم چشمہ سار است
ہمہ رویم بخون دل نگار است

چو از دو چشم من دو جوئی داری
بگرما بہ مرا سر شوئی دادی

سہ رہ دارد جہان عشق اکنون
یکی آتش یکی اشک و یکی خون

کنون در آتش و در اشک و در خون
برفتم زین جہاں دل خستہ بیرون

مرا بی تو سر آمد زندگانی
منت رفتم تو جاویدان بمانی

بکتاش کسی طرح کنوئیں سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور رابعہ کے اندوہناک انجام کی خبر پاکر حارث کو قتل کر دیا اور اس کے بعد رابعہ کی قبر پر خنجر سے اپنا کام تمام کر لیا۔ اسے رابعہ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ عطار فرماتے ہیں ؎

بخودش صبر بے یار نگیانہ   بہ او پیوست و کوتاشد فسانہ

محمد عوفی لکھتا ہے کہ "رابعہ بنت کعب القزداری اگرچہ زن بود اما بر مردان بخندیدے فارسی، ہردو میدان و دالی ہردو بیان برنظم تازی قادر و در شعر فارسی بغایت ماہر و با غایت ذکاء خاطر وحدت طبع پیوستہ عشق باختے و شاید بازی کردے و او را مگس روئین" خواندندے بہ سبب این کہ شعر گفتہ بود ے

خبر دہند کہ بارید بر سر ایوب
ز آسمان ملخان و سر ہمہ زرین
اگر ببارد زرین ملخ براد از صبر
سزد کہ بارد بر من یکی "مگس روئین"

بکتاش سے ایک اتفاقی ملاقات کے دوران رابعہ نے یہ اشعار کہے تھے ے

باز عشقت اندر آور دم بہ بند
کوشش بسیار نامد سود مند
عشق دریائے کرانہ ناپدید
کے توان کردن شنا اے ہوشمند
عشق را خواہی کہ تا پایان بری
بس کہ بپسندید باید ناپسند
زشت باید دید انگارید خوب
زہر باید خورد و انگارید قند

تو نے کردم ندانستم ہمی

کز کشیدن تنگ تر گردد کمند

نمونہ کلام

مرا بعشق مہتّم کنی بہ حیل

چہ حجت آری پیش خدائے عزوجل

بعشقت اندر ہمے نیازم شد

بہ نیم اندر طاغی ہمی شوم بشل

نعیم بی تو نخواہم جحیم با تو رواست

کہ بی تو شکر زہراست با تو زہر عسل

زلبس گل کہ در باغ ماوی گرفت

چمن رنگ ارتنگ مانی گرفت

مگر چشم مجنون بابر اندر است

کہ گل رنگ رخسار لیلی گرفت

نمی ماند اندر عقیقین قدح

سرشکے کہ در لالہ ماوی گرفت

سر نرگس تازہ از زرد سیم

نشان سر تاج کسری گرفت

جو رهبان شد اندر لباس کبود
بنفشہ مگر دین ترسا گرفت

فشاند از سوسن و گل سیم و زر باد
زہی بادی کہ رحمت باد بر باد
برد از نقش آذر صد نشان آب
نمود سحر مانی صد اثر باد
مثال چشم آدم شد مگر ابر
دلیلِ لطف عیسیٰ شد مگر باد
برائے چشم ہر نا اہل گوئی
عروس باغ را شد جلوہ گر باد

قاضی نور گنجابوی

قاضی نور محمد کا شمار خان میر نصیر خان کے مصاحبوں میں ہوتا ہے۔ وہ قاضی عبداللہ عرف کلوڑا کے فرزند تھے۔ انہیں گنداوہ کا قاضی مقرر کیا گیا تھا۔ اور وہ خاندانی قاضی تھے۔ فرماتے ہیں ؎

ندانم جزیں از نسب واز حسب
کہ در گنجبرام قاضی از جد و اب

زر دے نسب نیز عباسیم
زفضل دہنر گنجہ را قاضیم

پدر پیشہ ام است قاضی گری
بہ قاضی گری ضم بدہ شاعری

من اوّل بہ گنجا بہ قاضی بدم
در اشغال آن امر راضی بدم

ان کی شاعرانہ صلاحیت مسلم ہے۔ وہ مجاہد بھی تھے اور علاقہ کچھی میں کسی مقام پر بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ تاریخ وفات اور پیدائش غیر معلوم ہیں۔ مثنوی میں ید طولیٰ رکھتے تھے جو اس کی شہرت کا باعث تھا۔ حضرت امام حسین کی شہادت کے بعد یزید کی حکمرانی قائم ہونے کی وجہ سے حلب میں بلوچوں کی حالت اور ان کی ہجرت کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

بہ شہر عرب نیز یک چند سال
بسر کردہ انداز غم و از ملال

کہ از ہجر وز فرقت آلِ عبا
کمربستہ اندر صباح و مسا

ہمہ مرد و زن از صغیر و کبیر
ہمہ شیخ و شاب وز برنا و پیر

فغاں مے نمودند زین واقعہ
کہ مقتول گشتہ بنی فاطمہ

بہ یک سال این تعزیت داشتند
بماتم بہ سر موئے بگذاشتند

ہنوز آں رہ و رسم ماتم تمام
بود درمیان بلوچاں تمام

چو آں ملک را بادشاہ شد یزید
بر آل عبا ظلم آمد پدید

پس از مدتی زاں گروہے بلوچ
بہ کرمان زمین از حلب کردہ کوچ

مثنوی "تحفۃ النصیر بلوچ" کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے ۔

بنام خدائے جہاں آفرین
زمین و زمان انس و جان آفرین

خدائے عظیم علیم و خبیر
ہو اللہ تحکے کل شئی قدیر

خدائے کہ خلق جہاں آفرید
کزو گشت صنع الہٰی پدید

فضائل کہ بود انبیاء را تمام
ہمہ مجتمع شد درود و سلام

کہ در گنج مستی از و باز شد
دلش مخزن گوہر راز شد

چو ختم نبوت شدہ شان او
بود ختم قرآن برہان او

جنگ نامہ میں سکھوں کی چیرہ دستیوں کا ذکر یوں کرتا ہے ؎

شدہ شہر از جور سکھا خراب
ہمہ مرد مانش برنج و عذاب

ہمہ شہر ویران درون و برون
ہمہ قصر و کاخش شدہ سرنگون

ہمہ ملک سرہند و لاہور را
ز پنجاب و ملتان ہمہ جا بجا

ز جھنگ و خوشاب و زمین چناب
بکردند قسمت بخود بے حساب

بہر جا کہ فرمودۂ تاختیم
ھدو را خراب و تباہ ساختیم

کنون آنچہ امر است آں میکنیم
اگر کوہ آہن بود بشکنیم

بدزدی در آیند ہم دزد دار
یکے گرگ جنگی کنند ارکنار

بصف جنگ نایند در هیچگاه
گر آیند باشد رخ شان سیاه

نیایند در پیش جنگ آوران
بود جنگ شان حیله کافران

چو روز دگر چشمه زد آفتاب
بدر زد سر از قصر دریای آب

ز فوج قرادل سوارے دوان
بیامد بر شاه گیتی ستان

که آمد ز سک لشکرِ بے شمار
بپیوست با غازیان کارزار

شهنشاه بر اسپ روان بر نشست
همه رانده رهوار مقرح بدست

همه سروران و وزیر و امیر
خوانین افغان ز برنا و پیر

همه تاختند از پس شهریار
برآمد بعالم یکے گیر و دار

چو خان بلوچ این خبر را شنید
ازین غصه چوں دیگ آتش تپید

نخست از ہمہ پیش خان بلوچ
بروئے شہنشا روان شد بفوج

من آں روز در جنگ حاضر بدم
تماشاہ نمودم بچشم خودم
بہ یک دست تیغ و بدیگر قلم
بمیدان پس سک ہمے تاختم
خدا آفریدست شمشیر را
ہم از بہر افغان دشیر دغا
دگر از برائے بلوچ آفرید
دگر کس بدیشان نخواہد رسید

بجان نصیر این خبر در زمان
فرستاد آں شاہ گیتی ستان
کہ اے خان امروز روزِ غزاست
غزا کن کہ فردا غزا را جزاست
تو خود چوں حریصی ز بہر غزا
بہ قرآن تو خواندی غزا را جزا
چو دشمن بپائے خود آمد بگور
برآئید بر پشت اسپان بفور

ملا محمد حسن

ملا محمد حسن ابن عبدالرحمٰن بلوچستان کی ایک معروف شخصیت ہو گزرا ہے۔ فصاحت اور بلاغت اور فن شعر و سخن میں کمال رکھتے تھے۔ شاعری میں بلوچستان میں شاید ہی ان کے پائے کا کوئی شاعر پیدا ہوا ہو۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ تاریخ نے ان کی شخصیت کو بڑا گرد آلود بنا دیا ہے۔ لیکن تاریخ پر خود مورخ بھی کوئی قدرت نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ مورخ کی اپنی تخلیق نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کی بنیاد اس مواد پر ہوتی ہے جو ماضی میں دستاویزات کی صورت میں وجود میں آیا تھا اور اسے بدلنا کسی مورخ کے بس کی بات نہیں ہے۔ تاریخ کے کردار کی حیثیت ایک عالی مرتب جج کی سی ہوتی ہے جو کسی ملزم کو بہر کیف بے گناہ ہی تصور کرتا ہے۔ لیکن اگر پراسیکیوشن کی طرف سے کچھ اس قسم کا مواد فراہم ہو جائے کہ وکیل صفائی اس کی تردید میں کوئی مواد پیش نہ کر سکے تو پھر متعلقہ عدالت ملزم کو مجرم ہی قرار دے گی۔ لیکن جہاں تک ملا محمد حسن کی شاعرانہ صلاحیت کا تعلق ہے بلا مبالغہ ادبیات اور عالمانہ کردار کے بل بوتے پر ان کی شخصیت ایک درخشندہ ستارے کی مانند ہے اور یہ بات بڑی تعجب انگیز ہے کہ انتظامی مصروفیات کے باوجود ایک پر آشوب دور میں انہوں نے شعر و سخن کا ایک بہت بڑا گنج گرانمایہ تخلیق کیا۔ تاریخ پیدائش نامعلوم اور تاریخ وفات ۱۲۷۲ ہجری ہے

فرماتے ہیں (بحوالہ گلدستہ قلات) ؎

فرش زمین نگر کہ سراسر پر از گل است
مینا عجب بہ مجلسِ رندان بہ قلقل است
رفتم بہ باغ بہر تماشائے آن نگار
دیدم ورا بہ صحن چمن با تجمل است
مرغان بہ نغمہ گرد بگردش گرفتہ اند
در حیرت آمدم کہ عجب کار مشکل است
گفتم کہ این نزاکت شادی زبہر چیست
گفتند روز شادی آن شاہ عادل است
نوروز روز تخت نشینی لافتا ست
این رسم در تمامی ایران و کابل است
خوشحال چون شدم من ازین مژدہ آن زبان
نطقم ببین بہ مدح علی ہمچو بلبل است
من در کلات رخش سخن را دوانده ام
رستم بہ این صلابت و مردی ز زابل است
ہر کس بہ دستگیری کس در تنگ و دوند
دستِ حسن بدامن آن شاہ دلدل است
جفا ہرگز مکن بر من تو اے یار جفا کارم
وفا دارم وفا دارم وفا دارم وفا دارم

دلم را گیر در دست تو اے دلبر کہ از دستت

دل آزارم دل آزارم دل آزارم دل آزارم

بہاۓ بوسۂ لعل لبت گر جان بود جانان

خریدارم خریدارم خریدارم خریدارم

حسن خود از لب خوبان شکر نوشیدہ می گوید

شکر بارم شکر بارم شکر بارم شکر بارم

شوی بر مطلب دل کامیاب آہستہ آہستہ

کہ میگردد فلک چون آسیاب آہستہ آہستہ

بہر پیچ و خم موۓ پریرویان نظر لیکن

کہ آرد شانہ اکش در پیچ و تاب آہستہ آہستہ

اگر خواہی تنت خوشبو کنی با مشکبو پیوند

رسانت بر دماغت بو گلاب آہستہ آہستہ

بکش اے ساربان آہستہ محمل

کہ مے آید بہ دنبال تو صد دل

بہ پاۓ عاشقانش مے خلد خار

بکن بہر خدا کوتاہ منزل

نشستم بر رہش چون ماندہ گشتم

کہ کے یار آید از رہ زان قوافل

من از ہر آن استادہ سر رہ
کہ بر گوششش رسد بانگ جلاجل

آن روئے نازنین کہ برون از نقاب شد
مہتاب شد ستارہ شد و آفتاب شد
بہ ہر لبے کہ آب زلال لبش رسید
زمزم شد و حیات شد و خود شراب شد
ہر قامتے کہ دل بہ قد و قامت تو داد
نے شد چو خشک شد ہمہ تار رباب شد
گویا کہ شد زبان حق بہر گلہ خان
کاغذ شد و قلم شد و صاحب کتاب شد

مولاداد

مولاداد ملا محمد حسن کے فرزند ارجمند تھے۔ ۱۲۵۵ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۴ھ ہجری میں وفات پائی۔ شاعری کے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

در آب یار پری چہرہ پیرہن مے شست
بہ قوب سیمتن خویش سیمتن مے شست

زعکس عارضش آن آب لالہ گون گردید

مگر بہ آب گل ان گلبدن بدن مے شست

شکست درصف بتہائے آذری افتاد

دران زمان کہ صنم زلف پرشکن مے شست

پراز نبات وشکر شد دھان مولا داد

بر آن زمان کہ بت لب شکر دہن مے شست

گفتم چہ نامی اے صنم گفتہ کہ مہ نام منست

گفتم کجا داری مقام گفتہ فلک بام منست

گفتم مگر بر چرخ جاکردی زلبس عز و علا

گفتا کہ این چرخ کہن در زیر اقدام منست

گفتم کہ خاک پائے تو چون سرسر در چشمان کنم

گفتا کہ چشم عاشقان روشن ز انعام منست

گفتم مگر آب بقا داری بجام اے دلربا

گفتا کہ آب زندگی در لعل گلفام منست

گفتم کہ مولاداد را زین جام کے سازی عطا

گفتا کہ این بیچارہ را این خوش کہ در دام منست

مہر و مہ زرند اما این کجا و آن کجا

ہردو منظور اند اما این کجا و آن کجا

قامت موزوں جانان قد سرو بوستان

ہر دو مشہور اند اما این کجا و آن کجا

نرگس فتاں دلبر چشم آہوے ختن

ہر دو مخمور اند اما این کجا و آن کجا

نکہت گیسوے یار و نفحہ مشک و تتار

ہر دو مذکور اند اما این کجا و آن کجا

زینتِ دندانِ دلدار من و درِّ صدف

ہر دو پر نور اند اما این کجا و آن کجا

اوج احمد بر سما و موج موسیٰؑ بر زمین

ہر دو چون طور اند اما این کجا و آن کجا

مرزا احمد علی احمدؔ

کاظم حسین کے فرزند تھے۔ تاریخ پیدائش غیر معلوم ہے۔ تاریخ وفات ۱۳۱۲ھ ہجری ہے۔ ابتدا میں قلات میں مختلف عہدوں پر فائز رہے لیکن بعض وجوہات کی بنا پر ملازمت ترک کر کے جیکب آباد میں سکونت اختیار کر لی اور کچھ عرصہ کے بعد انگریزوں کے دورِ اقتدار میں محکمہ نمک کے ناظر مقرر کیے گئے۔ خان میر محمود خان کی خواہش پر واپس قلات چلے آئے لیکن اسی سال وفات پا گئے اور کوئٹہ میں سپردِ خاک کیے گئے۔ ان کی شہرت کا دار و مدار ان کے غزلیہ کلام پر ہے۔ نمونہ

کلام ملاحظہ ہو ؎

دلبود از من عنان دل بت خورشید رخسارے
دل آشوبے دل آرامے دل آویزے دل آزارے
نگارے گرگ خوے عاشق کشے بے مہر و بے لطفے
جفا رسمے جفا کیشے جفا خوے جفا کارے
خجستہ طلعتے سیمیں عذارے ماہ سیمائے
فرشتہ طینتے فرخندہ خوئے فرخ اطوارے
مہے زیبا رُخے ترکے لطیفے نازک اندامے
نگارے نازنینے ناز دلنے ناز کردارے
بچرخ نیکوئی ماہے بملک دلبری شاہے
زعلم عشوہ آگاہے لفوج حسن سردارے
بقامت محشر نازے بمژگان ناوک اندازے
دل افروزے سرافرازے بتے سرمست وعیارے
سیاہ چشمے بغمزہ غارت جاں کردہ مے آید
بت کافر وشے تاراج ایمان کردہ مے آید
بعارض شد شرر در خرمن خورشید افگندہ
بلب صد طعنہ بر لعل بدخشان کردہ مے آید
زرشک قامتش خم گشتہ قامت سروبتان را
جمالش عزم تاراجِ گلستان کردہ مے آید

کمان ابروش کردہ کمین بر صید مشتاقان

خدنگ غمزہ اش قصد غریبان کردہ مے آید

بدستش جام پر مے دیدم و گفتم کہ خضر من

ز رحمت ساغر پر ز آب حیوان کردہ مے آید

بکوش احمد بہ ترک دل کہ آن ترک جفا پیکر

مژہ از خون دلہا شاخ مرجان کردہ مے آید

ز عاشقاں روے او ز جور تند خوے او

بچرخ شد ز کوے او فغان و آہ و نالہا

ز جور چشم برہمش ز تاب زلف پر خمش

مراست بہرہ در غمش ز خون دل نوالہا

ز حسن جانفزائے او ز لعل دلربائے او

رسید در ثنائے او ز ہر طرف رسالہا

بعشق چشم مست آن شہنشہ پری رخان

نوشتہ اند عاشقاں بخون دل قبالہا

باز ز چشم مست خود کار کہ سست کردہ ای

از کہ قسم شکستہ ای یا کہ درست کردہ ای

کشتن عاشق حزین نیست ز دست تو عجب

زانکہ تو عہد قتل او روز نخست کردہ ای

شے محمد دُر فشاں

آپ کا نام شے محمد اور لقب دُر افشان والد کا نام شے جلال تھا۔ ذگری مذہب کے پیروکار تھے۔ ذگریوں میں بڑے علما فضلا اور شعرا پیدا ہوئے ہیں۔ شے محمد کے کلام سے ان کے مذہبی رحجانات اور ذگری عقائد کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس کا نانا میر عبداللہ جنگی اس کے بیٹے سلیمان اور کمالان اور پوتا شے جلال بھی شاعری سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور وہ ایرانی بلوچستان کے شہرستان قصرقند کے باشندے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

بنام خدائے کہ در ہست و بود
بر آورد از بحر افضال جود

بر آرندۂ آسمان و زمین
نگارندۂ آدم از ما و طین

فرازندہ بر خاک بر روئے آب
فروزندۂ عالم از آفتاب

بر آرندۂ حاجت نا اُمید
طرازندۂ نقش سیاہ و سفید

گہے قطرہ را مے کند او گہر
گہے نطفہ را مے کند او بشر

نہ گنجد ثنائش بوہم وخیال

دراوصاف اوطوطئ نطق لال

کسی گو بگوید ترا یافتم

خدایا ازو روے برتافتم

الہی بحکمت دلم برفروز

بجز یاد تو ہرچہ باشد بسوز

دہی نیکی ام گر بہ ہر دوسرا

مرا سود باشد چہ تاوان ترا

خلاصم کن از قید نفس ہوا

عنانم کش از راہ کبر وریا

اگر کار جملہ بسامان شود

ز دریاے جودت چہ نقصان شود

مکن چشم رحمت ز جملہ دریغ

مکن آفتاب ہمہ زیر میغ

آں سامعی کہ واقف سرّ نہاں بود

صنعت نماے جسم زمین وزمان بود

از فیض فضل اوست کہ از آب قطرۂ

اعضاے گوشت و پوست شود استخوان بود

انعام و بخشش کہ تو کردی بمؤمنان

از در گہہ امید محمد ہماں بود

چون درین جا مسجد است و خلوت است

راحت اندر راحت اندر راحت است

چونکہ ذکر و علم حرف و حال است

لذت اندر لذت اندر لذت است

اے محمد رفت ایام فراق

وصلت اندر وصلت اندر وصلت است

ناطق مکرانی

ناطق کی تاریخ پیدائش غیر معلوم ہے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ اپنے وطنِ عزیز میں گزرا لیکن ساری زندگی تنگ دست ہی رہے آخر تنگ آ کر پہلے سندھ میں صوبیدار خان ٹالپر کی سرپرستی حاصل کر لی اور اس کے بعد ہندوستان جا کر اودھ کے حکمرانوں اور شہزادوں سے وابستہ ہو گئے۔ اسی بنا پر قصائد کی طرف رجحان زیادہ تھا۔ غزل کے میدان میں وہ غالب سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ غالب سے رابطہ قائم تھا۔ سنہ ۱۲۶۴ ہجری میں وفات پائی۔ صاحبِ دیوان تھے۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:-

رفتم کہ باز سجدہ بران آستان کنم
خود را شریک غالب ہفت آسمان کنم
ہم ناصبور کردہ مرا عشق ہم غیور
ہم قاصدت فرستم و ہم قصد جان کنم
بے من مرو بہ سیل گل این پند گوش دار
ورنہ بہار را لفافہ نے خزان کنم
سوز و چنیں ز شعلہ آہم اگر چمن
در آتشم کہ باز کجا آشیان کنم

عاجز نیم ز عربدہ آسمان ہنوز
دارم بخویش قوت آہے گمان ہنوز
خاکسترم بہ باد شد و نالہاے من
با برق می جہند عنان بر عنان ہنوز
خورشید حشر سر زدو از دود آہ من
ظلمت سراست عرصہ این خاکدان ہنوز
صد شمع بر فروختم و دل ز تیرگی
باشد نیازمند فروغ شرر ہنوز

تیغ صد گنج بہائیم ولی بیقدریم
کز ہنر ورتہ زنگار بود خانہ ما

صد گہش در گذر خضر نشاندیم ولے
از سیاہ بختیٔ ما سبز نہ شد دانۂ ما

ناطقؔ از خجلت کم قیمتی خویش بدہر
آب شد بار دگر گوہر یک دانۂ ما

ناطق نہ شد بجز کفنے حاصلم ز دہر
آں ہم بمزد گورکنی گورکن گرفت

ضمیمہ نمبر ۱

مہر گڑھ

(جین فرانکوئیس جارج رچرڈ ایک میڈو)

پرانی دنیا کی قدیم ترین تہذیب دریاؤں کی وادیوں میں ابھریں۔ مغربی ایشیا کے دجلہ و فرات، شمالی افریقہ کے نیل اور جنوبی ایشیا کے دریائے سندھ ان تینوں تہذیبوں میں وادی سندھ کی تہذیب کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ اس کے شہروں میں دو بڑے شہر جنوب میں موہنجوڈرو اور شمال میں ہڑپہ تین ہزار ویں قبل مسیح کے سب شہروں سے بڑے تھے اور اس کی بستیاں اور گاؤں بحیرہ عرب سے لے کر شمالی افغانستان میں دریائے آمو تک پھیلے ہوئے تھے اور ۱۹۷۰ء تک یہ بات ایک معمہ تھی کہ تہذیب وادی سندھ کی ابتدا کیونکر ہوئی۔

اب پاکستان کے صوبہ بلوچستان میں چھ موسموں کے دوران زرعی بستیوں کے کئی سلسلوں کا انکشاف ہوا ہے جو ہڑپہ اور موہنجوڈرو

سے تین ہزار سال پیشتر بسائی گئی تھیں۔ یہ انکشاف بہت ہی اہم اور پر معنی ہے کہ اس سے پہلے یقین کیا جاتا تھا کہ اس وسیع علاقہ میں دہ نشین زرعی آبادیوں کے ایک عرصہ دراز تک کوئی شواہد نہیں ہیں۔ اس قسم کے شواہد کے فقدان نے تہذیب سندھ کے ممتاز طالب علم سر مارٹیمر ویلر کو یہ تجویز پیش کرنے پر اکسایا تھا کہ تہذیب وادی سندھ کی ابتداء ایک پسماندہ علاقے میں ایک ایسے خیال کے نفوذ کا نتیجہ تھی جو بدستور ہوا میں تھا جبکہ اس وقت مزید مغرب میں شہر پروان چڑھنے لگے تھے

پاکستان میں فرنچ ارکیالوجیکل مشن اور پاکستان کے محکمہ آثار قدیمہ کی جانب سے دریائے بولان کے کنارے مہرگڑھ کی قدیم بستی پر حفریات کا کام جاری ہے اور یہ ہمیں دیکھنے کے قابل بنا دیں گے کہ آیا سماجی اور اقتصادی طور و اطوار کی خصوصیات کی بنا پر تہذیب وادی سندھ کی جڑیں اس علاقے کے ماقبل تاریخ کی گہرائی میں واقع تھیں اس کی جائے وقوع درہ بولان کے مین کنارے واقع ہے۔ جو سطح مرتفع ایران اور سندھ کے درمیان دو مشہور راستوں میں سے ایک ہے۔ یہاں کچھی کا میدان جو دریا برار مٹی کا ایک ہموار اور وسیع میدان ہے۔ دو سو کلو میٹر تک جنوب کی طرف ڈھلوان صورت میں دریائے سندھ تک بڑھتا چلا گیا ہے۔ اس طرح یہ علاقہ اگرچہ بلوچستان کے انتظامی ضلع کا ایک حصہ ہے لیکن یہ دریائے سندھ کے نظام نکاسی آب کے دائرے میں واقع ہے۔

۱۹۷۳ء میں مہر گڑھ کے رقبہ میں تلاش کے دوران ایک چھوٹا ٹیلا ملا۔ یہاں حضریات کے دوران ایک ایسی آبادی کا سراغ مل گیا جو تین ہزارویں اور چار ہزارویں قبل مسیح سے تعلق رکھتی تھی۔ ۱۹۷۴ء میں سرگرمی کے ساتھ حضریات کا کام شروع ہونے پر معلوم ہوا کہ یہ ٹیلہ کئی ٹیلوں کے مجموعہ میں سب سے نمایاں ٹیلہ تھا۔ جو شمال میں تقریباً ایک کلو میٹر کے لگ بھگ دریائے بولان کے کنارے تقریباً ۵۰۰ ایکڑ کے رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں ٹیلوں کے اس مجموعہ میں فقط ایک بڑی بستی کی آبادی کا ملبہ نہیں تھا بلکہ یہ کئی چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے ملبہ پر مشتمل تھا۔ جس میں سے ہر ایک کسی پہلے کے جزوی یا کلی طور پر اجاڑ دینے کے بعد قائم کیا گیا تھا۔ تین ہزار یا چار ہزار سال کے دوران ایک بستی سے نقل مکانی کر کے کسی دوسری کو بساتے بساتے ان چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے آثار تمام علاقے میں پھیل گئے تھے۔

اس صدی کی ابتدا میں ایک سیلاب کے دوران دریائے بولان نے اپنا راستہ مغرب کی طرف بدل دیا تھا۔ اور پرانے راستے سے چند کلو میٹر دور اپنے نئے راستے پر بہنے لگا۔ اور ایسا کرتے ہوئے اس نے آبادی کے آثار کا وہ حصہ کاٹ دیا جو آبادی کا سب سے پرانا حصہ ثابت ہوا۔ اور دریا کے اس نئے راستہ کے کشادگی کی وجہ سے جو ٹیلا نما کھاڑ پیدا ہوا اس سے حجری عہد کے نہایت آشکارا ڈھانچے نمایاں ہو گئے جو اس سے پہلے مکمل طور پر دریا برد مٹی تلے دب گئے تھے۔ فرانسیسی

نیشنل سنٹر برائے ریسرچ کے مونیق لیچیوایئر نے اس حصہ پر حضریات کا کام شروع کر دیا ہے۔ جس کو ہم نے ایم آر ۳ کا نام دیا ہے برابر چار موسموں کے کام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس رقبہ میں مستقل ابتدائی حجری عہد کی مستقل زرعی آبادیاں بس گئی تھیں جبکہ مٹی کے برتنوں کا استعمال شروع نہیں ہوا تھا اور یہاں کچی اینٹوں کے عمارتی ڈھانچوں میں سے سب سے زیادہ نزدیک کے زمانہ سے تعلق رکھنے والے ڈھانچوں کے ایک سلسلہ سے کاربن ۱۴ کے طریقے کے بل بوتے پر تجزیہ سے معلوم ہوا کہ ان کا زمانہ تقریباً چھ ہزار دیں قبل مسیح ہے۔

تقریباً ۷۰۰ مربع میٹر پر مشتمل بالائی حجری تہوں سے مٹی ہٹا کر ایم آر ۳ کے آخری زرعی گاؤں کا خاکہ ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اس آبادی کے مکانات کچی اینٹوں سے تعمیر کردہ کئی مستطیل کمروں پر مشتمل تھے جن کی درمیانی کھلی جگہوں کو مدفن کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ ان ڈھانچوں میں بعض کے اندر دیوار تعمیر کر کے ان کو مربع نما کوٹھڑیوں میں تبدیل کیا گیا تھا جو بظاہر گودام یا سٹور (انبار) کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے۔ یہاں سے حاصل کردہ مصنوعات میں پسائی کے پتھر اور چقماقی پھل شامل ہیں جن کی چمکدار خصوصیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اناجوں کی کٹائی میں استعمال کیا جاتا تھا۔ زراعت کے بارے میں اس بالواسطہ شواہد کی تائید کئی قسم کے اناجوں کے دانوں کے نشانات سے بھی ہوتی ہے جو گھارے کے ملبے میں پائے گئے۔

اناجوں کے ان نشانات سے روم کے نیشنل میوزیم آف اورنٹیل آرٹ کے لورنیزو کانسٹینٹنی نے جو مہر گڑھ سے دریافت شدہ پودوں کے آثار کا مشاہدہ کر رہے ہیں کئی قسم کے اناجوں کی شناخت کر لی ہے ان میں جَو کی دو قسم اور گندم کی چار اقسام شامل ہیں جن میں روٹی میں استعمال ہونے والا گندم کا ایک نمونہ بھی شامل ہے۔ ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ بلوچستان زمانہ قدیم میں اناجی تہذیب کا ایک اہم ابتدائی مرکز تھا۔

ان عندیوں کو ایم آر ۳ کے ملبہ کی گہری کھدائی سے اور زیادہ تقویت ملتی ہے جو اصل زمین کی سطح تک پہنچا دی گئی ہیں۔ برتنوں سے مبرا اس ابتدائی حجری سطح سے کوئی سات میٹر کی گہرائی پر مزید اناجوں کے نشانات برآمد ہوئے ہیں جن میں گندم اور جَو کی مختلف اقسام شامل ہیں اگرچہ کاربن ۱۴ کے طریقہ تجزیہ سے ان گہری تہوں کا زمانہ معین نہیں کیا گیا ہے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ ۱۰ میٹر گہرا ملبہ کسی جلدی میں ان اناجوں کے دانوں کے اوپر نہیں جما دیا گیا ہوگا۔ لہذا ہم نے برنبائے تجربہ برتنوں کے استعمال سے نابلد حجری آبادی کے ابتدائی دور کے لئے چھ ہزار سال قبل مسیح سے کچھ عرصہ پیشتر کا زمانہ متعین کر لیا ہے اور ایم آر ۳ کے پورے رقبہ کو برنبائے زمانہ مہر گڑھ دور اول کا نام دیا ہے۔

کانسٹینٹنی نے دور اول کے ملبے میں اناجوں کے علاوہ دوسرے پودوں کی باقیات شناخت کر لی ہیں۔ آلوچہ کی مانند بیر کے میوہ کے بیج اور کھجور کی گٹھلیوں کے جلے ہوئے نمونے دریافت کر لئے گئے ہیں

جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ درخت بھی حجری دور میں خوراک کا ایک وسیلہ تھے۔

حیوانات کی باقیات بھی مہر گڑھ میں زرعی ترقی کے زمرے میں ایک اور اہم ذریعہ ہیں۔ ابتدائی حجری تہوں کی اوپر کی سطح سے صرف دو میٹر کی گہرائی میں جانوروں کی ہڈیوں کے مجموعہ میں جنگلی جانوروں کی ہڈیوں کی خصوصیات سے کلیتاً پالتو جانوروں کی ہڈیوں کی خصوصیات کی جانب نمایاں تبدیلی پائی جاتی ہے۔ مثلاً ابتدائی مرحلوں کے مجموعوں میں غزالوں پہاڑی بکروں، بھیڑوں، بارہ سنگھوں، نیل گائے اور مویشیوں کی ہڈیاں پالتو مویشیوں اور بکروں کی ہڈیوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ لیکن اس کے برعکس مہر گڑھ دور اوّل کے اختتام پر جانوروں کی ہڈیوں کے مجموعوں میں اگرچہ غزالوں اور جنگلی سور اور گورخروں کی تھوڑی بہت ہڈیاں موجود ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ باقی تمام جانوروں کی ہڈیاں پالتو جانوروں کی ہڈیوں پر مشتمل ہیں، جن میں بھیڑ بکریاں اور مویشی شامل ہیں۔ چونکہ چھ ہزار قبل مسیح میں بلوچستان کے اس علاقے میں جنگلی مویشی اور بھیڑ بکریاں پائی جاتی تھیں لہذا یہ بات ممکن ہے کہ ابتدائی حجری دور کے مہر گڑھ کے باشندوں نے ان تمام تین قسم کے جانوروں کو مقامی طور پہ پالتو بنا لیا ہوگا۔ کم از کم بھیڑوں کے زمرے میں کافی شواہد دستیاب ہیں کہ ان کو پالتو بنانے کا عمل مقامی طور پہ واقع ہوا تھا۔

اگر قدیم ترین جانوروں کی باقیات کے مجموعوں کے لئے چھ ہزار سال قبل مسیح کا زمانہ متعین کیا جاتا ہے تو پھر ان مجموعوں میں کچھ چھوٹے

اور قیاساً پالتو مویشیوں کی باقیات کی موجودگی کا صاف مطلب یہی ہے
کہ مہر گڑھ میں پالتو مویشیوں کی پرورش کا کام اس زمانہ میں شروع ہو گیا
تھا جس زمانہ میں یہ کام مغربی ایشیا میں ہوا تھا۔ مزید برآں بھینسوں کی بھی
کچھ نہ کچھ ہڈیاں ان حجری مجموعوں میں پائی گئی ہیں — یہ ہڈیاں چین
سے باہر ایشیا کے کسی بھی مقام کے مقابلہ میں اس جانور کے قدیم ترین شواہد
مہیا کرتے ہیں۔ لہٰذا مہر گڑھ کے دورِ اوّل میں اس طور و اطوار کو دہراتے
ہوئے دیکھا جا سکتا ہے جس کے متعلق مغربی ایشیا سے معلومات فراہم
ہو گئی ہیں۔ البتہ مہر گڑھ میں اس زمرے میں ایک بامعنی تغیر کی عکاسی
ہوتی ہے۔ یہاں سب سے اہم جانور بھیڑ بکریاں نہیں بلکہ مویشی ہیں۔

دورِ اوّل کے کاشتکاروں، گلہ بانوں اور شکاریوں نے اپنے مردوں
کی ہڈیاں قبروں میں چھوڑی ہیں جو آبادی میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ قدیم
ترین تہوں میں مُردوں کو دو طریق پر دفنایا جاتا تھا چت لٹاتے یا پہلو کے بل لٹا
کر ان کے گوڈے آگے کی طرف سینے تک اور پاؤں پیچھے کی طرف
پھیلائے جاتے تھے ان کے جسم کو سرخ گیرو سے ڈھانپ دیا جاتا
تھا۔ اثاثہ قبر میں منکوں کے ہار، پائل، پازیب اور کمر بند شامل ہیں۔
منکے، سیپ، ہڈیوں، فیروزہ اور کئی قسم کے مقامی پتھروں سے
بنائے جاتے تھے۔ بعض اوقات ٹوکریوں پر رال سے لیپ کر کے
مردے کے نزدیک رکھا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ
ان میں فنا ہونے والی اشیاء (خوراک) رکھی جاتی تھیں۔ فرانسیسی

آرکیالوجیکل مشن کے گانزاگ فیورانے ایم آر ۳ کی بالائی سطح میں بڑی محنت سے کوئی تیس کے قریب قبریں اجاگر کر دیں۔ ہر قبر کے پہلو میں ایک طرف سے دیوار یا چبوترہ تعمیر کیا گیا تھا۔ یہاں ان قبروں میں جو اشیاء بطور اثاثہ قبر رکھی گئی تھیں۔ ان میں پالش کئے ہوئے پتھر کی کلہاڑیاں اور اوزاروں کے پھل، ہندسی اشکال کے چقماق پھلڑے پتھر کے برتن، ہیوڑی کے گولے اور ذاتی زیورات (منکوں کی لڑیاں) شامل ہیں۔ منکے درآمد کردہ فیروزہ اور لاجورد سے تیار کئے جاتے تھے۔ دھات بھی ہوتا تھا جو ایک چھوٹے بچے کے پاؤں کی نچلی ہڈی کے پاس پڑا تھا۔ فیوران نے ایک ہی تانبے کا منکا کھود کر نکالا تھا

دور اوّل کی مصنوعات میں چقماق پتھروں کے ٹکڑے بہ تعداد کثیر پائے گئے ہیں۔ جن کی تعداد اس وقت بیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ یہ اوزار چقماق پتھر کی صنعت کی نمائندگی کرتے ہیں جو زیادہ تر اوزاروں کے پھلوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ان پھلوں کی اکثریت چھیلن رکھتا ہے جو ایک طرف یا دونوں طرف کے کنارے سے الگ کئے گئے تھے۔ ہندسی اشکال کے پھلڑوں کی تعداد دوسرے اوزاروں کے مقابلے میں ۴ فیصد سے کسی قدر کم ہے۔ ان میں تکون منحرف قسم کے اوزار بھی کچھ نہ کچھ تعداد میں شامل ہیں۔ جن کے تکون کی نوک نہیں ہے۔ ان کو از سرِ نو مزیّن کیا گیا ہے۔ اسی لئے ان پھلڑوں کی پشت اوپر سے خالی ہے۔ ان کا مقابلہ مغربی ایشیا سے

برآمد ہونے والے منحرف اوزاروں سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ہڈیوں کے اوزار بھی کچھ نہ کچھ تعداد میں برآمد کئے گئے ہیں۔ ان کی بہت بڑی تعداد فقط چمڑے میں سوراخ کرنے والی سوئیوں پر مشتمل ہے۔

دور اوّل کی غیر معمولی دریافت پانچ مجسمے ہیں جو ناپختہ مٹی سے بنائے ہوئے ہیں ان میں تین انسانی اور دو حیوانی مجسمے ہیں۔ انسانی مجسموں میں ایک مجسمہ شکل و شباہت کے اعتبار سے نوکیلا ہے اور اس کے گلے میں فنکاری کے بل بوتے پر بیشمار ہار پہنائے گئے ہیں۔ دوسرا مجسمہ نشست کی صورت میں ہے اور اس کے چہرے کے دو سوراخ آنکھوں کے مظہر ہیں۔ تیسرے انسانی مجسمہ کا صرف نچلا حصہ بچا ہوا ہے یہ بھی نشست کی صورت میں ہے۔ اس کی ٹانگیں اور پیر ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ بناوٹ کے اعتبار سے تینوں مجسموں سے مغربی ایران کے قدیم مجسموں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حیوانی مجسموں کی بناوٹ عام مجسموں کی مانند ہے۔ یہ سب مجسمے قدیم ترین مجسموں میں سے ہیں جو ابھی تک جنوبی ایشیا سے دریافت ہوئے ہیں۔

ایم آر ۳ کے عین جنوب میں ہم نے ایک چالکولیتھک آبادی کے شواہد دریافت کر لئے جس کا زمانہ مرکز پانچ ہزار ویں قبل مسیح ہے۔ (چالکولیتھک حجری اور کانسی دور کی تبدیلیوں کی ایک درمیانی کڑی ہے جو پرانی دنیا میں واقع ہوئی تھی) ہم نے اس رقبہ کو ایم آر ۴ کا نام دیا ہے۔ یہ جائے وقوع کی آبادی کی صورت کا دور دوئم

ہے۔ یہاں باقیات میں جو سطح کے بالکل نیچے واقع ہیں ظروف گلی شامل ہیں۔ یہاں حضریات کے دوران مستطیل ڈھانچے دریافت ہوئے ہیں جن کو دوبارہ دیوار تعمیر کرکے دروازوں سے عاری تنگ کوٹھڑیوں میں تبدیل کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک کوٹھڑی کی تہہ میں گندم اور جو کے دانوں کے نشانات ملے۔ یہاں سے دو درانتیاں بھی برآمد کی گئیں۔ دونوں رال میں ایک زاویہ پر بٹھا کر تین چقماقی پھلوں سے تیار کی گئی تھیں مکڑی میں چھید کرکے رال کو اس میں رکھا گیا تھا۔ لکڑی کے دستے تو بمرور زمانہ ضائع ہو گئے۔ لیکن فقط چھید کا نشان رال میں باقی رہ گیا ہے۔ ان درانتی کے پھلوں اور اناج کے دانوں کے نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کوٹھڑیوں میں سے کم از کم کچھ اناج ذخیرہ کرنے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔

ایک کوٹھڑی کی دیواروں سے باہر جلے ہوئے بیج کے دانے ایک جلے ہوئے رقبہ میں ملے۔ ان میں گندم اور جو کی مختلف اقسام کے اناج کے دانے اور کچھ کپاس کے بیج شامل ہیں۔ کپاس کے بیج کچھ اس طرح بوسیدہ حالت میں تھے کہ کانسٹنٹی ابھی تک یہ معلوم نہ کر سکا کہ آیا یہ بیج کسی کاشت شدہ پودے کے ہیں۔ ان کپاس کے بیجوں کی دوسرے کاشت شدہ بیجوں کے پہلو بہ پہلو ایک ڈھانچہ کے نزدیک موجودگی جو اناج ذخیرہ کرنے کی غرض سے استعمال کیا گیا تھا اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مہر گڑھ کے دور دوم کے کاشتکار کپاس

بھی کاشت کیا کرتے تھے کیونکہ یا تو وہ اسے پارچہ بافی کے لئے یا تیل سے معمور اس کے بیج کو کارآمد خیال کر کے اسے پسند کرتے تھے کپاس کی کاشت کے زمرے میں اس سے پیشتر سب سے پہلے شواہد اس خطہ میں تہذیب وادی سندھ سے متعلق بعض مقامات سے دریافت ہوئے ہیں جن کا زمانہ ۲۴۰۰ قبل مسیح سے بعد میں ہے۔

ایم آر ۴ کے کوڑے کرکٹ کے اندر سے ہڈیوں کے ہزاروں ٹکڑے برآمد کئے گئے ہیں۔ یہ سب کے سب پالتو جانوروں کی ہڈیاں ہیں جن میں بھیڑ بکریاں اور مویشی شامل ہیں لیکن ان میں زیادہ کثرت مویشیوں کی ہڈیوں کی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ جنوبی ایشیا کے زمانہ ماقبل تاریخ میں مویشی کو اس کے قدیم ترین دور میں ایک اہم جانور کے طور پر پرورش کیا جاتا تھا۔ یہ بات یقینی ہے کہ ان کا گوشت مہر گڑھ کے دور دوئم کے زمانہ میں اس کے باشندوں کی خوراک کا ایک اہم وسیلہ تھا۔ خیال ہے کہ ان مویشیوں کو ہل چلانے، اناج صاف کرنے، باربرداری اور دودھ حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا لیکن ان اضافی کرداروں کے شواہد بالواسطہ ہیں۔

خانوں میں بٹی ہوئی کوٹھڑیوں میں سے ایک کی جنوبی دیوار کے بالمقابل حضریات کے دوران ایک کارخانہ یا ورکشاپ کا پتہ چلا جہاں سوپ سٹون سے منکے بنائے جاتے تھے۔ چقماقی پتھر کے برمے گالے (برت) جن سے کہ اس نرم پتھر پر کام کیا جاتا تھا۔ ایسے منکوں کے ساتھ یکجا ملے جو تیاری کے مختلف مرحلوں میں تھے۔ نیز غیر استعمال شدہ سوپ سٹون اور برت کے بیکار ٹکڑے بھی اسی جگہ ملے۔ سیپ

کے منکے بھی یہاں تیار کئے جاتے تھے۔

اسی عمارتی ڈھانچہ کے مشرق میں ایک کھلی جگہ راکھ میں لت پت جانوروں کی ہڈیوں کی ایک تہ سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اسی جگہ سے ایک سو سے زائد چمڑہ سوراخ کرنے کی ہڈی کی سوئیاں اور دھری دار پتھر ملے جن کی مدد سے ان سوئیوں کی نوکوں کو باریک شکل دی جاتی تھی سرخ رال بھی دور دوئم میں اتنا ہی مقبول تھا۔ جتنا کہ اس سے پیشتر کے دور میں تھا۔ پسانی کے پتھر جو رنگ آلود تھے رال کی پیٹریوں کے ساتھ یکجا یہاں سے دریافت ہوئے۔ چقماقی اوزار بھی اس دور دوئم میں بکثرت بنائے اور استعمال کئے جاتے تھے لیکن دھات کی کمی تھی۔ تانبے کی فقط ایک کان کی کڑی اور ایک منکا دریافت ہو سکے۔

دور دوئم کی ظروف۔ گل عمدہ قسم کے برتنوں پر مشتمل ہے لیکن یہ تھوڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ برتنوں کی سب سے زیادہ عام بناوٹ ناشپاتی سے مشابہ مرتبانوں پر مشتمل ہے۔ جن کے لب باہر کی طرف مڑے ہوئے ہیں۔ ان برتنوں پر صیقل کاری کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی مٹی چمکدار نظر آتی ہے۔ ان کی سطح کے نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو تیاری کے دوران کسی ذریعے سے گھمایا جاتا تھا۔ مٹی کی بنی ہوئی دوسری اشیاء میں دو انسانی مجسمے شامل ہیں۔ جن میں وہی تصنع پایا جاتا ہے جو اس سے پیشتر حجری دور کے مجسموں میں پایا جاتا تھا ان میں سے ایک نشست کی حالت میں ہے جس کے پاؤں ایک

دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور دوسرا قلم کئے ہوئے نوک سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے نچلے حصے پر فیتہ کاری سے چرخیاں بنائی گئی ہیں۔ جس کا مطلب ایک قسم کا کپڑا ہے۔

ایم آر ہم دور دوئم کے رقبہ کی سطح کی مٹی اوپر سے بڑی نرم ہے اس کے اندر منقش اور ہاتھ سے بنائی ہوئی ظروف گلی کی ٹھیکریاں پائی جاتی ہیں۔ جن کا زمانہ افغانستان اور بلوچستان کے دوسرے علاقوں کی ظروف گلی کے ساتھ موازنہ کی بنا پر پانچ ہزار ویں قبل مسیح کا اواخر اور چار ہزار ویں قبل مسیح کا اوائل ہے۔ بلاشبہ اس ظروف گلی کا تعلق اس دور سے ہے جسے کلی گل محمد دور دوئم کا نام دیا گیا ہے اور جس کا زمانہ چار ہزار ویں قبل مسیح قرار دیا گیا ہے۔ امریکی نیچرل میوزیم آف نیچرل ہسٹری کے فیئر سروس نے ۱۹۵۱ء میں کوئٹہ شہر کے نزدیک کلی گل محمد کی قدیم بستی کے اوپر حضریات کا کام سرانجام دیا تھا۔

مہر گڑھ کی چھ ہزار ویں اور پانچ ہزار ویں قبل مسیح سے متعلق دریافتوں کا معنی و مطلب اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ وہ زمانہ ما قبل تاریخ کے مورخین کو معلومات کا وہ ٹھوس اور قیمتی سرمایہ ایک ایسے دور کے لئے فراہم کرتی ہیں جو اس سے پہلے جنوبی ایشیا کے آرکیالوجی (آثار قدیمہ) کے ریکارڈ میں موجود نہ تھیں۔ دور اوّل اور دور دوئم کی آبادیاں وسیع اور مستقل تھیں۔ ان کے مخزن میں کئی کمروں پر مشتمل باقرینہ عمارتی ڈھانچے شامل تھے جو بلا مبالغہ اناج ذخیرہ کرنے کے انبار (گودام) تھے۔ تمام

اور اناج جمع کرنے کے علاوہ، اس دور میں اضافی طور پر اناجوں
کی کاشت اور جانوروں کی پرورش بھی کی جاتی تھی۔ دور دوئم میں
شکار اور اناج کی جمع آوری ترک کردی گئی تھی۔ خصوصی ماہرانہ محنت
ترقی یافتہ تھی۔ طویل رابطوں کے جال کی بدولت مہرگڑھ میں فیروزہ
ایران یا وسط ایشیا سے لاجورد شمالی افغانستان سے اور سیپ گھونگے
بحیرہ عرب کے ساحل سے فراہم ہوتے تھے۔

تجہیز و تکفین کے مختلف طریقوں اور مدفنون کے غیر مساویانہ
وقوع سے اس بات کی غمازی ہوتی ہے کہ یہاں ہمارا واسطہ ایک ایسی
آبادی سے ہے جس میں کسی نہ کسی حد تک سماجی اختلافات موجود تھے
مزید گہری تہوں کے حسریات سے ہماری معلومات میں اضافہ ہو جائے
گا۔ کہ حجری دور کے اس علاقے کے لوگوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی مرحلے
میں خوراک پیدا کرنے کے زمرے میں کیا کردار ادا کیا تھا۔ مہرگڑھ وادی
سندھ سے متصل ایک زرعی مرکز کی موجودگی کا ثبوت مہیا کرتا ہے اور
اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ حجری انقلاب ایک پیچیدہ واقعہ
تھا۔ جس میں ایک سے زیادہ مراکز ملوث تھے۔ تقریباً چار ہزار دیں
قبل مسیح کے لگ بھگ، مہرگڑھ کی آبادی جنوب کی طرف منتقل ہوگئی
جس کے رقبہ کو ایم آر ۲ کا نام دیا گیا ہے۔ آبادی کے ملبہ میں جو
تقریباً تین میٹر گہرا ہے۔ آثار قدیمہ کا تسلسل و تواتر پوشیدہ ہے۔ تسلسل
کا مظہر ایم آر ۲ میں ظروف گلی کی موجودگی ہے جن کے اسی قسم کے

نمونے ایم آر ۴ اور جی ہوئی کوٹھڑیوں میں پائے گئے تھے۔ یہ نسبتاً بڑے ہیں اور زیادہ اہتمام سے تیار کیے گئے ہیں۔

دورِ سوم کے ابتدائی مرحلے کا طرۂ امتیاز مصنوعات میں اہم تبدیلی ہے۔ جہاں دورِ دوم کی ظروف گلی میں تیاری کے دوران کسی ذریعہ سے گھمانے کے آثار پائے جاتے ہیں وہاں دورِ سوم کی ظروف گلی کے متعلق یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کمہار کی چاک پر بڑے پیمانے پر تیار کیے جاتے تھے۔ یہ ایک قسم کی عمدہ ظروف گلی ہے جس کی سطح پر بندسی اور نیم فطری اشکال کی نقاشی کی جاتی تھی جیسا کہ بکروں اور پرندوں کی قطاروں میں نقاشی ہے۔

لاجورد، فیروزہ اور عقیق کے منکے سنگ یشب کے ٹکڑوں کے مخروطی برموں کی مدد سے تیار کیے جاتے تھے۔ ان ٹکڑوں کے اوپر گھسائی کے نشانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو کمانی دار برموں سے گھمایا جاتا تھا۔ سنگ یشب کے یہ ٹکڑے دورِ سوم کے قدیم ترین نمونے ہیں جن کے متعلق معلوم ہے کہ ان کی ایک قسم تین ہزار ق م قبل مسیح میں مشرقی ایران میں شہر سوختہ اور شہداد میں اور وادی سندھ میں استعمال کی جاتی تھی۔ جہاں یہ چنہو دڑو میں تہذیب وادیٔ سندھ کے عقیق کے ورکشاپوں سے وابستہ تھے۔

کمہار کی چاک اور منکے، سوراخ کرنے والے سنگ یشب کے برموں کے سب سے پہلے استعمال کے شواہد سے مہرگڑھ ٹیکنیکی

اختراع کا قدیم ترین مرکز قرار پاتا ہے جو زیادہ اہتمام سے مصنوعات کی تیاری میں دونوں مشرق اور مغرب پر ایک ہزار سال کی سبقت زمانی رکھتا ہے۔ ہم نے اس قسم کی بھٹیوں کا بھی کھوج لگایا جو تانبا پگھلانے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔

ایک دوسری اہم تبدیلی دورِ سوئم میں زراعت میں تنوع تھی اس سے پیشتر کے ادوار کے اناجوں کے ساتھ ساتھ خوردنی گندم کی دو نئی اقسام اور ایک جَو کی نئی قسم کی کاشت بھی ہوتی تھی۔ کانسٹینٹی نے کلیتاً ایک نئی قسم کے اناج جئی کی شناخت بھی کر لی ہے۔ آبادی میں اضافہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ بیک وقت کئی قسموں کے اناجوں کی کاشت اور بھیڑ بکریوں اور مویشیوں کی گلہ بانی سے دورِ سوئم کی آبادی کو بڑی مقدار میں خوراک حاصل ہو جاتی تھی۔ اس دورِ سوئم کے اختتام سے پہلے ایم آر ۲ کی آبادی بڑھ کر ایک سو پچیس ایکڑ پر پھیل گئی تھی۔

تقریباً ۳۵۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ آبادی مزید جنوب کی طرف منتقل ہو گئی۔ اس رقبے کو ایم آر ۱ کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں حفریات کے دوران اس قسم کی عمارتیں اجاگر ہو گئیں جن کے اندر خوراک ذخیرہ کرنے والے بڑے بڑے برتن رکھے ہوئے تھے۔ دورِ چہارم کے کوزہ گر مختلف شکل اور موٹائی کے غیر منقش اور سادہ برتن بڑے پیمانے پر بناتے تھے۔ جن میں انڈے کے چھلکے کی مانند بڑے نازک کٹورے

شامل تھے۔ انہوں نے منقش برتنوں کی تیاری بھی ترک نہیں کی تھی لیکن بکروں اور پرندوں کی نقاشی متروک ہو گئی تھی اور ان کی جگہ ایک سے زیادہ اور کثیر رنگوں میں نہایت پیچیدہ ہندسی اشکال کی نقاشی کی جاتی تھی۔ مختلف شکل و صورت، ساخت اور سائز کے برتنوں میں اضافہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور کے کوزہ گر ایک بڑے متنوع طلب کو پورا کر رہے تھے۔

نسوانی مجسموں کی تیاری بھی جاری تھی اور وہ پہلے کی طرح نشست کی صورت میں بنائے جاتے تھے۔ لیکن ان کی شکل و صورت اب نسبتاً فطری تھی اور وہ پختہ مٹی کے بنائے جاتے تھے۔ مہریں بنانے میں یہی مواد استعمال کیا جاتا تھا۔ ہڈیوں سے بنی ہوئی مہریں پہلی مہریں ہیں جو مہر گڑھ سے دریافت ہوئی ہیں۔

تقریباً ۳۲۰۰ قبل مسیح میں ہم مہر گڑھ (دور پنجم) میں سکونت پذیری کے ایک ایسے دور میں پہنچ جاتے ہیں جو مشرقی ایران اور مغربی پاکستان کی حضریات کی بنا پر بڑا جانا پہچانا ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر خیال کیا جاتا تھا کہ بلوچستان اور سندھ کی قدیم بستیوں کی بنیاد اسی زمانہ میں پڑی تھی۔ بلاشک و شبہ مہر گڑھ کی آبادی کے ابتدائی مرحلوں سے پیشتر خیال کیا جاتا تھا کہ چار ہزار قبل مسیح کے اختتام ہی پر جنوبی ایشیا میں ترقی یافتہ زرعی معیشت کی ابتدا ہوئی تھی۔

اس وقت گمان کیا جاتا تھا کہ بلوچستان میں تبدیلی کے محرکات

وسطی ایشیا کی قدیم بستیوں سے وارد ہوئے تھے جن کا تعلق پتہ نمازگاہ دور سوئم کے تہذیبی مرحلے سے تھا۔ ایک ایسا محرک جو ایران میں شہر سوختہ اور افغانستان میں منڈیگک کی وساطت سے اثر انداز ہوا تھا۔ اب یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ یہاں کے مقامی باشندوں نے جن میں مہر گڑھ کے باشندے بھی شامل تھے۔ چار ہزار دیں قبل مسیح کے وسط میں ایشیا کے اس حصے میں تبدیلی لانے کے دوران ایک غیر فعال کردار کی بجائے ایک فعال اور سرگرم کردار ادا کیا تھا۔

اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ تجارت کے زمرے میں ۳۲۰۰ قبل مسیح سے پیشتر ہی رابطوں کا ایک جال بلوچستان کو مشرقی ایران اور جنوبی ترکمانستان سے مربوط کر رہا تھا۔ ذرائع آمد و رفت کے ان راستوں کی وجہ سے نہ صرف اشیاء تجارت بلکہ خیالات کے تبادلہ میں بھی آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ ان تبادلوں کا عکس ان مصنوعات کی ایک ہی طرز پر تیاری میں نمایاں ہے جس نے اس وسیع علاقے کو خصوصیات کا مالک بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر خانہ دار مہریں اور کئی قسم کے اسالیب نقاشی اس خطے کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک یکساں اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔

دور پنجم کے اختتام کے بعد مہر گڑھ ایک خوشحال زرعی مرکز بنا۔ چار ہزار دیں قبل مسیح کا اختتام اور تین ہزار قبل مسیح کی ابتدا مہر گڑھ کے دور ششم اور ہفتم پر مشتمل ہے۔ حفریات کے دوران اس قسم کے

کمرے دریافت کیے گئے جن کے اندر سے ایسے بڑے بڑے برتن برآمد ہوئے جو غالباً لعمت نعمت خانہ یا سٹور کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے انگیٹھیوں کے نزدیک جلے ہوئے گندم، جو اور جئی کے دانے اور لپائی کے پتھر یک جا پائے گئے. فصل کاٹنے کی درانتیاں دورِ دوئم کی درانتیوں سے مختلف نہیں ہیں. چقماق پھلڑے رال میں بٹھا دیئے گئے تھے اور زراعت میں ایک نئی ایجاد انگور تھا. جو تقریباً تین ہزار قبل مسیح کی پیداوار ہے.

دورِ ششم اور ہفتم کا متاثر کرنے والا پہلو بڑے پیمانے پر برتنوں اور مجسموں کی تیاری ہے. فرانکائیس آدرز اور کیتھرائین جارج نے ایم آر اے کے شمال میں ایک جگہ دریافت کرلی جہاں ۲۶۰۰ قبل مسیح میں برتنوں کو آگ کی تپش دی جاتی تھی. مختلف سائز کے دو سو سے زائد برتن اس جگہ متبادل قطاروں میں یا ایک دوسرے کے اندر رکھے گئے تھے لیکن اچانک طور پر آگ کی تپش دینے کے دوران آگ کے شعلوں نے برتن پکانے کے عمل کو غلط کر دیا اور کوزہ گروں نے فقط یہ کیا کہ ان ضائع شدہ برتنوں کو اسی جگہ رہنے دیا. جہاں یہ پکانے کے لئے رکھے گئے تھے.

یہاں اس علاقہ میں یہی طریقہ بدستور رائج چلا آتا ہے. کمہار سب سے پہلے زمین پر بھوسہ کی ایک تہ بچھا دیتے ہیں. ان کے اوپر ۵۰۰ سو سے کر ۱۰۰۰ برتن رکھ دیتے ہیں. ان برتنوں کے

اوپر اور زیادہ بھوسہ اور برتنوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بچھا دیئے جاتے ہیں۔ اور آخر میں ان کے اوپر گارے کی ایک تہہ جما دی جاتی ہے۔ بھوسہ کو آگ لگا دی جاتی ہے جو ۲۴ گھنٹے تک جلتی ہے اس کے بعد ان برتنوں کو ایک ہفتہ تک ٹھنڈا ہونے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ آڈوز اور کیتھرائن جارج نے ان خراب شدہ برتنوں کا مشاہدہ کر کے معلوم کر لیا کہ برتنوں کو پکانے کے معاملہ میں یہی طریقہ پانچ ہزار سال پہلے بھی اختیار کیا جاتا تھا۔ یہ اس زمانہ کے نیم صنعتی اعتبار سے اعلیٰ معیار کے برتنوں کے بارے میں کوزہ گری کا ایک بامعنی ثبوت ہے۔ غالباً ان برتنوں کو اسی علاقہ کی مقامی ضروریات کے پیش نظر بنایا جاتا تھا۔ اور آج بھی اسی خیال سے بنائے جاتے ہیں۔

نسوانی مجسموں کی تیاری میں اضافہ ہوا۔ دور ششم میں یہ نشست کی صورت میں بنائے جاتے ہیں۔ لیکن اب ان کی ٹانگوں کے گرد مٹی کا ایک تار لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ ان کے چہروں کے دونوں طرف بالوں کے عجیب و غریب لٹے آویزاں ہوتے ہیں۔ جن سے ایک عجیب و غریب تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ان مجسموں کے دستے کو آویزاں چھاتیوں کے ساتھ جو جزوی طور پر ہاروں کی لڑیوں سے چھپی رہتی ہیں۔ فطری انداز میں بنایا گیا ہے۔

دور ششم تین ہزار قبل مسیح سے شروع ہوا تھا۔ اور ۲۷۰۰

قبل مسیح میں دورِ ہفتم شروع ہوا تھا۔ دورِ ہفتم کے آخری مرحلہ میں
جس کا خاتمہ ایک صدی کے بعد ہوا تھا۔ بڑے پیچیدہ قسم کے کمرں
کا ایک سلسلہ ایم آر اے میں دریافت ہوا۔ ان میں سے بیشتر کمرے دو
منزل تک اونچے تھے اور ان کے اوپر چڑھنے کے لئے ایک کم
اونچا کمرہ استعمال کیا جاتا تھا۔ جس کی چھت اس کے فرش سے فقط
ایک میٹر اونچی تھی۔ اور وہ سٹور کا کام بھی دیتا تھا۔ لکڑی کے شہتیر
اور دھنیوں کی متوازی قطاروں کے اوپر بالائی منزل کی بنیاد رکھی
کی گئی ہے جس کے اندر سٹور کے طور پر استعمال ہونے والے برتن
رکھے ہوئے تھے۔ سیڑھی کے طور پر استعمال کئے جانے والے ایک
کمرے میں سے ۲۰۰ کے قریب مختلف شکل اور سائز کے برتن ملے
جن کی نقاشی مسحور کن تھی۔

اس مشترکہ اقامتی اور گدامی رقبہ کے شمال میں کھلی جگہیں تھیں
جہاں مٹی کے برتن بھٹیوں میں پکائے جاتے تھے۔ ایک دوسرے
کے اوپر بھٹوں کی تین تہیں دریافت ہوئیں جن کی بنیادیں بیضوی
اور گول تھیں۔ ان کا فقط ایک ہی تلا ہے۔ اس بات کا امکان ہے
بیکار اور بھدا مواد استعمال کر کے دوسرا تلا بھی بنایا جاتا ہوگا۔ جو
آگ کی تپش کے بعد پھٹ جاتا ہوگا۔ لیکن یہ بھٹے اس قابل ضرور تھے
کہ وہ اس قدر حرارت بہم پہنچا سکتے تھے کہ جس سے مطلوبہ مصنوعات
پک سکیں۔ راکھ کے ڈھیروں میں بیجوں کی باقیات اور حیوانی الائش اس

بات کے شواہد ہیں کہ بھوسہ، اور جانوروں کی لید ایندھن کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔

برتنوں اور مجسموں کے ٹوٹے ہوئے ڈھیروں سے پتہ چلتا ہے کہ دورِ ہفتم کے آخری مرحلے میں کوزہ گر بہت ہی بڑے پیمانے پر ظروف سازی میں مصروف تھے ان برتنوں میں کچھ برتن فنکاری اور ہنرمندی کے ایسے عمدہ نمونے ہیں جن کو آرٹ کا درجہ حاصل ہے ان میں بھورے رنگ کے نہایت عمدہ اور نفیس پیالے اور کٹورے ہیں جن کے اوپر سیاہ رنگ سے ہندسی، نباتاتی اور حیوانی اشکال کی نقاشی کی گئی ہے۔ اس بھورے رنگ کی ظروف گلی کے نمونے مہرگڑھ سے بہت دور مشرقی ایران تک پائے گئے ہیں۔ دورِ ہفتم کے مجسموں کی نمائندگی مجسموں کے ہزاروں ٹکڑے کرتے ہیں۔ جو عموماً بازوؤں اور ٹانگوں پر مشتمل ہیں اور کچھ ایسے نمونے بھی ملے ہیں جو ثابت ہیں بلوچستان میں اس سے پیشتر کسی مقام پر ان مجسموں کی اتنی تعداد میں اجتماع دیکھنے میں نہیں آیا ہے۔ یہ مجسمے اب نشست کی صورت میں نہیں ہیں بلکہ یہ سیدھے اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہیں۔ ان کے سر میں تصنع پایا جاتا ہے۔ جن کی آنکھیں بڑی بڑی گول اور ناک منقاری ہے لیکن باقی مجسمے پہلے کی نسبت زیادہ فطری انداز میں بنائے گئے ہیں مثلاً چوتڑوں کی ایک طرف سے ذراسی گولائی نے نسوانی مجسموں کو ایک ایسی مسحورکن صورت دی ہے کہ جن سے مابعد کے ہندی

نسوانی مجسموں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مہر گڑھ میں پہلی بار مردوں کے مجسمے بہ تعداد کثیر نظر آتے ہیں۔ جو کل مجسموں کے ۳۰ فیصد ہیں جن کی شناخت جنس کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ نسوانی مجسمے بالوں کے طرز آرائش میں ایک وسیع نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جن کو سیاہ رنگ اور زیورات کو زرد رنگ سے زینت دی گئی ہے۔ مردوں کے مجسموں کے سر پر ایک بڑی پگڑی اور ان کے گلے میں نیکٹائی کے قسم کا ایک آویزہ ہے۔ دور ہفتم کے اختتام پر یہ ذرا زیادہ اکڑے ہوئے انداز میں ہوتے ہیں اور ان مجسموں کو عام طور پر رسمی انداز میں شکل و صورت دی گئی ہے جو ان مجسموں کی خصوصیات ہیں جن کے نمونے بلوچستان کے دوسرے مقامات اور بلوچستان سے باہر دریافت ہوئے ہیں۔

حیوانی مجسموں میں کوہان والے سانڈوں (زنا دیا) سوروں اور پرندوں کے مجسمے شامل ہیں۔ ان سب کو ہنر مندی سے شکل و صورت دی گئی ہے۔ اور وہ تہذیب وادی سندھ کے مجسموں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ایک غیر معمولی دریافت ایک مینڈھے کے مجسمہ کی ہے جس کو سنگ جراحت سے تراش کر بنایا گیا ہے۔ بہت سی مہریں بھی دریافت ہوئی ہیں جو پختہ مٹی کی بنی ہوئی ہیں اور عموماً گول ہی ہیں اور ان میں سے ایک پر دوڑتے ہوئے سانڈ (زنا دیا) کی تصویر ہے۔ دور ہفتم کی مابعد کی تہوں سے دریافت ہونے والے برتن

اور مصنوعات تہذیب سندھ سے متعلق مصنوعات کی خصوصیات سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ان میں تکونی پتھرے جو پختہ مٹی کے ہیں۔ متوازی اطراف والے پھل جن میں سے کچھ کی لمبائی ۱۸ سنٹی میٹر ہے۔ بلاشبہ ایک چھوٹے سے ٹیلہ کی سطح کی باقیات جو مہر گڑھ سے صرف ۸ کلومیٹر کے قریب واقع ہے۔ تہذیب وادی سندھ کے پختہ دور کی پیداوار ہیں۔ لیکن تہذیب سندھ کے دتوع ہونے کے کوئی آثار یہاں نہیں پائے جاتے ہیں۔ البتہ یہاں دور ہفتم کے مابعد کا ایک مدفن تہذیب وادی سندھ کا ہم عصر ہو سکتا ہے۔

ایم آر I کے جنوب میں ماریل سانٹونی نے قبروں کی ایک بڑی تعداد سفریات کے دوران دریافت کرلی ہیں۔ جن کا اثاثہ ظروف گلی، تانبہ کے برتن اور دوسری مصنوعات جنوبی ترکمانستان کے کئی مقامات کے اثاثہ سے مشابہت رکھتے ہیں جو مدفنوں سے دریافت ہوئے ہیں۔ اسی قسم کے مدفن افغانستان میں بھی دریافت ہوئے ہیں رجو دشلی بیجر سے متعلق ہیں۔ مہر گڑھ میں اسی مواد کی موجودگی تہذیب سندھ کے وطن کی سرحد پر واقع ہے۔ افغانستان میں اپنے معکوس متوازی صورت رکھتی ہے جہاں تہذیب سندھ سے متعلق ایک قدیم بستی شورتگی میں دریائے آمو کے کنارے دریافت کی گئی ہے۔

مہر گڑھ میں ابھی بہت کام کرنا باقی ہے۔ ہمارے پہلے چھ موسموں کی کارکردگی کے نتائج بہرکیف اس بات کے مظہر ہیں کہ

اس سے پیشتر جنوبی ایشیا کی ماقبل تاریخ کی ترجمانی میں جو نظریاتی طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ اب اس پر نظر ثانی کر کے اس کی مکمل جانچ پڑتال کرنا لازمی ہو گیا ہے۔ معلومات سے بھرپور یہ مقام باعتبار زمانہ ایک طویل تسلسل کے ساتھ آثار قدیمی سکونت پذیری کا ایک ریکارڈ فراہم کرتا ہے۔ اس تسلسل سے ایک ایسے روز افزوں اہتمام کے عمل کا اظہار ہوتا ہے جو اناجوں کی کاشت جانوروں کی پرورش مصنوعات، عمارات حتیٰ کہ نظریات پر بھی اثر انداز ہوا تھا۔ قدم بقدم اس سٹیج کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جو نہایت پیچیدہ تہذیبی تبدیلی اور ترقی کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ جو تین ہزار دیں قبل مسیح کے وسط میں تہذیب وادی سندھ کے بڑے بڑے شہروں پر منتج ہوا۔

ضمیمہ نمبر ۲

ذگری۔ بحوالہ کامل القادری

عام روایت ہے کہ ابوسعید بلیدیوں کا مورث اعلیٰ تھا۔ اور بلیدی ہلمند کے علاقہ گرم سیر کے باشندے تھے جو نقل مکانی کر کے مکران چلے آئے اور مکران میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ پہلے ہی سے ذگری مذہب کے پیروکار تھے اور انہوں نے ہی ذگری مذہب کو مکران میں روشناس کرایا۔ لیکن ایک دوسری روایت یہ ہے کہ مکران کے ملک خاندان کے حکمران ابتدا میں ہلمند کے علاقہ گرم سیر کے باشندے تھے۔ اور انہوں نے مکران وارد ہونے کے بعد یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اسی خاندان کے اراکین ذگری مذہب کے پیروکار تھے اور انہی کی کوششوں سے ذگری مذہب مکران میں مقبول ہوا۔ انہوں نے ہی اس دین کی اشاعت کی اور انہی کی مساعی سے اس مذہب کو پہلے مکران اور اس کے بعد بلوچستان کے بعض علاقوں میں فروغ حاصل ہو گیا۔

باور کیا جاتا ہے کہ سید محمد جونپوری ذگری مذہب کا بانی تھا اس کے متعلق ابوالفضل کا بیان ہے کہ سید محمد جونپوری ایک بلند پایہ

۱:۔ نوکین دور۔ مکران نمبر (تاریخ غیر معلوم)

عالم دین تھا۔ اس نے اپنے زمانہ کے جید علما و فضلا سے درس حاصل
کر لیا تھا۔ وہ علم و فضل کو جذب نہ کر سکا۔ اور اس نے مہدیت کا دعویٰ
کیا۔ بہت سے لوگ اس کے پیروکار بن گئے، وہ جونپور سے گجرات
چلے گئے۔ جہاں سلطان محمد نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اس کا
معتقد بن گیا۔ لیکن ہندی مسلمانوں میں اس کی مخالفت بڑھ گئی اور معاملہ
تقریر و تحریر اور مناظروں سے گزر کر مجادلہ و مقاتلہ تک جا پہنچا۔
ان حالات کے نتیجہ میں اسے ہندوستان سے ہجرت کرنا پڑی اور
فراہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ۱۵۰۵ء میں اس نے فراہ ہی میں وفات
پائی۔ اس کی تاریخ پیدائش ۱۴۴۳ء ہے۔

سید محمد کے اپنے یا اس کے کسی پیروکار کی مکران میں آمد کا کوئی
ثبوت فراہم نہیں ہو سکا ہے اور نہ ہی اس بات کا کوئی ثبوت
موجود ہے کہ ذگری فرقہ کا بانی سید محمد یا اس کا کوئی پیروکار تھا۔ یہ بات
بھی پوری طرح واضح نہیں ہے کہ جن مذہبی معتقدات کی اشاعت
سید محمد نے کی تھی وہی معتقدات ذگری مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔
خود ذگریوں کے پیشوا جو ملائی کہلاتے ہیں سید محمد جونپوری کے بارے
میں کسی قسم کی معلومات نہیں رکھتے ہیں۔ ذگری ملا فقط دو کتابوں سفرنامہ
مہدی اور تردید مہدیت کا ذکر کرتے ہیں لیکن یہ کتابیں دستیاب نہیں
ہیں۔ ذگری فرقہ کی اپنی کوئی دینی کتاب بھی نہیں ہے۔ وہ قرآن مجید کو
اپنی دینی کتاب تسلیم کرتے ہیں اور وہ اس کی باقاعدہ تلاوت بھی کرتے

ہیں۔ اور اسے داعی کہہ کر پکارتے ہیں۔ ذگری اپنے آپ کو بھی داعی کا نام دیتے ہیں۔ خیال ہے کہ ان کے بعض دینی اصول آشکارا اور بعض خفیہ ہیں

ذگریوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نا قابل عمل ہے اور اس کی بجائے مہدی کے اصول دین قابل عمل ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید نازل ہو چکا تھا لیکن مہدی صاحب تاویل ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کی آیت الذکر وصلوہ کا مطلب فقط ذکر ہی ہے اور۔ رمضان شریف کے روزے موقوف ہیں اور فقط ذوالحج کے نو دنوں کا روزہ فرض ہے جس کے بعد دسویں ذوالحج کو قربانی بھی فرض ہے۔ لا الہٰ لا اللہ محمد مہدی نور پاک رسول اللہ ذگریوں کا کلمہ ہے۔ ذگری نماز اور آذان کی بجائے ذکر کرتے ہیں ان کا معبد خانہ ذکر خانہ کہلاتا ہے زکوٰۃ اور عشر دونوں ایک دہائی کے حساب سے ادا کیا جاتا ہے۔ ذگریوں میں عورتوں کا پردہ معتقدات کا جزو نہیں ہے اور نہ مذہبی اعتبار سے ان میں پردہ کا رواج ہے گمان کیا جاتا ہے کہ وہ مباح کو جائز خیال کرتے ہیں لیکن وہ برملا اس کا اظہار نہیں کرتے ہیں[1]۔ ہر ایک ذگری کا یہ دستور رہے کہ وہ شادی کے بعد اپنی دلہن کو اپنے پیشوا یا ملائی کی زیارت کرتے اسی کے پاس ضرور لے جاتا ہے۔

---

[1] ہ۔ ذگری سختی سے مباح کی تردید کرتے ہیں۔

ذگریوں کے ہاں دو قسم کی عبادات مروج ہیں۔ ایک ذکر کہلاتا ہے اور دوسرا کشتی۔ کشتی خاص مواقع پر منعقد کی جاتی ہے ذکر روزانہ چھ مرتبہ کیا جاتا ہے جس کے اوقات اور ورد مقرر ہیں۔

۱۔ لاالٰہ الا اللہ۔ یہ خفی ہے۔ طلوع آفتاب سے پہلے تیرہ مرتبہ فرداً فرداً اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۲۔ سبحان اللہ یرجبو۔ یہ ذکر جلی ہے یہ بوقت صبح (گور بام) بآواز بلند ذکر کیا جاتا ہے اور آخر میں سجدہ کیا جاتا ہے۔ سجدہ ذکر خفی سے شروع کیا جاتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں حسبی ربی و جلالہ طلوع آفتاب تک یہی ورد جاری رہتا ہے اور طلوع آفتاب کے بعد سجدہ کیا جاتا ہے۔ یہ سجدہ تمت کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔

۳۔ سبحان اللہ یرجبو۔ یہ ذکر جلی ہے جو بوقت مہر نیم روز (نیم روچ ء ذکر) ورد کیا جاتا ہے اس میں کوئی سجدہ نہیں۔

۴۔ سبحان اللہ یرجبو۔ یہ ذکر خفی ہے جو آفتاب کے پیلے پڑ جانے (روچ زرد ء ذکر) پر کیا جاتا ہے اور یہ غروب سے ذرا پہلے کا ذکر ہے۔ بعد ورد آفتاب غروب ہوتے ہی سجدہ کیا جاتا ہے۔

۵۔ سر شب ء ذکر یعنی عشا کا ذکر ہے جو ذکر جلی کی صورت میں بآواز بلند ورد کیا جاتا ہے۔ اس میں تمام ذکر کے کلمات

کو براخراج سبحان دوہرایا جاتا ہے۔

۶۔ نیم ہنگام ۶ ذکر۔ یعنی ذکر نیم شبی۔ یہ ذکر خفی ہے۔ فرداً فرداً ورد کیا جاتا ہے۔ کلمہ ورد لاالہٰ الا اللہ ہے جو ایک ہزار مرتبہ ورد کیا جاتا ہے اور ہر سو ورد پورے ہونے کے بعد ایک سجدہ ہوتا ہے۔

کشتی ایک خاص قسم کی عبادت ہے۔ کشتی میں شامل ہونے والے دائرہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک دو مرد یا عورتیں دائرہ کے درمیان میں آ کر مہدی کی ثنا وصفت ترنم سے پڑھتی ہیں۔ دوسرے لوگ اسے ایک ساتھ (آوازیں زمیل) دہراتے ہیں۔ جب گانے والے یا والیاں ہادی کا نعرہ دیتی ہیں تو دائرہ میں بیٹھے ہوئے لوگ پکار اٹھتے ہیں: "گل مہدیا" یعنی ہمارا پھول مہدی حقیقی ہدایت کی راہ پر گامزن ہے۔ کشتی پیدائش، ختنہ اور شادی کی تقریبات کا ایک جزو لاینفک ہے اور اس کے لئے کوئی وقت اور دن مقرر نہیں ہے۔ کسی وقت بھی کشتی منعقد ہو سکتی ہے اس سے قطع نظر کشتی کے لئے مندرجہ ذیل ایام متعین ہیں۔

۱۔ ہر اس جمعہ کی رات کو مجلس کشتی منعقد ہوتی ہے جو مہینہ کی چودھویں تاریخ کو پڑے گویا چودھویں چاند کی رات کو اس کا انعقاد فضیلت رکھتا ہے اور یہ اس رات کو لازمی طور پر منعقد ہوتی ہے۔

۲۔ عیدالاضحیٰ کی قربانی سے فارغ ہونے کے، دوسرے دن بھی مجلس کشتی لازمی طور پر منعقد ہوتی ہے لیکن رات کے وقت

۳۔ یکم یا دہم ذوالحج کی شبوں کو مجلس کشتی منعقد ہوتی ہے اور نویں ذوالحج کی کشتی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

ذگری اپنی میت کی تجہیز و تکفین عام مسلمانوں کی طرح کرتے ہیں لیکن نماز جنازہ نہیں پڑھا جاتا ہے اور نہ اس موقع پر کوئی ذکر یا مجلس کشتی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

ذکر کے بعض ورد بڑے دلکش اور عجیب ہوتے ہیں۔ جو مقالمہ کی صورت میں بولے جاتے ہیں۔ مثلاً

ایک کہتا ہے :۔ مانرواں زیر زمینا (ہم زیر زمین نہیں جائیں گے)

دوسرا کہتا ہے :۔ حجت بار تہ زیر زمینا (حجت زیر زمین لے جائے گی)

ایک کہتا ہے :۔ ہادی سوز دل۔

دوسرا کہتا ہے :۔ مہدی پہ دل وجان (مہدی دل وجان سے)

ایک کہتا ہے :۔ مرحبا منی دل بیچارگیں (آج میرا دل بیچارہ ہے)

دوسرا کہتا ہے :۔ مانند مرغے بے بازلیں (اس پرندہ کی مانند جسکے پر نہ ہوں)

ایک کہتا ہے :۔ کشتی کجا پا دکئت (کشتی کہاں سے اٹھے گی یا چلے گی)

دوسرا کہتا ہے :۔ مہدی ءِ کوہ ءِ بنا۔ (مہدی کے پہاڑ کے دامن سے)

ایک کہتا ہے :۔ قولی گن قول ہادی ءِ (میں ہادی کے معاہدے یا قول کا پابند ہوں)

دوسرا کہتا ہے :۔ مارا صدقیں دین ہادی (ہمارے لئے ہادی کا دین سچا ہے)

ایک کہتا ہے :- منی دل ءِ دوست بیا کہ رون کیچ (میرے دل دوست چلو کیچ چلیں)

دوسرا کہتا ہے :- جی با تربت ءِ زیارت کنوں بیا (جی آؤ تربت کی زیارت کریں)

ایک کہتا ہے :- سیلانی سیلانانت (سیر کرنے والے سیر کر رہے ہیں)

دوسرا کہتا ہے :- ماگلاں پہ مہدیا (ہم مہدی کی ملاقات سے شاد ہیں)

اس قسم کے مکالمات (کورس) لاتعداد ہیں جو اوقات ذکر میں کئے جا سکتے ہیں۔

کوہ مراد کی زیارت کو ذگریوں کے مذہبی معتقدات میں بڑی اہمیت حاصل ہے جو سال میں ایک دفعہ حج کے دنوں میں بلا ناغہ کی جاتی ہے اور ذگری مرد اور عورت پر جو بالغ ہو کوہ مراد کی زیارت کم از کم ایک دفعہ فرض ہوتی ہے۔ اس رسم کی بنیاد ملا مراد گچکی نے رکھی تھی۔ کوہ مراد ایک پہاڑی ہے جس کے بالائی سرے پہ ایک وسیع میدان ہے اس میدان کے مشرق و مغرب میں ایک پندرہ بیس فٹ اونچی پہاڑی ہے۔ تقریباً تین کلومیٹر (مربع) یہ میدان تین میٹر اونچی دیوار سے محیط ہے اور چونکہ یہ پہاڑی ذگریوں کے نزدیک مقدس اور متبرک ہے۔ زائرین جوتے اتار کر اس پہاڑی پر چڑھتے ہیں۔ پہاڑی سے ذرا فاصلہ پر ایک دائرہ نما جگہ ہے جو مقام ذکر ہے زیارت کے دنوں میں ذگری درویش یہاں بیٹھ کر ذکر کرتے ہیں۔ ذگری ننگے پاؤں پتھروں کو بوسہ دیتے ہوئے اوپر چڑھتے ہیں۔ پہاڑی چوٹی پر اس کے مشرق میں ایک تنگ جگہ ہے۔ جہاں دائرہ بنا ہوا ہے۔ ذگری اسی دائرے

کے گرد طواف کرتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ ذکر بھی کرتے ہیں۔

تربت کے قریب ایک کنواں ہے جس کو ذگری چاہ زمزم کا نام دیتے ہیں اور اس کے بعد کوہ مراد کی زیارت کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ کوہ مراد کے نزدیک صاف اور شفاف پانی کا ایک دوسرا کنواں بھی ہے۔ جس کے پانی کو زائرین عموماً پینے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کوہ مراد کے نزدیک چند رہائشی مکانات بھی ہیں۔ جہاں کوہ مراد کے مجاور اور اس کے گشتی چوکیدار سکونت رکھتے ہیں۔ ذگری غسل اور وضو کی بجائے فقط استنجاہ کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہی موٹے موٹے اصول ذگری مذہب یا فرقہ کے بنیادی پتھر خیال کئے جاتے ہیں جو زمانہ قدیم کی طرح آج بھی ان کی زندگی پر پیدائش سے موت تک جاری رہتے ہیں۔

ضمیمہ نمبر ۳

علامہ سید محمد جونپوری ۔ بحوالہ فقیر بخش بگٹی

سیّد محمد ۷،۸۴۷ھ (۱۴۴۳ء) میں شہر جونپور میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام سید عبد اللہ عرف سید خان تھا۔ اور آپ کی والدہ کا نام بی بی آمنہ عرف انا ملک تھا۔ آپ نے سات سال کی عمر میں قرآن حکیم کو حفظ کیا اور بارہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے۔ چونکہ بحث وتحیض میں آپ کو یدِطولیٰ حاصل تھا۔ اسلئے جونپور کے شیخ درنیال اور دوسرے علماء نے آپ کو اسد العلماء کا لقب دیا۔ آپ ایک جیّد عالم تھے اور علوم ظاہری وباطنی میں اپنے عہد میں یکتا تھے۔ آپ جادو بیان مقرر تھے اور سامعین پر اس طرح چھا جاتے تھے کہ آپ کی زندگی میں بے شمار مناظرین آپ سے مات کھا کر آپ کے مرید ہو گئے۔ مریدوں کی تعداد آپ کی زندگی میں ہزاروں سے متجاوز ہو چکی تھی۔

دعویٰ مہدیت

آپ نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ چونکہ مہدی کا ذکر آیا ہے اس لئے یہاں اس امر پر مختصر بیان ضروری ہے۔ شیعہ حضرات کا

عقیدہ ہے کہ امام مہدیؑ آخرالزمان ہوں گے ان کے مطابق وہ امام غائب ہیں۔ جو زندہ کہیں موجود ہیں۔ متعدد مدعیان مہدویت کے باوجود جو ہو گزرے ہیں۔ وہ اب تک یقین کامل رکھتے ہیں کہ امام مہدی اپنے وقت پر ظہور میں آئیں گے۔ اس نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت تک جس قدر لوگوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا وہ ، وہ مہدی نہیں ہو سکتے۔ جن کے معتقد شیعہ حضرات ہیں عود الی المقصود آپ نے تین شادیاں کی تھیں۔ آپ کی ازدواج محترمہ کے نام یہ ہیں :-

۱- انیس سال کی عمر میں آپ نے اپنے چچا کی دختر بی بی اللہ دادی سے شادی کی۔ آپ کی اس اہلیہ محترمہ نے ذی الحج ۹۱۷ھ میں بمقام چندیری، جبکہ آپ حج کرنے تشریف لے جا رہے تھے وفات پائی۔

۲- حج سے مراجعت پر بمقام پٹن (احمد آباد) آپ نے مولانا اوڑشاؒ کی دختر بی بی ملکاں سے شادی کی۔

۳- دورانِ سفر کاھہ کے مقام پر آپ نے بی بی بون سے شادی کی یہ آپ کی تیسری شادی تھی۔

تعلیم

آپ کی تعلیم کا مدار ان امور پر تھا :-

۱- ترکِ دنیا ۔ ۲- صادقوں کی صحبت۔ ۳- خلق سے علیحدگی۔ ۴-

ذکر کثیر۔ ۵۔ ہجرت و توکل ۔ ۶۔ دیدار الہٰی کی طلب ۔ ۷۔ عشر۔

ان امور کی بنا پر آپ کے پیروؤں کا عقیدہ ہے کہ قرآنی فرائض و واجبات دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم ان احکام پر مشتمل ہے جن کا تعلق نبوت اور شریعت سے ہے۔ ان کے خیال کے مطابق رسول اللہ نے ان احکام کی زبان میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دوسری قسم ان احکام کی ہے جن کا تعلق اس ولائت سے ہے جو حضور کی تعلیم سے وجود میں آئی۔ جس کی تبلیغ، احیا اور تکمیل منشائے الہٰی ہے اور اس لئے انہوں نے اس کا بیڑا اٹھایا۔

ان کی اس تعلیم پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوا کہ وہ ایسی ولائت کے مدعی تھے جس کا نتیجہ ترکِ دنیا اور عزلت گزینی تھا ان کی بے داغ اور منزہ طہارت و پاکدامنی علم و فضیلت اور اپنی ذات پر انتہائی جفاکشی اور جفائے جہان و جہانداران کی برداشت اور مجاہدانہ تگ و تازہ باوجود اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہوگا۔ کہ ان کی تعلیم کا ماحصل اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا کہ اس کو اگر اس کی انتہا تک عمل میں لایا جاتا اس کا نتیجہ منطقی طور پر یہ ہوتا کہ دنیا۔ جس کی بنا حق پر ہے جسے حق پر چلانا اس کی تخلیق کا تقاضا اور مدعا ہے اور جس کے وارث قرآن کی زبان میں صالحین ہیں۔ کو نظام باطل کے سپرد کرنا ہوتا۔

ظاہر ہے یہ صورت حال نہ اقتضائے الہٰی ہے نہ مدعائے قرآن اور نہ رضائے رسالت۔ اس کی تائید مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوتی ہے۔

"بالآخر علمائے احمد آباد آپ کے روز افزوں اشراد رخلق اللہ کے رجوع کی حالت دیکھ کر گھبرا گئے اور جانپانیر اس کی عرضی بھیجی کہ سید محمد جونپوری کے وعظ و تلقین میں تجرد اور ترک دنیا کی ترغیب ہوتی ہے تمام شہر کے علماء و سپاہ و رعیت اور مشائخ چند ہی روز میں آپ کے معتقد و گرویدہ ہو گئے ہیں یا ہو رہے ہیں یا سب کے سب دنیا چھوڑ کر اگر فقیر ہو گئے تو ریاست کے کل پرزے بیکار ہو جائیں گے اور کچھ دنوں یہ سید اور یہاں رہا تو تمام شہر اس کے مطیع ہو جائے گا۔ اور ریاست ہاتھ سے جاتی رہے گی۔ بہتر ہے کہ ابھی سے انسداد کیا جائے۔ اس درخواست پر آپ کے اخراج کا حکم ہوا اور آپ نے پٹن کا رخ کیا" (مقالاتِ حافظ محمود شیرانی جلد دوم صفحہ ۱۵۲)

سفر و سیاحت

۸۸۷ھ (۱۴۸۲ء) میں چالیس سال کی عمر میں آپ کو حج بیت اللہ کا خیال ہوا۔ چنانچہ آپ داناپور روانہ ہوئے وہاں سے کالپی اور چندیری ہوتے ہوئے مہانیر پہنچے۔ یہاں ہی آپ کی اہلیہ محترمہ بی بی اللہ دادی کا انتقال ہوا۔ یہاں آپ نے ڈیڑھ سال قیام کیا اور وعظ و پند کا سلسلہ جاری رکھا۔ کافی لوگ آپ کے مہدی ہونے کے معتقد ہو کر مرید ہو گئے۔ آخر یہاں سے مانڈو گئے۔ یہاں بھی آپ نے بہت سے لوگ اپنے معتقد بنائے۔ پھر دولت آباد آئے

اور وہاں سے احمد نگر پہنچے وہاں سے بیدر گئے اور بیدر سے گلبرگہ پہنچے یہاں سے بیجا پور اور چیتاپور ہوتے ہوئے ڈابول بندر پہنچے بیت اللہ میں بھی آپ نے اپنے مہدی ہونے کی دعوت پیش کی حج سے فارغ ہو کر مراجعت فرمائی۔ دیو بندیا بندر کھنبات میں جہاز سے اترے وہاں سے احمد پور پہنچے۔ احمد آباد سے پٹن گئے (پٹن قصبہ بڑلی) سے جاتور گئے، جاتور سے نصیر پور اور وہاں سے ناگپور گئے یہاں سے جیسلمیر اور پھر ٹھٹھہ پہنچے۔ ٹھٹھہ سے دریا کے راستے کاصہ تشریف لے گئے۔ اور یہاں سے قندھار پہنچے اور شرفاء معززین کی ایک بڑی تعداد آپ کی معتقد ہو گئی۔ ان میں سے محمد کا شانی. میاں اشرف ہانسوی. میاں دانش خراسانی. حاجی محمد عبداللہ اور عبدالہاشم وغیرہ جیسے نامور لوگ قابل ذکر ہیں. قندھار سے فراہ پور گئے فراہ سے موضع رج میں پہنچے اور اس مقام پر ۱۹ ذی قعدہ ۹۱۰ھ کو بروز دوشنبہ آپ نے وفات پائی اور فراہ اور رج کے درمیان دفن کیے گئے.

اس وقت آپ کے پیرو (گجرات، راجپوتانہ. ریاست پالن پور مدراس پریسیڈنسی. دکن. کرناٹک، مرہٹہ، تلنگا اور ملیبار کے علاقوں میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں. اس کے علاوہ مکران میں ایک فرقہ "ذگری" کے نام سے موجود ہے اس فرقہ کی نسبت بھی سید محمد جونپوری سے کی جاتی ہے. آپ کا مکران میں جانا ابھی تک کی مستند

تاریخ سے ثابت نہیں ہوا۔ گمان غالب یہ ہے کہ میاں دانش خراسانی نے مکران کے علاقے میں آپ کی تعلیم کی تبلیغ کی ہوگی اور موجودہ ذکری ان ہی کی مساعی کا نتیجہ ہیں ؎

یک نالہ مستانہ ز جائے نہ شنیدم
ویراں شود آں شہر کہ میخانہ ندارد!
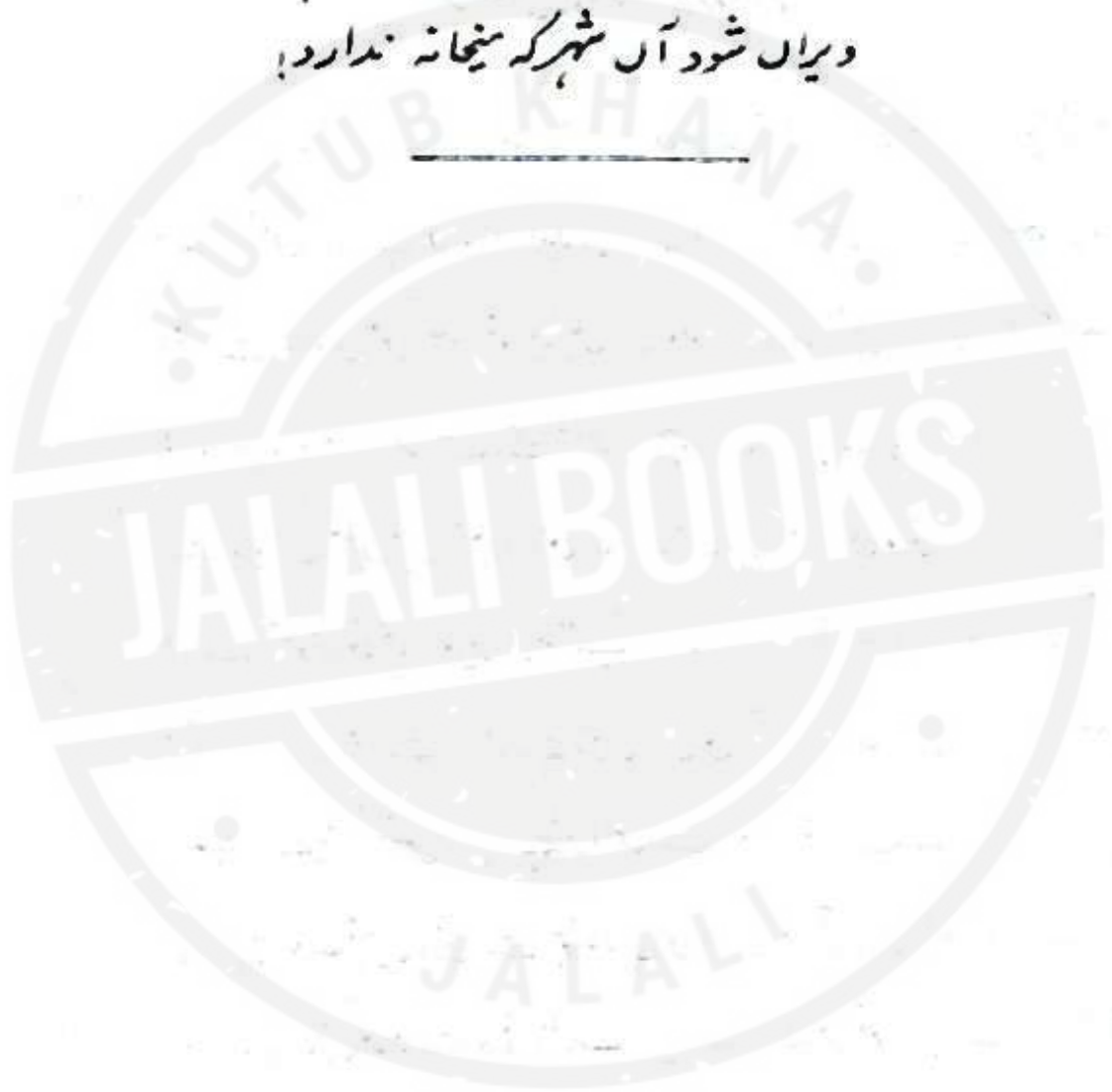
ضمیمہ نمبر ۴

خواجہ خیل اور میر بجار

آخوند محمد صدیق نے میر بجار کے قلات کے سلسلہ میں "تاریخ خوانین احمد زئی" میں لکھا ہے کہ خواجہ خیلوں نے میر بجار کی گھوڑے، اسلحہ اور رقم سے امداد کی تھی۔ لیکن خواجہ خیل ان دنوں کمزور تھے۔ اس لئے اس کی مزید مدد نہیں کر سکتے تھے۔ معلوم نہیں کن روایات یا دستاویزی حوالوں سے یہ باتیں لکھی ہیں۔ لیکن اپنی کتاب میں ان امور کی کوئی نشاندہی نہیں کی ہے۔ آخوند ملا محمد صدیق کی مرتب کردہ تاریخ ایک حوالہ کی کتاب کی حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کی تحریریں نقائص سے مبرا نہیں۔ سب سے بڑا نقص تو یہ ہے کہ اس نے اہم واقعات کے وقوع پذیر ہونے کی تاریخ تک نہیں دی ہے جو تاریخ کی جان ہوتی ہیں۔ نیز اس نے اُس زمانہ کے سماجی حالات کا ذکر تک نہیں کیا ہے جو ملکی سیاست اور فتوحات کے رخ کو موڑنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ مثلاً آخوند صاحب نے یہ تبلانے کی کوشش ہی نہیں کی ہے کہ مکران سے میر بجار اور میر گوہرام کے ہجرت کرنے اور قلات کی طرف نکل آنے کی وجوہات کیا تھیں۔ کیا وہ قلات پر حملہ کرنے کی غرض سے مکران کی طرف نکل کھڑے ہوئے تھے۔ یا

پھر اس مہاجرت کی وجہ قحط سالی یا ایران کے صفوی بادشاہ کے ملازمین کے زیادہ ٹیکس وصول کرنے اور اس میں زیادہ سختی کرنے کی وجہ سے مکران کو خیر باد کہہ کر قلات اور سندھ کا رُخ کیا تھا۔

جہاں تک خواجہ خیلوں کا تعلق ہے وہ ان ایام میں کمزور نہیں تھے بلکہ اپنی طاقت کی بنا پر مستونگ کی سرسبز وادی کے مالک تھے اور پورے علاقہ پر ان کا غلبہ اور تسلط تھا۔ اگر بلوچوں کا قلات پر حملہ کر کے قلات کے مقامی حکمران میر عمر کو قتل کر کے قلات پر قبضہ کرنے کا واقعہ ایک تاریخی حقیقت ہے تو پھر خواجہ خیلوں نے اسلحہ۔ گھوڑے اور رقم کے علاوہ میر بجار کو نفری بھی مہیا کر کے اس کی بھرپور امداد کی تھی۔ کیونکہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ میر بجار تن تنہا قلات اور سوراب تک نہیں گیا ہوگا۔ بلکہ یقیناً اس کے ہمراہ ایک جنگی لشکر بھی ہوگا۔ جس کو خواجہ خیلوں نے ہی فراہم کیا ہوگا۔ یہ روایت ابھی تک قبیلہ خواجہ خیل کے افراد میں مشہور ہے کہ انہوں نے میر بجار کو ایک سو جنگی جوان مع گھوڑے اور اسلحہ فراہم تو کئے تھے۔ میر بجار کی والدہ بی بی مہناز خواجہ محب علی کی بیٹی تھی جو قبیلہ خواجہ خیل کا سردار تھا۔ اور علاقہ کی قیادت اس کے ہاتھ میں تھی۔ یہ قرین قیاس نہیں کہ وہ اکیلا اور بے سروسامانی کی حالت میں قلات اور سوراب تک سفر کیا ہو۔ لیکن بلوچوں کا قلات پر حملہ کر کے میر عمر سے نبرد آزما ہونا کچھ مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک براہوئی، بلوچی رزمیہ داستانوں کا تعلق ہے میر عمر کا جدگالوں سے نبرد آزما ہونے کا ذکر

تفصیل سے ملتا ہے اور وہ غالباً انہی جدگالوں کے ہاتھوں شہید بھی ہوا تھا۔ خاران کے سلام بیگ نیابت کے وادی شمشان کے قبروں پر، بالا، تو ہو اور ان کی بہن لبوّ کے نام کندہ ہیں۔ جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ قیس دون اور محمد تاوہ کے عالی زئیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی براہوئی جدگال جنگ کے دوران جو جھالاوان کے علاقہ میں ہوئی تھی، جدگالوں کے خلاف ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ میر کجاّر نے جب تلات پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا تو اس نے بھی بلوچوں کی بجائے جدگالوں کے خلاف نبرد آزما ہو کر ان علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ جہاں وہ بڑی تعداد میں اپنے سرداروں کے تحت آباد ہو کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ لہذا اس اعتبار سے آخوند ملا محمد صدیق کی تحریریں بڑی ہی مشتبہ ہیں اور ان پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ جدگالوں کے خلاف براہوئی قبائل کی لڑائیوں کے دوران میر عمر کے ایک غلام گوشو نے بڑا کردار ادا کیا تھا۔ جس کا ذکر بلوچی نظموں (BALLADS) میں ملتا ہے۔ اس کی اولاد سے چند گھرانے ابھی تک تغاڑ علاقہ سوراب میں تغاڑی کے نام سے آباد ہیں۔ خیال ہے کہ یہ رزمیہ داستان ملا محمد صدیق کی تحریروں کی نسبت زیادہ قابلِ اعتبار ہیں کیونکہ بلوچی شعراء اس قسم کی نظمیں (BALLADS) واقعات کے فوراً بعد مرتب کیا کرتے تھے اور یہ پرانی اور سنی سنائی روایات پر مبنی نہیں ہیں ٭